چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 6000 روپے

مستقل سلسلے

ستمبر 2015

جلد 38 شمارہ 6

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ کے قلم سے

اداریہ

ماہ ستمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

یہ مہینہ پاکستان کے دفاع کا سبق یاد دلاتا ہے۔ جب 1965ء میں اسی مہینے قوم کے بہادر اور جیالے سپوتوں نے دشمن کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ اپنی جان وطن عزیز پر قربان کرکے قربانی کی بے مثال داستانیں رقم کی تھیں مگر وطن پر آنچ نہیں آنے دی تھی۔ ان ہی کی یادیں ہر سال 6 ستمبر یوم دفاع کے طور پر منایا جاتا ہے جبکہ ہماری فضائی افواج اپنی شجاعت اور بہادری کی داستانوں کی یاد میں 7 ستمبر کو یوم فضائیہ کے نام سے مناتی ہے۔ یہ دن دراصل اس سبق کو دہرانے اور یاد رکھنے کے لیے منائے جاتے ہیں کہ وطن عزیز کو جب بھی ضرورت پڑی تو اس مشکل گھڑی میں کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ہمارا دشمن مسلسل موقعوں کی تلاش میں رہتا ہے اور جارحیت کرکے ہمارے نہتے شہریوں کو نشانہ بناتا ہے لیکن دشمن یہ جان لے کہ ہم وطن عزیز کے دفاع کی خاطر کبھی سمجھوتہ نہیں کریں گے اور وطن کے چپے چپے کا دفاع کریں گے۔ پاکستان اللہ کے فضل سے دنیا کی ساتویں بڑی ایٹمی طاقت اور بہترین مسلح افواج کا حامل ملک ہے۔

اس ماہ میں عیدالاضحی بھی آرہی ہے۔ یہ عید دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کو یاد کرنے کے لیے منائی جاتی ہے۔ اس بات کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ ہم اپنے رب کی رضا کی خاطر کبھی کسی بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ کوشش کریں کہ اس عید سعید کو اس کی روح کے مطابق منائیں اور ان خوشیوں میں ایسے لوگوں کو ضرور شامل کریں جو اس تہوار کو منانے کی استطاعت سے محروم ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- عیدالاضحیٰ اسپیشل میں شیف راحت سے ملاقات،
- اداکار حمزہ علی عباسی سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکار فارس شفیع کہتے ہیں "میری بھی سنیے"،
- اس ماہ "سدرہ یوسف" کے مقابل ہے آئینہ،
- "وانپنزل" تنزیلہ ریاض کا سلسلے وار ناول،
- "ردائے وفا" فرحین اظفر کا سلسلے وار ناول،
- "میں گمان نہیں یقین ہوں" نبیلہ ابر راجہ کا مکمل ناول،
- "شدمات" نایاب جیلانی کا مکمل ناول،
- "پھر نہ کہنا" سلمیٰ نفیر حسین کا دلچسپ مکمل ناول،
- "شاید" فائزہ افتخار کا دلکش ناولٹ،
- "اب نیند ہوئی پرائی" مقدس مشعل کا ناولٹ،
- صدف ریحان گیلانی، نادیہ احمد اور سحرش فاطمہ کے افسانے اور مستقل سلسلے شامل ہیں۔

مفت،

گوشت کے پکوان اور قربانی کے فضائل اور اہمیت پر مبنی کتاب کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے پیش خدمت ہے۔

حمد باری تعالیٰ

ہر دل کی دھڑکنوں میں شامل ہے نام تیرا
دیتا ہے جو ہدایت وہ ہے کلام تیرا

تیری ہی روشنی ہے، روشن ہے تیری ہستی
ذہنوں میں جگمگائے، ایسا ہے نام تیرا

سنتی ہے روح جس کو پڑھتی زباں جسے ہے
جو دل میں گونجتا ہے وہ ہے کلام تیرا

کوئی شریک تیرا نہ ثانی ہے اے خدایا
لاریب سب سے ارفع و اعلیٰ مقام تیرا

تو نے عطا کیا ہے دردِ جنوں کنول کو
کرتی ہے ذکر مولا وہ صبح شام تیرا

یاسمین کنول

نعت رسولِ مقبولؐ
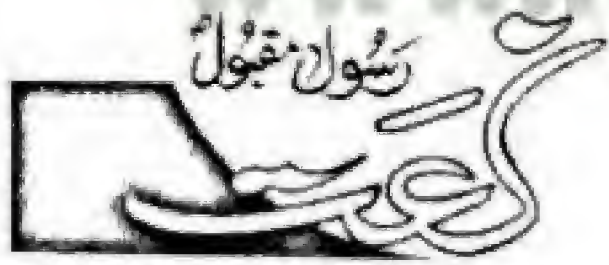
خسروی اچھی لگی نہ سروری اچھی لگی
ہم فقیروں کو مدینے کی گلی اچھی لگی

دُور تھے تو زندگی بے رنگ تھی بے کیف تھی
ان کے کوچے میں گئے تو زندگی اچھی لگی

میں نہ جاؤں گا کہیں بھی درِ نبی کا چھوڑ کر
مجھ کو کوئے مصطفیٰ کی چاکری اچھی لگی

ناز کر تو اے حلیمہ، سرورؐ کونین پر
گر لگی اچھی تو تیری جھونپڑی اچھی لگی

رکھ دیے سرکار کے قدموں پہ سلطانوں نے سر
سرورِ کون و مکاں کی سادگی اچھی لگی

مہر و مہ کی روشنی مانا کہ اچھی ہے مگر
سبز گنبد کی مجھے تو روشنی اچھی لگی

آج محفل میں نیازی نعت جو میں نے پڑھی
عاشقانِ مصطفیٰ کو وہ بڑی اچھی لگی

عبدالستار نیازی

شیف راحت

شاہین رشید

بقرا عید کی آمد آمد ہے تو ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہر سال اس موقع پر کسی شیف کا انٹرویو ضرور دیں تو اس بار شیف راحت سے کچھ باتیں آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔ ان کا شمار لائیو کوکنگ شو کی پارٹیز میں ہوتا ہے۔ آج انہی کی وجہ سے ہر کوکنگ چینل لائیو کوکنگ شو کرتے ہیں۔

★ "بچپن میں تو اکثر لڑکیوں کو کوکنگ کا شوق نہیں ہوتا اور بڑے ہو کر بھی نہیں.... آپ کے اندر کوکنگ کے شوق نے کب جنم لیا؟"

✻ "آپ کو سن کر حیرت ہو گی کہ مجھے بچپن سے ہی کوکنگ کا شوق تھا اور اس وقت میں شوقیہ کھانے پکایا کرتی تھی اور گھر والے بھی خوش ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب لڑکیاں ایسے کام کریں گی تو گھر والے خوش ہی ہوں گے اور اگر میں یہ کہوں کہ شادی کے بعد شوق کی تکمیل ہوئی تو غلط نہ ہو گا۔"

★ "اچھا گڈ.... سب از خود ہوا یا ٹریننگ بھی لی؟"

✻ "شوق تو از خود ہی ہوا تھا' البتہ کوکنگ کورسز کرنے سے اور پھر پریکٹیکلی کام کرنے سے مزید مہارت حاصل ہوئی۔ شادی کے بعد جب بیرون ملک قیام کا موقع ملا تو پھر میں نے کافی کورسز کیے۔"

★ "بیرون ملک قیام؟ کس طرح؟"

✻ "میرے میاں صاحب ایئر لائن میں تھے تو مختلف ممالک جانے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ لہٰذا جب کہیں قیام کا موقع ملتا تھا تو پھر میں کوکنگ کا کوئی نہ کوئی کورس کر لیا کرتی تھی۔"

★ "مثلاً....؟"

✻ "مثلاً" امریکہ' برطانیہ اور سعودی عرب سے چائنیز' بیکنگ کولڈ کچن' ہاٹ کچن اور کچن سے متعلق

کورسز کیے۔"

★ "تو پھر پریکٹیکلی اس کو کس طرح جاری رکھا؟"

✻ "یہ کام تو ایسا ہے کہ چھوڑ دیا تو بس چھوڑ دیا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ایک ایڈ ائزر کمپنی میں بہ حیثیت "ایگزیکٹو" کوکنگ کلاسز لینے کی جاب مل گئی۔ اس کے علاوہ کریک کلب' وومن کلب اور مختلف جگہوں پہ بہ حیثیت انسٹرکٹر بھی کوکنگ کلاسز لیں میں نے تو پریکٹس تو جاری رہی میری اور شاید آپ کے علم میں یہ بات ہو گی کہ میں "امریکن شیف ایسوسی ایشن کی تاحیات رکن بھی ہوں۔"

★ "اچھا گڈ۔۔ اور بھی تو بہت کچھ کیا آپ نے' وہ بھی تو بتائیے نا ہمارے قارئین کو؟"

✻ "گوگل میں سب کچھ ہے۔"

★ "ہاں مگر گوگل کی سہولت سب کے پاس نہیں ہے؟"

✻ "ہوں۔۔۔ یہ تو ہے۔ تو جناب میں حکماء کونسل گورنمنٹ آف پاکستان" سے رجسٹرڈ حکیم ہوں اور میں نے حکمت کے چار سالہ کورس میں دوسری پوزیشن حاصل کی "پیمن" پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز میں بھی کام کیا۔ ریڈیو شارجہ میں ایشین کمیونٹی کے لیے تقریباً "ڈھائی سال پروگرام کیے۔"

☆ "ماشاء اللہ۔۔۔ آپ تو اپنی فیملی کے لیے اور اپنے شوہر کے لیے ایک بہت ہی قابل فخر خاتون ہیں اور اب آپ کی بیٹی بھی اس فیلڈ سے وابستہ ہے۔

کب احساس ہوا کہ آپ اس فیلڈ کو بطور پروفیشن یا ذریعہ روزگار اپنا سکتی ہیں؟"

✻ "مجھے تو کوئی احساس نہیں ہوا۔ ہاں گھر والے میری کوکنگ سے بہت متاثر تھے اور اکثر کہتے تھے کہ جب سسرال جاؤں گی تو سسرال والے بہت خوش ہوں گے کہ تم اتنی سگھڑ بہو ہو۔ کیونکہ تم بہت مزے دار کھانے پکاتی ہو۔"

★ "شیف بننے کا خیال کیسے آیا؟"

✻ "شیف بننے کا خیال تو کبھی بھی نہیں آیا۔۔۔ کیونکہ بہت زمانے تک تو خواتین شیف کا تو تصور بھی نہیں تھا۔ بس اچھا پکانے والی سگھڑ لڑکی ضرور کہلاتی تھی۔ ہاں مجھے یاد ہے کہ جب میں شادی کے بعد امریکہ گئی تو میری بھائی بھی ساتھ تھے۔ جب وہاں میں نے اپنے بھائیوں کو مزے دار کھانے پکا کر کھلائے تو وہ اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں امریکہ میں ایک ریستوران کھول لوں۔ مگر یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔۔۔ البتہ میں نے وہاں رہ کر متعدد کورسز ضرور کرلیے کہ کبھی نہ کبھی اسے کام میں ضرور لاؤں گی۔"

★ "پہلی ڈش کس عمر میں پکائی تھی۔۔۔ کچھ یاد ہے؟"

✻ "پہلی ڈش تو مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ کیونکہ وہ خراب ہو گئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ میں شاید نو یا دس سال کی تھی۔ گھر میں میں تھی اور میرا بڑا بھائی۔۔۔ اچانک بھائی کے ایک دوست آگئے' بھائی نے کہا کہ تمہیں کسٹرڈ بنانا آتا ہے میں نے کہا نہیں۔ تو کہنے لگے کہ چلو میں سکھا دیتا ہوں۔ انہوں نے مجھے ترکیب بتائی اور خود دوست کے ساتھ گپوں میں مصروف ہو گئے۔ میں نے سکھاتے ہوئے انداز میں کسٹرڈ بنایا مگر اس میں کسٹرڈ زیادہ حل نہیں ہوا یا پتا نہیں کیا ہوا کہ گٹھلیاں بن گئیں اور کسٹرڈ خراب ہو گیا۔ تھوڑی ڈانٹ بھی پڑی

مگر میرا کیا قصور تھا۔ میری عمر تھی بھلا کوکنگ کی۔ نو دس سال کی عمر میں تو لڑکیاں کھیل کود رہی ہوتی ہیں مگر اس عمر میں بھی مجھے شرمندگی کا احساس تھا کہ مجھ سے کچھ غلط ہو گیا ہے۔ میری کم عمری میں ہی میری والدہ کا انتقال ہو گیا تھا تو اگرچہ گھر کا نظام بڑے بھائیوں اور بہن نے سنبھالا ہوا تھا مگر میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میں کچھ نہ کچھ کرتی رہوں۔ چنانچہ میں کچھ نہ کچھ پکاتی رہتی تھی مگر احتیاط سے اور آپ یوں سمجھیں کہ آہستہ آہستہ میں اپنے آپ سے بھی کافی چیزیں بنانا سیکھ گئی تھی۔"

★ "مختلف اداروں میں تو آپ سکھاتی تھیں۔ پھر ٹی وی تک رسائی کیسے ہوئی؟"

✱ "یہ انہی دنوں کی بات ہے جب میں مختلف کمپنیز کی طرف سے منعقدہ پروگراموں میں کوکنگ کلاسز لیا کرتی تھی اس وقت ایک ٹی وی چینل نے میری اجازت سے میرے پروگرام ریکارڈ کیے اور اپنے چینل پہ چلائے اور پھر بڑی باقاعدگی سے میرے پروگرام ریکارڈ کیے جاتے تھے۔ اور آن ایئر کیے جاتے تھے۔"

★ "اچھا تو لگتا ہو گا اپنا پروگرام دیکھ کر؟"

✱ "بہت اچھا لگتا تھا۔ مگر سچ بات بتاؤں ریکارڈنگ میں دیر بہت ہو جاتی تھی اور وقت بہت ضائع بھی ہوتا تھا اور میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ میں اب مزید پروگرام نہیں کروں گی۔۔۔ اور میں نے تقریباً "پروگرام کو خیرباد کہہ ہی دیا۔۔۔ تو ایک دن میری بیٹی نے کہا کہ آپ اتنی ماہر ہیں دنیا کو سکھاتی ہیں اگر ٹی وی چینل کو چھوڑ دیں گی تو کتنے لوگ مایوس ہوں گے خیر میں ایک اور چینل پہ گئی اپنے بارے میں بتایا انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے ہمارے چینل کے لیے آپ پروگرام کریں۔ میں نے کہا ریکارڈنگ میں وقت ضائع ہوتا ہے۔ مجھ پر بھروسا کریں مجھے لائیو پروگرام کرنے دیں۔ چنانچہ میں نے اپنی مرضی سے لائیو پرفارمنس دی جسے سب نے بہت پسند کیا اور اس طرح پاکستان میں کوکنگ کا پہلا "لائیو شو" میں نے کیا اور پھر میرے پروگرام کے بعد اور لوگوں کو بھی حوصلہ ہوا اور انہوں نے بھی لائیو شو کرنے شروع کر دیے۔"

★ "خواتین سے زیادہ مرد شیف زیادہ ہیں۔ کیا وہ خواتین سے زیادہ اچھے شیف ہوتے ہیں؟"

✱ "ایسا کچھ نہیں ہے۔ مرد اگر اچھے شیف ہیں تو خواتین بھی بہت اچھی شیف ہیں اور کوکنگ کا شعبہ تو ہے ہی خواتین کا۔ آپ کسی سے بھی پوچھیں کہ کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے تو وہ اپنی ماں کا یا اپنی بیوی کا ہی نام لیں گے۔"

★ "ہاتھ کی بات کی۔۔۔ تو کیا ہاتھ میں ذائقہ ہے والی بات حقیقت ہے یا محبت ہے؟"

✱ "حقیقت ہے۔ ہر انسان کے ہاتھ میں ایک الگ ذائقہ ہوتا ہے۔ میری امی لوکی گوشت بہت اچھا پکاتی تھیں۔ انہی کی ترکیب کے ساتھ میں پکاتی ہوں تو وہ ذائقہ نہیں آتا جو ماں کے ہاتھ میں تھا۔ تو ذائقہ والی بات میں بہت صداقت ہے۔"

★ "ماں کے ہاتھ کا ذائقہ تو سب ہی کو پسند ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی بے لوث محبت کھانے میں بھی شامل ہوتی ہے۔ آپ کے بچوں کو بھی آپ کے ہاتھ کے پکوان ہی پسند ہوں گے خواہ دوسرے کتنے ہی اچھے پکوان کیوں نہ پکالیں۔۔۔ خیر یہ بتائیں کہ جب اس فیلڈ

میں نئی نئی آئیں تو کیا کچھ ہوا تھا۔ کوئی بات جو یاد ہو؟" ویسے مجھے سبزیاں زیادہ پسند ہیں۔"

★ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

✱ "بہت سے واقعات ہیں جس زمانے میں میں کوکنگ کلاسز لیا کرتی تھی اس زمانے میں میری کلاس میں لڑکے بھی تھے اور اکثر لڑکے شرارتی تھے' ہماری کوکنگ کلاس میں ایک رول تھا کہ لڑکے لڑکیاں سب کے سر ڈھکے ہوئے ہوں اور ایک بال بھی نظر نہ آئے۔ ایک دن ایک لڑکے کو شرارت سوجھی اور اس نے ایک ڈش میں ایک بال ڈال دیا۔ چونکہ بال ڈالا گیا تھا اس لیے اوپر ہی اوپر نظر بھی آگیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ یہ بال لڑکے کا ہے یا لڑکی کا... تو ایک لڑکا بولا کہ بال کی لمبائی سے اندازہ لگائیں کہ کس کا ہے میرے بالوں سے ناپا گیا تو میرے سائز کا ہی نکلا... اللہ جانے اس نے وہ بال کہاں سے لیا۔ لیکن سب کچھ اتنے اچھے انداز میں ہوا کہ سب ہی اس کی اس شرارت سے محظوظ ہوئے۔"

★ "شاید اس نے شرارت آپ سے ہی سیکھی ہوگی' کیونکہ پکوان کے دوران آپ بھی اکثر شرارتی موڈ میں ہوتی ہیں؟"

✱ "ہاں... شاید کیونکہ میں کھانا پکانے کو بہت ایزی کام سمجھتی ہوں... موڈ خوشگوار ہو اور تھوڑا تھوڑا گنگنا بھی لیں تو کیا حرج ہے۔ موڈ خراب میں کوکنگ کریں گے تو نہ کھانا اچھا پکے گا نہ ہی اس میں ذائقہ آئے گا۔ ماں کے ہاتھ میں ذائقہ اس لیے بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے پکا رہی ہوتی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اچھی سے اچھی چیزیں میرے بچے کھائیں۔"

★ "آپ کے گھر والے آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا کیا پسند کرتے ہیں؟"

✱ "میرے گھر والے کبھی کسی ایک کھانے پہ مطمئن نہیں ہوتے۔ انہیں ہر وقت کچھ مختلف ہی چاہیے ہوتا ہے کھانے کے لیے۔"

★ "اور آپ کو خود کیا پسند ہے؟"

✱ "ابلی ہوئی لوکی اور ابلے ہوئے چاول... پسند ہیں اور میرے کھانے میں چاولوں کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔

✱ "سب کو معلوم ہے میرے بارے میں... میں کراچی میں پیدا ہوئی اور تعلیم و تربیت بھی کراچی میں ہی ہوئی۔ جب سولہ سال کی تھی تو والدین نے میری شادی کردی... اور بس۔"

★ "پسند تھی آپ کی؟"

✱ "سولہ سال میں کیا کسی کو پسند کرتی' سولہ سال بھی کوئی عمر ہوتی ہے' خالصتاً "ارینج میرج" تھی۔ میرے بڑے بھائی اور میرے جیٹھ سعودی عرب میں ایک ہی کمپنی میں کام کرتے تھے اور دونوں کا آپس میں بہت پیار تھا اور پکی دوستی بھی اور جب یہ دونوں گھر آئے تو اپنی والدہ کو بھی لے کر آئے اور چونکہ میری والدہ نہیں تھیں تو میری دوستی ان کی والدہ سے ہوگئی بعد میں انہوں نے میرا رشتہ مانگ لیا اور اس طرح میری شادی ہوگئی۔"

★ "پہلے تو بات پکی ہوئی ہوگی... تو پھر ملاقات ہوتی تھی میاں صاحب سے یا منگیتر سے؟"

✱ "جی ان کا گھرانہ کافی روشن خیال ہے۔ تو جب رشتہ طے ہوا تو میرے شوہر کراچی آئے (کیونکہ میرا سسرال لاہور میں تھا) تو میری ان سے ملاقات ہوئی تو گھر والوں کے ساتھ ہم دونوں کبھی کبھار کھانا کھانے باہر چلے جاتے تھے۔ پھر پہلے نکاح ہوا اور نکاح کے دو ماہ کے بعد رخصتی ہوئی۔"

★ "پھر ٹائم کیسا گزرا؟"

✱ "الحمدللہ بہت اچھا۔ جب سسرال آئی تو گھر کے کاموں میں اور کھانا پکانے میں اتنی ماہر نہیں تھی مگر مجھے کبھی اس چیز کا طعنہ نہیں ملا اور سب نے بہت پیار دیا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

حمزہ علی عباسی سے ملاقات

شاہین رشید

جی نام سے نہ سہی لیکن ان کے کردار سے لوگ ان کو بہت زیادہ پہچانتے ہیں۔ "پیارے افضل" کا افضل۔ حمزہ عباسی نے شہرت راتوں رات پائی اور اس ڈرامے سے پائی۔

جن دنوں یہ سیریل آن ایئر تھا ہم نے بہت کوشش کی کہ حمزہ عباسی سے آپ کی ملاقات کروائیں۔ مگر ایسا ممکن نہ ہو سکا' ایک تو مصروفیت پھر شہرت کا نشہ... البتہ اس سیریل کے رائٹر خلیل الرحمٰن قمر صاحب سے ہماری تفصیلی بات ہوئی۔ جو قارئین کی نذر کی تھی۔

حمزہ عباسی کی شہرت صرف "پیارے افضل" نہیں ہے بلکہ یہ تھیٹر میں بھی کام کر چکے ہیں۔ فلم میں بھی پلاننگ بھی کی سیاست سے بھی وابستہ ہیں اور ایک اچھے ڈائریکٹر بھی ہیں۔

★ "کیسے ہیں پیارے افضل' میرا مطلب ہے حمزہ عباسی صاحب؟"

٭ ہنستے ہوئے "جی اللہ کا شکر ہے۔"

★ "آپ کا اپنا بڑا نام ہے... مگر پھر بھی آپ کی پہچان "پیارے افضل ہے" ایسا ہی نا؟"

٭ "بالکل ہے جی... لوگ مجھے زیادہ تر پیارے افضل کے نام سے ہی پکارتے ہیں اور مجھے ایسا لگتا ہے۔ یہ لوگوں کا پیار ہے کہ وہ مجھے عزت دیتے ہیں۔"

★ "دل نہیں کرتا کہ لوگ آپ کو آپ کے نام سے بلائیں؟"

٭ "لوگوں کو میرا نام بھی معلوم ہے ایسا نہیں کہ وہ صرف مجھے پیارے افضل کے نام سے ہی جانتے

ہوں۔ چونکہ سیریل بہت پاپولر ہوا تو یہی نام لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا۔"

★ "اب تک کتنے ڈرامے یا سیریل کر چکے ہیں؟"

✻ "میں نے ٹی وی پہ بہت زیادہ کام نہیں کیا لیکن یہ میری خوش قسمتی ہے کہ جتنا بھی کیا لوگوں نے بہت پسند کیا۔"

★ "کچھ فیملی بیک گراؤنڈ بتایئے؟"

✻ "جی ضرور.... میرے والد مرحوم کا نام مظہر علی عباسی ہے۔ وہ پاک فوج میں تھے۔ میجر کے عہدے پر اور اس عہدے سے ریٹائر ہوئے اور والدہ نسیم بیگم جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئیں۔ میں ملتان میں پیدا ہوا اور ہم دو ہی بہن بھائی ہیں۔ میں نے چھٹی کلاس تک آرمی پبلک اسکول سے تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد والدین نے اعلا تعلیم کے لیے مجھے امریکہ بھیج دیا امریکہ سے بیچلرز کی ڈگری حاصل کی اور پھر پاکستان آکر ماسٹرز کیا اور اماں کی خواہش پر سی ایس ایس کا امتحان بھی پاس کیا اور بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا۔"

★ "سی ایس ایس اور پھر شوبز... جاب کو ترجیح نہیں دی؟"

✻ "سی ایس ایس کر کے بھی پاکستان میں اچھی جاب ملنے کا کوئی چانس نہیں تھا' اس لیے اس فیلڈ کو ترجیح دی... اور آپ کو بتاؤں کہ جب میری تعلیم مکمل بھی نہیں ہوئی تھی تب سے میں اس فیلڈ سے وابستہ ہوں ... ابتدا میں نے تھیٹر سے کی اور یہ بات ہے 2006ء کی۔"
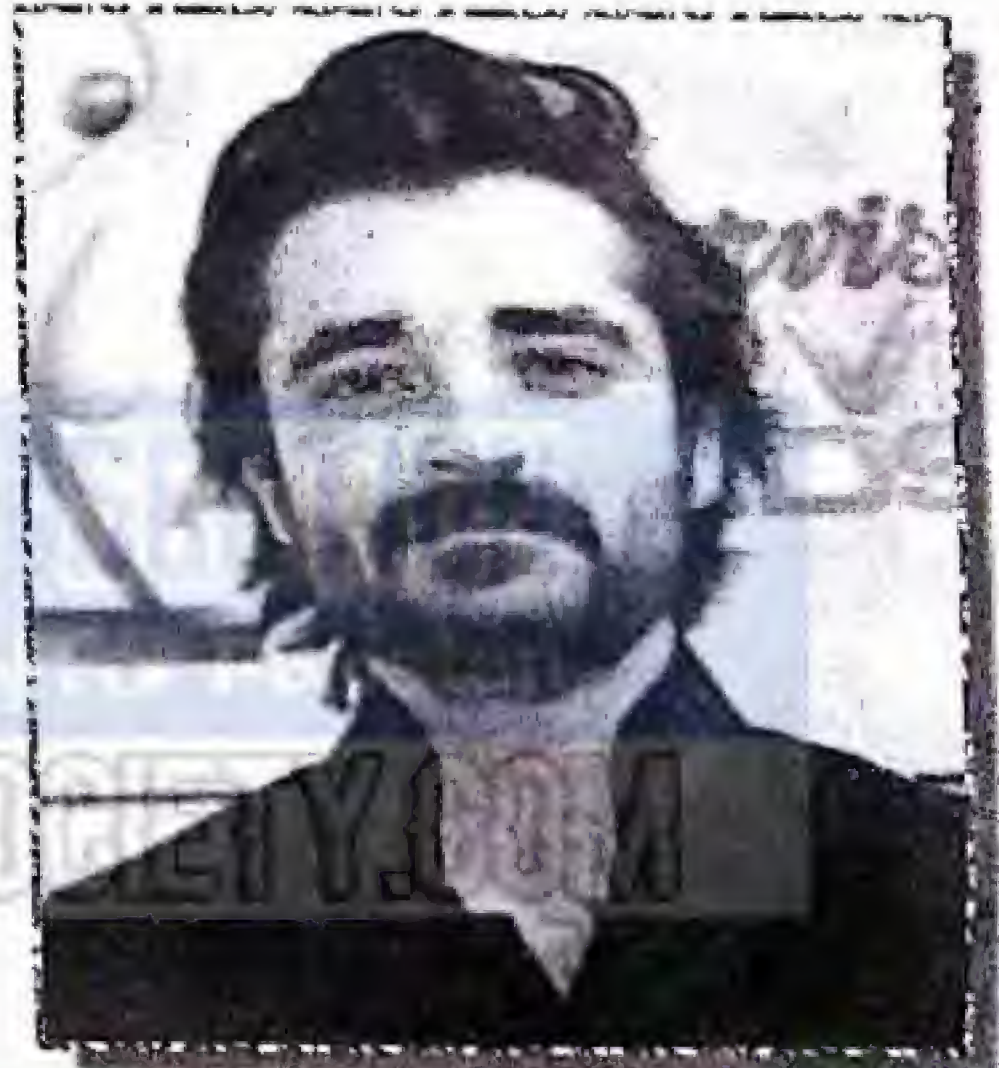
★ "اچھا!... آمد کیسے ہوئی؟"

✻ "2006ء میں ایسے ہی شوقیہ ایک تھیٹر کا ڈرامہ کیا۔ ریسپانس اچھا ملا تو ہمت بڑھی اور مزید کام کی آفرز بھی آگئیں تو سوچا کہ کام اچھا ہے۔ ریسپانس بھی مل جاتا ہے اور جیب خرچ بھی نکل آتا ہے۔ 2010ء میں اپنے ایک دوست بلال لاشاری کی فلم میں ایک مختصر رول کیا اور وہ فلم بھی مختصر دورانیے کی ہی تھی۔ بس پھر جب فیلڈ میں داخل ہو جاؤ تو راستے کھلتے چلے جاتے ہیں اور میرے راستے بھی کھلتے چلے گئے۔ کمرشلز بھی ملنے لگے اور ڈرامے بھی۔"

★ "بچپن کا خواب پورا ہوا یا کچھ اور بننے کا سوچا تھا؟"

✻ "خواب بھی سمجھئے' کیونکہ تھیٹر میں کام کرنے کا شوق تھا جو پورا ہوا اور پھر اس فیلڈ سے مزید راستے بھی نکلے' ڈائریکشن کا بھی شوق ہے اور آج کل کئی پروجیکٹس پہ کام بھی کر رہا ہوں۔"

★ "گھر والوں نے حوصلہ افزائی کی؟"

✻ "بالکل کی' مگر والدہ کی خواہش تھی کہ میں سی ایس ایس کر کے کوئی سرکاری ملازمت کروں' جیسے کہ وہ چاہتی تھیں کہ میں پولیس کا شعبہ جوائن کروں مگر میں سرکاری ملازمت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تب والدہ نے کہا کہ ٹھیک ہے جو فیلڈ تمہیں اچھی لگتی ہے تم اس کو اپنا لو۔"

★ "ملک سے باہر جا کر تعلیم حاصل کی پھر پاکستان میں رہنے کو ترجیح کیوں دی؟"

✻ ہنستے ہوئے... "اس لیے کہ مجھے اپنے ملک سے بہت پیار ہے۔ میرا رزق اللہ نے اس ملک سے وابستہ کر رکھا ہے۔ میرا کام میری شہرت سب اسی سے وابستہ ہیں۔ ورنہ آپ یقین کریں کہ میں نے دنیا بھر

کے ممالک کی سیر کی ہے۔ مگر سکون اپنے ملک میں ہی ملتا ہے۔"

★ "اچھا!.... گڈ.... اپنے ملک کا فیوچر کیسا دیکھتے ہیں؟"

* "فیوچر؟.... سچ میں میرا خواب ہے کہ میں بھی بلکہ ہم سب بھی اپنے ملک پر فخر کر سکیں اور امید ہے کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب ہم اپنے ملک پہ فخر کر سکیں گے۔"

★ "دوسرے ملک میں جا کر احساس ہوتا ہے کہ ہم پیچھے رہ گئے ہیں.... کم سے کم مجھے تو ضرور ہوتا ہے؟"

* "ہاں.... مجھے بھی بہت زیادہ محرومیت کا احساس ہوتا ہے۔ مگر ایک اکیلا انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

★ "آپ تو شاید تحریک انصاف سے بھی تو وابستہ ہیں؟"

* "جی ہاں۔ میں تحریک انصاف سے وابستہ ہوں اور میں اس جماعت سے وابستہ بھی اس لیے ہوا ہوں کہ مجھے اس سے بہت امیدیں ہیں اور میں اس پارٹی کے ساتھ مل کر ملک کی ترقی کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

★ "گویا فیوچر کے سیاست دان ہیں آپ؟"

* "ارے نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ میرا کوئی ارادہ نہیں سیاست دان بننے کا' میں تو اس پارٹی کو اس لیے سپورٹ کر رہا ہوں کہ مجھے ان کے منشور میں پاکستان کا فیوچر روشن نظر آتا ہے دیکھا جائے تو ہر انسان اندر سے کسی نہ کسی پارٹی کا سپورٹر ضرور ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ لیڈر بننا چاہتا ہے' یا اپنے اندر لیڈری کی کوالٹی رکھتا ہے۔ ہاں میری یہ سوچ بھی ہے کہ اس ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کو سپورٹ کرنا چاہیے اور ویسے بھی میرا رجحان فلاحی کاموں کی طرف بہت زیادہ ہے تو اکثر اوقات کار خیر بھی کرتا رہتا ہوں جس سے مجھے دلی سکون ملتا ہے۔ امی جب مجھے ایسے کاموں میں انوالو دیکھتی ہیں تو کہتی ہیں کہ تم میں عبدالستار ایدھی والی صلاحیتیں بھری ہوئی ہیں اور مجھے اچھا لگتا ہے اپنے لیے ایسے جملے سن کر۔"

★ "اس فیلڈ میں آنے کے بعد زندگی خوشگوار ہوئی یا تھوڑی مشکل؟"

* "ویسے تو اس فیلڈ میں آنے کے بعد زندگی خوشگوار ہی ہوئی۔ اس فیلڈ میں آ کر بہت کچھ پایا ہے۔ مگر اپنے ذاتی شوق کی قربانی دینی پڑی۔ جیسے کہ مجھے جانور پالنے کا بے حد شوق ہے مگر اپنی مصروفیات کے باعث اس شوق کو پورا نہیں کر سکتا اور اس کے علاوہ کوئی مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ میں ہمیشہ سے اس بات کا قائل ہوں کہ اپنے کام سے کام رکھو تو کبھی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

★ "اپنا فیوچر کیسا دیکھتے ہیں؟"

* "کوئی پلاننگ نہیں کرتا.... بس اللہ تعالیٰ میری قسمت کا جو فیصلہ کرے گا مجھے منظور ہو گا' کیونکہ اللہ اپنے بندے کے لیے جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ اگر میری قسمت میں اونچا مقام لکھا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے خود راستہ دکھائے گا۔"

★ "بہت اچھے پرفارمر ہیں آپ' پھر بھی کبھی تنقید ہوئی کام پر؟ اگر ہوئی تو غصہ آیا؟"

* "منہ پر تو کبھی تنقید نہیں ہوتی' نہ ہی سننے کو ملی۔ مگر میں تنقید سے نہیں گھبراتا کیونکہ میری نظر میں تنقید آپ کے اندر کی خامیوں کو دور کر دیتی ہے اور آپ کو مزید اچھا بناتی ہے۔ بشرطیکہ جائز تنقید ہو۔ پوزیٹو ہو۔"

★ "انڈر پروڈکشن کتنا کام ہے؟"

* "یہ بتانا تو مشکل ہے۔ کیونکہ کام تو چلتا رہتا ہے کب مکمل ہو گا' کب آن ایئر ہو گا کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

★ "آنے والے وقت سے ڈر لگتا ہے؟"

✳ "بالکل لگتا ہے۔ کیونکہ کسی کو نہیں پتا کہ آئندہ آنے والی زندگی میں آنے والا وقت کیسا ہو گا۔ بس مجھے ڈر لگتا ہے تو اس بات سے کہ اللہ مجھے کسی کا محتاج نہ کریں اور نہ ہی کسی بری بیماری میں مبتلا کرے۔"

★ "عام لائف میں کوئی ایسی شخصیت جس سے ڈر لگتا ہو؟"

✳ "نہیں اللہ کا شکر ہے کہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ اللہ سے ڈرتا ہوں اور والدین کا احترام کرتا ہوں۔ اللہ کا ساتھ اور والدین کی دعائیں اگر آپ کے ساتھ ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت آپ کو ترقی کرنے سے روک نہیں سکتی۔"

★ "والدین کا اتنا احترام کرتے ہیں تو کیا شادی بھی ان کی پسند سے کریں گے؟"

✳ "ان شاء اللہ۔ ویسے ابھی تک کوئی لڑکی مجھے بھی پسند نہیں آئی اور اگر مجھے کوئی لڑکی پسند آ گئی تو میری خواہش ہو گی کہ میری پسند میری والدہ کی پسند بھی بن جائے۔ اس طرح دونوں کے لیے کام آسان ہو جائے گا۔"

★ "کافی عرصہ ملک سے باہر آپ نے گزارا۔ کچن سے تو خاصی دوستی ہو گی آپ کی؟"

✳ "صرف دوستی۔ ارے بھئی، بہت لگاؤ اور دلچسپی ہے اور کھانا پکانے کا بے حد شوقین ہوں۔ خاص طور پر باربی کیو بہت اچھا بنا لیتا ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ اگر میں اداکار نہ ہوتا تو پھر ایک اچھا شیف ضرور ہوتا اس سے اندازہ لگائیں میرے شوق کا۔"

★ "مذہب سے لگاؤ؟"

✳ "بہت زیادہ۔ مگر افسوس کہ باقاعدگی سے نماز ادا نہیں کر پاتا۔ کام اور مصروفیات کی وجہ سے ایک آدھ نماز ضرور رہ جاتی ہے۔"

★ "کس دن کا انتظار رہتا ہے؟"

✳ "سالگرہ کا۔ اور وہ بھی اس لیے کہ مجھے لوگوں کی محبت اور گفٹس کا انتظار ہوتا ہے۔ ویسے سارا دن سو کر ہی گزارتا ہوں۔"

★ "بھارت سے آفر آئی؟"

✳ "جی بالکل کافی آفرز ہیں اور کام اس وقت کروں گا جب کوئی بہت ہی بہترین اور منفرد کردار آفر ہوا۔ ایسا ویسا کردار نہیں لوں گا کہ شکر ہے کہ بھارت سے آفر آئی ہے۔ ویسے اپنے ملک میں میں بہت خوش ہوں۔"

★ "شہرت پا کر کیا تبدیلی آئی۔ غرور آیا یا انکساری؟"

✳ "غرور سے تو اللہ تعالیٰ دور ہی رکھے۔ انکساری پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے اور رہے گی۔ شہرت نے مجھے میرے اللہ سے بہت نزدیک کر دیا ہے۔"

★ "کونسا کارنامہ سرانجام دینے کو دل چاہتا ہے؟"

✳ "جہاز اڑا کر کوئی کارنامہ انجام دینے کو دل چاہتا ہے۔ مگر اس کے لیے اچھا پائلٹ ہونا بہت ضروری ہے۔"

★ "جھوٹ بولتے ہیں؟"

✳ "ایک زمانہ تھا جب میں بھی جھوٹ بولتا تھا مگر پھر احساس ہوا کہ جھوٹ بولنے سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ سچ کتنا ہی کڑوا کیوں نہ ہو وہ جھوٹ سے بہتر ہوتا ہے۔ اس لیے اب اگر کوئی جھوٹ بولے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔"

★ "غصہ آتا ہے تو ردعمل کیا ہوتا ہے؟"

✳ "کوئی سخت ردعمل نہیں ہوتا۔ بلکہ تمیز کا دامن نہیں چھوڑتا، کیونکہ غصے میں کہے گئے الفاظ واپس نہیں آتے۔"

★ "کچھ یاد ہے سینما میں سب سے پہلی فلم کون سی دیکھی تھی؟"

✳ "جی بالکل یاد ہے۔ عمر شریف صاحب کی کامیڈی فلم "مسٹر چارلی" دیکھی تھی اور بہت انجوائے کیا تھا۔ سینما میں فلم دیکھنے کا اپنا ہی مزا ہے۔"

★ "شاپنگ کرنے کا مزا اکیلے میں آتا ہے یا گھر والوں کے ساتھ؟"

✳ "گھر والوں کے ساتھ تو گھر سے باہر فیملی ڈنر کرنے میں مزا آتا ہے البتہ شاپنگ اکیلے میں ہی کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔"

میری بھی سنیے

فارس شفیع

شاہین رشید

1 "میرا پورا نام؟"
"فارس شفیع۔"

2 "پیار سے پکارتے ہیں؟"
"فارس۔"

3 "جنم سال / جنم شہر؟"
"2 نومبر 1987ء / لاہور۔"

4 "ستارہ / قد؟"
"اسکارپیو / 6 فٹ 6 انچ۔"

5 "بہن بھائی؟"
"ایک بڑی بہن اور میں۔"

6 "ڈگری؟"
"ایڈورٹائزنگ میں گریجویٹ ہوں۔"

7 "شادی؟"
"فی الحال ارادہ نہیں، جب اللہ کو منظور ہو گا۔"

8 "شہرت؟"
"بہت خوش ہوں شہرت پا کر اور مجھے میرے ہر ڈرامے نے شہرت دی۔ چاہے وہ "قرض ہو" "من جلی" یا "میرے حضور" ہو۔"

9 "شوبز میں والدہ کا نام کام آیا؟"
"ہرگز نہیں۔ اپنے ٹیلنٹ سے آیا ہوں۔"

10 "میری نظر میں حجاب؟"
"اچھی چیز ہے۔ مگر یہ لڑکی کی اپنی خواہش ہوتی ہے ہم اور آپ کسی کو فورس نہیں کر سکتے۔ کچھ ممالک ہیں ایسے جہاں یہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اکثریت میں نہیں... کسی بھی کام میں زبردستی نہیں ہونی چاہیے۔"

11 "برائی کس شعبے میں زیادہ ہے؟"
"میرے خیال میں ہر شعبے میں ہی برائی ہے اور برائی اس لیے ہے کہ تعلیم کی بہت کمی ہے ہمارے ملک میں۔"

12 "لڑکیوں اور خواتین میں کامن برائی؟"
"برائی؟... نہیں نہیں... مجھے خواتین اور لڑکیاں اچھی لگتی ہیں کہ یہ خدا کی حسین تخلیق ہیں۔"

13 "خاندان کی کس شخصیت کے پاس سکون ملتا ہے؟"
"اپنی نانی کے پاس۔"

14 "میں جمع کرتا ہوں؟"
"اچھے خیالات، اچھے الفاظ، اچھی باتیں۔"

15 "بری عادت؟"
"وقت کی پابندی نہیں کرتا۔"

16 "مجھے پسند ہیں؟"
"نگیٹو رول... کیونکہ ان میں اداکاری کا مارجن زیادہ ہوتا ہے۔"

17 "موبائل فون کے فائدے؟"
"بہت سے ہوں گے مگر ایک تو یہ ہے کہ نام لکھے ہوئے جاتے ہیں اگر بات کرنے کا موڈ نہیں ہے تو بیل بجنے دیں اور فون سائلنٹ پہ کر دیں۔"

18 "نرم گوشہ کس میں ہوتا ہے؟"
"میرے خیال میں مرد میں ہوتا ہے۔"

19 "کس فیلڈ میں آگے تک جانا چاہتا ہوں؟"
"میوزک کی فیلڈ میں کہ یہ میرا جنون ہے۔"

20 "میں بننا چاہتا تھا؟"

"جی سنگر اور اداکار۔۔۔ سو بن گیا۔"

21 "بھوک لگی ہو اور؟"

"اور کھانا نہ ملے تو بس مت پوچھیں کتنا غصہ آتا ہے۔"

22 "مجھے انتظار رہتا ہے؟"

"کل کے دن کا۔"

23 "تھکن کے باوجود جانے کے لیے تیار رہتا ہوں؟"

"کہیں بھی نہیں۔۔۔ سونے کے لیے' اپنے کمرے میں چلا جاؤں اور آرام کا موڈ ہو تو کہیں نہیں جاتا۔"

24 "لڑکیوں کا گھورنا کیسا لگتا ہے؟"

"کوئی خاص نہیں۔۔۔ ظاہر ہے میں سیلبرٹی ہوں تو اور اگر لڑکیوں کو پسند ہوں تو ظاہر ہے وہ گھوریں گی ہی۔"

25 "میں ڈرتا ہوں؟"

"اپنے ہی غصے سے۔"

26 "ایک تحفہ جو موڈ اچھا کر دیتا ہے؟"

"پیار و محبت کے دو بول۔"

27 "صبح اٹھ کر پہلی خواہش؟"

"سگریٹ پینے کی۔"

28 "چڑچڑا کب ہوتا ہوں؟"

"جب بھوک لگے اور کچھ کھانے کو نہ ملے تو۔"

29 "کب غصے میں آجاتا ہوں؟"

"جب کوئی بلاوجہ بحث کرے اپنے آپ کو پارسا ثابت کرے۔"

30 "کیفیت؟/ رد عمل؟"

"بات کرنا چھوڑ دیتا ہوں۔"

31 "میری بری عادت؟"

"سگریٹ نوشی۔"

32 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"

"مھندی۔"

33 "کیڑے مکوڑے جو برے لگتے ہیں؟"

"لال بیگ' چوہے وغیرہ۔۔۔ بہت برے بھی لگتے ہیں ڈر بھی لگتا ہے۔"

34 "کس سے لگاؤ؟"

"بہت ہے۔ زیادہ تر اپنے ہی ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاتا ہوں۔ ناشتا بھی خود ہی بناتا ہوں زیادہ تر۔"

35 "گھر سے اس وقت تک نہیں جاتا؟"

"جب تک گاڑی کی چابی نہ لے لوں' والٹ نہ لے لوں اور ہاں سگریٹ نہ لے لوں۔"

36 "میرا دل چاہتا ہے کہ؟"

"کہ میں ان لوگوں پر دل کھول کر خرچ کروں جو ہم سے زیادہ محنت کرتے ہیں مگر کماتے ہم سے کم ہیں اور ان لوگوں پر جن کے پاس اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔"

37 "مجھے مشکل لگتا ہے؟"

"صبح' سویرے اٹھنا اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں کبھی مارننگ شو میں نہیں گیا کہ یہ کام میرے لیے مشکل ہے۔ پھر مارننگ شو میں یہ شو کیا جا رہا ہوتا ہے کہ آنے والا مہمان اپنی زندگی سے بہت مطمئن اور خوش ہے اور یہ ایک جھوٹ ہے۔"

38 "مجھے مزا آتا ہے؟"

"قہقہہ۔۔۔ انگڑائیاں اور جمائیاں لینے میں مزا آتا ہے۔ بستر پر لیٹتا ہوں تو کروٹیں وغیرہ لینے میں مزا آتا ہے۔ تو بہت ساری ایسی باتیں ہیں جن پر مزا آتا ہے۔"

39 "اگر دنیا سو جائے اور میں جاگ رہا ہوں تو؟"
"تو مت پوچھیں کہ کیا ہو گا۔ بہت انجوائے کروں گا اور بہت کچھ کروں گا۔"
40 "جھوٹ کب بولتا ہوں؟"
"جھوٹ..... بہت کم بولتا ہوں کوشش کرتا ہوں کہ نہ ہی بولوں۔"
41 "فریش محسوس کرتا ہوں؟"
"شام کے وقت۔"
42 "زندگی بری لگتی ہے؟"
"یہ تو وقت اور حالات پر منحصر ہے۔ اچھا وقت چل رہا ہو تو زندگی سے زیادہ حسین چیز ہی کوئی نہیں اور برا وقت ہو تو زندگی سے زیادہ بری چیز ہی کوئی نہیں۔"
43 "مجھ میں سستی ہے؟"
"بالکل ہے۔ چھٹی کے دن کہیں جانا پڑ جائے تو تیار ہونے میں بہت سستی دکھاتا ہوں۔ مجھے چھٹی کا دن گھر پر گزارنا اچھا لگتا ہے۔"
44 "کسی کو اجازت نہیں کہ؟"
"کہ اگر میں گہری نیند سو رہا ہوں یا سو رہا ہوں تو کوئی آ کر مجھے اٹھائے..... میں اپنی مرضی سے اٹھنا اور سونا پسند کرتا ہوں۔"
45 "زندگی میں بڑا change آیا؟"
"جب میں ترکی گیا بہت خوب صورت ملک ہے بہت کچھ سیکھا میں نے وہاں جا کر اور جب میں اس فیلڈ میں آیا اور کامیابیاں ملیں تو change آیا۔"
46 "اپنے ملک کے لیے سوچتا ہوں؟"
"کہ اگر میں پاور میں آ گیا تو وفاقی بجٹ میں کمی کر کے تعلیمی بجٹ میں اضافہ کروں گا۔ تعلیم کے بغیر کوئی ملک ترقی نہیں کر سکتا۔"
47 "فارغ اوقات کے مشاغل؟"
"اپنی میوزک۔ کام کرنا اور گیم کھیلنا۔"
48 "پسندیدہ چینل؟"
"اسپورٹس اور ڈسکوری۔"
49 "موڈ اچھا ہو جاتا ہے؟"
"اگر کوئی پیار سے اور اپنائیت سے بات کرے تو۔"

50 "میں متاثر ہوں؟"
"ترکی کے نظام حکومت سے۔"
51 "میری صبح کب ہوتی ہے؟"
"جب کہیں کام سے جانا ہو' شوٹ پہ جانا ہو تو جلدی اٹھ جاتا ہوں' ورنہ دیر تک سوتا رہتا ہوں۔"
52 "میرے لیے رول ماڈل؟"
"میرے گھر والے۔"
53 "فٹ رہنے کے لیے ڈائیٹنگ یا جم؟"
"میں نے جم جوائن کیا ہوا ہے اور ڈائیٹنگ سے نہ صرف جسم خراب ہو جاتا ہے بلکہ کمزوری بھی ہو جاتی ہے۔"
54 "ٹیکنالوجی نے انسان کو کیا دیا؟"
"وقت سے پہلے ہر چیز کی انفارمیشن۔"
55 "شاپنگ پہ پہلی ترجیح؟"
"الیکٹرونک کی شاپ پہ پہلے جاتا ہوں' لیکن میرا تعلق بھی الیکٹرونک کی چیزوں اور کام سے ہے۔"
56 "پسندیدہ پروفیشن؟"
"یہی جس میں ہم ہیں ہوں۔"
57 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"مجھے تو لفظ نصیحت ہی برا لگتا ہے۔"
58 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"اپنی کار کے لیے مہنگے ترین اسپیکر لگوائے تھے۔"
59 "غلطی تسلیم کر لیتا ہوں؟"
"بالکل کر لیتا ہوں۔ یہ کام ذرا مشکل لگتا ہے مگر تسلیم کر لینا ہی انسان کی بڑائی ہے۔"
60 "موبائل فون رحمت یا زحمت؟"
"دونوں۔"
61 "اپنے سرہانے کیا کیا رکھتا ہوں؟"
"چھوٹی چھوٹی کافی چیزیں ہیں جو رکھتا ہوں۔ جیسے عینک' سگریٹ' والٹ' پانی کی بوتل وغیرہ وغیرہ۔"
62 "کسی بھی لائن میں لگنے کا اتفاق ہوا؟"
"بالکل ہوا..... مگر سب سے تکلیف دہ لائن سی این جی کی لائن ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے اپنی کار سے گیس کٹ بھی نکلوائی ہے۔"

مقابل ہے آئینہ

سدرہ یوسف

ادارہ

س: "آپ کا پورا نام گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"

ج: "میرا پورا نام سدرہ یوسف ہے مگر اسکول' مدرسہ' ہر جگہ مختلف ناموں سے مشہور رہی' مثلاً "سدرہ نیازی' سدرہ رانی' سدرہ شہزادی وغیرہ وغیرہ اور اپنی عزیز ترین دوستوں میں سدری کے نام سے مشہور ہوں جس کا عربی ترجمہ میری سدرہ ہے۔"

س: "کبھی آئینہ نے آپ سے یا آپ نے آئینہ سے کچھ کہا؟"

ج: "سچ پوچھیں تو اتنے مصروف دور میں آئینہ فرصت سے دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملتا ہاں پھر بھی جب بھی آئینہ دیکھتی ہوں تو بے ساختہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ جس نے مجھے مکمل بنایا کوئی معذوری نہیں دی۔"

اللھم انت حسنت خلقی محسن خلقی۔

س: "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

ج: "میری سب سے قیمتی ملکیت میری کتابیں' میرے رسائل میرے مدرسے میں گزارے ہوئے چار قیمتی سال اور ان میں بسی خوب صورت اور حسین یادیں اور سب سے بڑھ کر میرے اپنے' میری قیمتی ملکیت ہیں۔ جن کو میں کبھی کھونا نہیں چاہتی۔"

س: "اپنی زندگی کے دشوار لمحے بیان کریں؟"

ج: "جب مدرسے سے فارغ ہوئی اور اپنا مادر علمی چھوڑ کے آنا پڑا تب بہت دشوار لمحات تھے۔ اپنے پیارے اساتذہ کو چھوڑ کر آنا' اپنی ہمجولیوں سے بچھڑنا اور سب سے بڑھ کر قال اللہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پرنور فضاؤں کو خیرباد کہنا یہ سب کرنا بہت مشکل تھا۔"

س: "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"

ج: "میرے لیے محبت ایک آفاقی جذبہ ایک خوب صورت احساس' ایک ایسا تحفہ جو کہ نیک لوگوں کو ودیعت کیا جاتا ہے مگر تب جب محبت پاکیزہ بندھن میں بندھ جائے۔"

س: "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا ہے؟"

ج: "اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنی ہے۔ ارادہ تو یہی ہے آگے جو خالق کائنات کو منظور ہوا۔ کیونکہ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ سو رب تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ میرا ارادہ پایہ تکمیل تک پہنچے۔ (آمین)

س: "پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کیا ہو؟"

ج: "پچھلے سال میں نے تجوید العالمات کا امتحان دیا تھا جس میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی جس پر میں خلق دو جہاں کی بہت شکر گزار ہوں۔"

س: "آپ اپنے گزرے کل' آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"

ج: "میرا گزرا کل ایک خوب صورت خواب' موجودہ آج جہد مسلسل اور آنے والا کل' اس جہد مسلسل کا بہترین ثمرہ ہو گا ان شاء اللہ۔"

س: "آپ اپنے آپ کو بیان کریں؟"

ج: "اپنے آپ کو لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے' پھر بھی بتاتی چلوں کہ الحمد للہ کانفیڈنٹ ہوں' خوش رو' زندہ دل اور سادہ مزاج ہوں۔ پر میری سب سے بڑی خامی کہ غصے کی تیز ہوں بہت کچھ الٹا سیدھا بول دیتی ہوں جس پر بعد میں افسوس بھی ہوتا ہے اور معافی بھی مانگ لیتی ہوں اور ہاں انا ور نہیں ہوں غلطی ہو تو تسلیم کر کے معافی بھی مانگتی ہوں۔ حساس بہت ہوں۔"

یہاں دنیا کے میلے میں سبھی انسان فانی ہیں
کسی انسان پہ ہنسنا مجھے اچھا نہیں لگتا

س: "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہوں؟"

ج: "جی بچپن میں میری کزن کے والد فوت ہو گئے تھے۔ وہ ڈر میرے اندر بیٹھ چکا ہے۔ ماں باپ کو اپنوں کو کھونے سے بہت ڈرتی ہوں میں اور سب سے بڑا ڈر کہ روز محشر رب کو کیا جواب دوں گی کہ زندگی جو کہ تیری عطا کی گئی امانت ہے کہاں اور کیسے خرچ کی تو نے جو انبیاء کا وارث بنایا اس کا حق بھی ادا کیا کہ نہیں؟ اللہ ہم سب کو روز محشر کی سختی سے بچائے آمین۔"

کچھ درد نہاں، کچھ فکر جہاں، کچھ شرم خطا، کچھ خوف سزا
اک بوجھ اٹھائے پھرتا ہوں اور بوجھ بھی کتنا بھاری ہے

س: "آپ کی کمزوری۔ آپ کی طاقت کیا ہے؟"

ج: "میری کمزوری میرے اپنے ہیں جن کو میں بے حد چاہتی ہوں اور میری طاقت میرا رب ہے جو مایوس دلوں کو سہارا دیتا ہے۔ جو دکھی دلوں کو تقویت دیتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے اپنوں سے بھی بڑھ کر اپنا ہے بھی تو ہمیں اپنی رحمت کے سائے میں سمیٹتا ہے۔"

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرم خانہ خراب کو میرے عفو بندہ نواز میں

س: "آپ کے نزدیک دولت؟"

ج: "دولت بقدر ضرورت اہم ہے۔ اس سے زیادہ یا کم نہیں کیونکہ ضرورت سے زیادہ دولت خواہشات کو جنم دیتی ہے اور خواہشات جب بڑھ جائیں تو گناہوں کو جنم دیتی ہیں اور گناہ جہنم کا راستہ ہیں۔"

س: "آپ خوشگوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"

ج: "میں اپنے خوشگوار لمحات اپنوں کے ساتھ مل کر انجوائے کرتی ہوں کیوں کہ وہ خوشی ہی کیا جس میں اپنے نہ ہوں۔"

س: "گھر" آپ کی نظر میں؟"

ج: گھر میں میری نظر میں اگر امن و سکون ہو تو دنیا میں "جنت" اور اگر سکون نہ ہو تو دنیا میں "جہنم"

س: "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟"

ج: "نہیں میں نہیں بھول سکتی بھول جانا بہت مشکل ہے۔ ہاں معاف ضرور کر دیتی ہوں حالانکہ بھول جانے کی بہت کوشش کرتی ہوں پر گزرے پل کی تلخی کے اک ہوک سی سینے میں اٹھتی ہے۔ جیسے

میں اپنوں کے سامنے مسکرا کر دبا لیتی ہوں۔ کیونکہ میرا نظریہ یہ ہے کہ اگر اپنوں کی انجانے میں کی گئی غلطیوں کو اگر بار بار دہرایا جائے تو زندگی کے پر کیف لمحات کا حسن ختم ہو جاتا ہے۔"

س: "کامیابی آپ کی نظر میں؟"

ج: "کامیابی میری نظر میں میرے رب کی عطا، اپنوں کی دعاؤں کا صلہ اور میرے لیے مزید آگے بڑھنے کا گرین سگنل ہے۔ اک جاں فزا خوش کن احساس جو کہ آگے بڑھنے کی لگن پیدا کرتا ہے۔"

س: "سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کر دیا ہے یا یہ واقعی یہ ترقی ہے؟"

ج: "جی یہ تو درست ہے کہ ہم سائنسی ترقی کے تحت مشینوں کے محتاج ہو گئے پر یہ بھی درست ہے کہ اسی بدولت وقت کی بہت بچت ہوتی ہے۔ پہلے جو کام گھنٹوں میں ہوتے تھے اب وہ منٹوں میں ہو جاتے ہیں اور ہم اس وقت کو بہترین مصرف میں خرچ کر سکتے ہیں۔"

س: "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"

بقول غالب.....

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

ج: "میری سب سے بڑی خواہش ہے کہ دین کی داعیہ بن کے سارے عالم میں دین کا ایسا روشن چراغ جلاؤں جسے وقت کی تیز و تند آندھیاں کبھی بجھا نہ سکیں اور میرا خواب کہ میں مصنفہ بنوں، کاش میں بھی اتنا پختہ لکھ پاتی جتنا عمیرہ احمد لکھتی ہیں۔ میری تحریروں میں بھی ایسا بہاؤ اور روانگی ہو جیسی نمرا احمد کی تحریروں میں ہوتی ہے۔ لیکن ان شاء اللہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا کیونکہ میرا یقین ہے کہ۔

آسانیوں سے نہ پوچھ منزل کا راستہ
اپنی راہ کے پتھر تلاش کر
ذرہ سے کائنات کی وسعت پوچھ لے
قطرہ کی وسعتوں میں سمندر تلاش کر

س: "برکھا رت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

ج: "میں برکھا رت کو بھیگ کے انجوائے کرتی ہوں۔

بارش میں بھیلنا بہت اچھا لگتا ہے۔ بارش میں بھیلنا' کچھ چیٹ پٹا کھانا اور دعا مانگنا میرا محبوب ترین مشغلہ ہے۔"

س: "آپ جو ہیں وہ نہ ہوتی تو پھر کیا ہوتی؟"

ج: "میں الحمدللہ عالمہ' حافظ ہوں اور خدا کا لاکھ شکر ہے کہ جس نے مجھے اس قابل بنایا اور اگر میں یہ نہ ہوتی تو پھر میں کچھ بھی نہ ہوتی' کیونکہ دین الٰہی کی معرفت نصیب والوں کو ملتی ہے۔"

س: "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟"

ج: "مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ جب میں نیکی کا کام کرتی ہوں اور جب میرے اپنے میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ جب میں کسی کی مدد کر کے دعائیں لیتی ہوں۔"

س: "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

ج: "مجھے ذہانت متاثر کرتی ہے۔ خاص طور پر ذہین بچے اور وہ لوگ بھی بہت متاثر کرتے ہیں جو اپنی قسمت خود بنانے پہ یقین رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو کامیابیوں سے ہمکنار کرواتے ہیں۔"

س: "آپ کیا مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں؟ یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟"

ج: "جی بالکل میں مقابلے کو انجوائے کرتی ہوں اور آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ مقابلے کے بغیر آگے بڑھنے کا مزا نہیں آتا لیکن غیر ضروری چیزوں میں مقابلہ کرنا میری فطرت نہیں ہے۔"

بھلے لگتے ہیں طوفانوں سے لڑتے بادباں مجھ کو
ہوا کے دوش پہ چلتی کشتیاں مجھے اچھی نہیں لگتی

س: "متاثر کن کتاب' مصنف' مووی؟"

ج: "متاثر کن کتاب قرآن مجید اور اس کے بعد صحیح البخاری شریف مصنف نمرہ احمد اور مووی دیکھتی نہیں۔"

س: "کوئی ایسی شکست جو آج بھی اداس کر دیتی ہے؟"

ج: "ایسی کوئی خاص شکست نہیں ہے۔"

س: "آپ کا غرور؟"

ج: "تمام تعریفیں اللہ کی ذات کے لیے ہیں ہم کون ہوتے ہیں غرور کرنے والے ہاں البتہ اپنے مسلمان ہونے پر دین کا علم حاصل کرنے پر قرآن جیسی لازوال کتاب سینے میں محفوظ کرنے پر فخر ضرور ہے۔ یہ سب میرے اللہ کا کرم ہے ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔"

س: "کیا آپ نے پالیا جو کچھ آپ پانا چاہتی ہیں؟"

ج: "زندگی تو نام ہی پانے اور کھونے کا ہے۔ ویسے میں جو کچھ چاہتی تھی الحمدللہ اس سے بڑھ کر پایا ہے۔"

س: "اپنی ایک خوبی یا خامی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟"

ج: "میری خوبی کہ میں رشتوں کو اہم سمجھتی ہوں۔ انا کو نہیں اور خامی یہ کہ بعض اوقات غصے میں آ کے اپنے پیارے رشتوں کو ناراض بھی کر دیتی ہوں۔"

س: "کوئی ایسا واقعہ جو آپ کو شرمندہ کر دیتا ہے؟"

ج: "ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے۔ بس بچپن کی کچھ بے وقوفانہ شرارتیں ہیں جو کوئی سر محفل چھیڑ دے تو شرمندہ ہو جاتی ہوں۔"

س: "کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جو آپ کو حسد میں مبتلا کر دیتی ہو؟"

ج: "اللہ کا شکر ہے حسد جیسی موذی بیماری سے محفوظ ہوں۔"

س: "مطالعہ آپ کی نظر میں؟"

ج: "مطالعہ میری نظر میں میری روح ہے۔ مطالعہ کے بغیر چین ہی نہیں آتا بقول شاعر۔"

انسان کو بناتا ہے اکمل مطالعہ
ہے چشم دل کے واسطے کاجل مطالعہ

س: "آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی کیا ہے؟ جو آپ اپنے علم' تجربہ' مہارت میں استعمال کرتی ہیں؟"

ج: "زندگی غم و خوشی کے مجموعہ کا نام ہے۔ ہمیں یہ سوچ کے زندگی گزارنی چاہیے کہ یہی سب تو زندگی کا حسن ہے کیونکہ اگر وقت ہمیشہ ایک جیسا رہتا تو ہم یکسانیت سے اکتا جاتے۔"

س: "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"

ج: "میری پسندیدہ شخصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور میرے معزز و مکرم استاد محترم رانا مفتی عمران احمد صاحب جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور پڑھا۔"

تنزیلہ ریاض

داستان

مہر کو کہانیاں سننے کا بے حد شوق ہے۔ اسکول کے فینسی ڈریس شو میں وہ شہزادی راپنزل کا کردار ادا کر رہی ہے' اس لیے اس نے اپنے پاپا سے خاص طور پر شہزادی راپنزل کی کہانی سنانے کی فرمائش کی۔ کہانی سناتے ہوئے اسے کوئی یاد آجاتا ہے' جسے وہ راپنزل کہا کرتا تھا۔

نینا اپنے باپ سے ناراض رہتی ہے اور ان کو سلام کرنا بھی گوارا نہیں کرتی' وہ ابا سے جتنی نالاں اور متنفر رہتی' لیکن ایک بات سچی تھی کہ امی سے اسے بہت محبت تھی' لیکن اسے محبت کا مظاہرہ کرنا نہیں آتا تھا۔ اس کی زبان ہمیشہ کڑوی ہی رہتی۔ نینا اپنے خرچے مختلف ٹیوشن پڑھا کر پورے کرتی ہے۔ اس کی بہن زری ٹیلی فون پر کسی لڑکے سے باتیں کرتی ہے۔

سلیم کی محلے میں چھوٹی سی دکان تھی۔ چند سال پہلے میٹرک کا رزلٹ پا کر کے وہ خوشی خوشی گھر واپس آرہا تھا کہ ایک گاڑی سے اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے اور وہ ایک ٹانگ سے معذور ہو جاتا ہے۔ ذہنی بیمار ہونے کی وجہ سے اس کی ماں نے ہمت قدم اٹھاتے ہوئے محلے میں ایک چھوٹی سی دکان کھلوا دی' سلیم نے پرائیویٹ انٹر کر کے بی اے کا ارادہ کیا۔ سلیم کی غزل احمد علی کے نام سے ایک ادبی جریدے میں شائع ہو جاتی ہے' جو اس نے نینا کے ہاتھ بھجوائی تھی۔

صوفیہ کا تعلق ایک متوسط گھر سے تھا۔ وہ اپنی بہنوں میں قدرے دبی ہوئی رنگت کی مالک' لیکن سلیقہ شعاری میں سب سے آگے تھی۔ صوفیہ کی شادی جب کاشف نثار سے ہوئی تو پورے خاندان میں اسے خوش قسمتی کی علامتی مثال بنا دیا گیا۔ کاشف نہ صرف چلتے ہوئے کاروبار کا اکلوتا وارث تھا' بلکہ وجاہت کا اعلا شاہکار بھی تھا۔ کاشف خاندان کی ہر لڑکی اور

دوستوں کی بیویوں سے بہت بے تکلف ہو کر ملتا' جو صوفیہ کو بہت ناگوار گزرتا تھا۔ صوفیہ کو خاص کر اس کے دوست مجید کی بیوی حبیبہ بہت بری لگتی تھی۔ جو بہت خوب صورت اور ماڈرن تھی اور اس کی خاص توجہ کاشف کی طرف رہتی۔ حبیبہ کی وجہ سے کاشف اکثر صوفیہ سے کیے ہوئے وعدے بھول جاتا تھا۔ صوفیہ کے شک کرنے پر کاشف کا کہنا تھا کہ یہ اس کا کاروباری تقاضا ہے۔

بی بی جان 'صوفیہ کی ساس کو کاشف سے جھگڑا کرنے سے منع کرتی ہیں' لیکن صوفیہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی اور اکثر و بیشتر کاشف سے بحث کرنے لگتی جو کاشف کو ناگوار محسوس ہوتا۔ صوفیہ پریگننٹ ہو جاتی ہے اور بی بی جان کاشف سے صوفیہ کا خیال رکھنے کو کہتی ہیں۔

شہرین نے ضد کرکے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جا کر سمیع سے شادی تو کرلی' لیکن پچھتاوے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ حالانکہ سمیع اسے بہت چاہتا ہے' اس کے باوجود اسے اپنے گھر والے بہت یاد آتے ہیں اور وہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے اور زیادہ تر پلز لے کر اپنے بیڈ روم میں سوئی رہتی ہے۔ سمیع نے اپنی بیٹی ایمن کی دیکھ بھال کے لیے دور کی رشتہ دار اماں رضیہ کو بلا لیا جو گھر کا انتظام بھی سنبھالے ہوئے تھیں۔ سمیع اور شہرین دونوں ایمن کی طرف سے لاپروا ہیں اور ایمن اپنے والدین کی غفلت کا شکار ہو کر ملازموں کے ہاتھوں پل رہی ہے۔ اماں رضیہ کے احساس دلانے پر سمیع غصہ ہو جاتا ہے اور ان کو ڈانٹ دیتا ہے۔ شہرین کے بھائی بہن راستے میں ملتے ہیں اور سمیع کی بہت بے عزتی کرتے ہیں۔

اب آگے پڑھیے

تیسری قسط

"ارے یہ موا ڈپریشن ہی کھا گیا ہے سب کو" انہیں زیادہ حیرانی نہیں ہوئی تھی۔ آج کل اکثر لوگوں کے منہ سے وہ یہی سنتی رہی تھیں۔

"پر بیٹی تمہیں کا ہے کا ڈپریشن... تمہیں تو اللہ نے اتنا چاہنے والا میاں دیا' اتنی قدر کرتا ہے تمہاری... سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے تمہیں ماشاءاللہ" وہ بہت لاڈ سے بولیں۔ صبح ہونے والی گفتگو اپنی جگہ لیکن ان کے دل میں سمیع کے لیے کافی محبت تھی اور اسی وجہ سے انہیں شہرین سے بھی لگاؤ تو تھا۔

"میں خود نہیں جانتی اماں... یہ ڈپریشن آتا کہاں سے ہے..." وہ واقعی عاجز نظر آتی تھی۔ اس نے بلینکٹ ہٹایا تھا اور باتھ روم کی جانب چل دی۔ اماں بستر درست کرتی رہی تھیں۔ اس کمرے میں پھیلاوا ہونا بھی کہاں تھا۔ بچی تو سارا وقت نیچے رہتی تھی۔ اوپر میاں بیوی رہتے تھے لیکن وہ بھی کافی سلیقہ مند تھی۔ انہیں اس کمرے میں کبھی چیزیں بکھری نظر نہیں آتی تھیں۔ شہرین کو باتھ روم میں کچھ وقت لگا تھا تب تک ماں رضیہ وہیں بیٹھی رہیں تاکہ اس سے پوچھ کر ہی جوس بنوائیں۔

"آج تو سر میں کچھ زیادہ ہی درد ہو رہا ہے۔" شہرین نے نکلتے ہوئے بھی سر تھام رکھا تھا۔

"چائے بنوا دیں اماں..." اس نے جوس کو انکار دیا تھا۔

"جیسی تمہاری مرضی بیٹا... اگر کہو تو سر میں تیل ڈال دوں... تمہیں سکون ملے گا۔" انہوں نے سوالیہ انداز میں کہا تھا۔ شہرین نے لمحہ بھر انہیں دیکھا پھر یاسیت سے سر ہلایا۔ ایک بار پھر اپنی ماں کی یاد آنے لگی تھی اسے۔

"جی اماں... پلیز سر بہت بھاری ہو رہا ہے۔" اس نے التجائیہ انداز میں کہا۔

اماں تیل لینے باتھ روم کی سمت گئی تھیں لیکن وہ ابھی مڑی بھی نہیں تھیں کہ انہوں نے شہرین کو عجلت بھرے انداز میں باتھ روم میں آتے دیکھا۔ وہ کچھ سمجھ بھی نہیں پائی تھیں کہ شہرین واش بیسن کی سمت مڑی تھی اور اس

نے ابکائی کرنے والے انداز میں منہ کھولا تھا۔
"اللہ خیر... بیٹی کیا ہوا؟" وہ ایک دم گھبرا گئی تھیں۔ شہرین چند لمحے واش بیسن کے پاس اسی طرح کھڑی رہی۔ معدہ خالی تھا سو نکلا تو کچھ نہیں لیکن شہرین چند سیکنڈز میں ہی زرد پڑ گئی تھی۔ سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اماں نے بمشکل سہارا دے کر اسے بستر پر بٹھایا پھر چلا کر رانی کو آواز دی اور شہرین کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگیں۔
"کیا ہو گیا بیٹی... ابھی تو ٹھیک تھیں۔" وہ حیران تھیں۔
"مجھے خود پتا نہیں چلا۔ لیکن اب ٹھیک ہوں... غبار سا نکل گیا ہو جیسے... سر کو بھی سکون مل گیا ہے۔" شہرین نے نقاہت بھرے انداز میں کہا۔ اسی اثنا میں رانی بھی ایمن کو گود میں اٹھائے چلی آئی تھی۔
"رانی بیگم صاحبہ کے لیے جوس لاؤ" انہوں نے حکم دیا تھا۔ مالکوں کی غیر موجودگی میں وہ خود مالک بن جاتی تھیں۔
"ایمن کو یہیں چھوڑ جاؤ" شہرین نے بچی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ رانی ایمن کو چھوڑ کر دوبارہ کمرے سے نکل گئی۔
"پہلے بھی کبھی ہوا ہے ایسے؟" اماں نے اس کی طرف بغور دیکھا۔ ان کی چھٹی حس نے جیسے کوئی الارم سا بجایا تھا۔
"ایسے ہوا تو نہیں کبھی پہلے میرے ساتھ... آج ہی ہوا ہے" وہ ایمن کی جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"جب ایمن پیدا ہونے والی تھی؟" اماں نے ایک اور سوال کیا۔ شہرین نے چونک کر دیکھا۔ اسے اب سمجھ میں آئی تھی کہ وہ کیا پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ وہ خود حیران سی ہو کر سوچ میں پڑ گئی۔
"بیٹی کوئی اچھی خبر لگتی ہے۔" اماں کو اس کا پر سوچ انداز دیکھ کر جیسے یقین سا آگیا تھا۔
"پتا نہیں... اماں... شاید۔" وہ واقعی پر یقین نہیں تھی۔
"ماشاءاللہ... اللہ مبارک گھڑی لائے۔ ایمن تین سال کی ہو رہی ہے۔ اللہ نے بروقت خوشی دکھائی ہے۔" اماں نے جھٹ پٹ دعائیں دی تھیں۔ جوس لاتی رانی دروازے پر ہی رک گئی۔ اندر سے آوازیں صاف باہر تک آرہی تھیں۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ دونوں مالکنیں اندر کیا بات کر رہی ہیں۔
"لو بتاؤ... پہلے والا بچہ تو سنبھالا نہیں جاتا خود سے اور دوسرے کی تیاری شروع کر دی ہے۔" اس نے ناک چڑھا کر سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اتنی محبت کرتی ہو مجھ سے...؟" اس دن کاشف نے اس کی محبت کو پہلی بار واقعی دل کی گہرائی سے محسوس کیا تھا۔ بی بی جان کی باتوں نے بھی اسے اس کی غلطی کا احساس دلایا تھا۔
"بہت زیادہ کاشف... اسی لیے تو دل جلتا ہے جب آپ کو کسی اور کے ساتھ دیکھتی ہوں" وہ استحقاق بھرے لہجے میں بولی تھی۔ کاشف کچھ نہیں بول سکا تھا۔
اسے صوفیہ سے محبت نہیں تھی لیکن افسوس ناک بات یہ تھی کہ اسے حبیبہ سے بھی محبت نہیں تھی۔ اسے بس تتلی کی طرح اپنے ارد گرد منڈلاتی عورت اچھی لگتی تھی۔ اس کی کسی کمینی سی حس کو تسکین پہنچتی تھی، جب عورت بھنورے کی طرح اس پر واری صدقے جاتی تھی۔
اس کی اپنی بیوی تو ہستی بولتی ہی تھی۔ اس کی محبت میں قربان ہو جانے کو بھی تیار تھی لیکن اس میں کیا خاص بات تھی۔ بیویاں تو سب کی ہی ایسی ہوتی ہیں اسے اصل مزا تب آتا تھا جب دوسروں کی بیویاں بھی اس پر مرتی تھیں اس کے ساتھ بات کرنے کو ترستی تھیں۔ اس کی تعریف کرتی تھیں۔ اس کی مردانگی کو اس سے جلا ملتی تھی لیکن بی بی جان کی باتوں سے اسے شرمندگی ہوئی تھی۔

صوفیہ سے بے شک اسے محبت نہیں تھی لیکن ہونے والی اولاد کے لیے اس کا دل ابھی سے بہت بے چین رہتا تھا۔ اس دن اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ صوفیہ کے ساتھ وفادار رہنے کی کوشش کرے گا۔

☆ ☆ ☆

"نینا کہاں ہے؟" ابا نے زری کو ٹی وی کے سامنے بیٹھے دیکھ کر امی سے سوال کیا تھا۔

"وہ آپا (سلیم کی امی) کی طرف گئی ہے کیوں کوئی کام تھا۔"

امی کو پہلا خیال یہی سوجھا تھا۔ ابا عام طور سے بچیوں کے متعلق زیادہ سوال جواب نہیں کرتے تھے وہ جانتے ہی تھے کہ عشاء کے بعد زری اور نینا ٹی وی کے سامنے نہیں ہوتی تھیں تو اپنے کمرے میں ہوتی تھیں۔ ابا خاموش رہے۔ امی ان کے لیے تازہ روٹی اتارنے باورچی خانے کی سمت چل دیں۔

"کیا بات ہے... کیا سوچ رہے ہیں؟"

کھانا ٹرے میں سجائے پلٹ کر آئیں تو امی نے ابا کے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہیں۔ انہوں نے ایک نظر بیوی کا چہرہ دیکھا پھر کچھ نہیں بولے۔ ان کے ذہن میں کچھ دنوں سے جو خیال گونج رہا تھا وہ یکدم بیان کرنا آسان نہیں تھا۔ حلیمہ چند لمحے ان کی جانب دیکھتی رہیں۔

"کیا پریشان کر رہا ہے آپ کو۔ نینا نے کوئی بدتمیزی کی؟" ان کو خدشہ تھا کہ یہی ہوا ہوگا۔

"آپ دل پر مت لیں... اس کی تو عادت ہے" انہوں نے ساتھ ہی تسلی دینی چاہی تھی۔ ابا نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا پھر فوراً "نفی میں سر ہلایا تھا۔

"ارے نہیں بھائی... اب ایسی بدتمیز بھی نہیں ہے وہ... تمہارے ساتھ ذرا لاڈ پیار میں زبان چلاتی رہتی ہے ورنہ میرے ساتھ تو کبھی زبان درازی نہیں کی" وہ مسکراتے ہوئے ان کی ہمت بندھا رہے تھے۔

"ہاں میں نے تو اس کی جانے کی ساری ادائیں ضبط کر رکھی ہیں نا۔" امی چڑ کر بولی تھیں۔ ابا نے کوئی جواب نہیں دیا اور ٹرے کو اپنے سامنے کر لیا۔ امی جگ سے پانی نکال کر ان کے سامنے رکھتے ہوئے بھی ان کے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ زری ٹی وی میں مگن تھی۔

"یہ اپنی نینا سلیم سے کتنی چھوٹی ہے؟" انہوں نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے یک دم سوال کیا تھا۔ امی نے ان کا چہرہ پھر غور سے دیکھا۔ پتا نہیں کیا کھچڑی پک رہی تھی ان کے اندر۔

"چھوٹی کہاں ہے... بڑی ہے سال چھ مہینے کا فرق ہوگا۔"

امی نے جواب تو دے دیا لیکن بے چینی تھی کہ وہ کچھ اور پوچھیں تو امی جانچ سکیں کہ آخر وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ وہ ان کے بہن بھائیوں کے متعلق زیادہ بات چیت نہیں کرتے تھے۔ سلیم سے بھی اس کی دکان کی وجہ سے علیک سلیک تھی کیونکہ وہاں انہیں چھوٹا موٹا سودا سلف لینے کبھی کبھی جانا پڑ جایا کرتا تھا۔

"وہی تو میں سوچ رہا تھا کہ عمروں میں کچھ فرق ہے اپنی نینا سے چھوٹا ہی ہے... ہم عمر نہیں ہے" ابا دوسرا نوالہ بنا رہے تھے۔

"چند مہینوں کا ہی فرق ہے... ہم عمر ہی سمجھیں" اب کی بار امی نے لاپروائی سے کہا تھا۔ ابا سر ہلاتے ہوئے کھانا کھانے لگے لیکن چہرے پر ابھی بھی کچھ پریشانی سی چھلکتی تھی۔

"سنو نینا سے کہنا رات بے رات منہ اٹھا کر خالہ کے گھر نہ جایا کرے... مناسب نہیں لگتا وہ اب بچی نہیں رہی... بڑی ہو گئی ہے۔"

انہوں نے وہ غبار نکال ہی دیا تھا جو شام سے دل میں پک رہا تھا۔ ایک دن پہلے وہ نینا کو "بچی" کہہ رہے تھے اور اب وہی اسے "بڑی" قرار دے رہے تھے۔

سلیم کا نام براہ راست نہیں لے سکتے تھے۔ یہ بات نینا سمیت اس کی ماں کو بھی بری لگ سکتی تھی، وہ دیکھ سکتے تھے حلیمہ کا چہرہ ان کی بات پر بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔

"دھوپ زندگی ہے" اماں رضیہ نے اس کے گھنے لمبے بالوں کو بہت نرمی سے چھوتے ہوئے شفقت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ شہرین کی گود میں پلیٹ دھری تھی، جس میں سیب کی قاشیں کٹی پڑی تھیں۔ ابکائی آنے کی وجہ سے اس کا بلڈ پریشر قدرتی طور پر کم ہو گیا تھا تو اسے کھانے کی حاجت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ سیب کو رغبت بھرے انداز میں کھانے میں مصروف تھی۔ ایمن بھی اس کے سامنے کارپیٹ پر بیٹھی اپنے ٹیڈی بیئر سے کھیلنے میں مگن تھیں۔ اماں رضیہ اس سارے سین سے سب سے زیادہ خوش تھیں۔ انہیں سمجھ میں آگیا تھا کہ شہرین کو سمجھانا سمیع کو نصیحتیں کرنے سے زیادہ بہتر تھا۔

"ہوا، روشنی انسان کی بنیادی ضروریات ہیں... یہ سب چیزیں نا ملیں تو انسان کمزور پڑ جاتا ہے پھر وہ بیمار نا ہوتے ہوئے بھی خود کو بیمار محسوس کرنے لگتا ہے... تم خود کو دیکھو کتنی کمزور ہو رہی ہو... آنکھوں کے نیچے حلقے ہو گئے ہیں... اتنی اکتائی ہوئی کیوں رہتی ہو بیٹی" اماں رضیہ اس کے بالوں میں تیل انڈیلتے ہوئے تمہید بھی باندھ رہی تھیں۔ انہوں نے رانی کو اچھا سا ناشتا تیار کرنے کا حکم بھی دے دیا تھا۔ شہرین سیب تو کھا رہی تھی لیکن الجھن بھی چہرے پر بکھری تھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوراً" سمیع کو گڈ نیوز دے دے۔ اس نے اسے کال بھی کی تھی لیکن سمیع فی الوقت ریسیو نہیں کر رہا تھا۔

"اماں میرا دل بجھتا سا جاتا ہے۔ کسی کام میں نہیں لگتا۔ مجھے خود سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہے۔ لیکن ہر چیز سے بے زاری محسوس ہوتی ہے... مجھے یہ احساس کھائے جاتا ہے کہ میں نے اپنے باپ کا بہت دل دکھایا ہے... انہیں تکلیف پہنچائی ہے، بہت بدقسمت بیٹی ہوں میں۔" اماں کی انگلیاں بہت نرمی سے اس کے بالوں میں چل رہی تھیں۔ اسے ذہنی سکون مل رہا تھا۔ اس نے بھی دل کی بات انہیں بتا ہی دی۔ اماں کو تاسف نے گھیر لیا۔ انہیں شہرین پر اور بھی پیار آیا۔ وہ کس قدر دکھی لگتی تھی۔

"ایسے نہیں کہتے میری بچی... تم تو بہت قسمت والی ہو۔ ان شاء اللہ ماں باپ کی ناراضی بھی ختم ہو جائے گی لیکن اس کے متعلق سوچ سوچ کر ابھی تو اپنی زندگی برباد نا کرو۔ اللہ نے تمہیں ہیرے جیسا خاوند دیا ہے، پھول جیسی بچی ہے، ان نعمتوں کی قدر کرو۔ ان کا لطف اٹھاؤ۔" وہ اس کے بالوں کا مساج کرتے ہوئے اسے سمجھا بھی رہی تھیں۔ شہرین کچھ بھی نہیں بولی۔ اس کی نظریں ایمن کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بہت دن بعد ایمن اس کمرے میں آئی تھی ورنہ وہ نیچے اپنی میڈ کے پاس ہی رہتی تھی۔ اماں رضیہ نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا پھر ایمن کو دیکھتا پا کر انہیں بہت اچھا لگا۔ یہی تو موقع تھا وہ اسے سمجھا سکتی تھیں۔

"میری بات کا برا مت ماننا بیٹی... چھوٹا منہ بڑی بات... لیکن کہے بغیر رہ بھی نہیں سکتی۔" اماں نے اتنا ہی کہا تھا کہ شہرین نے مڑ کر انہیں دیکھا پھر فوراً" بولی۔

"ارے نہیں اماں... آپ میری امی جیسی ہیں۔ میرے اور سمیع کے دل میں بہت عزت ہے آپ کی... آپ کا تو احسان ہے ہم پر کہ آپ ایمن کو اتنی محبت اور توجہ سے پال رہی ہیں... آپ کی وجہ سے مجھے ایمن کی بالکل فکر نہیں ہوتی... میرے دل کو آپ کی موجودگی سے اتنی ڈھارس ملی ہے کہ میں الفاظ میں بیان بھی نہیں کر سکتی" وہ جو بھی کہہ رہی تھی اس کے چہرے کا ایک ایک عضو اس کے بیان کی تصدیق کر رہا تھا۔ اماں رضیہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ اتنی عزت و توقیر تو آج کل کوئی اپنے سگے ماں باپ کو نہیں دیتا تھا، وہ تو پھر دور پار کی ایک غریب ضرورت مند رشتہ دار تھیں۔ وہ مزید محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگیں۔

"کہیے نا... کیا کہنا چاہ رہی تھیں آپ...؟" شہرین نے بہت ادب سے سوال کیا تھا۔ اماں رضیہ نے محبت

پاش نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اب اس کے منہ سے اتنے اچھے الفاظ میں' اپنا تذکرہ سن کر وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ اپنی بیٹی کو وقت دیا کرو۔۔۔ وہ ان پر بھروسا کرتی تھی تو اپنی ننھی منی پھولوں جیسی بیٹی ان کے سپرد کر رکھی تھی۔ انہوں نے اپنا مطمح نظر بیان کرنے کے لیے' بہت مہذب الفاظ منتخب کیے۔

"ارے بیٹی بس یہی کہنا چاہتی تھی کہ زندگی میں خوش ہونے کے مواقع تلاش کیا کرو۔۔۔ گھربار میں دلچسپی لیا کرو۔۔۔ اس چار دیواری سے باہر نکل کر ملازموں کو دیکھا بھالا کرو۔۔۔ اتنی پیاری بچی ہے۔۔۔ اس کے ساتھ کھیلا کرو۔۔۔ اولاد کی ایک مسکراہٹ ماں کا دل ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اپنے دل کا سکون اپنی اولاد میں ڈھونڈو' اللہ تمہیں مزید خوشیاں دے۔ اولاد نرینہ کا سکھ دے۔" شہرین ان کی باتوں پر سرہلا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں رانیہ کی جانب سے بہت مطمئن ہوں" رانیہ کی امی نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ نینا نے اپنی مسکراہٹ چھپا کر سرہلایا تھا۔ وہ پہلے جن بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھی' ان کی مائیں بھی اس سے کافی خوش رہتی تھیں لیکن وہ جونیئر کلاسز کی تھیں۔ رانیہ ایک بڑی بچی تھی' اس لیے اس کی امی کے اس طرح کہنے پر نینا کا خون کئی سیر بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنے کام کے سلسلے میں کوتاہی کرتی بھی نہیں تھی۔

"میں رانیہ کی کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔۔۔ بہت دل لگا کر پڑھ رہی ہے تمہارے ساتھ۔۔۔ بہت تعریف کرتی ہے تمہاری۔۔۔ میں تو مسز مشتاق کی دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے تمہارے جیسی اچھی لڑکی کا بتا دیا مجھے' ورنہ آج کل اچھے ٹیوشن ٹیچرز ملتے کب ہیں۔۔۔ اس کو خوب پریکٹس کرواؤ تاکہ سب کمی پوری ہو جائے۔۔۔ اس کی پرسنٹیج اچھی آ جائے بس تو سمجھو مجھے سکون ہو جائے۔" رانیہ کی امی کافی خس مکھ اور باتونی خاتون واقع ہوئی تھیں۔

"ان شاء اللہ۔۔۔ نائٹی سکس پرسینٹ سے کم نہیں ہوں گے۔۔۔ رانیہ بہت ذہین ہے اور محنتی بھی۔۔۔ آپ فکر مت کریں جو کمی بیشی ہے وہ بہت جلد پوری کروا دوں گی۔" اس نے انہیں تسلی دی تھی اور اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا۔۔۔ اسے دیر ہو رہی تھی جبکہ مسز رحیم کی باتیں آج کافی طویل ہو گئی تھیں۔ عام ماؤں کی طرح وہ بھی اپنی بیٹی کے ایگزامز کے لیے بیٹی سے زیادہ پریشان رہتی تھیں۔

"ان شاء اللہ۔۔۔ میں واقعی بہت مطمئن ہوں۔۔۔ بیٹھے بٹھائے اتنی اچھی ذہین و فطین' قابل اور محنتی ٹیوشن ٹیچر مل جانا کسی نعمت سے کم نہیں۔۔۔ میں تو جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔۔۔ اسی لیے میں یہ چاہ رہی تھی کہ تم اسے اردو بھی پڑھا دیا کرو۔" انہوں نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر مدعا بیان کیا تھا۔ نینا' جو اپنی تعریفیں سن سن کر خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی' کو دل ہی دل میں جھٹکا لگا۔ اس نے چہرے پر مسکراہٹ قائم رکھتے ہوئے تھوک نگلا۔ اردو سے تو اس کی اپنی جان جاتی تھی۔

"آج کل کے انگلش میڈیم کے بچے اردو میں اتنے کمزور ہیں کہ اب اس مضمون کی بھی ٹیوشن پڑھنی پڑتی ہے۔۔۔ ہمارے زمانے میں ایسا تھوڑی ہوتا تھا۔۔۔ ہم خود ہی سب پڑھ لیا کرتے تھے۔۔۔ اتنے اتنے لمبے مضمون بغیر یاد کیے لکھ آیا کرتے تھے ایگزامز میں۔۔۔ لیکن یہ میری بیٹی صاحبہ ایک شعر کی تشریح خود نہیں کر سکتیں۔۔۔ اردو کا ایک مضمون نہیں لکھ سکتی خود سے۔۔۔ خیر اس زمانے میں پڑھائیاں آسان بھی ہوتی تھیں۔۔۔ آج کل تو بچوں کو بچپن سے ہی اسکالر بنانے میں لگ جاتے ہیں پھر تین سال تو یہ قرآن حفظ کرنے کی وجہ سے اسکول گئی ہی نہیں ہے۔ اس کو تو زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ میری ریکویسٹ ہے کہ تم اسے اردو بھی پڑھا دیا کرو مجھے امید ہے تم اردو بھی بہت اچھے طریقے سے پڑھا لوگی۔" وہ بہت مہذب طریقے سے اپنا مدعا بیان کر رہی تھیں۔ نینا کو سمجھ میں نہیں آیا کہ

ایک دم ان کو انکار کس طرح کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں اردو نہیں پڑھانا چاہتی۔ نئی نئی ٹیوشن ملی تھی اور پھر اپنی تعریفیں سن کر تو وہ بالکل بھی ایک دم انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے دوسرا حربہ اپنایا تھا۔

"پڑھانے کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا... میں آرام سے کروا دیتی اردو بھی لیکن لیکن آپ جانتی ہیں مجھے یہاں سے یونیورسٹی جانا ہوتا ہے... نو بجے میری کلاس ہوتی ہے۔" یہ سب سے بہتر اور مناسب بہانہ تھا۔ رانیہ کی امی نے تاسف سے سر ہلایا۔

"اوہو، یہ تو واقعی مسئلہ ہے لیکن میں زیادہ وقت نہیں لوں گی تمہارا، صرف پینتالیس منٹ، اتنا وقت ہی کافی ہے۔" وہ اصرار کر رہی تھیں۔ رانیہ مسکرائی۔ دل ہی دل میں اسے اس بات کی بہت خوشی تھی کہ وہ اس کے کام سے اتنی مطمئن تھیں کہ مزید وقت کے لیے منت وسماجت تک آ گئی تھیں۔

"مسز رحیم یقین کیجیے میرے پاس وقت نہیں ہوتا... میں پینتالیس منٹ تو دور کی بات دس منٹ نہیں نکال سکتی۔ آپ کے گھر سے نکلتی ہوں تو بھاگتے ہوئے اسٹاپ تک جاتی ہوں... ذرا سی دیر ہو جائے تو یونیورسٹی بس مس ہو جاتی ہے۔" اس نے سہولت سے انکار کرنا چاہا تھا۔ وقت تو وہ نکال سکتی تھی لیکن اردو پڑھانا اس کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہ میتھس، انگلش، سائنس، سبجیکٹس تو کروا سکتی تھی لیکن اردو، معاشرتی علوم سے اس کی جان جاتی تھی۔

"بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے... میں زیادہ اصرار نہیں کرنا چاہتی کہ میری بیٹی کی اتنی اچھی ٹیچر کو کوئی مشکل یا پریشانی ہو" وہ بالآخر مان گئی تھیں۔ نمنا نے دل ہی دل میں شکر ادا کرنا چاہا تھا لیکن اگلے ہی لمحے مسز رحیم بولیں۔

"میرے پاس ایک آپشن ہے... میں تمہیں ڈرائیور سے یونیورسٹی ڈراپ کروا دیا کروں گی... تم آرام سے دس منٹ پہلے یہاں سے ڈرائیور کے ساتھ چلی جایا کرنا۔" انہوں نے حل نکالا تھا۔ نمنا کو اب کی بار بےزاری محسوس ہوئی۔

"ارے نہیں... آپ کیوں زحمت کرتی ہیں... ایسی بات نہیں ہے۔" وہ دوٹوک انکار کرنے کے لیے الفاظ جمع کرنے لگی۔

"زحمت کی بات ہے ہی نہیں... ہمارا گھر کا ڈرائیور ہے... صبح سے شام تک یہاں گھر میں فارغ ہی ہوتا ہے اور یونیورسٹی تک بمشکل دس منٹ کی ڈرائیو ہے... کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے... میں درخواست کرتی ہوں پلیز چند ایک مہینے کی تو بات ہے۔" وہ تو جیسے اس کے گھٹنوں میں بیٹھنے کو تیار تھیں۔

"اچھا میں دیکھوں گی کہ کیا کر سکتی ہوں... آپ پلیز ریکویسٹ مت کریں... آپ بڑی ہیں مجھ سے... اچھا نہیں لگتا۔" اس نے بمشکل انہیں ٹالا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جب وہ اتنا اصرار کر رہی ہیں تو وقت نکال ہی لے۔

"بڑی کہہ کر عزت کر رہی ہو تو اب انکار کر کے میرا دل نا توڑنا" انہوں نے مان بھرے لہجے میں کہا تھا۔ نمنا کو اس لمحے خود اپنے آپ پر ہی ترس آیا لیکن وہ چپ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"زرمین" بی بی جان نے گلابی لحاف میں لپٹی وہ چھوٹی سی پوٹلی اس کی گود میں رکھ دی تھی۔ تکلیف، اذیت انتظار اور بےچینی سب اختتام کو پہنچ گئی تھی۔ اس نے بسم اللہ پڑھ کر بچی کو تھام لیا۔

"مبارک ہو صوفیہ... اللہ نے تمہیں اپنی رحمت سے نوازا ہے" بی بی جان بہت خوش دکھائی دیتی تھیں۔ صوفیہ کے دل کو سکون مل گیا۔ پیدائش کے وقت جب نرس نے اسے بتایا تھا کہ بیٹی ہوئی ہے تو وہ یہ سوچ کر اداس ہو گئی تھی کہ نجانے بی بی جان اور کاشف کا کیا ردعمل ہو لیکن تیسرے دن گھر آنے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ

وہ غلط سوچ رہی تھی۔ وہ دونوں تو بے تحاشا خوش تھے۔ انہوں نے سارے گھر کو تازہ پھولوں سے سجا کر اس کا استقبال کیا تھا۔ بچی کا عقیقہ اس طرح کیا گیا تھا کہ جیسے صوفیہ کے جاننے والوں میں کسی نے بیٹے کا بھی نا کیا ہوگا۔ سارے خاندان کو مدعو کیا گیا تھا۔ سات طرح کے کھانے اور دوسرے لوازمات سے تواضع کرنے کے بعد دیسی گھی والے موتی چور کے لڈو بانٹے گئے تھے۔

فقیرنیاں وقفے وقفے سے دروازے پر خیرات کے لیے آرہی تھیں۔ کئی مدرسوں میں بکرے کے گوشت کے پلاؤ اور زردے کی دیگیں بھجوائی گئی تھیں۔ بی بی جان نے پوتی کو "زرمین" نام دیا تھا۔ اسے اور صوفیہ کو قیمتی سونے کے کنگن پہنائے گئے تھے۔ ایک پیشہ ور فوٹو گرافر تصاویر کھینچنے کے لیے گھر بلوایا گیا تھا۔ صوفیہ جب اس گھر میں آئی تھی تو بھی اس کے استقبال میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی لیکن زرمین کے لیے تو محبت اور پیسہ واقعی پانی کی طرح بہایا جارہا تھا۔ بعد کے آنے والے دنوں میں بھی صوفیہ کے خاندان میں ہر شخص کی زبان پر صوفیہ کی خوش بختی کا چرچا رہا۔ بہنیں بھابھیاں کزنیں۔۔۔ سب اس کی قسمت پر ایک بار پھر رشک کرتی رہیں۔

وہ بہت خوب صورت دن تھے۔ صوفیہ کے دل سے ہر وسوسہ ہر برا خیال مٹ کر رہ گیا تھا۔ کاشف فیکٹری سے گھر آکر سارا وقت صوفیہ اور زرمین کو دیتا تھا۔ زرمین میں تو اس کی جان تھی۔ اسے گود میں لے کر جھلاتا رہتا۔ اس ننھے وجود سے نجانے کون کون سی باتیں کرتا رہتا۔ صوفیہ دیکھتی اور اللہ کا شکر ادا کرتی رہتی۔ شادی کے بعد سے اب تک یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ حبیبہ جیسی عورتوں کے وسوسے اور خوف سے اسے نجات مل رہی تھی۔ زرمین اسے اپنی طاقت لگتی تھی۔ وہ تھی بھی بالکل باپ کی کاپی۔۔۔ رنگ، روپ، نقش ہر چیز میں باپ کا ثانی۔۔۔ جو بھی دیکھتا بچی کی خوب صورتی کو سراہے بغیر نا رہ پاتا۔ اس میں صوفیہ کی محنت کا تو کوئی عمل دخل نہیں تھا لیکن اسے بہت طاقت اور فخر کا احساس ہوتا۔

"یہ بالکل تمہارے جیسی ہے۔۔۔ وہی ناک نقشہ۔۔۔ وہی نمکین رنگت" حبیبہ دوبارہ ملنے کے لیے آئی تو زرمین کو دیکھ کر بولی۔ زرمین تین مہینے کی ہو رہی تھی اور اب اس کی باپ سے مشابہت مزید واضح ہونے لگی تھی۔ حبیبہ نے اسے گود میں لے رکھا تھا اور بہت نزاکت سے اس کا گال وقفے وقفے سے سہلاتی تھی۔ صوفیہ نے اس کے ہاتھ سے زرمین کو پکڑ لیا۔

"میری بیٹی تھی۔۔۔ میرے جیسی ہی ہونی تھی۔ اب بابرہ شریف جیسی تو ہونے سے رہی۔" اس نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ حبیبہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ بالکل تمہارے جیسی ہے۔۔۔ بہت پیاری اور تیکھی سی" حبیبہ کا انداز صلح جو تھا۔

"جی بھابھی میں بہت اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں" صوفیہ نا چاہتے ہوئے بھی طنز کر گئی تھی۔ یہ عورت اسے سلگا کر رکھ دیتی تھی۔ اس کے سامنے نجانے کون سا احساس کمتری اس کے سارے وجود پر چھا جاتا تھا۔

"کیا بات ہے صوفیہ۔۔۔ میں نے محسوس کیا ہے تم بہت طنزیہ سی ہوتی جارہی ہو۔۔۔ میری کوئی بات بری لگی ہے کیا" حبیبہ سارے معاملات آج ہی نبٹانے کے چکر میں تھی۔

"نہیں بھابھی۔۔۔ میں طنزیہ نہیں ہورہی۔۔۔ یہ دراصل آپ ہیں جس نے طنز کی ابتدا کی تھی۔" وہ چڑ کر بولی۔

"لیکن میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو تمہیں اتنا برا لگ گیا۔۔۔؟" اس نے حیرانی سے سوال کیا۔

"سارے زمانے کو زرمین کی مشابہت کاشف جیسی لگتی ہے اور آپ کو یہ میرے جیسی لگ رہی ہے" وہ اسی انداز میں بولی تھی۔ حبیبہ مزید حیران ہوئی۔

"اس میں برا منانے والی کیا بات ہے۔۔۔ میں نے تو۔۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ صوفیہ نے اس کی بات کاٹ

دی۔

"آپ یہی کہنا چاہتی ہیں کہ زرمین خوب صورت نہیں ہے۔"

"ارے باخدا نہیں۔۔۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ یہ بالکل تمہارے جیسی خوب صورت ہے۔" وہ زچ ہوئی تھی یا شاید زچ ہونے کی اداکاری کر رہی تھی۔ صوفیہ نے گہری سانس بھر کر اپنے بلاوجہ عود کر آنے والے غصے پر قابو پایا۔

"یہی طنز ہے آپ کا۔۔۔ سمجھیں آپ۔۔۔" وہ غرا کر بولی تھی۔ حبیبہ حیرانی سے اس کی جانب دیکھا پھر وہ اپنا پرس اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تم پاگل ہو۔۔۔ بالکل پاگل۔۔۔ میں تم سے دور رہوں' یہی بہتر ہے۔" وہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔ صوفیہ نے اس کی پشت کی جانب دیکھتے ہوئے ناک چڑھائی تھی پھر نجانے اس کے دل میں کیا سمائی۔ حبیبہ کے پیچھے گئی اور بولی۔

"میرے شوہر سے بھی دور رہو" حبیبہ نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا' دیکھتی رہی' پھر مسکرائی۔ چبھتی ہوئی تلخ' طنزیہ اور ذو معنی مسکراہٹ۔

"یہ ناممکن ہے میری جان۔۔۔ اس سے دور نہیں رہ سکتی میں" وہ کہہ کر رکی نہیں تھی بلکہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کا اس قدر کھلا ڈلا اعتراف صوفیہ کو جی جان سے سلگا گیا تھا۔ وہ اس عورت کو قتل کر دینا چاہتی تھی لیکن بے بس تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے رانیہ کی اردو کی کتابیں کھول کر اپنے سامنے رکھیں پھر صفحات پلٹ کر دیکھتی رہی۔ اسے بے زاری ہو رہی تھی۔ اس مضمون کو پڑھانے کے لیے اسے خود پہلے ایک گھنٹہ پڑھنا پڑتا تھا پھر ہی وہ اس قابل ہو سکتی تھی کہ رانیہ کو اچھے طریقے سے پڑھا سکتی تھی۔ وہ چند لمحے ایسے ہی بیٹھی رہی پھر اسے سلیم کا خیال آیا تھا۔ وہ اس سے بھی تو مدد لے سکتی تھی۔ بے شک وہ صرف ایف اے پاس تھا لیکن یہ کتابیں بھی تو انٹر کی ہی تھیں اور پھر اسے اردو پر اچھا عبور حاصل تھا۔ وہ شاعری کرتا تھا' کہانیاں لکھتا تھا۔ اتنا تو قابل تھا ہی کہ وہ اردو پڑھانے کے لیے اس کی کوئی معاونت کر سکتا۔

نیناں نے کتابیں سمیٹیں۔ دوپٹا اٹھا کر کندھے پر پھینکا اور چپل پاؤں میں اڑستے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔ امی اپنے کمرے میں تھیں' شاید نماز پڑھ رہی تھیں اور زری شاید واش روم میں تھی کیونکہ پانی گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نیناں نے دروازہ بجا کر اسے نیچے جانے کا بتایا اور سیڑھیاں اتر آئی۔ شام اتر آئی تھی لیکن ابھی تاریکی مکمل طور پر نہیں پھیلی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس وقت سلیم اپنی دوکان پر مصروف ہو گا۔ اس نے آخری سیڑھی پر دوپٹے کی پوزیشن ذرا درست کی پھر لمبے لمبے قدم اٹھاتی' سلیم کی بیٹھک نما دوکان میں آ گئی۔ وہ اپنا کھاتا کھولے موبائل کان سے لگائے بیٹھا تھا۔

پچیس تاریخ کے بعد وہ حساب کتاب کی پڑتال کر کے ان تمام چیزوں کا آرڈر فون پر ہی دے دیا کرتا تھا جو درکار ہوتی تھیں۔ شام تک بڑے کریانے کے اسٹور کا لڑکا اپنی سوزوکی میں اس کا مطلوبہ سامان بھر کر ڈیلیور کر جاتا تھا۔ سلیم بھی موقع پر ادائیگی کر دیتا۔ یہ اس کے لیے بہت سہولت ہو گئی تھی کہ فون پر ہی کام ہو جاتا تھا۔ کہیں جانے کی مشکل تھی' نا کسی کا احسان لینا پڑتا تھا۔ سامان چھوڑ کر جانے والا لڑکا خود ہی اس کے ساتھ مدد کرواتے ہوئے سامان دکان کے اندر رکھوا دیتا تھا۔ وہ اسی حساب کتاب میں مشغول تھا۔ نیناں کو دیکھ کر ہی اس نے جان بوجھ کر با آواز بلند کہا تھا۔

"ہاں بھئی ہاں... چلی بلی اس بار مت بھیجنا... میری دکان میں چوہیا گھس آتی ہیں اور ساری چلی ملی کھا جاتی ہیں۔ اس بار ایک کارٹون بھی نا آئے سامان میں... یاد رکھنا" وہ تاکید کر رہا تھا۔ نینا نے خود ہی کاؤنٹر کا دروازہ ہٹایا اور اندر داخل ہو گئی۔

"مت منگواؤ چلی ملی... میں بھی تمہارے ابو کو جا کر بتاتی ہوں کہ ان کا لڑکا کسی لڑکی کی محبت میں عجیب و غریب شاعری کرتا رہتا ہے اور پھر فرضی ناموں سے مجھ غریب سے مختلف میگزینز کو بھجواتا ہے... اور یہ بھی بتاؤں گی کہ وہ لڑکی ہماری ذات برادری کی بھی نہیں ہے، جس کے لیے سلیم صاحب شاعری کرتے ہیں اور یہ بھی کہوں گی کہ سلیم گھر سے بھاگ کر اس کی ساتھ شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے" وہ دھمکی آمیز انداز میں کہہ رہی تھی۔ سلیم نے سٹپٹاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی قریب سن تو نہیں رہا پھر اسے گھور کر بولا۔

"اللہ بچائے تم سے نینا... رائی کا پہاڑ... لفظ سے افسانہ... دھاگے سے رضائی اور ورق سے پوری کتاب بنا لیتی ہو تم... سوچ بیلیں مری تھیں تو تم پیدا ہوئی تھی۔"

"ہاں تو فائدہ ہوا نا... سوچ بیلیں ختم ہوئیں دنیا سے... میرا دنیا میں آنا کس قدر مبارک ثابت ہوا... اور ایسے ہی منہ پھاڑ کر نا کہہ دیا کرو پہلے الحمدللہ کہا کرو اور پھر ماشاءاللہ بھی کہا کرو... نظر لگتے پتا تھوڑی چلتا ہے" وہ واقعی ڈھیٹ تھی۔ سلیم نے زوردار آواز کے ساتھ کھاتے والا رجسٹر بند کیا۔

"اپنی آمد کا مطلب بتاؤ اور جاؤ یہاں سے... میں ویسے بھی تم جیسی خود غرض لڑکی سے زیادہ بات وات نہیں کرنا چاہتا..." وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔ نینا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"سلیم اتنی بدتمیزی...؟" اس نے مصنوعی حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے آنکھیں پھیلائیں۔

"بدتمیزی نہیں... ادلے کا بدلہ تم بھی تو یہی کرتی ہو تمہیں میں نے کل کہا تھا کہ رات کو آنا تمہیں ایک چیز دکھاؤں گا لیکن تم آئی نہیں... اب اپنا کوئی کام ہے تو فوراً" آ گئی ہو..." وہ واقعی ناراض لگتا تھا۔

"میں رات کو آئی تھی شہزادہ سلیم لیکن تم سو چکے تھے... میں خالہ کے پاس بیٹھ کر واپس آ گئی" اس نے وضاحت کی۔ سلیم نے اس کی جانب دیکھا آیا وہ سچ کہہ رہی ہے یا جھوٹ... وہ جھوٹ تو بولتی نہیں تھی۔

"تمہاری رات تہجد کے وقت ہوتی ہے کیا... میں انتظار کر کے دس بجے سویا تھا... مزید کتنا انتظار کرتا۔ سارا دن کا تھکا ہوا ہوتا ہوں... جلدی نیند آ جاتی ہے۔" اس نے بھی وضاحت دی تھی۔

"آج کل دس بجے کون سوتا ہے سلیم صاحب... اور میں بھی فارغ تو نہیں ہوتی... اسائنمنٹ بنا رہی تھی۔ اس سے فارغ ہوئی تو نیچے آ گئی پھر آنٹی زبیدہ روک کر کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے باتیں کرنی شروع کر دیں تو بیس پچیس منٹ لگ گئے" وہ اکتا کر بولی تھی۔ اسے وضاحتیں دینے سے چڑ تھی۔

"اچھا خیر چھوڑو... اب بتا دو... کیا دکھانا تھا" وہ صلح جو انداز میں پوچھ رہی تھی۔ سلیم نے اس کی جانب دیکھا پھر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اس نے بھی مصنوعی ناراضی ختم کی تھی۔

"تمہیں تم گھر آنا... یہاں نہیں دکھا سکتا... تم بتاؤ کیا لینے آئی تھیں اور یہ ہاتھ میں کیا پکڑا ہے" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی کتابوں کی جانب اشارہ کر کے پوچھ رہا تھا۔

"یہ اردو کی کتاب ہے... وہ جو نئی ٹیوشن ملی تھی نا... انہوں نے اردو پڑھانے کو بھی بول دیا ہے اور اردو میری کتنی اچھی ہے... تم جانتے ہی ہو مجھ سے تو ٹرگنو میٹری کروا لو... الجبرا سیکھ لو... یہ اردو کہاں پڑھائی آتی ہے مجھے، لیکن رانیہ کی امی کہتی ہیں کہ کچھ دن اردو پڑھا دو... تم سے مدد لینے آئی تھی" وہ اپنا مسئلہ بیان کرنے لگی تھی۔ سلیم اس کے ہاتھوں کی جانب ہی دیکھ رہا تھا جن میں کتابیں دبی تھیں۔

"تم انکار کر دو نا... اتنا خوار ہونے کی ضرورت کیا ہے... تمہاری اپنی پڑھائی اتنی مشکل ہے... اپنا پڑھو گی یا اپنی

اسٹوڈنٹ کا ہوگی۔" وہ چڑ کر بول رہا تھا۔

"انکار کیا تھا میں نے... لیکن وہ اتنی محبت سے اصرار کر رہی تھیں... مجھے حامی بھرنی پڑی۔ مروت بھی کوئی چیز ہوتی ہے سلیم صاحب۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔ سلیم کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی۔

"ہمیں کیا پتا مروت کیا ہوتی ہے... ہمارے ساتھ کبھی برتی ہو تم نے تو ہمیں پتا ہونا" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"سلیم تم جتنا وقت بے تکی باتیں کرنے میں ضائع کرتے ہو نا... اتنی دیر میں انسان پڑھ لکھ کر ایم اے پاس کر آتا ہے۔" وہ مزید چڑ کر بولی۔

"دیکھا... اسی لیے میں نے کہا کہ ہمیں کیا پتا مروت کیا ہوتی ہے... یہ نایاب چیز تو تم اپنے اسٹوڈنٹس اور ان کے گھر والوں پر ضائع کر آتی ہو" سلیم بھی اسی کے انداز میں بولا تھا۔ نینا نے جواب میں کچھ کہنا چاہا تو سلیم نے ہاتھ سے اشارہ کر کے اسے روک دیا۔

"میرے پاس پرانی گائیڈ بکس پڑی ہوئی ہیں... تم رات کو آؤ گی نا تو میں تمہیں دے دوں گا، لیکن جلدی آنا" سلیم نے کہا پھر کاؤنٹر کے دراز میں پہلے سے رکھے گئے چلی ملی کے پیکٹ نکال کر اسے دے دیے تھے۔ اس نے جھپٹنے کے انداز میں پکڑے اور شکریہ ادا کیے بنا کھول کر کھانے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"زری تم نے عصر کی نماز پڑھ لی؟" وہ موبائل ہاتھ میں لے کر لاؤنج میں بیٹھی ہی تھی کہ امی نے آکر پوچھا۔ اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے فیس بک کی دنیا میں قدم رکھا۔

"وقت پر نماز تو ادا کر لیا کرو تم دونوں... اتنی بڑی تو ہو گئی ہو اب کہ یہ بات مجھے بار بار یاد دلا کروانی پڑے" امی نے ناپسندیدگی سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ زری نے ناک چڑھائی۔

"امی ابھی تو اذان ہوئے پندرہ منٹ ہی ہوئے ہیں... پڑھ لیتی ہوں... نہا کر آئی تھی تو بال ذرا گیلے ہیں۔ تھوڑے سے خشک ہو جائیں تو پڑھتی ہوں نماز" وہ اسکرول ڈاؤن کرتی ہوئی موبائل اسکرین میں گم تھی۔

"ٹھیک ہے لیکن اب اس موبائل میں ہی گم مت رہنا... نماز پڑھ لینا بلاوجہ نماز قضا کرنے کا فائدہ...؟" وہ اس کے لمبے بھورے بالوں کو بغور دیکھتے ہوئے تاکید کر رہی تھیں۔ اس کے بال بہت خوب صورت تھے اور وہ ان کا خیال بھی بہت رکھتی تھی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ ان میں نمی چمک تو رہی تھی۔ انہوں نے دل ہی دل میں بیٹی کے بالوں کی خوب صورتی کو سراہا پھر انہیں دوسری بیٹی کی یاد آئی۔

"نینا کدھر ہے... اب تک سو رہی ہے؟" انہوں نے ایک نظر اس کے کمرے کی جانب دیکھا۔

"نہیں... وہ نیچے اتری تھی... سلیم کے پاس گئی ہوگی چلی ملی لینے" زری لاپروا مگن سے انداز میں بولی۔ امی کو یکدم جیسے کچھ یاد آیا۔ ابا نے کچھ تاکید کی تھی۔ اشاروں اشاروں میں انہیں کیا باور کروانا چاہا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔

"یہ لڑکی کب سدھرے گی... اب کوئی بچی تو نہیں رہی کہ جب چاہے منہ اٹھا کر گھر سے باہر نکل جائے" وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر رہی تھیں۔ زری ٹیکسٹ کرنے میں مگن ہو گئی تھی۔ اس کی انگلیاں تیزی سے ٹچ اسکرین پر چل رہی تھیں۔ اس کا سارا دھیان موبائل میں ہی تھا لیکن امی کی بات کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔

"آپ کو پتا ہی ہے اسے چپس، جوس اور چلی ملی کھائے بغیر سکون نہیں آتا... وہی لینے گئی ہوگی... آجائے گی ابھی۔"

"ابھی آجائے تو اچھا ہے" انہوں نے جیسے خود کلامی کی۔

"کیا ہو گیا ہے امی... کون سا پہلی بار گئی ہے... دن میں کئی بار جاتی ہے۔ آپ جانتی ہی ہیں سلیم کے پاس جائے بغیر اسے سکون نہیں ملتا" زری نے تسلی دی تھی۔

"یہی تو غلط بات ہے۔ بلاوجہ منہ اٹھا کر جب جی چاہے دکانوں پر گھومتے رہنا کون سی اچھی بات ہے۔ وہ سلیم کی دکان ہے اس کا میکہ نہیں ہے۔" امی چڑ کر بولی تھیں۔ اب کی بار زری نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ کافی ناخوش اور الجھی ہوئی نظر آتی تھیں۔ زری نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔ نینا کی شروع سے یہی روٹین تھی لیکن امی نے پہلے کبھی تو نہیں ٹوکا تھا۔

"اب تم کیا منہ اٹھا کر مجھے دیکھنے لگی ہو۔ چلو رکھو اپنی اس جڑواں بہن کو ادھر اور نماز ادا کرو۔" انہوں نے اس کے موبائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا اور کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ انہیں نجانے کیوں اتنا غصہ آ رہا تھا۔ زری ان کے انداز پر حیران تو ہوئی لیکن اس موضوع پر مسلسل سوچتے رہنے کا وقت اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ دوبارہ سے موبائل میں گم ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ترنگ ہے؟" شوکت بھائی نے شٹر کے نیچے سے دکان کے اندر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا تھا۔ سلیم، وہیل چیئر پر آرام دہ حالت میں بیٹھا سستانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سہ پہر کے وقت بعض اوقات وہ دکان بند بھی کر دیا کرتا تھا یا کبھی اماں آ کر کاؤنٹر سنبھال لیتیں اور وہ آدھ پونا گھنٹہ سستا لیا کرتا تھا اور اگر کچھ لکھنے کا دل چاہتا تب بھی یہی وقت مناسب ترین تھا، لیکن آج اماں بھی گھر نہیں تھیں۔ لکھنے کا من بھی نہیں تھا لیکن سستی سی چھائی ہوئی تھی اسی لیے وہ تھوڑا سا شٹر گرا کر وہیں اخبار منہ پر رکھ کر بیٹھا رہا تھا۔

شوکت بھائی کی آواز پر چہرے پر سے اخبار ہٹا کر اس نے ان کی جانب دیکھا پھر اس ادھ سوئی کیفیت میں بھی شرارت اس کے دل میں گدگدی کرنے لگی تھی۔

"ترنگ ہی ترنگ ہے جی۔ بتائیے کیا کر کے دکھاؤں... بھنگڑا ڈالوں یا لڈی پیش کروں یا دھمال پسند کریں گے؟" شوکت بھائی اس کی بات پر ہنسے۔

"آپ کی ذاتی ترنگ کی بات نہیں کی میں نے سلیم صاحب... چائے والے دودھ کی بات کر رہا ہوں" انہوں نے وضاحت کی۔ سلیم نے وہیل چیئر گھما کر آگے کی پھر بولا "وہ والا "ترنگ" تو نہیں ہے۔" اس نے بائیں ہاتھ سے جماہی روکتے ہوئے کہا تھا۔ شوکت بھائی نے لکڑی کے چوکھٹے کے ساتھ اوپر کی جانب لٹکتی ہوئی مختلف تھیلیوں کی طرف دیکھا تھا۔ ڈٹرجنٹ پاؤڈرز، شیمپو، انسٹنٹ ڈرنک کے پاؤڈر... کافی چیزیں لٹک رہی تھیں لیکن چائے میں ملانے والا پاؤڈر نہیں تھا۔ انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"یار چائے کی طلب ہو رہی تھی اور تمہارے پاس ایوری ڈے بھی نہیں ہے۔" سلیم نے بھی گردن ذرا باہر نکال کر دیکھنے کی کوشش کی۔ مطلوبہ پائنٹ واقعی ختم ہوا تھا۔

"خشک دودھ ہے تو وہ دے دو" شوکت بھائی اب اندر نظریں دوڑا رہے تھے۔

"ہے تو سہی... لیکن شاید آپ کے لیے نہیں ہے" اس نے وہیل چیئر کو گھما کر پیچھے کی جانب کیا تھا۔

"کیوں بھئی... کیوں" ان کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔

"کیوں کہ پاکستان کا ہر تیسرا بچہ آئرن کی کمی کا شکار ہے... وہ آپ کا بھی ہو سکتا ہے" اس نے خشک دودھ کا پیکٹ ان کے سامنے کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے اس برانڈ کے اشتہاری پروگرام کی نقل کی تھی۔ شوکت بھائی ہنسے۔

"اوہ نہیں بھائی... میرا نہیں ہو سکتا شکر ہے میرے تو دو ہی بچے ہیں تیسرا ہوتا تو آئرن کی کمی کا شکار ہوتا"

انہوں نے پیکٹ اٹھا کر ادائیگی کی تھی۔ اسی دوران خالو (نینا کے والد) دکان کی جانب آتے دکھائی دیے۔ سلیم مئودب سا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ سارے محلے کے ساتھ ہلڑبازی ہنسی مذاق کرنے والا سلیم ' اپنے خالو کے سامنے ایک تہذیب یافتہ تمیزدار لڑکا نظر آنے کے ہر ممکن کوشش کیا کرتا تھا۔

"گولڈلیف ہے نا۔۔" خالو نے اپنی مطلوبہ سگریٹ کی ڈبیا کے متعلق پوچھا تھا۔ شوکت بھائی نے ذومعنی انداز میں سلیم کا چہرہ دیکھا۔

"سلیم صاحب کو اشاروں کی زبان سمجھ میں آتی ہے۔۔۔ بات کو گھما پھرا کر کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔۔۔ ابھی میں نے چائے کے لیے "ترنگ" مانگا تو بولے۔۔۔" شوکت بھائی چند منٹ پہلے کی بات مزے لے کر بتانے لگے۔ سلیم نے انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹوکا تھا۔ وہ خالو سے بہت مرعوب رہتا تھا۔ ایک وہی تو انسان تھے سارے محلے میں جن سے وہ خائف رہتا تھا۔ ابھی ترنگ والی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ مختار بھائی بھی آکر کھڑے ہو گئے۔ سلیم نے سگریٹ کی ڈبی نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دی تھی لیکن شوکت بھائی کی بات ختم نہیں ہوئی تھی اس لیے اس نے خالو کو متوجہ نہیں کیا تھا۔ وہ ترنگ کے بعد آئرن کی کمی والی بات بھی بتانے لگے تھے۔ سلیم کو دل ہی دل میں شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ خالو کے ساتھ اتنا بے تکلف نہیں تھا۔ ان کی بات ختم ہوئی تو مختار بھائی بولے۔

"ارے یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ مزے کی بات میں بتاتا ہوں آپ کو' وقار آصف ہیں نا وہ نکڑ والے' ان کا بڑا بیٹا کافی شرارتی ہے۔ پرسوں واپسی پر اسکول سے کسی سے جھگڑا ہو گیا۔ بچوں میں مارا ماری ہو گئی۔ وہ بھی بازو چھلوا کر گھر آیا' انہوں نے چھوٹے بیٹے کو بھیجا کہ سلیم سے ڈیٹول لے آؤ۔ سلیم میاں نے ڈیٹول کی بجائے "کمفرٹ" (کپڑوں کی دھلائی کے بعد ڈالنے والا خوشبودار محلول) دے دیا۔۔۔ کہ ٹی وی پر تو یہی دکھاتے ہیں کہ ہر دھلائی کے بعد کمفوٹ لگانا چاہیے" مختار بھائی ایسے بتا رہے تھے جیسے کوئی بہت ہی خوش گوار بات ہو۔۔۔ شوکت بھائی بھی سن کر ہنس دیے لیکن خالو کے چہرے پر مروت والی مسکراہٹ کی رمق ہی چمکی اور غائب ہو گئی۔

"باتوں کا ہی تو کھاتے ہیں یہ۔۔۔ ورنہ اس دکان میں رکھا ہی کیا۔۔۔ ڈھنگ کی کوئی چیز تو ملتی نہیں ہے۔" خالو نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ ان کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ انہوں نے سگریٹ کی ڈبیا اٹھالی تھی۔

"برخوردار باتوں کی بجائے کام پر دھیان دیا کرو۔۔۔ یہی دکان کل پونجی ہے تمہاری۔۔۔ گپیں مارنے اور کرکٹ کھیلنے سے فرصت ملے تو اس پر دھیان دو' ورنہ جو چار پیسے آتے ہیں وہ بھی آنے بند ہو جائیں گے" اپنے بھرے ہوئے والٹ سے پیسے نکالتے ہوئے وہ اسے مشورہ دے رہے تھے۔ اس نے بدقت مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

اسے کچھ عجیب سا لگا تھا۔ خالو کم گو تھے۔ اس کے ساتھ تو ایک طرف' اس کے اماں ابا سے بھی بہت لیے دیے انداز میں بات کرتے تھے لیکن ایسا رعونت بھرا انداز بھی کبھی نہیں اپنایا تھا۔ اس کی دکان پر بھی کم و بیش روز ہی آتے تھے لیکن بات ہمیشہ نرم انداز میں کرتے تھے۔ آج ان کا انداز سلیم کو کچھ سنجیدہ اور طنزیہ سا لگا۔ وہ چپ سا ہو گیا۔ ان کا انداز اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

☼ ☼ ☼

"واقعی۔۔۔؟" سمیع نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ یہ خبر اس کے لیے غیر متوقع اور زیادہ اچھی بھی نہیں تھی۔

"میری طبیعت۔۔۔ کچھ دنوں سے نارمل نہیں رہتی۔۔۔ نیند بھی پوری کرتی ہوں مگر سر بھاری رہتا ہے۔۔۔ متلی کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔۔۔ بے زاری چھائی رہتی ہے شک تو مجھے بھی تھا لیکن آج کنفرم ہو گیا۔" ثمرین خود بھی کنفیوزڈ سی تھی۔

"ایک ذرا سی متلی سے یہ تصدیق کیسے ہو گئی یار کہ گڈ نیوز ہے۔۔۔ کیسی بچوں جیسی باتیں کرتی ہو" وہ مصنوعی

انداز میں مسکراتا ہوا اکتا کر بولا۔ اسے دوسرے بچے کی خواہش نہیں تھی۔

"اماں رضیہ سے بات کی تھی وہ بھی یہی کہہ رہی تھیں" شہرین کا انداز ابھی بھی ویسا ہی تھا۔

"اوہ اچھا اچھا۔ اماں رضیہ نے تو ایم بی ایس کیا ہوا ہے' میں بھول ہی گیا تھا۔ لاؤ وہ پریسکوپشن بھی دے دو جس میں انہوں نے ملٹی وٹامنز اور آئرن سپلیمنٹ لکھ کر دیے ہیں۔ کل آفس سے واپسی پر لیتا آؤں گا" وہ اسے چڑا رہا تھا اور ساتھ ہی ریموٹ سے ٹی وی کی آواز اونچی کی تھی۔ شہرین نے اسے مصنوعی ناراضی سے گھور کر دیکھا پھر مسکرائی تھی۔

"ایم بی بی ایس کی بات نہیں ہے... سیانی عورت ہیں... تجربہ بھی کوئی چیز ہوتی ہے... وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ رہی تھیں" شہرین نے ریموٹ اٹھا کر دوبارہ سے ٹی وی کی آواز دھیمی کی۔

"تجربہ اور چیز...؟" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"یہ دراصل ان غلطیوں کا نام ہوتا ہے جو انسان اپنی زندگی میں خود کرتا ہے لیکن شرمندگی سے بچنے کے لیے دوسروں کو اپنے کارنامے کہہ کر سناتا ہے... شہرین سمیع! یہی جدید زندگی کا اصول ہے" اس نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔ شہرین نے ہاتھ اپنے پیچھے کر لیا۔

"سمیع وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں... مجھے بھی لگتا ہے کہ گڈ نیوز ہے... اتنی مارننگ سک نیس ہوتی ہے آج کل نوزیا (متلی کی کیفیت) فیل ہوتا ہے بہت" شہرین نے ریموٹ ابھی بھی اسے نہیں دیا تھا۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا... میں کسی اچھے نیورو سرجن سے ٹائم لیتا ہوں... سردرد کے بعد اب نوزیا بھی رہنے لگا ہے... یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔" سمیع کے چہرے پر فکرمندی جھلکنے لگی تھی۔

"نہیں مجھے گائناکولوجسٹ سے ملنا ہے۔ تم ڈاکٹر بشریٰ صفدر سے ٹائم لو..." شہرین نے ریموٹ اسے دینے کے لیے ہاتھ آگے کیا تھا۔

"پہلے مجھ سے تو مل لو اچھی طرح... میری طرف تو شاید عرصے سے دیکھا بھی نہیں ہے تم نے" سمیع نے ریموٹ کی بجائے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ شکوہ کر رہا تھا۔ شہرین کو فی الوقت شوہر کے جذباتی سہارے کی بہت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

"آئی ایم سوری سمیع لیکن یقین کرو میں خود اب اس صورت حال سے تھک گئی ہوں... میں نکلنا چاہتی ہوں اس اینزائیٹی سے... میں بھی خوش ہونا چاہتی ہوں۔ صرف تمہارے اور ایمن کے بارے میں سوچنا چاہتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کوئی بات مجھے پریشان نا کرے... کسی بیماری کا خیال مجھے پریشان نا کرے۔"

"تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے... تمہیں صرف میری محبت کا مرض لاحق ہے اور تمہاری سب بیماریوں کا شافی علاج میں ہوں... تم اگر سب فضول قسم کی سوچیں ترک کر کے صرف میرے بارے میں سوچا کرو تو تمہیں کسی ڈاکٹر سے ٹائم نا لینا پڑے" وہ بہت محبت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ شہرین نے سر ہلایا تھا۔ اسے سمیع کی بات سے اتفاق تھا۔

"تم میرے لیے دعا کرتے ہو نا" وہ اس کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"تمہارے لیے نہیں کروں گا تو کس کے لیے کروں گا یار" وہ ہارے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ شہرین کو اماں رضیہ کی بات پر پختہ یقین تھا۔ اسے واقعی ہیرے جیسا شوہر ملا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ ہمیں بھی ساتھ لے چلتے... میں اور زرمین آپ کے بغیر اداس ہو جائیں گے" کاشف کے کپڑوں کے

سوٹ کیس کولاک کرتے ہوئے وہ افسردگی سے بولی تھی۔ کاشف بیڈ پر بیٹھا موزے پہن رہا تھا۔ پندرہ منٹ میں اسے ایئرپورٹ کے لیے نکلنا تھا۔

"یہ ایک بزنس ٹرپ ہے یار.... تم میرے ساتھ جاتیں تو بور ہو جاتیں.... میں نے مجید بھائی سے کہا تھا کہ وہ اپنی فیملی کو بھی تیار کر لیتے تو پھر میں تمہیں بھی ساتھ لے جاتا لیکن حبیبہ نے انکار کر دیا" موزوں کے بعد اب وہ رسٹ واچ باندھ رہا تھا۔

"اچھا ہوا... اس کے ساتھ جانا بھی نہیں تھا مجھے" وہ ناک چڑھا کر بولی۔ کاشف ذو معنی ہنسی ہنسا۔

"اتنی اچھی خاتون ہے یار... تم پتا نہیں کیوں اتنا خار کھاتی ہو" وہ اسے چڑا رہا تھا۔

"ہر وہ خاتون جو آپ کو اچھی لگتی ہے... ہاں میں اسے سے خار کھاتی ہوں... کرلیں جو کرنا ہے" وہ محبت بھرے مان سے بولی تھی۔ زرمین کی پیدائش نے اس کے پاؤں کے نیچے کی زمین کو کنکریٹ کا بنا دیا تھا۔ وہ خود کو بہت بہت مضبوط سمجھنے لگی تھی۔ بی بی جان کی کہی ہر بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔ زرمین کی آمد اور اس کی ہر درجہ محبت نے اس کے شوہر کے دل میں اس کا قلعہ کافی مضبوط کر دیا تھا۔

"اتنی محبت کرتی ہو مجھ سے" وہ اب پرفیوم اسپرے کر رہا تھا۔

"آپ کی سوچ سے بھی زیادہ" صوفیہ نے اعتراف کیا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے دل میں کاشف کی محبت مزید سے مزید تر ہوتی جاتی تھی۔ وہ ایک ہفتے کے لیے دبئی جا رہا تھا اور اس کی جدائی کے متعلق سوچ کر صوفیہ کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"نا کرو یار... جب شوہر گھر سے دور جا رہا ہو۔ وہ بھی ایک ہفتے کے لیے تو ایسی باتیں نہیں کیا کرتے... اسے آسان الفاظ میں ظلم کہتے ہیں" وہ پلٹ کر اس کی جانب آیا تھا اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا تھا۔

"اسے ظلم نہیں کہتے... ظلم اسے کہتے ہیں جو آپ کر رہے ہیں۔ مجھے ساتھ نا لے جاکر' ایک ہفتہ تھوڑا نہیں ہوتا۔" وہ دل گیر لہجے میں بولی تھی۔ کاشف نے اپنا سر اس کے سر کے ساتھ مس کیا۔

"مجھے احساس ہے لیکن جانا بھی ضروری ہے نا... میری بیٹی بہت خوش قسمت ہے اس کی پیدائش کے بعد سے اب تک مجھے لاکھوں کا منافع ہوا ہے' میں اپنے بزنس کا دائرہ بڑھا رہا ہوں۔ دبئی ایک بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ مجھے بہت اچھی آفرز آرہی ہیں... میں ان کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ بس اسی لیے دل پر پتھر رکھ کر جا رہا ہوں۔" وہ وضاحت دے رہا تھا۔

"میں سمجھ سکتی ہوں کہ کوئی ٹھوس وجہ ہوگی نا جو آپ جا رہے ہیں لیکن اپنا خیال رکھیے گا اور؟ یں یاد رکھیے گا۔ روز فون کرنا مت بھولنا... ورنہ میں اور میری بیٹی ناراض ہو جائیں گے" وہ لاڈ سے بولی۔ کاشف نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اسی دوران فون کی گھنٹی کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ کاشف نے اس کے کندھوں سے ہاتھ اٹھا کر تپائی پر پڑا کارڈلیس اٹھایا تھا۔

"کیا... کب... کیسے اوہ مائی گاڈ" وہ نجانے کس سے بات کر رہا تھا لیکن اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے صوفیہ کو احساس دلایا تھا کہ کچھ بہت ہی بری خبر ہے۔

"کیا ہوا؟" اس کے فون بند کرتے ہی اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا۔

"مجید بھائی ایئرپورٹ جا رہے تھے... راستے میں ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ پولیس اسٹیشن سے فون تھا... کہتے ہیں موقع پر ہی دم توڑ گئے" کاشف کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہو چلا تھا۔ صوفیہ بھی ڈھے سی گئی۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ حبیبہ سے اسے کتنی بھی نفرت تھی لیکن اس نے کبھی اس کا برا سوچا تھا' نا چاہا تھا۔ کاشف مزید کچھ کہے بنا گاڑی کی چابی اٹھا کر دوڑتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

"گڈ نیوز تو نہیں ہے۔" ڈاکٹر بشریٰ نے اسے دیکھتے ہوئے پیشہ ورانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا لیا تھا۔ وہ شہرین کو کافی پہلے سے جانتی تھیں۔ ایمن بھی انہی کے ہاسپٹل میں پیدا ہوئی تھی۔ انہوں نے شہرین کے تمام لیب ٹیسٹ اور اسکیننگ وغیرہ کروائی تھی۔ شہرین کے اندازے کی تصدیق نا ہو سکی تھی۔ سمیع نے مسکراتے ہوئے جتانے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"میں بھی سو فیصد پر یقین نہیں تھی، لیکن کچھ مسائل تھے تو بس اس لیے سوچا آپ سے مل لوں۔" شہرین نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"بہت اچھی بات ہے۔۔۔ تمام ٹیسٹ ہو گئے۔۔۔ وہم ختم ہو جاتا ہے اس طرح سیف سائیڈ پر رہنا ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔ میں کچھ میڈیسن لکھ دیتی ہوں۔۔۔ وہ باقاعدگی سے لو۔۔۔ ان شاء اللہ تمام مسائل ختم ہو جائیں گے۔" ڈاکٹر بشریٰ کا بات کرنے انداز شہرین کو بہت پسند تھا۔

"ڈاکٹر بظاہر تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ رپورٹس بھی ٹھیک ہیں۔۔۔ اسکیننگ میں کچھ نہیں ہے۔۔۔ لیکن میں اپنے آپ کو ٹھیک نہیں محسوس کرتی۔۔۔ ہر وقت ایک بوجھ میرے ذہن پر سوار رہتا ہے۔ چاہتے ہوئے بھی خوش نہیں رہ پاتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی طاقت مجھے کھائے جا رہی ہے، میرا دل بجھا بجھا رہتا ہے۔ بہت سے ڈاکٹرز سے مل چکی ہوں لیکن سب ڈپریشن کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں۔" وہ منہ لٹکا کر اپنا مدعا بیان کر رہی تھی۔ ڈاکٹر بشریٰ اس کی بات سنتے ہوئے مسلسل سہلا رہی تھیں۔

"ڈپریشن کا ہے کا۔۔۔ کوئی پریشانی ہے کیا زندگی میں۔۔۔ کیوں مسٹر سمیع یہ کیا کہہ رہی ہیں شہرین۔۔۔ ایسا کیوں ہے۔۔۔ آپ خیال نہیں رکھتے ان کا۔" ڈاکٹر بشریٰ نے مصنوعی انداز میں اسے گھورتے ہوئے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحبہ! اس لڑکی میں جان ہے میری۔۔۔ کسٹڈی میں نے اپنا دل نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا ہوا ہے۔۔۔ یہ دن کو 'رات' کہے تو میں رات کہہ دیتا ہوں۔۔۔ یہ رات کو 'دن' کہے میں تب بھی مان لیتا ہوں۔ بتائیں کیا خیال نا رکھتا ہوں گا اس کا۔۔۔ بہت پریشان رہتا ہوں اس کی وجہ سے۔۔۔ اسے پتا نہیں کس بیماری کا وہم ہے جو ہمیشہ اس کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔" وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ محبت کے اظہار اور اعتراف کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

"میں مذاق کر رہی تھی۔۔۔ میں جانتی ہوں آپ بہت خیال رکھنے والے شریک حیات ہیں لیکن شہرین جو محسوس کرتی ہے اسے بھی وہم نہیں کہہ سکتے آپ' یہ پوسٹ نیٹل ڈپریشن ہے۔" ڈاکٹر بشریٰ نے ریوالنگ چیئر گھما کر پیچھے کی اور بولیں۔

"بچے کی پیدائش کے بعد وہ پیچیدگیاں جو ہمارے ملک میں بالکل نظر انداز کر دی جاتی ہیں اور ان کے علاج پر بالکل دھیان نہیں دیا جاتا۔ پوسٹ نیٹل ڈپریشن بھی ان میں سے ایک ہے۔۔۔ وجود اور اعصاب پر تھکن اور اداسی کا بلاوجہ غلبہ۔۔۔ رونے کی خواہش بعض اوقات سر درد' کسی کام میں جی نا لگنا۔۔۔ اپنے آپ سے اور خود سے وابستہ رشتوں سے الجھن محسوس ہونا۔۔۔ روٹین کے کاموں میں بے رغبتی۔۔۔ ہارمونل امبیلنس۔۔۔ یہ سب علامات پوسٹ نیٹل ڈپریشن کی بھی ہو سکتی ہیں۔"

"پوسٹ نیٹل ڈپریشن۔۔۔؟" سمیع نے ان کا بولا ہوا لفظ دہرایا۔

"کیا ہمیں سائیکاٹرسٹ سے ملنا چاہیے؟" وہ ان کا مشورہ طلب کر رہا تھا۔

"بالکل لیجیے۔۔۔ کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ لوگ اس سلسلے میں پہلے بھی

کچھ معالجین سے مل چکے ہیں اور افاقہ نہیں ہوا تو میرا خیال ہے اب اپنا علاج خود کیجیے۔ جی ہاں ڈپریشن کے لیے کوئی بھی دوا کھانے سے بہتر ہے کہ خود اپنا علاج کیجیے۔ آپ کی رپورٹس کے مطابق میرا علم یہ کہتا ہے آپ کو کوئی بیماری نہیں ہے صرف اپنا لائف اسٹائل تبدیل کرلیجیے۔ زندگی میں دلچسپیاں بڑھائیں۔ اللہ نے آپ کو اولاد دی ہے۔ اس کے ساتھ وقت گزاریں۔ ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزاریں۔ جس سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔ اس سے بار بار ملیں۔ جن کی موجودگی دل کو ناگوار گزرتی ہے اس شخص اور خیال کو بھی قریب نا پھٹکنے دیں۔ خوش رہیں مطمئن رہیں۔ مصروف رہیں۔ یہ بہترین علاج ہے۔" ڈاکٹر بشریٰ نے کہنے کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا کتابچہ بھی ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"اس میں اس ڈپریشن کی علامات اور روحانی علاج درج ہے۔ فرصت نکال کر اسے پڑھ لینا۔ اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ صرف آپ کے ساتھ نہیں ہو رہا۔ پاکستان میں ہر پانچویں ماں اس صورت حال سے گزرتی ہے۔ زندگی کی جانب مثبت رویہ رکھیے۔ اچھی سوچ اچھی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔" ڈاکٹر بشریٰ نے مسکراتے ہوئے شہرین سے کہا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ سمیع نے اطمینان بھری گہری سانس لی تھی۔ اسے جیسے حوصلہ مل گیا تھا کہ اب شہرین اپنی مردہ دلی سے ضرور ہی پیچھا چھڑوا کر پہلے والی چلبلی سی شہرین بن جائے گی۔

☆ ☆ ☆

محبتوں کی فطرت میں عجیب سی لامکانی ہے
عجب سی بے یقینی ہے، عجب سی بے دھیانی ہے
ان کی قسمتوں میں بھی ہجرتیں ہی لکھی ہیں
ان کے فیصلوں میں بھی شدتیں جھلکتی ہیں
منزلوں کی خواہش میں لحہ لحہ یہ اپنے راستے بدلتی ہیں
چاہے جانے کی چاہ میں نکھرتی ہیں بکھرتی ہیں
لیکن ایسا ہوتا ہے کہ ایک حد گزرنے پر
مزاج کی سیلانی سے جب یہ تھکنے لگتی ہیں
زیست کے مصائب سے جب یہ مرنے لگتی ہیں
تب دلوں کے سبز خطوں کو جہاں سے نرم پاتی ہیں
وہیں نگر سجاتی ہیں۔ وہیں پہ گھر بناتی ہیں

"یہ کیا لکھتے رہتے ہو تم۔ مجھے تو سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ محبت محبت محبت۔ ہر وقت محبت۔ تمہارا ذہن کچھ اور کیوں نہیں سوچتا" نہینا نے اس کی نظم کو پڑھنے کے بعد ڈائری اس کو تھمادی تھی۔ وہ صبح کی اٹھی ہوئی تھی۔ دوپہر کو بھی نہیں سوپائی تھی اس لیے اب نیند سے آنکھیں بوجھل ہوتی جا رہی تھیں۔ سلیم سے گائیڈ بکس نا لینی ہوتیں تو شاید وہ آتی بھی نہیں لیکن اب مجبوری بھی تھی اور سلیم کی نئی چھپنے والی شاعری بھی دیکھنی تھی اسی لیے وہ آگئی تھی۔ ابا اور امی اپنے کمرے میں تھے۔ وہ زری کو بتا کر سیڑھیاں اتر آئی تھی۔ سلیم اسی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

"تم بہت بدذوق ہو نہینا۔ تمہیں اتنی اچھی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ محبت تو ایک الوہی جذبہ ہے اور

شاعری میں جذبات ہی تو ہوتے ہیں۔۔۔ جذبات نا لکھوں تو اور کیا لکھوں۔۔۔ اچھا بتاؤ اور کیا سوچوں یا لکھوں جو تمہیں سمجھ میں آجائے اور اچھا بھی لگے" سلیم نے ڈائری بند کر دی اور اپنی ٹانگ کو سیدھا کیا تھا۔ نینا کو واقعی شاعری سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن دوٹوک ناپسندیدگی کا اظہار بھی سلیم کو اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ پہلے ہی خالو کے شام والے رویے کی وجہ سے کافی دل گرفتہ ہو رہا تھا۔

"مجھے تو ایک ہی جذبہ سمجھ میں آتا ہے اور وہ ہے وفا۔ انسان کو انسان کے ساتھ وفادار ہونا چاہیے۔۔۔ باوفا اور مخلص۔۔۔ دنیا میں تعلقات صرف اسی بنیاد پر بنائے اور نبھائے جا سکتے ہیں۔۔۔ میرے لیے وفا سے زیادہ انمول کوئی اور چیز نہیں ہے۔۔۔ باقی سب تو غیر ضروری بے کار باتیں ہیں" وہ سادہ سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ سلیم نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"وفا ایک آؤٹ ڈیٹیڈ چیز ہے کزن۔۔۔ زمانے میں پنپنے کے لیے انسان نے اب بہت سی نئی چیزیں ایجاد کرلی ہیں۔۔۔ وفا دنیا داری کی لسٹ میں سب سے آخری نمبر پر آتی ہے" وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔ نینا نے بغور اس کا چہرہ دیکھا اور پھر دیکھتی رہی۔ وہ اس قدر بے زار کیوں دکھتا تھا۔

"کیا ہوا خالہ سے ڈانٹ پڑی۔۔۔ کسی نے کچھ کہا ہے کیا۔۔۔؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں کوئی طنز یا مذاق نہیں تھا۔

"نہیں تو۔۔۔ اماں کی ڈانٹ پھٹکار تو ماضی بعید کا قصہ ہوگئی۔۔۔ عرصہ ہوا انہوں نے تو کبھی سخت لہجے میں بھی بات نہیں کی" وہ اسی انداز میں بولا تھا جو نینا کو کچھ باور کروا رہا تھا۔

"یہ جو میری ٹانگ تھی نا۔۔۔ اللہ اسے غریق رحمت کرے۔۔۔ بڑی کوئی کرموں والی تھی۔۔۔ جب جسم کے ساتھ تھی تب بھی زندگی میں اس کی وجہ سے بڑا آرام تھا۔ اب نہیں رہی تو بھی کچھ چیزیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔۔۔ اس میں سے ایک اماں کی ایکسٹرا توجہ اور محبت کا ملنا ہے۔۔۔ پہلے سے زیادہ محبت کرنے لگی ہیں مجھ سے۔۔۔ سب سے پہلے میرے لیے کھانا نکال کر دکان پر دے جاتی ہیں۔۔۔ پھل آئے ہوں تب بھی میرا حصہ پہلے نکالتی ہیں باقی بھائیوں کو بعد میں دیتی ہیں۔

ابا کو دینے سے بھی پہلے، میرے لیے دودھ کا گلاس بھر کر رکھ جاتی ہیں یہاں۔۔۔" اس نے تپائی کی جانب پڑے دودھ کے گلاس کی جانب اشارہ کیا جو ابھی بھی بھرا ہوا تھا۔ نینا نے مڑ کر دیکھا پھر اس کے چہرے کو ایک بار پھر جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اسے ٹال رہا تھا۔۔۔ لیکن کیوں؟ وہ اداس لگتا تھا۔ وہ اکثر اس طرح اداس ہو جایا کرتا تھا لیکن نینا سے "اس ناراضی کی وجہ کبھی چھپائی نہیں تھی۔ اس نے صرف شرارتاً" وہ گلاس اٹھا لیا تھا۔

"خالہ بھی غلط کرتی ہیں۔۔۔ اتنی محبت کے قابل بھی کہاں ہو تم۔۔۔ بتاؤ دودھ کا اتنا بڑا گلاس تمہیں دے دیتی ہیں۔ اس دودھ کو پینے سے کون سا تمہاری صحت میں برکت پڑ جانی ہے۔۔۔ تم نے کون سا ہینڈسم لگنے لگ جانا ہے۔" اس نے دودھ کے گلاس سے گھونٹ بھرا تھا۔ سلیم چپ چاپ اپنی ٹانگ کی جانب دیکھتا رہا۔ اس کی بات پر مسکرایا نا کوئی جواب دیا۔ نینا اب کی بار کچھ پریشان ہوئی۔

"کیا بات ہے سلیم کوئی مسئلہ ہے؟" یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ نا پاتی۔ سلیم مسکرایا۔ وہی مصنوعی مسکراہٹ جو نینا کو الجھا رہی تھی۔

"نہیں نہیں۔۔۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔۔۔ میں تو سوچ رہا تھا تم واقعی ٹھیک کہہ رہی ہو اتنی محبت کے قابل کہاں ہوں میں۔۔۔" وہ اسی پژمردہ انداز میں بولا تھا۔

"بتاؤ گے کہ کیا ہوا ہے یا میں جاؤں یہاں سے؟" وہ چڑ کر بولی۔ اس سے زیادہ صبر نہیں تھا اس میں۔

"نینا مجھے ایسا لگتا ہے جیسے خالو مجھے پسند نہیں کرتے" اس نے وہ بات کہہ ڈالی جو شام سے اسے افسردہ کیے ہوئے تھی۔ نینا نے ہاتھ میں پکڑا دودھ کے گلاس سے ایک سپ لیا اور پھر گردن ہلائی جیسے سلیم کی بات اس کے لیے بالکل غیر اہم ہو۔

"وہ مجھے بھی پسند نہیں کرتے۔۔۔ اور ریتا کو"

"تمہاری بات اور ہے نینا۔۔۔ تم ان کی بیٹی ہو" وہ لفظ "بیٹی" پر زور دے کر بولا تھا۔

"تمہیں بھی فرق نہیں پڑنا چاہیے پاگل شاعر آدمی کیونکہ تم ان کی بیٹی نہیں ہو۔" وہ اسی کے انداز میں بولی تھی۔

"مجھے فرق پڑتا ہے۔۔۔ بہت فرق پڑتا ہے' میں بہت ہرٹ ہوتا ہوں' ڈر جاتا ہوں اس لیے کہ میں جانتا ہوں میں واقعی محبت کے قابل نہیں ہوں" وہ چند لمحے پہلے بولا گیا اسی کا جملہ دوہرا رہا تھا۔ حساسیت اس کے ہر لفظ و انداز سے ٹپک رہی تھی۔ نینا زچ ہوئی۔

"یہ ڈائیلاگز میرے سامنے بول کر مجھے یہ احساس مت دلاؤ کزن کہ میں نے کوئی نامناسب بات کردی ہے۔ میری تو عادت ہے ایسا اناپ شناپ بولتے رہنا۔۔۔ تم سے کس نے کہا کہ تم محبت کے قابل نہیں ہو۔ سارا محلہ تمہاری اماں سمیت تم پر دل و جان سے فدا ہے۔۔۔ محلے کی ساری باجیاں آنٹیاں تمہارے گن گاتے نہیں تھکتیں۔۔۔ محلے کے بچے تو بچے بچوں کے اباؤں کو بھی اپنی مٹھی میں کر رکھا ہے تم نے۔ تمہاری شاعری کو پسند کرتے ہیں لوگ' تمہاری کہانیاں پڑھتے ہیں۔۔۔ اس کے علاوہ اور کیا چاہتے ہو تم 'ناشکرے انسان" وہ مصنوعی انداز میں چڑ کر بولی تھی۔ اسے سلیم کے رویے کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔ احساس کمتری کا مخصوص دورہ اس پر حاوی ہو رہا تھا۔

"نظمیں' غزلیں۔۔۔ یہ افسانے کہانیاں۔۔۔ ان سب کا ایک ہی مقصد ہے نینا۔۔۔ میں بہت قابل بن جانا چاہتا ہوں۔۔۔ اتنا قابل کہ میری ٹوٹی ہوئی ٹانگ اور میری کریانے کی دکان' میری خواہش کی راہ میں حائل نا ہو سکیں۔۔۔ میں تم لوگوں کے برابر آجانا چاہتا ہوں۔۔۔ تم لوگوں کے سامنے کمتر نہیں لگنا چاہتا۔۔۔ میں خالو کی نظر میں ان کی بیٹی کے ہم پلہ ہو جانا چاہتا ہوں" سلیم نے سر جھکا کر کہا تھا۔ نینا کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس چھلکتے چھلکتے بچا۔ وہ یہ کیسی نئی اور انوکھی بات کر رہا تھا۔

اتنا واضح اعتراف اور اپنی خواہش کا اظہار۔۔۔ اس نے اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی جانب دیکھا اور پھر دیکھتی رہی۔ وہ اسے کیا کہتی۔ الفاظ کی کمی اسے بری طرح محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ اس کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی لیکن یہ اس کے اپنے اختیار کی بات نہیں تھی۔ اس نے دودھ کا گلاس دوبارہ تپائی پر رکھ دیا اور پھر اپنی انگلیوں کی جانب دیکھتی رہی۔

"یہ ممکن نہیں ہے سلیم۔۔۔" اس نے کہتے ہوئے جان بوجھ کر اس کے چہرے کی جانب نہیں دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

سرورق کی شخصیت

ماڈل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایشا نور

میک اپ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ موسیٰ رضا

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

نادیہ احمد

تو بہت دیر سے ملا ہے

"میں آج بھی تمہارا منتظر ہوں ماہا' آخری فیصلہ تب بھی تمہارا تھا' آج بھی اس کا اختیار تمہارے پاس ہے۔" یہ کہہ کر وہ رکا نہیں تھا اور گزرے سولہ سال ایک فلم کی طرح میری یادوں کے پردے پہ چلنے لگے تھے۔ جن زخموں کو میں برسوں پہلے' دل کے تابوت میں دفن کر چکی تھی وہ آج بھی اتنے ہی تازہ تھے' ان میں سے اب تک میرے ارمانوں کا خون رستا تھا۔

اس کا ساتھ میری زندگی میں بہت طویل نہ سہی مگر حسین ضرور تھا' وہ پل آج بھی میرے اندر سانس لیتے ہیں۔ ایم۔ فل کے وہ دو سال' یونی ورسٹی میں اس کے ساتھ گزرے وہ چند گھنٹے' اس کا ساتھ جو میری مشقت بھری زندگی میں تازہ ہوا کا جھونکا تھا۔ وہ زندگی میں آیا تو میری ذات کو معنی مل گئے۔ میرا بہترین دوست اور میرا پہلا پیار' شہریار بخاری۔

☼ ☼ ☼

ابا کی مختصر سی تنخواہ اور تین بیٹیوں کی ذمہ داری۔ میں وقت سے پہلے بڑی ہو گئی اور ابا کا بوجھ بانٹ لیا۔ میٹرک کے بعد محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھائی' اپنی اور چھوٹی بہنوں کی تعلیم کے اخراجات اٹھاتی رہی۔ اچھے وقت کے انتظار میں سال گزرے لیکن وقت نہیں بدلا۔ جیسے جیسے میں بڑی ہو رہی تھی' اماں کی شکایتیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔

حمیدہ کے ساتھ پچھلے ہفتے جو لوگ آئے تھے انہوں نے بھی ٹکا سا جواب دے دیا ہے۔ اماں کا واحد مسئلہ ان دنوں' صرف میری شادی تھا۔ تیئس سال کی ایم۔ اے پاس بیٹی کو جہیز کے بغیر بیاہنے کا ٹارگٹ انہیں دن رات پریشان کر رہا تھا۔

"تو اس میں نیا کیا ہے۔ کون سا پہلی بار ایسا ہوا ہے۔ آپ یہ بات کیوں نہیں سمجھ لیتیں کہ لڑکیوں کی شادیاں صورت اور تعلیم سے نہیں مالی حیثیت پہ منحصر ہیں۔" اپنی آئے دن کی پریڈ سے میں خود بھی تنگ آ چکی تھی۔ پتا نہیں اماں کو میری اذیت کا احساس کیوں نہیں ہوتا تھا۔

"اماں سمجھنے کی کوشش کریں میں دن رات اتنی محنت اس لیے نہیں کر رہی کہ میرے لیے کسی شہزادے کا رشتہ آ جائے بلکہ مجھے ہمارے گھر کے حالات بدلنے ہیں' صرف چند سال کی بات ہے' پھر میرا بھی معاشرے میں ایک عزت دار مقام ہو گا۔ ہمارے حالات بدلیں گے تو لوگوں کے رویے بھی بدل جائیں گے۔ میری بہنوں کی شادیاں کسی اچھے گھر میں ہو جائیں گی۔" میں نے ایک بار پھر اماں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"تم چاہتی ہو تمہاری ان بے وقوفانہ باتوں پہ یقین کر کے میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھے' اچھے وقت کے آنے کا انتظار کرتی رہوں' تمہارے علاوہ اور بھی دو بیٹیاں بیاہنی ہیں مجھے۔ ایم۔ اے کر لیا تو چند ہزار کی نوکری ہی مل پائی نا۔ آگے پڑھ کر کیا تیر مار لو گی بی بی۔" اماں پہلے ہی رشتے سے انکار پر چڑی بیٹھی تھیں' میری باتوں پہ اور بھی سیخ پا ہونے لگیں۔ البتہ ابا ان معاملات میں کبھی نہیں بولتے تھے' مہینے کا لگا بندھا خرچ اماں کے حوالے کر کے وہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے بری الذمہ

ہو جاتے تھے اور پھر تمام معاملات میں خاموشی ان کی بہترین پالیسی تھی۔

میں ایک قریبی اکیڈمی میں پڑھاتی تھی۔ ایم۔ فل کا سمسٹر شروع ہوا تو میں اور بھی مصروف رہنے لگی۔ ان ہی دنوں میری ملاقات شہریار سے ہوئی' شہریار بخاری بھی میری طرح لوئیر مڈل کلاس کا نمائندہ تھا' دو چھوٹی بہنوں اور بیوہ ماں کی ذمہ داری اور اس کی عام سی نوکری' جو ابھی پروبیشن پہ تھی۔ ہمیں قریب لانے میں شاید بڑا ہاتھ ہمارے حالات کا تھا۔ شہریار ایک غیر معمولی اسٹوڈنٹ تھا' جو اسکالرشپ پہ پڑھ رہا تھا۔ ہم دنیا کی مالیاتی پالیسیاں پڑھتے' اقتصادیات کے بخیے ادھیڑتے اور اپنے مالی حالات پہ کڑھتے آگے بڑھ رہے تھے۔ جیسے جیسے سمسٹر ختم ہو رہے تھے ہمارا ساتھ مضبوط ہو رہا تھا۔

"جانتی ہو ملا' جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو' سب کچھ اچھا لگنے لگا ہے۔ زندگی سے' قسمت سے

میری شکایتیں کم ہونے لگی ہیں۔ تمہاری مثبت سوچ نے میرے اندر بھی امید بھر دی ہے' ورنہ میرے گھر کے مسائل اور موجودہ جاب نے مجھے فرسٹریشن کے سوا کچھ نہیں دیا۔ میں ہر وقت منفی سوچوں میں گھرا رہتا تھا۔ محبت انسان کو کیسے بدل دیتی ہے یقین نہیں آتا۔" یونی ورسٹی گراؤنڈ میں بیٹھے وہ اکثر ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔

"یاد رکھنا شہریار! ہم سے سب کچھ چھین لیا جائے تو بھی کوئی ہماری امید ہم سے نہیں چھین سکتا اور یہ وہ واحد طاقت ہے جو ہار کو جیت میں بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہم ساتھ رہیں یا نہ رہیں' مجھ سے وعدہ کرو تم اپنے اندر امید کا دیا جلائے رکھو گے۔" میری اس بات پہ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"تم بھی میرے ساتھ رہو گی اور یہ امید بھی' میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گا۔" اس نے پورے جذب سے میرا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ مجھے اس کے جذبوں کی صداقت پہ خود سے زیادہ بھروسا تھا۔

"سوری یار اس سے زیادہ مہنگا تحفہ تمہاری سالگرہ پہ میں افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔" ریپر میں جگجیت سنگھ کی غزلوں کا ایک کیسٹ اس نے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میری سالگرہ پہ پہلی بار کسی نے مجھے تحفہ دیا تھا' میں اسے کیسے بتاتی یہ میرے لیے ہفت اقلیم کی دولت سے بڑھ کر ہے۔ زندگی میں وہ پہلا شخص تھا جس کو میری سالگرہ کا دن یاد رہا اور آخری بھی۔

اماں کے وظیفے اور حمیدہ خالہ کی کارکردگی ایک دن ہمارے دروازے پہ حسن بیگ کو لے آئی۔ اڑتالیس سالہ طلاق یافتہ بزنس مین جس کی لمبی گاڑی کی چمک نے اس کے ظاہر سے لے کر باطن تک کو احسن طریقے سے ڈھک دیا۔ ہم جس سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں وہاں مرد کا اسٹیٹس صرف اس کی کمائی ہوتا ہے۔ اماں کو تو اس رشتے کی اتنی خوشی تھی کہ مجھ سے پوچھنا تو دور کی بات' انہوں نے ابا کی رائے لینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ یوں بھی یہ میرا آخری سمسٹر تھا اس لیے جلد میری شادی کی جا سکتی تھی۔ میرے انکار پہ اماں نے خودکشی کی دھمکی بھی دے ڈالی۔

"شہریار میں بہت پریشان ہوں۔" اگلے دن یونی ورسٹی میں اسے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔

"ماہا یہ کیسے ممکن ہے ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں' ہماری دو سال کی کمٹمنٹ ہے اور اب تو میری جاب بھی پرمننٹ ہو گئی ہے۔" اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

"اماں خودکشی کی دھمکی دے رہی ہیں' ابا سے مدد مانگنا بے کار ہے۔ اس سب کا واحد حل یہ ہی ہے تم اپنی والدہ سے بات کرو اور انہیں ہمارے گھر بھیجو' اماں کا اس رشتے کے لیے اصرار صرف اس لیے ہے کہ دوسرا کوئی رشتہ نہیں۔ اب اگر تمہاری امی ہمارے گھر آجاتی ہیں اور میں بھی اپنا فیصلہ تمہارے حق میں کروں تو امی کو میری بات ماننا پڑے گی۔" میں ایک آخری کوشش کرنا چاہتی تھی۔

"ٹھیک ہے ماہا تم بالکل پریشان مت ہونا۔ میں کل ہی امی کو تمہارے گھر لے کر آتا ہوں۔" میرے اداس چہرے نے اس کو اور بھی پریشان کر دیا تھا۔

"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا شہریار۔ گھر میں دو جوان بیٹیاں بٹھا کر اس غربت میں تمہاری دلہن بیاہ لاؤں۔ اتنا باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے۔" صفیہ کا پارہ تو یہ سن کر ہی ہائی ہو رہا تھا کہ بیٹا پکی نوکری ملتے ہی لڑکی بھی پسند کر چکا ہے۔ پھر اپنے گھر میں دو جوان بیٹیاں ہوں تو بیٹے کے سر پہ سہرا سجانے کا حوصلہ کسی ماں میں نہیں ہوتا۔

"امی میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں ماہا سے کمٹ کر چکا ہوں کہ کل آپ کو اس کے گھر لے کر آؤں گا۔ آپ صرف ایک بار میرے ساتھ چلیں' ہمیں شادی کی جلدی نہیں ہے بس صرف اس کی والدہ کی تسلی کے لیے چلتے ہیں' تاکہ وہ اس رشتے سے انکار کر دیں۔ ورنہ وہ ماہا کی شادی کہیں اور کر دیں گی۔" شہریار نے ماں کے سامنے التجا کی تھی۔

"تو کر دیں شادی اگر اتنی ہی ہوا کے گھوڑے پہ سوار ہیں۔ ہمیں کوئی لڑکیوں کی کمی ہے۔ دیکھنا' چاند سی

دلہن لے کر آؤں گی میں اپنے لال کے لیے۔" شہریار کے ماتھے کی شکن دیکھ کر صفیہ بیگم نے پینترا بدلا۔

"خود غرضی اچھی نہیں بیٹا' میری بیٹیوں کے سر پہ باپ کا سایہ نہیں اور میں بھی کتنے دن جی پاؤں گی۔ ایسے میں تو ہی ان کا واحد سہارا ہے۔ جوان بیٹیاں گھر بٹھا کر میں بھولے آئی' ان پہ تو پکی عمر کا ٹھپہ لگ جائے گا۔ میری بچیاں اپنے گھر کی ہو جائیں تو میں چین سے مر پاؤں گی۔" صفیہ بیگم کا آخری حربہ کامیاب رہا اور شہریار مزید کوئی بات کیے اٹھ کر چلا گیا۔

"امی ابھی میری شادی کے لیے راضی نہیں ہیں' ان کا کہنا ہے پہلے میری دونوں بہنوں کی شادی ہو جائے' پھر جہاں کہوں گا وہ میری شادی کرنے کے لیے تیار ہیں۔" ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہے اس کے چند فقروں نے میری آخری امید بھی چھین لی تھی۔

"ایک راستہ ہے۔" میرے چہرے کو اپنی نظروں میں رکھتے وہ مدھم آواز میں بولا تھا۔

"کیا؟" میں نے امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے غلط مت سمجھنا ماہا' میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ اگر تم ساتھ دو تو ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔ ایک بار نکاح ہو گیا تو ہمارے گھر والوں کو اسے ہر حال میں قبول کرنا ہو گا۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"کورٹ میرج۔ یہ تم کہہ رہے ہو شہریار؟ تم چاہتے ہو اپنے ماں باپ کی عزت کو داؤ پہ لگا کر میں اپنے ارمان پورے کر لوں۔ اس کا نتیجہ سوچا ہے کبھی؟ میرے گھر میں بھی دو بہنیں ہیں۔ میں ایسا کر کے ان کے مستقبل کو تاریک نہیں کر سکتی۔ اس سے تو بہتر ہے میں وہاں شادی کر لوں جہاں میرے والدین مجھے شادی کے لیے کہہ رہے ہیں۔" اس کے سوال کا میرے پاس صرف ایک جواب تھا۔

اگلے مہینے میری شادی ہو گئی۔ دو لاکھ حق مہر نقد اور تین لاکھ کی رقم شادی کے لیے حسن بیگ کی طرف سے میرے گھر والوں کو ملی اور تب میں سمجھی یہ شادی نہیں یہ اماں خود کشی کیوں کر رہی تھیں۔ میرے ساتھ انہوں نے میری دونوں بہنوں کا مستقبل بھی سنوار لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"عورت کو سر پہ بٹھا کر رکھنے کی عادت نہیں ہے مجھے' وہ اور مرد ہوتے ہیں جنہیں خوب صورت اور کم عمر عورتیں بے وقوف بنا دیتی ہیں۔ میں بہت پریکٹیکل انسان ہوں' جذبات سے نہیں سوچتا۔ تمہاری کلاس کی لڑکیوں کو بہت جلدی یہ خوش فہمی ہو جاتی ہے کہ شاید ان کا بے مثال حسن شوہر کو دیوانہ بنا دے گا۔

مگر میں یہاں واضح کر دوں کہ میں بے وقوفوں کے اس قبیلے سے ہرگز نہیں جس میں بیوی کو سر پہ بٹھا کر لوگ اپنے لیے تمام راستے بند کر لیتے ہیں۔ تمہارے جائز حقوق تمہیں ملیں گے مگر اس سے زیادہ کی توقع مجھ سے مت رکھنا۔" حسن کے عالی شان کمرے میں آج میری پہلی رات تھی۔

"ایک بات اور واضح کر دوں جو کچھ تمہیں دینا تھا شادی پہ دے چکا ہوں' میری جائیداد میں تمہارا کوئی شیئر نہیں ہو گا۔ پہلی بیوی کے نام پہ کافی پراپرٹی خریدی تھی' دو سال بعد ہی اس نے طلاق لے لی اور سب کچھ ہتھیا لیا۔ اب اتنی محنت کی کمائی یوں ہی تو لٹائی نہیں جا سکتی۔" حسن نے میرا گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے ہی منہ دکھائی میں زہر میں بجھے یہ جملے تحفے میں دیے تھے۔

"جی۔۔۔" میرے پاس اس سے زیادہ کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

"ایک اور بات کہنا تھی تم سے۔" کان کھجاتے ہوئے اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

"میرا لائف اسٹائل اور اسٹیٹس کا تو تمہیں اس گھر میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہو گیا ہو گا۔ میں ملازم سوچ سمجھ کر رکھتا ہوں اور رشتے داریاں محتاط رہ کر۔ کوشش کرنا تمہارے تعلقات اپنی فیملی سے محدود رہیں اور مجھ تک تو وہ لوگ ہرگز اپروچ نہ کریں' شادی پہ انہیں جتنا سپورٹ کرنا تھا میں کر چکا ہوں' اب اگر

ان لوگوں نے بہانے بہانے سے مزید رقم ہتھیانے کی کوشش کی تو میں تمہیں بھی ان کے ساتھ ہی روانہ کردوں گا۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ کپڑے بدلنے چلا گیا تھا۔

پھولوں کی سیج سے روح کیسے زخمی ہوتی ہے اس بات کا احساس مجھے اپنی شادی کی پہلی رات ہوا تھا' ایسا لگا کسی کی آہ لگ گئی ہو۔ حسن کی خود پسندی اور احساس برتری نے مجھے کبھی حقیقی معنوں میں خوش نہیں رہنے دیا۔ میں نے ہمیشہ خلوص اور ایمان داری سے بیوی ہونے کا ہر فرض ادا کیا۔ دیکھنے والوں کے لیے میری زندگی بہت آئیڈیل تھی' اللہ نے میرا نصیب کھول دیا تھا' کہاں دو کمروں والا محلے کا مکان اور معمولی سی نوکری اور کہاں حسن کا نوکروں والا گھر اور نئے ماڈل کی گاڑیاں' مگر کوئی نہیں جانتا تھا میں کس اذیت سے گزر رہی ہوں۔ کہیں پڑھا تھا مرد جب عورت پہ ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ اپنی ہی نظروں میں گر جاتی ہے' چوٹ صرف مارنے سے تو نہیں لگتی۔ روح پہ لگے زخم ان تھپڑوں سے زیادہ گہرے ہوتے ہیں جن کے نشانوں کا پتا نہیں ہوتا۔

"میں تمہیں ہوٹل لے تو آیا ہوں مگر اب ٹینشن ہو رہی ہے پتا نہیں تم یہاں کیسے بی ہیو کرو گی' زندگی میں پہلی بار آئی ہو نہ کسی ہوٹل میں تم۔" میری بھرپور تیاری کو یکسر نظر انداز کرتے حسن کے جملوں نے میری شام کو آلودہ کر دیا تھا۔

"جی پہلی بار آئی ہوں۔" اپنے اندر کی توڑ پھوڑ کو مسکراہٹ کے پردے میں چھپاتے میں نے جواب دیا۔

"یار تم کھانا تو اچھے سے کھاؤ' کہاں نصیب ہوا ہو گا کبھی تمہیں ایسا کھانا۔ میرے تو بس دو ہی شوق ہیں' اچھا کھانا اور مہنگی گاڑیاں۔ اپنی پچھلی گرل فرینڈ کو بہت عیش کروایا ہے میں نے۔ اس شہر کے مہنگے ترین ہوٹلوں سے کھانے کھلائے ہیں۔" ہنستے ہنستے مجھے میری اوقات یاد دلا کر وہ پھر کھانے میں مشغول ہو گیا تھا۔ میرا نوالہ حلق میں ہی اٹک چکا تھا۔

"شادی کیوں نہیں کی اس سے؟" پانی کا گھونٹ بھر کر میں نے حلق میں اٹکے نوالے کو نگلنے کی کوشش کی۔

"بہت چالاک تھی' فرمائشیں ہی نہیں ختم ہوتی تھیں اس کی۔ لیکن تھی بہت خوب صورت۔ ویسے بھی گرل فرینڈز سے شادی کون کرتا ہے۔ یہ تو صرف اچھی کمپنی کے لیے ہوتی ہیں۔" اپنے سے چودہ سال چھوٹی' خوب صورت اور اعلا تعلیم یافتہ بیوی کے سامنے بیٹھے حسن نے بڑی شان سے اپنی پرانی گرل فرینڈ کے حسن کا تذکرہ کیا۔

وقت کے ساتھ مجھے اپنا آپ ایک گلیشیر لگنے لگا تھا۔ دیکھنے میں برف کا حسین جزیرہ' خوب صورت' دل آویز' سفیدی' لیکن اندر سے چٹخا ہو' دراڑوں سے بھرا وجود' تنہائی' بے بسی' سرد موت۔

اماں سے ملنے پہ تو پابندی تھی' لیکن کبھی کبھی چھپ کے فون پر بات ہو ہی جاتی تھی۔ ان کے خیال میں میری پریشانی قبل از وقت تھی۔ حسن کسی بری عورت کے فریب کا ڈسا ہوا ہے اور اسے میرے خلوص اور جذبے ایک دن بدل دیں گے۔ رامس کی پیدائش نے اماں کی امیدیں بڑھا دی تھیں۔

"تم دیکھنا ماہا کیسے اب حسن تمہارے آگے پیچھے گھومتا ہے۔ وارث دیا ہے تم نے اسے۔ بیوی کو لاکھ غیر سمجھیں اولاد پہ تو جان دیتے ہیں مرد۔" شاید اماں بے چاری یہ بات کہتے ہوئے اپنی زندگی بھول گئی تھیں کہ وہ بھی ابا کی تین بیٹیوں کی ماں ہیں یا پھر وہ اس صف میں کھڑی ہی نہیں ہو پائی تھیں اور ابا کی بے اعتنائی کی وجہ انہیں صرف یہ ہی نظر آتی تھی کہ وہ انہیں بیٹا نہیں دے پائی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کیسی ماں ہو! بچہ رو رہا ہے اور تم کہہ رہی ہو آنکھ لگ گئی تھی۔ میرا بچہ نہیں سنبھالا جاتا تو چلی جاؤ اپنی ماں کے گھر' میں اس کے لیے کوئی ملازمہ رکھ لوں گا۔" تمام رات رامس کے ساتھ جاگتے نہ جانے کب نیند

سے آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور اس کے رونے کی آواز سن کر حسن کو مجھے ذلیل کرنے کا ایک اور بہانہ مل گیا تھا۔ اپنے بچے کے دو منٹ رونے پہ تڑپتے ہوئے اُسے ایک بار بھی یہ احساس نہیں ہوا ہو گا کہ وہ کسی کی بیٹی کو دو سال سے کتنا رلا رہا تھا۔

"حسن مجھے کچھ پیسے چاہئیں' بہت عرصے سے شاپنگ نہیں کی میں نے' آج رامس کے ساتھ اپنے لیے بھی کچھ کپڑے اور جوتے لے آؤں گی۔" حسن کو رامس کے سامان کے پیسے دیتے دیکھ کر میں نے اپنے لیے بھی کچھ پیسے مانگے تھے' چھوٹے بچے کے ساتھ وقت بھی تو نہیں ملتا تھا کہیں آنے جانے کا۔

"تم عورتیں کسی پیراسائٹ سے کم نہیں ہو' خون چوسنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی ہو۔ یہ جو دن رات میں محنت کر رہا ہوں یہ تمہاری عیاشیوں کے لیے نہیں ہے ماہا' بلکہ مجھے اپنے بڑھاپے کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ میرا بچہ میری ذمہ داری ہے۔ اس کا تو سب میں نے ہی کرنا ہے' تمہیں انڈی پینڈنٹ ہونا چاہیے' اتنی پڑھائی لکھائی کس دن کام آئے گی آخر!" والٹ سے چند ہزار مزید نکال کے میری طرف بڑھاتے ہوئے بڑی نخوت سے حسن نے کہا تھا۔

غرور کے باعث ابلیس کو مردود ٹھہرایا گیا تھا مگر ابن آدم نے اس غرور کو اون کر لیا۔ پھر بھی گناہ گار حوا ہے اور اس گناہ کا بوجھ حوا کی بیٹیوں کو اٹھانا پڑے گا۔

چاہتی تو میں بھی یہ ہی تھی کہ ملازمت شروع کر دوں اور اپنی تعلیم کا ٹوٹا ہوا سلسلہ ایک بار پھر جوڑ لوں' میرا پی ایچ ڈی میری زندگی کا سب سے بڑا خواب تھا' لیکن چند ماہ کے بچے کے ساتھ یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔ میں جانتی تھی حسن کی اس بات کا مقصد صرف مجھ پر طنز کرنا ہے' ورنہ رامس کی دیکھ بھال میں وہ جتنا پوزیسو تھا اور میں تو بغیر جاب کے دن رات مصروف رہتی تھی' وہ کبھی مجھے گھر سے نکلنے کی اجازت نہ دیتا۔

وقت گزر جاتا ہے۔ میرا بھی گزر رہا تھا۔ دن رات صرف اسی کوشش میں گزرتے کہ حسن کو میری کوئی بات بری نہ لگ جائے' انہیں میری بے عزتی کا ایک اور موقع نہ مل جائے۔ پھر کوئی طنز میں بجھا تیر میری شخصیت کو گھائل نہ کر دے۔ اپنی اس کوشش کے باعث اب تو میں نے سوچنا بھی حسن کی طرح شروع کر دیا تھا۔ اپنے ہر کام کا سب سے پہلے منفی پہلو دیکھنے لگی تھی۔ اپنی ہی نقاد بنتی جا رہی تھی۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ رہ جاتا اور حسن کا لیکچر شروع ہو جاتا۔

گھر میں نوکر چاکر ہونے کے باوجود کھانا میں خود بناتی تھی کیونکہ حسن کو ملازموں کے ہاتھ کے کھانے پسند نہیں تھے۔ دعوتوں میں میرے ہاتھ کے پکے کھانے کی ہمیشہ تعریف تھی لیکن حسن کہتے تھے مجھے کھانا بنانا نہیں آتا تھا' اس لیے روز کھانے پہ ڈانٹ پڑنا تو لازمی تھا۔

دونوں بہنوں کی شادیاں اماں نے بی اے کے بعد ہی کر دیں۔ میری مثال سامنے تھی' اس لیے دونوں دامادوں کی عمر میری بہنوں کے جوڑ کی تھی۔ ان کی محدود آمدنی کے باوجود میری بہنیں خوش تھیں۔ نہ تو ان کے خاوند پہلی بیویوں کے تجربے کی بدولت چھاچھ پھونک پھونک کر پیتے تھے اور نہ ان کے پاس غرور کرنے کے لیے دولت کے انبار تھے۔ رامس چار سال کا ہوا تو اس کا ایڈمیشن شہر کے مہنگے ترین اسکول میں کرا دیا گیا۔ اس کے اسکول جانے کے بعد مجھے اپنے لیے بھی کچھ وقت ملنے لگا۔

"حسن اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنا پی ایچ ڈی شروع کر لوں۔ رامس اسکول چلا جاتا ہے اور صبح کا کچھ وقت میرے پاس فری ہوتا ہے۔" ڈرتے ڈرتے ایک دن میں نے حسن سے پوچھا تھا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں گھر' رامس اور آپ کی ذمہ داری میں بالکل کوتاہی نہیں ہو گی۔" حسن کو اپنی طرف دیکھتے پا کر میں نے التجا کی تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں اب مزید آگے پڑھنے کی' پہلی پڑھائی نے کون سا مثبت اثر ڈالا ہے تمہاری شخصیت پہ۔ الٹا دماغ ہی خراب کیا ہے۔ یہ جو میری ہر بات پہ جی جی کرتی ہو مجھے پتا ہے اندر کتنا بغض بھرا ہے

تمہارے۔ سب نظر آتا ہے مجھے تمہاری آنکھوں میں۔" حسن کو پتا نہیں مجھ سے کون سے گلے تھے جو خاموشی بھی انہیں بری لگتی تھی۔ بولتی تو نہ جانے کون سی قیامت آجاتی۔

"اپنی پڑھائی کے چکر میں گھر کو تو تم بھول ہی جاؤ گی۔ عورت کے پاس اور ہوتا ہی کیا ہے مرد کو دینے کے لیے سوائے وقت کے' اب اگر وہ وقت بھی نہ دے پائے اپنے شوہر کو' اس کے گھر کو اور اس کی اولاد کو تو کیا فائدہ ایسی عورت کا۔ ویسے بھی بہت افلاطون قسم کی عورتوں سے تو مجھے سخت چڑ ہے جو مردوں پہ اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے کتابیں رٹتی رہتی ہیں۔" حسن کا منفی ردعمل سن کر میں خاموش ہوگئی تھی۔ درد کو محسوس کرنا تو بہت سال پہلے ہی چھوڑ چکی تھی۔ اب تو میں بہت ڈھیٹ ہو چکی تھی' جتنی بھی ذلت ملتی خاموشی سے سن لیتی یا مسکرا کر بات ختم کر دیتی تھی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے' آخر ایسی بھی کیا کمی تھی مجھ میں جو میں نے حسن سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا' چھوڑ بھی تو سکتی تھی۔ پڑھی لکھی تھی اپنا بوجھ خود اٹھا سکتی تھی۔ ہماری سوسائٹی نے عورت کو اتنا اختیار کب دیا ہے کہ وہ اپنے لیے کوئی فیصلہ تنہا کر پائے۔ شادی سے انکار پر اماں کی خودکشی کی دھمکی اور اگر شادی کے بعد گھر واپس چلی جاتی تو اماں تو مر ہی جاتیں۔ لوگ کیا کہیں گے' دنیا کیا سوچے گی' ہم رشتے داروں کو کیا جواب دیں گے۔ اماں کو تمام عمر اپنی بیٹی سے نہ ملنا منظور تھا' مگر اس کے ماتھے پہ طلاق کا داغ قبول نہیں تھا۔

"گھر بسانے کے لیے بہت قربانیاں دینی پڑتی ہیں ماہا۔ یہ زندگی کورس کی کتاب نہیں کہ سب سوال اسی میں سے آئیں گے۔ زندگی کے پرچے کو اپنی فہم و فراست سے حل کرنا پڑتا ہے۔ بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ اپنی انا اور میں کو پیچھے رکھ کر سوچو' اپنے بچے کا سوچو۔

"عورتیں تو اپنے سلوک سے مردوں کو اپنا گرویدہ کر لیا کرتی ہیں پھر تم کیوں آج تک اپنے شوہر کے دل میں اپنی جگہ نہیں بنا پائیں۔ کیا فائدہ ایسی اعلا تعلیم کا جب عورت اپنا گھر نہ بسا پائے۔" اماں کا لیکچر نصیحت سے شروع ہوتا اور طنز پہ ختم اور میں نئے سرے سے شوہر کے دل میں جگہ بنانے کی ترکیب ڈھونڈنا شروع کر دیتی۔

☆ ☆ ☆

"میں دیکھ رہا ہوں آج کل تم رامس کو اگنور کرنے لگی ہو۔" میں رامس کو ٹیسٹ کی تیاری کروا رہی تھی۔ جب حسن کی طرف سے ایک نیا الزام میرے کانوں نے سنا۔

"ایسا کرو رامس کو پک اور ڈراپ اب تم ہی کیا کرو اس طرح ایک تو روزانہ اس کے اسکول سے باخبر رہو گی دوسرے رامس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع بھی مل جایا کرے گا۔" حالانکہ حسن اور رامس کا ہر کام میں اپنے ہاتھ سے کرتی تھی۔ ان کا کھانا' پکانے سے لے کر جوتے پالش کرنا بھی میری ہی ذمہ داری تھی جسے اپنی لاکھ مصروفیت کے باوجود میں نے کبھی گرانٹڈ نہیں لیا تھا۔ ایک بار ملازمہ کو حسن کے کپڑے استری کرنے کا کہنے پہ مجھے ملازموں کے حقوق پہ بہت لمبا لیکچر سنایا گیا تھا۔

"گھر میں ملازم ہونے کا یہ مطلب تھوڑی ہوتا ہے کہ آپ ہل کر پانی بھی نہ پئیں اور پھر تم کون سے نوکروں والے گھر سے آئی ہو' پہلے بھی تو اپنے سارے کام خود ہی کرتی ہو گی۔ ہمیں ملازموں کے حقوق کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

میں اس گھر کا سربراہ ہوں اور میرے سامنے تم انہیں ہرگز ایکسپلائٹ نہیں کر سکتیں' کون سا پورے سسرال کی ذمہ داری ہے تم پر۔ دو لوگوں کا کام ہی کتنا ہوتا ہے۔ آئندہ میں تمہیں بلاوجہ ملازموں پہ رعب جماتے نہ دیکھوں۔" اور اس وقت میں صرف یہ سوچ رہی تھی کہ ملازموں کے حقوق پہ اللہ کا خوف کھانے والا حسن بیگ بیوی کے حقوق کے متعلق کیسے لاعلم ہے۔

"جی اچھا۔" اس سے آگے کچھ بھی کہنا بے کار تھا۔ حسن کو حکم سنانا آتا تھا۔ جواز سننے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ میں نے خود کو ایڈجسٹ کرلیا تھا۔ میری زندگی کا اصل محور میرا گھر اور میری فیملی ہی تھی۔ حسن کی باتیں پہلے بہت تکلیف دیتی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے کانٹے دل میں اتر رہے ہوں مگر اب مجھے ان کانٹوں کے ساتھ برسوں ہوئے جینے کی عادت ہوچکی تھی۔ اب تو ان میں معمولی سی ٹیسیں ہی اٹھتی تھیں جن کو میں زیادہ محسوس نہیں کرتی تھی۔

"حسن آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' آپ پلیز جلدی ناشتا ختم کریں اور رامس کو اسکول ڈراپ کردیں۔" کل سے مجھے بخار تھا اور تمام رات میں ٹھیک سے سو بھی نہیں پائی تھی۔ ایسے میں گاڑی چلا کر رامس کو اسکول لے جانا مجھے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

"گھٹیا عورت' دیکھ نہیں رہی میں ابھی ناشتا کررہا ہوں۔ صرف وقت ہی ضائع کیا ہے کتابوں کو پڑھ کر۔ تمیز' تہذیب سے تو تمہارا دور تک کا واسطہ نہیں۔ بارہ سال میں اتنا بھی اندازہ نہیں ہوا تمہیں کہ مجھے کھانے میں ٹوکنا زہر لگتا ہے۔"

"حسن میں نے آپ کو ٹوکا نہیں ہے۔ میں تو صرف آپ سے ریکویسٹ کررہی ہوں کہ آج رامس کو آپ اسکول ڈراپ کردیں۔" اپنے گیارہ سال کے بیٹے کے سامنے صبح سویرے ایک معمولی سی بات پہ اپنی عزت افزائی ہوتے دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے تھے۔

"بکواس بند کرو۔ میں نے کہا تھا نہ کہ اپنی ذمہ داریوں کو تمہیں خود پورا کرنا ہے اور میں اس سلسلے میں کسی قسم کی لاپروائی برداشت نہیں کروں گا۔ ایک معمولی سا بخار کیا ہوگیا محترمہ کو مکار عورتوں کی طرح ڈرامے کرنا شروع کردیے۔ جیسے جانتا نہیں میں تم عورتوں کے ان حربوں کو۔ جو کام تمہارے ذمہ ہے اسے تمہیں ہی پورا کرنا ہے۔" پتا نہیں حسن آج کون سا حساب چکانے کے موڈ میں تھے۔

"اپنا کون سا کام میں نہیں کرتی۔ اتنے سالوں میں میرا کون سا ایسا فرض ہے جو میں نے ادھورا چھوڑا ہے۔ آپ کی ہر ذمہ داری' رامس کی پڑھائی' اس کی دیکھ بھال۔ اپنے کون سے کام میں کوتاہی برتی ہے میں نے۔ سب کچھ تو کرتی ہوں پھر بھی آپ کی شکایتیں ختم نہیں ہوتی ہیں۔" شاید آج میرے صبر کا پیمانہ بھی چھلک چکا تھا یا مجھ سے رامس کے سامنے اپنی اتنی ذلت سہی نہیں گئی۔

"احسان کرتی ہو مجھ پہ اپنا ہی کام کرتی ہو' نہ کہ محلے والوں کا۔ ہر عورت یہ ہی کرتی ہے۔ کبھی سوچا ہے تمہاری اوقات کیا تھی اور میں نے تمہیں کیا بنادیا ہے۔ تم جو اپنی لمبی چوڑی ڈگریوں کے باوجود چند ہزار کی نوکری کرکے اپنا کنبہ پال رہی تھیں۔ ساری عمر گھر میں گزار دیتی ہیں تم جیسی ڈگری والیاں۔ جس چھت کے نیچے کھڑی ہو یہ میری بدولت ہے۔ سوسائٹی میں آج بھی تم ماہا حسن بیگ کے نام سے عزت پاتی ہو۔ میرا احسان مانو جو تم جیسی دو ٹکے کی عورت کو اتنے سالوں سے برداشت کررہا ہوں' ورنہ کب کا فارغ کرچکا ہوتا۔ زہر لگتی ہیں مجھے تم جیسی مردوں کا مقابلہ کرنے والی عورتیں۔" چائے کا کپ پیتے ہوئے' بہت مضبوط لہجے میں وہ میری شخصیت کو پامال کررہا تھا۔ رامس سر جھکائے بیٹھا تھا اور میں کسی مجرم کی طرح حسن کے لگائے الزامات سن رہی تھی۔

"تو نہ کرتے مجھ سے شادی۔ آج سے پہلے میں سمجھتی تھی آپ ایک مشکل انسان ہیں' اپنی ذات کے غرور میں مبتلا ہیں۔ لیکن آج پتا چلا آپ احساس کمتری کے مارے ہوئے چھوٹے انسان ہیں۔" حسن کے ساتھ اپنے رشتے کو نبھانا میرے لیے ایک چیلنج تھا۔ مجھے لگا پتھر پہ بھی مسلسل پانی پڑے تو اس میں سوراخ ہوجاتا ہے لیکن یہ میری بھول تھی وہ شخص پتھر نہیں پہاڑ تھا جسے سر کرنے کے لیے عزم اور ہمت کے ساتھ قسمت کی ضرورت بھی پڑتی ہے اور میرے کارڈز میں قسمت نہیں تھی۔ میری کم عمری' خوب صورتی اور

تعلیم سب میدان جنگ میں ناکارہ نکلے۔
"بکواس بند کرو ذلیل عورت۔" حسن کے مضبوط ہاتھ کا نشان میرے سفید گال کو لال کر گیا تھا۔ "نکل جا ابھی اسی وقت میرے گھر سے۔" اس کی آنکھوں میں اشتعال تھا۔
"مجھے بھی اس گھٹن میں اب مزید نہیں رہنا۔ چلو رامس۔۔۔" میرا ہاتھ اب بھی میرے گال پہ ٹکا تھا۔
"رامس کہیں نہیں جائے گا۔ یہ حسن بیگ کا بیٹا ہے' تمہاری طرح کسی ٹٹ پونجیے کی اولاد نہیں۔ اس کا باپ اس کی پرورش شاہانہ انداز میں کر سکتا ہے۔ تم اسے کیا دے سکتی ہو' ہے کیا تمہارے پاس' نہ چھت اور نہ روٹی۔" غرور میں ڈوبے حسن کے الفاظ میرے کانوں سے ٹکرائے تھے۔ "میں ممی کے ساتھ جاؤں گا پاپا۔" رامس کی آواز پہ میں نے حیرت سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔
"آپ ممی کو ڈانٹتے ہیں' مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آپ ان کے بغیر رہ سکتے ہیں' میں نہیں۔" اس کے لہجے کی مضبوطی نے حسن کو ہی نہیں مجھے بھی حیران کر دیا تھا۔ میرا بیٹا اپنی ماں کے ہر غم کا چشم دید گواہ تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر میں اور رامس' حسن کی اس جنت سے نکل آئے۔ نہ کوئی منزل تھی' نہ راستہ۔ اپنے ماں باپ کے گھر میں جانا نہیں چاہتی تھی اور سر چھپانے کے لیے دوسرا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ حق مہر کے دو لاکھ اور چند لاکھ کے زیور' فی الوقت یہ میرے لیے گنج قارون تھا۔ میری ہمت رامس کے بعد' میرا دوسرا آسرا تھی۔ پروفیسر سجاد سے سالوں بعد ملی اور انہیں اپنی ضرورت کے بارے میں بتایا۔ ان کا ریفرنس اور ریکمنڈیشن لیٹر اپنے سی وی کے ساتھ لگا کر ان کی بتائی ہوئی جگہ گئی۔ میری قابلیت اس پوسٹ سے بڑھ کر تھی۔ اپنی پہلی کامیابی پہ اللہ کا شکر بجا لائی۔ رامس کا اسکول بدلنا نہیں چاہتی تھی' لیکن ابھی میرے حالات مجھے اپنے بیٹے کی اتنی مہنگی اسکولنگ کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

حسن کے طعنے مجھے سکون سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ میں رامس کو وہ سب کچھ دینا چاہتی تھی جو اسے اس کا باپ دے رہا تھا اور اس کے لیے مجھے بہت محنت کرنا تھی۔
میں یہ بھی جانتی تھی کہ حسن اتنی آسانی سے رامس کو میرے حوالے کرنے والا نہیں تھا۔ ضرور اس میں اس کا اپنا ہی کچھ فائدہ تھا۔ اپنی کاروباری مصروفیات میں ایک بچے کے لیے وقت نکالنا اور اسے سنبھالنا کسی مرد کے بس کی بات نہیں یہ صرف ماں ہوتی ہے جو اپنی اولاد کو دس مصروفیات کے ساتھ پال لیتی ہے۔
پروفیسر سجاد کی مہربانی سے میرا پی ایچ ڈی اکنامکس شروع ہو چکا تھا۔ میری تعلیمی قابلیت کے باعث اسکالر شپ آسانی سے مل گیا۔ وقت چیونٹی کی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ زندگی مشکل تھی' مگر میں مطمئن تھی۔ اماں اکثر میرے پاس آتیں اور مجھے میری بے وقوفی پہ کوستیں۔ ان کے خیال میں ایک شان دار زندگی کو چھوڑ کر میں نے اپنے لیے مشکل راستہ چن لیا ہے اور اپنے ساتھ رامس کو بھی خوار کر رہی ہوں۔ اگلے ڈھائی سال زندگی کس امتحان سے کم نہیں تھی۔ رامس کا سہارا نہ ہوتا تو شاید یہ سب نہ ہوتا۔ اسے دیکھتی تو نئے سرے سے عزم و حوصلہ پیدا ہوتا۔ حسن نے اس دوران ایک دو بار رامس سے مل کر اسے ساتھ لے جانے کی سرسری کوشش کی لیکن رامس نے انکار کر دیا۔ البتہ اس دوران حسن نے مجھے طلاق بھی نہیں دی اور یہ بات مجھے کافی حیران کر رہی تھی۔ میں خود بھی خلع نہیں چاہتی تھی ایسا کرنا ہوتا تو یہ سب بہت سال پہلے کر چکی ہوتی۔
ڈگری ملتے ملتے ڈھائی سال لگ گئے اور ایک دن پروفیسر سجاد نے اپنے آفس بلا کر اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے پوسٹ ڈاکٹورل ریسرچ پروگرام کی ایپلی کیشن تھما دی۔ ایک سال کے کنٹریکٹ میں پاکستان کی اقتصادیات اور مالیاتی سسٹم پہ ریسرچ' ماہانہ تنخواہ کے ساتھ بے شمار مراعات' اپنے سی وی کے ساتھ ڈاکٹر

سجاد جیسے قابل پروفیسر کے ریفرنس کے باعث مجھے ریسرچ اناسٹ کی پوسٹ مل گئی۔

جب وجود تاریکی اور گھٹن کا شکار ہو تو ایک سوراخ بھی زندگی کی نوید ہوتا ہے۔ مجھ پر تو روشنی کا دروازہ کھل گیا تھا۔ کامیابی بس ایک ہاتھ پر تھی اور میں نے یہ سفر سالوں میں طے کیا۔ اگر اماں اس وقت میری شادی کی ضد پکڑ کر نہ بیٹھی ہوتیں تو آج نہ صرف میں ایک عزت دار زندگی گزار رہی ہوتی بلکہ میرے گھر والے بھی اس کا حصہ ہوتے۔

اس ایک سال میں میری زندگی بدل گئی تھی۔ رامس کا داخلہ دوبارہ اسی اسکول میں کروادیا جہاں حسن نے کرایا تھا۔ میرا ریسرچ ورک کامیاب رہا۔ میں اپنے بیٹے کو ایک شان دار زندگی دینے کے قابل بن چکی تھی۔ اپنی پہلی کامیابی پہ میں آج سرخرو ہو گئی تھی۔ ریسرچ کے بعد مجھے ایک بہتر جاب کی تلاش تھی ان ہی دنوں ورلڈ بینک کی طرف سے اکنامسٹ کی چند پوزیشن اوپن ہوئی تھیں۔ میں نے اپلائی کیا اور میری پہلی پوسٹنگ واشنگٹن ڈی سی میں ہوئی۔ ایک ماہ کے بعد مجھے اپنی سیٹ سنبھالنی تھی۔ ڈی سی کے پبلک اسکول میں رامس کا ایڈمیشن کروا کر آج مجھے آفس میں رپورٹ کرنی تھی۔

"ڈاکٹر ماہا میں آپ کا تعارف ہمارے لیڈ اکنامسٹ اور آپ کے ڈیپارٹمنٹ ہیڈ ڈاکٹر شہریار بخاری سے کروانا چاہوں گا۔" آفس اسٹاف سے تعارفی میٹنگ کے دوران سولہ سال کے بعد اپنے سامنے شہریار کو دیکھ کر پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔

"آپ کو اس آفس میں خوش آمدید۔ آپ کو کسی قسم کی معاونت درکار ہو تو آپ با آسانی مجھ سے رابطہ کر سکتی ہیں۔" انتہائی پروفیشنل لہجے میں بولے اس کے چند جملے اور غیر شناسا آنکھیں۔ میں بدقت مسکرا کر سر ہلا پائی۔ وقت نے اسے اور بھی پرکشش بنا دیا تھا۔ اس کی پراعتماد شخصیت اور امریکی لہجے میں بولی انگریزی اسے سب میں نمایاں کر رہی تھی۔

اس رات پہلی بار میں نے خود کو آئینے میں بہت دیر تک دیکھا۔ ڈھلتی عمر کی لکیریں نمایاں ہونے سے کیا انسان اتنا بدل جاتا ہے کہ کوئی آپ کو پہچان بھی نہ پائے۔ اپنی بڑھتی عمر کا احساس جتنی شدت سے آج ہوا تھا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔

"کیسا رہا آپ کا پہلا دن؟" رامس کب میرے کمرے میں آیا پتا ہی نہیں چلا۔

"ممی؟" مجھے اپنی طرف متوجہ نہ پا کر اس نے پکارا۔

"ہاں؟ کیا کہا تم نے۔" میں نے آئینے سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

"میں پوچھ رہا ہوں آپ کا پہلا دن کیسا گزرا؟" صوفے پہ بیٹھتے اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"اچھا تھا... کچھ تعارفی ملاقاتیں تھیں۔ صحیح مصروفیت تو ایک ہفتے تک شروع ہو گی جب کام سمجھ آجائے گا۔" میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

"تم سناؤ اسکول پسند آیا؟"

"اچھا ہے۔ کچھ دن میں ایڈجسٹ ہو جاؤں گا۔" وہ مسکرا کر بولا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماہا اگر تم فری ہو تو میرے کیبن میں ایک کپ کافی پیتے ہیں۔" کانفرنس روم سے نکلتے میرے کانوں میں شہریار کی آواز ٹکرائی تھی۔

"شیور" انکار کرتی تو بہت بچکانہ سا لگتا۔ وہ مجھے بھولا نہیں تھا اس احساس نے عجیب سی طمانیت دی تھی۔

"کیسی ہو؟" کیبن میں کافی پیتے بہت دیر بعد اس نے خاموشی کو توڑا۔

"ٹھیک ہوں۔" خود کو کمپوز کرتے میں نے جواب دیا۔

"بیٹے کا ایڈمیشن ہو گیا۔" کچھ سوچ کر اس نے ایک اور سوال کیا۔ شاید اسے بھی میری طرح سمجھ نہیں آرہی تھی کہ بات کہاں سے شروع کریں۔

"تمہیں کیسے پتا میرا ایک بیٹا ہے؟" میں نے اس

کی بات پہ چونک کے سوال کیا۔
"اپنے کولیگز کا سارا ریکارڈ ان کے جوائن کرنے سے پہلے ہی مل جاتا ہے ہمیں اور تمہاری شہرت تو اسٹیٹ بینک کے ریسرچ پروجیکٹ کے ساتھ ہی مجھ تک پہنچ چکی تھی۔ پاکستان میں کتنی خواتین ہیں جو اسٹیٹ بینک سے ورلڈ بینک کے کیریر کو ہٹ کرتی ہیں۔
"تمہاری فیملی کیسی ہے؟ کتنے بچے ہیں تمہارے؟" وہ میرے بارے میں کافی باخبر تھا اور اس کے اگلے سوالوں سے بچنے کے لیے میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرکے اپنا سوال پوچھ لیا۔
"بچے کتنے ہیں؟ حالانکہ پہلے تمہیں یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ شادی کب کی؟" میری بات سے محظوظ ہوتا وہ بولا۔
"تم نے شادی نہیں کی شہریار؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
"نہیں۔" اس کی آنکھوں میں کچھ تھا کہ میں آگے کچھ نہیں کہہ پائی۔
"خانہ بدوشی راس آگئی ہے مجھے۔" اس کی مسکراہٹ میں طنز تھا۔
"گھر والے کیسے ہیں تمہارے؟" میں نے بدقت مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"بہنوں کی شادیاں ہوچکی ہیں۔ بڑی اسلام آباد ہوتی ہے اور چھوٹی یو کے۔" اس نے بتایا۔
"اور امی؟" میں نے پوچھا۔
"پانچ سال پہلے ان کی ڈیتھ ہوگئی۔ ان دنوں میں سڈنی میں تھا۔" اپنی بات کے اختتام پر اس نے ایک سرد آہ بھری جیسے کوئی تکلیف دہ بات یاد آگئی ہو۔ اس دن کے بعد اپنے کاموں میں اتنا وقت ہی نہیں مل پایا کہ دوبارہ شہریار سے کوئی غیررسمی بات ہو۔ میرے لیے اتنی بڑی پوسٹ پہ کام کرنا پہلا تجربہ تھا' میں محتاط بھی تھی اور مصروف بھی۔
"جگجیت کی برسی پہ ہوٹل لی میریڈین' ورجینیا میں شام غزل ہورہی ہے میرے پاس اس کے وی آئی پی پاس ہیں۔ تمہارے فیورٹ سنگر کو ٹریبیوٹ دیا جارہا ہے' چلوگی؟" شہریار نے انٹرکام پر مجھ سے پوچھا تھا۔
"تمہیں اتنی پرانی بات یاد رہی؟" اس کی بات نے مجھے حیران کردیا تھا۔
"میں تو خود زمانہ ہوا یہ بھول چکی ہوں کہ میرا فیورٹ سنگر کون ہے؟ یا مجھے غزلیں پسند ہیں۔" میرا آخری سوال خود سے تھا' مگر میں اسے کچھ کہہ نہیں پائی۔
"وہ جو دل کے قریب ہوتے ہیں ان کی باتیں نہیں بھولتیں بھلے عمر ہی کیوں نہ گزر جائے۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔
"مشکل ہے میرا آنا۔ رامس کے لیے بس ویک اینڈ ہی نکال پاتی ہوں۔ اس ویک اینڈ اس کے ساتھ کچھ کمٹمنٹ ہے ورنہ ضرور چلتی۔ امید کرتی ہوں تم برا نہیں مانوگے۔" میں شہریار سے دور رہنا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ ماضی کی تلخیاں اور بھی شدت سے یاد آنے لگتی تھیں اور ویسے بھی زندگی کے اس موڑ پہ میں اسے کوئی نئی امید نہیں دلانا چاہتی تھی۔
"ناٹ ایٹ آل۔ ایسے شوز تو ہوتے رہتے ہیں۔ پھر بھی پاس تمہیں بھجوارہا ہوں اگر موڈ ہو تو آجانا۔" بڑی متانت سے میری بات کا جواب دے کر اس نے کال ڈسکنکٹ کردی تھی۔
"واؤ... شام غزل... آپ جارہی ہیں؟" بے دلی سے جو پاس میں نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھے تھے وہ رامس کے ہاتھ میں تھے۔
"نہیں میرے پاس ان سب فضولیات کے لیے وقت کہاں ہے۔ ویسے بھی دو دن تو ہوتے ہیں ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے کے ساتھ سپینڈ کرنے کے لیے۔ ایسا کرتے ہیں نیویارک چلتے ہیں۔" اپنی خواہش کو رامس سے چھپا کر اب میں اس کے ساتھ پلان بنارہی تھی۔
"ممی آپ تھک نہیں جاتیں؟" رامس میری طرف بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔
"کیا مطلب؟" میں نے اس سے نظریں چراتے

ہوئے پوچھا۔

"میں نے آپ کے سامان میں ایک کیسٹ دیکھا ہے۔ آپ نے اسے بہت سنبھال کے رکھا ہوا ہے اور جہاں تک میں جانتا ہوں وہ اسی سنگر کا ہے۔ جس کے نام سے یہ شام غزل ہو رہی ہے۔ ممی آپ کب تک اپنی ہر خوشی، ہر خواہش کو قربان کرتی رہیں گی۔

پہلے پاپا نے آپ کو خوش نہیں رہنے دیا اور اب آپ میری وجہ سے کہیں آتی جاتی نہیں ہیں۔ میں بہت گلٹی فیل کرتا ہوں۔ آپ کو اتنی محنت کرتے دیکھ کر۔ مجھے اچھی زندگی دینے کی خاطر آپ نے اپنی ذات کو مکمل اگنور کر دیا ہے۔ آپ کے کولیگز ہوں گے وہاں، ایشین کمیونٹی ہو گی چینج کے لیے سہی آپ کو جانا چاہیے۔ اس نے قطعیت سے کہا تھا۔

شہریار سے دور بھاگنے کی کوشش میں آج کل وہی میرے حواس پہ سوار رہتا تھا۔ شاید مجھے خود کو اس سے اوائڈ کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، بلکہ نارمل رہ کر اس کا سامنا کرنا ہی صحیح طریقہ ہو گا۔ میرے لیے وہ بس ایک کولیگ ہے۔ رامس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے میں نے خود کو مطمئن کرنے کے لیے یہ ہی جواز سوچا تھا۔ بلیک ڈنر سوٹ میں آنکھوں پہ ڈیزائنر فریم لیس گلاس لگائے وہ الگ ایک ٹیبل پہ بیٹھا تھا۔ مجھے اس نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا اور اب اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرا انتظار کر رہا تھا۔

"ساڑھی بہت سوٹ کرتی ہے تم پہ۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ یہ اتفاق تھا میں نے بھی آج کالا لباس پہن رکھا تھا۔

"تم بہت بدل گئی ہو ماہا۔ پہلی نظر میں تو تم پہچانی ہی نہیں گئیں تھیں۔ کہاں وہ تین گز کی چادر میں لپٹی لڑکی اور کہاں ایک اسٹائلش، ماڈرن، کامیاب خاتون تمہیں دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ تم پندرہ سالہ بیٹے کی ماں ہو۔" اس کی نظریں مجھے کنفیوژ کر رہی تھیں۔

"تھینکس فار دی کمپلیمنٹ۔ لگتا ہے پروگرام شروع ہونے لگا ہے۔" رامس کے مجبور کرنے پر آ تو گئی تھی لیکن اپنا آپ موضوع گفتگو بننا اچھا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے اس کی بات کا مختصر جواب دے کر میں نے اپنا دھیان اسٹیج کی طرف کر لیا۔ اب تک بہت سے فارمل ڈنر اٹینڈ کیے تھے، مگر آپ پہلی بار کسی پروگرام میں میری شرکت ذاتی تھی۔ میں نے واقعی اس شام کو بہت انجوائے کیا تھا۔

اس موڑ سے شروع کریں، پھر یہ زندگی
ہر شے جہاں حسین تھی، ہم تم تھے اجنبی

جگجیت کی خوب صورت غزل مجھے کسی ٹرانس میں لے گئی تھی۔

"مجھ سے شادی کرو گی ماہا؟" شہریار کے اس سوال کے لیے شاید میں ذہنی طور پہ تیار نہیں تھی۔ ہوٹل کی لابی سے نکلتے اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"میں آج بھی وہاں کھڑا ہوں جہاں سولہ سال پہلے ہم جدا ہوئے تھے۔ میں آج بھی تمہارا منتظر ہوں۔ برسوں پہلے تم نے اپنا راستہ جدا کر لیا تھا، لیکن کیا آج تمہاری زندگی کا کوئی راستہ مجھ تک آتا ہے؟ میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا امید ہے تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔" اپنی بات کہہ کر وہ رکا نہیں تھا۔ اس نے آج بھی فیصلے کا اختیار مجھے ہی دیا تھا۔ وہ میرے جواب کا منتظر تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں تم سے ملنا چاہتی ہوں شہریار!" فون پہ اسے ملنے کی جگہ بتا چکی تھی۔ اسے مزید انتظار کی اذیت نہیں دینا چاہتی تھی۔

"کل تم میرے لیے ایک سوال چھوڑ آئے تھے۔ میں تمہاری بات کا جواب اسی لمحے دے سکتی تھی لیکن تم رکے نہیں۔ تم میرے بارے میں کتنی انفارمیشن رکھتے ہو اس کا مجھے اندازہ نہیں، لیکن اتنا میں تمہیں ضرور بتا دوں، میں اور حسن پچھلے چار سال سے الگ ضرور رہتے ہیں لیکن میں اب بھی اس کے نکاح میں ہوں۔ آئیڈیل تو یہ ہو گا کہ میں تمہارا پروپوزل قبول کر لوں، حسن سے علیحدگی اختیار کر لوں اور آنے

والے سال اپنے لیے اپنی خوشی کی خاطر گزاروں لیکن میں سوچتی ہوں اس سب میں رامس کا کیا قصور ہے؟ میرے بیٹے نے بہت چھوٹی عمر میں بہت بڑا فیصلہ کیا ہے۔

حسن جیسے آئیڈیل باپ کو اپنی ماں کی خاطر چھوڑنے کا فیصلہ لیکن میں جانتی ہوں وہ اپنے باپ سے بھی اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی مجھ سے۔ اولاد کے پاس ماں باپ سے محبت کرنے کے علاوہ کوئی اور چوائس نہیں ہوتی ہے۔ انہیں دونوں سے ہی محبت کرنی پڑتی ہے اور میں رامس کو مزید کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ آج بھی اس کے دل میں یہ امید ہوگی کہ شاید اس کے پیرنٹس ایک بار پھر اکٹھے ہو جائیں اور اس کی امید کو ختم کرنے کا گناہ میں اپنے سر نہیں لے سکتی شہریار۔ حسن کو میری تمنا کبھی نہ ہو‘ پھر بھی میں اس سے اپنا تعلق ختم نہیں کرنا چاہتی اور اس کی ایک وجہ رامس ہے۔“ میں شہریار کو کسی امید میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

”تو کیا تم سب کچھ بھول کر حسن کے ساتھ دوبارہ رہنا چاہتی ہو؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”حسن کے ساتھ دوبارہ رہنا محض میرے سوچنے سے تو ممکن نہیں لیکن اگر کبھی حسن نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میرا انتخاب میرا شوہر ہوگا۔ مانتی ہوں حسن کے ساتھ گزاری زندگی بہت تلخ تھی لیکن میں اس سے نفرت نہیں کرتی۔ نفرت انسان کی برائی سے کی جاتی ہے انسان سے نہیں۔ اماں کہتی تھیں کالج یونی ورسٹی میں ڈسٹنکشن لینے سے قابلیت نہیں منوائی جاتی‘ ایک عورت کی قابلیت اس وقت ثابت ہوتی ہے جب وہ اپنی شادی شدہ زندگی کا امتحان پاس کرلے۔ میں نے بھی اس امتحان کو پاس کرنے کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں استعمال کرلیں لیکن بدقسمتی سے فیصلہ میرے حق میں نہیں ہوا۔

آج بھی میرے دل میں صرف ایک خواہش‘ ایک کسک ہے‘ ایک ادھورا پن ہے کہ میرا شوہر مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ حسن کو جیتنے کی آرزو میں اپنا آپ کب کا ہار بیٹھی ہوں۔ مجھے کسی بھی چیز کی خواہش نہیں۔ یہ نوکری‘ اعلا ڈگری‘ عزت‘ شہرت یہ سب کچھ لے کر اگر کوئی مجھے حسن کی محبت دے دے تو یہ خسارے کا سودا نہ ہوگا لیکن میں جانتی ہوں ایسا نہیں ہو سکتا اور اس کی وجہ تم ہو شہریار‘ ذرا سوچو! اپنی ہر کوشش کے باوجود میں کیوں حسن کے دل میں جگہ نہیں بنا پائی۔ کیونکہ مجھے تمہاری بددعا لگ گئی تھی۔“ میں نے ہسٹریائی لہجے میں کہا۔

”ماہا یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو کہ میں تمہیں کبھی بددعا دوں گا۔“ وہ فوراً بولا تھا۔

”کیوں نہیں دو گے تم بددعا‘ تمہاری تنہائیوں کی ذمہ دار ہوں میں۔ محبت کرکے اسے نہ نبھانے کا گناہ کیا ہے میں نے اور تم آج بھی میرے منتظر ہو۔ تمہارے سچے جذبوں کی ناقدری کا جرم سرزد ہوا ہے مجھ سے‘ جب تم خوش نہیں رہے تو مجھے خوشی کیسے نصیب ہوتی؟

پچھلے سولہ سال سے اپنے ضمیر پہ بوجھ لیے گھوم رہی ہوں۔ میرا خالی دامن گواہی دیتا ہے کہ میں نے تمہیں بہت تکلیف پہنچائی ہے۔ آج میں ہاتھ جوڑ کر تم سے التجا کرتی ہوں۔ شہریار مجھے معاف کردو۔ اپنی بددعا واپس لے لو‘ مجھے اس احساس ندامت سے نجات دلا دو۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہیں کبھی بددعا نہیں دی‘ بلکہ ہمیشہ تمہاری خوشی کی آرزو کی ہے۔ پھر بھی اگر میرے چند لفظ تمہیں مطمئن کر سکتے ہیں تو ماہا میں نے تمہیں معاف کیا۔“ میرے بندھے ہاتھوں کو تھام کر اس نے کہا۔

”جو گزر گیا اسے نہ تم واپس لا سکتے ہو نہ میں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم دونوں دریا کے دو کنارے ہیں‘ ہمیشہ ساتھ رہ کر بھی ہم کبھی نہیں مل سکتے۔ اس وقت ہمارے درمیان دنیا تھی لیکن آج وقت آچکا ہے‘ ہم ایک نہیں ہو سکتے‘ لیکن کیا ہم اچھے دوست رہ سکتے ہیں؟“ اپنے آنسو پونچھتے میں نے اس سے سوال کیا۔

"یہ بات اگر تم نہ بھی کہتیں تو بھی ہم دوست رہتے۔ زندگی میں کبھی بھی پکار لینا' شہریار بخاری کو اپنے ساتھ پاؤ گی۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ شہریار سے ملنے کے بعد کتنی دیر پارک کے بینچ پہ بیٹھی رہی۔ میرا سیل بار بار بج رہا تھا' لیکن میں اس وقت کسی سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ سولہ سال سے جس بات کو خود سے نہیں کہہ پائی تھی آج اسے شہریار کے سامنے کہہ ڈالا تھا۔ کیوں اتنے سال حسن کی بے مروتی سہ کر بھی مسکراتی رہی؟ اس لیے کہ حسن کی دی ہوئی تمام تکالیف کے باوجود میں اس سے محبت کرتی تھی اور اپنے اس سوال کا جواب مجھے اس وقت ملا جب شہریار نے مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔

"ممی آپ کہاں تھیں میں کب سے آپ کو کال کر رہا تھا۔" رامس کی آواز پہ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کچھ دیر پہلے میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھی تھی۔

"Is everything alright سب ٹھیک ہے نا؟" رامس نے پریشانی سے پوچھا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں' بس تھک گئی ہوں' کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔" رامس مجھے دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔ اس لیے اس کے سامنے خود کو کمپوز کرتے میں نے جواب دیا۔

☼ ☼ ☼

زندگی اپنی ڈگر پہ چل رہی تھی۔ رامس کا ہائی اسکول مکمل ہوا تو اس نے میری لینڈ یونیورسٹی میں اپلائی کر دیا۔ وہ مجھ سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا' ورنہ اس کے کیریر کے لیے مجھے کسی بھی دوسری اسٹیٹ میں بھیجنے پر اعتراض نہ ہوتا۔ شہریار نے اپنی بات نبھائی' وہ اب بھی میرا کولیگ اور اچھا دوست ہے۔

"ممی جلدی آئیں دیکھیں کون آیا ہے۔" رامس کی خوشی سے چہکتی آواز پہ میں اسٹڈی سے باہر نکلی۔

"ممی دیکھیں پاپا آئیں ہیں۔ فائنلی پاپا ہمارے پاس آگئے ہیں۔" رامس کو جیسے دو جہان کی دولت مل گئی تھی۔ چھ سال کے بعد حسن کو اپنے سامنے دیکھ کر مجھے

سمجھ نہیں آرہا تھا مجھے کیسے ری ایکٹ کرنا ہے۔
"مجھے معاف کردو ماہا' جانتا ہوں میں نے تمہارا بہت دل دکھایا ہے۔ معافی کے چند لفظ تمہاری تکالیف کا ازالہ نہیں کرسکتے۔ میں تمہارا قصوروار ہوں۔" یہ وہ حسن نہیں تھا جسے میں اٹھارہ سال سے جانتی تھی۔
"یہ جو معاشرہ مرد کو حکمرانی کا سرٹیفکیٹ دے دیتا ہے کہ جو چاہو کرو اور جیسے چاہو عورت کے ساتھ سلوک کرو' اس احساس برتری نے مجھے اور تمہیں کبھی چین سے رہنے نہیں دیا۔ ایک عورت کی بے وفائی کا بدلہ میں نے تم سے لیا۔ وہ عورت جس کی بدولت مجھے گھر کا سکون اور اولاد ملی اس کی کبھی قدر نہیں کرسکا اور تم نے ہمیشہ میری زیادتیوں کو برداشت کیا۔ تمہیں تنگ کرکے سکون ملتا تھا۔ تم روتیں تو لگتا میرے ساتھ دھوکا کرنے والی عورت رو رہی ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ میں تمہاری خوبیوں کو تسلیم نہیں کرتا تھا دل تو میرا بہت سال پہلے تم جیت ہی چکی تھیں۔ بس میں اپنے اندر کے تکبر کے مارے شخص کو شکست نہیں دے پایا۔
"پچھلے چند سالوں میں اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے باوجود میرے اندر خالی پن اور تشنگی ہے۔ مجھے وہ سکون چاہیے جو تمہارے وجود سے میری زندگی میں تھا۔ تمہارے اور رامس کے بغیر وہ گھر گھر نہیں رہا۔ کئی مہینوں سے تمہارا سامنا کرنے کی ہمت اکٹھی کررہا ہوں ماہا۔ یہ دولت اور شان و شوکت آپ کی تنہائی دور نہیں کرسکتے۔ اس بات کو سمجھنے میں مجھے کئی سال لگ گئے۔ آج میں اپنی انا اور اپنے تکبر کو ہرا کر تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں
میری زندگی میں تمہاری شمولیت میری بہت دل سے مانگی دعا کا نتیجہ ہے۔ تم میری کسی نیکی کا ثمر ہو ماہا۔ میں تمہارے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔ تم اور رامس میری زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ ہو۔ تمہارا دل بہت بڑا ہے' کیا تم میری غلطیوں کو معاف کرکے میرے ساتھ نئے سرے سے اپنی زندگی گزارنا چاہو گی؟" اتنے طویل انتظار کے بعد حسن کے اپنائیت بھرے جملوں نے ہمارے بیچ کی تمام رنجشیں ختم کردی تھیں۔
"کتنا طویل انتظار کرایا ہے آپ نے مجھے' ان چند جملوں کے لیے حسن۔ ایسا لگ رہا ہے آج پوری کائنات کی خوشیاں میری جھولی میں آگری ہیں۔ میرے لیے تو آپ ہی میری کل کائنات ہیں۔ عورت کی اگر ذاتی زندگی ناکام ہے تو تمام دنیا کی فتح بھی اسے سچی خوشی نہیں دے پاتی ہے اور برسوں سے اس ناکامی کا کانٹا میری روح کو چھلنی کررہا تھا۔ آپ کو میں بتا نہیں سکتی کہ آپ کے اقرار محبت نے مجھے کتنا سکون دیا ہے۔" آنکھوں سے چھلکتے آنسوؤں نے میرے گالوں کو بھگو دیا تھا۔
"تم بہت عجیب ہو ماہا۔ جب میں تمہیں ناحق تنگ کرتا تھا اس وقت بھی روتی تھیں اور آج میں اپنے رویے پہ شرمندہ ہو کر تم سے معافی مانگ رہا ہوں پھر بھی تم آنسو بہا رہی ہو۔" حسن نے اپنی انگلی کی پوروں سے میرے گالوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔
"ان آنسوؤں میں اور ان آنسوؤں میں بہت فرق ہے۔" میں نے دھیمی مسکراہٹ سے جواب دیا۔
"مجھے تو کوئی فرق نہیں لگتا۔ تم پہلے بھی میری بات سن کر ایسے ہی رونے لگتی تھیں' آج بھی رو رہی ہو۔" اس کے لہجے میں الجھن تھی۔
"جب درد ہوتا ہے تو آنسو نکلنا فطری بات ہے۔" میں نے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو صاف کیا۔
"اس کا مطلب میری باتوں سے آج بھی تمہیں تکلیف پہنچی ہے؟" حسن کے لہجے میں ندامت تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔
"کانٹے چبھنے کی تکلیف اور کانٹے نکلنے کی تکلیف ایک جیسی ہوتی ہے' حسن بس اس تکلیف سے نکلنے والے آنسو الگ الگ ہوتے ہیں۔" اس کے چہرے پہ سکون اتر آیا تھا اور اس کے بازو میں لپٹے مجھے پہلی بار احساس ہوا یہ شخص میرا کتنا بڑا سہارا ہے۔ میرے اتنے سالوں کی بے چینی اس ایک لمحے میں رخصت ہوگئی تھی۔

☆ ☆

فائزہ افتخار

چوتھی قسط

سالار کا ذہن پہلے سے امہانی کی باتوں سے الجھا ہوا تھا۔ وہ سعد کے بارے میں اتنی سادگی سے سب بتا رہی تھی کہ وہ چاہ کے بھی اپنی ناگواری یا سخت رد عمل ظاہر نہیں کر پایا تھا مگر یہ تھا جو چبھ رہا تھا۔۔۔ بری طرح سے' اماں کی بات پہ وہ مزید چڑ گیا۔

"یہ آپ کو بیٹھے بٹھائے اس کی فکر کیوں ستانے لگی۔ یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے۔ ام ہانی اس گھر کی بہو بن کے آنے والی ہے۔ اس کے معاملات ہم سے الگ نہیں

ناولٹ

ہیں۔"

"مگر بہتر ہو گا آپ خود کو ان معاملات سے الگ ہی سمجھیں۔" اس کے تختی سے تنبیہہ کرنے پہ بھی وہ رہ نہ سکیں۔

"سالار۔۔۔ ہمیں خیال رکھنا چاہیے کہ وہ بن ماں باپ کی بچی ہے اس کے ساتھ نا انصافی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا حق اسے ملنا چاہیے۔"

اس پر وہ ٹھٹک گیا۔

"کیا کسی نے آپ سے کہا ہے کہ اس کے ساتھ نا انصافی ہو رہی ہے یا اس کا حق غصب کیا جا رہا ہے۔"

"نہیں ایسا تو کچھ نہیں ہے۔ کون کہے گا بھلا۔" وہ گڑبڑا گئیں۔

"تو کیا آپ کو الہام ہوا ہے۔"

"زمانہ بہت خراب ہے اور تم بھول گئے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا تھا۔۔۔ تم کم عمر تھے اور میں جوان بیوہ۔۔۔ تو کیا دنیا ہمیں ہڑپ کرنے کو تیار۔۔۔ وہ بھلے لوگ سہی ۔۔۔ لیکن کسی کی نیت کا کیا پتا۔"

"کیا ہو گا زیادہ سے زیادہ۔۔۔ وہ لوگ اس کی جائیداد رکھ لیں گے؟ رکھ لیں۔۔۔ اگر ام ہانی چاہے گی تو میں اس کی پائی پائی اسے دوبارہ واپس دلوا دوں گا۔ مگر تب۔۔۔ جب مجھے اس کا اختیار ہو گا۔ ابھی آپ اس معاملے سے دور رہیں اور جو کام آپ کو سونپا ہے صرف وہ کریں ۔۔۔ یعنی شادی کی تیاریاں۔"

اس کا بے زار لہجہ بتدریج بد تمیز ہوتا گیا تو اماں چپ ہو گئیں۔۔۔ مگر جو ٹھان بیٹھی تھیں۔ اس سے پیچھے نہ ہٹ سکیں۔

☼ ☼ ☼

دل میں چور ہو تو انسان ویسے ہی میسنا اور گھنا سا بن کر نظر جھکا کے بیٹھتا ہے بیجیسے میں کھانے کی میز پہ اس وقت ان دونوں کی باتوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی سنتا حلق سے نوالے اتار رہا تھا۔

"تم اس ویک اینڈ پہ ام ہانی کو لے کر شہر چلی جانا شاپنگ کے لیے۔"

"بالکل۔۔۔ اور جیولر کو میں نے گھر ہی بلا لیا ہے ہانی پسند کر لے گی۔"

"وہ سادگی پسند ہے۔ میں جانتا ہوں کیا پسند کرے گی مگر تم اس کی پسند کے علاوہ بھی کچھ بھاری زیورات بنوا لینا ورنہ لوگ کیا کہیں گے۔"

"بالکل مجھے بھی اس بات کا احساس ہے۔ دنیا ہر عمل پہ نظر رکھتی ہے۔ ذرا سی کوئی کسر رہ گئی تو کہیں گے ام ہانی کے ماں باپ زندہ ہوتے تو یہ کرتے۔۔۔ وہ کرتے

”دنیا کی زبان کون پکڑ سکتا ہے مگر مجھے لوگوں سے زیادہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہونے کی فکر ہے.... میں نے کل وکیل کو بلوایا ہے ام ہانی کی ساری پراپرٹی اس کے نام باقاعدہ، مستقل کرنے کے لیے....“ میرے کان کھڑے ہوئے۔

”بلکہ میں سوچ رہا ہوں کہ ہم اپنی جانب سے ہی اسے کوئی پراپرٹی گفٹ کریں۔“

شرمندگی کے مارے لقمہ میرے حلق میں پھنس گیا۔

”ضرور کریں.... ہماری اپنی بیٹی ہوتی تو کیا ہم اسے نہ دیتے۔ رضوان آپ کو لوگوں کی پروا ہو نہ ہو.... مگر مجھے ہے۔ میں ڈرتی ہوں جب کوئی ہماری نیت پہ شک کرے یا ہم پہ انگلی اٹھائے۔“

اس سے زیادہ مجھ سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا.... میں کھانا چھوڑ کے وہاں سے اٹھ گیا.... وہ دونوں حیرت سے مجھے جاتا دیکھ رہے تھے۔ شاید پکارا بھی ہو.... مگر

مجھ میں اب اور کچھ سننے کا حوصلہ نہیں تھا میں اندھیرے لان میں آکے بیٹھ گیا۔ جیسے سب سے چھپنا چاہتا ہوں۔ کسی کو نظر نہ آنا چاہتا ہوں۔ مگر اوپر۔۔۔ دور کھلی کھڑکی سے جھانکتی ام ہانی کی نظروں سے کیسے اوجھل رہتا۔

رات بھر اوس میں بھیگنے کے بعد میں برآمدے میں نماز پڑھ رہا تھا۔ جب وہ کانوں کے پیچھے دوپٹا اڑستی وہاں نکلی۔۔۔ دیر تک کھڑی مجھے نماز پڑھتے دیکھتی رہتی۔۔۔ جب میں نے دعا کے بعد ہاتھ چہرے پہ پھیرے تو کہنے لگی۔

"ارے واہ۔۔۔ آج تو بڑے اچھے بچے بنے ہوئے ہو' نماز پڑھی جارہی ہے۔ کیا مانگ رہے تھے؟"

"جس سے مانگا ہے اسے پتا ہے۔"

"تمہیں مسجد جاکے پڑھنی چاہیے تھی نماز۔۔۔"

"مجھے اللہ سے اکیلے میں کچھ بات کرنا تھی۔" میں اٹھ کے اسی سنجیدگی سے جائے نماز تہ کرنے لگا۔

"وہی بات۔۔۔ جو ساری رات باہر اکیلے بیٹھ کر کرتے رہے۔" اس کے سوال پہ میں چونکا۔ پھر رخ بدل کے ٹال گیا۔ مگر وہ ٹلنے والی تھی۔

"بتاتے کیوں نہیں کہ ہوا کیا ہے؟"

"نہ کچھ ہوا ہے۔۔۔ نہ میں ہونے دوں گا' سمجھیں۔"

تلخ لہجے میں اسے جھاڑ کے میں اندر چلا گیا اور کل کی طرح کمرے میں بند ہو گیا۔ اس وقت تک جب تک مجھے سالار کی اماں کے آنے کی اطلاع نہیں مل گئی۔

☼ ☼ ☼

"بغیر اطلاع کے آنے کے لیے معذرت چاہتی ہوں۔" ایک شرمندگی خجالت اور الجھن کے ساتھ ساتھ ان کے چہرے پہ ایک تذبذب بھی تھا' جیسے وہ ابھی تک شش و پنج کے عالم میں ہوں کہ انہیں یہ بات کہنی چاہیے کہ نہیں۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔۔۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔"

امی کھٹک تو گئی ہوں گی ان کے انداز سے مگر ظاہر نہ ہونے دیا۔ البتہ ابو نے فوراً" اظہار کر دیا۔

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو آپ کچھ پریشان ہیں۔"

"پریشان تو نہیں البتہ۔۔۔ میں یہ سوچ کے ہچکچا ضرور رہی ہوں کہ آپ میری بات کا غلط مطلب نہ نکالیں۔"

"آپ کھل کے بات کریں۔" امی۔۔۔ ابو۔۔۔ پھوپھو' تینوں سنبھل گئے۔

"ام ہانی آپ کی بیٹی ہے مگر اب ہمارا بھی اس سے ایک رشتہ جڑنے جارہا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں یہ حق ہے کہ اس کے معاملات میں۔۔۔ اس کی بھلائی کی خاطر۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔" وہ رک رک گئیں۔

"دیکھیں روپیہ' پیسہ' جائیداد یہ سب بہت بد لحاظ چیزیں ہیں محبتوں اور رشتوں میں دراڑ پیدا ہو جاتی ہے ان سے۔ اگر بروقت ان کے بارے میں فیصلہ نہ کر لیا جائے۔" امی اور ابو دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے۔

"میں سمجھا نہیں آپ کی بات۔" انہوں نے وضاحت چاہی۔

"ام ہانی کو اپنے والدین سے ورثے میں جو بھی ملا ہے" آپ لوگوں نے بہت ایمانداری اور خلوص سے اب تک اسے سنبھالا ہے مگر اب وقت آگیا ہے کہ اس کی امانت اسے سونپی جائے۔"

امی ابو تو یقیناً" ایک سناٹے میں آگئے تھے۔ مگر پھوپھو نے واویلا مچا دیا۔

"ہائے اللہ۔۔۔ تو آپ کے کہنے کا مطلب ہے شادی سے پہلے ہانی کی ساری جائیداد آپ کے حوالے کر دی جائے۔۔۔ غضب خدا کا۔" پھوپھو کی آواز باہر مجھ تک با آسانی آرہی تھی۔ اور میں دعائیں کر رہا تھا کہ اونٹ اسی کروٹ بیٹھے جس کروٹ میں چاہتا تھا۔

"نہیں نہیں۔۔۔ ہمارے حوالے کیوں خدانا خواستہ۔۔۔ ام ہانی کی چیز ہے اس کے حوالے کریں۔" وہ گڑبڑا

کے وضاحت دینے لگیں۔

"ایک ہی بات ہوئی۔۔۔ لے کر تو وہ آپ کے گھر آئے گی۔ اتنا اتاؤلا پن۔۔۔ ہم کونسا کھا جانے والے تھے اس کا حق۔"

"مہ پارہ۔۔۔ خاموش رہو۔" ابو کے ڈپٹ کے چپ کرانے پہ بھی وہ تلملاتی رہیں۔

"بھائی صاحب۔۔۔ اچھا ہوا ان کی نیت وقت پہ سامنے۔۔۔"

"میں نے کہا ناں مہ پارہ۔۔۔ خاموش۔" اور پھر واقعی ایک خاموشی چھا گئی۔ اندر جانے کی میری ہمت نہیں ہو رہی تھی اور اب باہر تک کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں بے چینی سے پیتی گھاس پہ ٹہل رہا تھا۔ اندر سے سالار کی اماں کو نکلتے دیکھ کر میں اوٹ میں ہو گیا۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے اندر کے ماحول کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔۔۔ مگر دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے انہوں نے چادر آگے تک کھینچ رکھی تھی۔ لاچار مجھے ان کی گاڑی گیٹ سے نکلتے ہی اندر آنا پڑا تاکہ صحیح صورت حال جان سکوں' امی ابو اس سکتے اور افسوس کے سے عالم میں تھے جبکہ پھوپھو بھڑاس نکال رہی تھیں۔

"کمال ہے۔۔۔ اتنی بڑی بات پی گئے آپ لوگ۔۔۔ اور انہیں کورا سا جواب دینے یا آئینہ دکھانے کی بجائے تسلی دے کر روانہ کر دیا۔"

"شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے اور وہ بھی بیس دن بعد کی۔ ایسے میں کسی قسم کی بدمزگی کا مطلب جانتی ہو تم۔۔۔ مہ پارہ؟"

"اور جو انہوں نے کہا اس کا مطلب جانتے ہیں آپ۔۔۔ ان کی نظر ہانی کی دولت اور جائیداد پہ ہے۔۔۔ ارے کیسے خاندانی لوگ ہیں یہ' انہوں نے تو اتنا ہلکا پن دکھلا دیا۔ ابھی سے یہ حال ہے تو بعد میں کیا کریں گے۔"

"لیکن یہ بھی تو دیکھو مہ پارہ۔ ہانی کا جو ہے اسے ہی دینا ہے۔" امی کی بات کو پھوپھو نے مکھی کی طرح ہوا میں اڑا دیا۔

"ہاں۔۔۔ مگر کوئی اپنے منہ سے تو نہیں مانگتا۔ ابھی بھی وقت ہے سوچ لیں۔"

"نہیں اب بالکل بھی وقت نہیں ہے۔" ابو نے قطعی لہجے میں کہا اور میں آگے بڑھتا بڑھتا رک گیا۔ یہی خطرہ تھا مجھے۔۔۔ اور وہ بھی ابو کی جانب سے ہی۔

"دنیا کو کیا کہیں گے ہم کہ انہوں نے ہانی کی جائیداد اس کے نام کرنے کا کہا تو ہم نے رشتہ توڑ دیا تاکہ لوگ سمجھیں ہم واقعی ایسا نہیں کرنا چاہتے اور کیا گارنٹی ہے اس بات کی کہ جو بھی دوسرا رشتہ آیا وہ ہر طرح کے لالچ سے مبرا ہو گا۔"

میں مدد طلب نظروں سے پھوپھو کو دیکھنے لگا۔ ان کا ہی آسرا تھا۔ امی تو اپنے سرتاج کی زبان بول رہی تھیں۔

"بیٹی کا رشتہ تو ایک رسک ہی ہوتا ہے۔ لینا پڑتا ہے' آگے ہماری دعائیں اور اس کا مقدر بس تم سے ایک درخواست ہے بلکہ ہاتھ جوڑتی ہوں کہ دادا جی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ ان کی ضد کے آگے ہم کچھ نہیں کر پائیں گے۔ وہ اس عمر میں ہیں کہ زیادہ سوچ بچار نہیں کر سکتے۔ بس جذباتی فیصلہ صادر کر دیں گے فوراً"۔ تم اپنا حال دیکھو' ان کی ضد کی وجہ سے تم بیٹھی رہ گئیں کسی کا کیا گیا۔" ہمیشہ کی طرح اس آخری بات نے پھوپھو کی زبان بند کر دی۔

"بلکہ ام ہانی سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے بچی کا دل برا ہو گا۔"

میں پیر پٹختا اپنے کمرے میں جانے لگا۔ تیسرا دن تھا' مجھے کمرے میں خود کو سارا دن بند کیے۔۔۔ سب کے دل میں الٹے سیدھے وسوسے تو آنے ہی تھے۔ مگر آج امی ابو اور پھوپھو کے دل میں پہلے سے اتنے وسوسے تھے کہ انہیں فرصت ہی نہ ملی' میرے تیور پہ غور کرنے کی۔ ایک ہنی تھی جو وقفے وقفے سے آ کے دستک دیتی اور پکارتی اور پھر مایوس ہو کے لوٹ جاتی تھی۔ رات گئے مجھے بھوک نے ستایا تو میں دبے پاؤں نکلا اور ہال کے اندھیرے کونے سے گزرتے گزرتے امی ابو کی آواز سن کے رک گیا۔

"یہ دنیا ہے رضوان' یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔" امی کی آواز میں افسوس تھا۔ دکھ تھا بے یقینی تھی۔

"مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا لگ رہا ہے نائلہ۔" اور ابوان کی آواز میں تو اتنا کرب تھا کہ میں لرز کے رہ گیا۔

"میری نیت اور خلوص پہ شبہ کیا گیا ہے نائلہ۔۔۔ اور وہ بھی بیٹی کے معاملے میں کیا میں اتنا کم ظرف ہوں کہ اپنی ہی بچی کے ساتھ۔۔۔"

"دل پہ نہ لیں رضوان۔ خدا جانتا ہے آپ کی نیک نیتی کو۔"

"ہاں۔۔۔ مگر میں نے خود کو آج سے پہلے کبھی کمزور اور بے بس محسوس نہیں کیا ٹوٹ گیا ہوں اندر سے۔"

ان کی بات پہ میں نے اپنے اندر بھی کچھ ترخ سے ٹوٹتے محسوس کیا۔۔۔ کچن تک جاتے قدم واپس موڑ کے میں لان میں چلا آیا۔ کمرے میں جاتا تو شاید گھٹن سے دم نکل جاتا میرا۔

"ابو آئم سوری' آئم سوری ابو۔" آنسوؤں میں بھیگی آنکھیں بند کیے میں نے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا۔

"کیا کیا ہے تم نے سعد۔"

پتا ہی نہیں چلا۔ کب بنی میرے ساتھ آکے بیٹھ گئی تھی' میں نے گردن موڑ کے دیکھا اور اس کی چبھتی نظروں سے بچنے کے لیے رخ پھیر لیا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی نہیں میں نے کیا کرنا ہے۔"

"جھوٹ مت بولو۔" وہ رعب سے مجھے لتاڑ رہے گئی۔

"میں تمہارے سب انداز پہچانتی ہوں سعد۔"

"بکواس' تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتیں' نہ جاننے کی اہلیت ہے تم میں۔"

"کچھ تو کیا ہے تم نے۔۔۔ جسے چھپا بھی رہے ہو اور اس پہ پچھتا بھی رہے ہو۔۔۔ کہہ دو گے تو دل ہلکا ہو جائے گا۔"

"نہیں بتاؤں گا۔" میں نے روٹھی نظروں سے اسے گھورا اور اس نے غصہ سے۔

"سعد۔۔۔ بتاتے ہو یا لگاؤں ایک؟"

"میری دادی بننے کی کوشش نہ کرو۔۔۔ میں تمہارا اسٹوڈنٹ نہیں ہوں۔"

"دوست تو ہو۔۔۔" وہ مسکرا دی۔

"اور میں جانتی ہوں۔ بے وقوفی اور جلد بازی میں تم بہت سی الٹی سیدھی حرکتیں کر جاتے ہو اور پھر نادم بھی ہوتے ہو۔ سچ سچ بتاؤ۔۔۔ کیا رزلٹ اچھا نہیں آیا۔ چھپایا ہے تم نے؟"

اس نے بڑی ہمدردی سے میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھا۔۔۔ مگر میں اس کے الٹے سیدھے اندازوں پہ چڑا بیٹھا تھا۔ ہاتھ جھٹک دیا۔

"سعد مجھے بتا دو گے تو میں تمہیں ڈانٹ سے بچالوں گی۔"

"کیوں؟ تم گاڈ فادر ہو میری۔۔۔ میری گارجین ہو؟" میرے دھاڑنے پہ اس کی آنکھوں میں دہشت سی بھر گئی۔

☆ ☆ ☆

"میں۔۔۔ مگر میں کیوں؟" سالار ریسیور کان سے لگائے حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

"اگر آپ نے اپنے لائر کو بلایا ہے اپنے ایک ضروری کام سے تو میرا ہونا کیوں ضروری ہے۔"

اس کے استفسار پہ رضوان کو اسے ساری بات تفصیل سے بتانا ہی پڑی۔ دوسری جانب ایک گہری خاموشی تھی اور پھر کھٹ سے فون بند۔ انہوں نے فون رکھتے ہوئے ایک سانس بھر کے کہا۔

"سالار کو بھی بلالیا ہے میں نے' یہ قدم اٹھانا تو ہے ہی۔ مگر وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کے کہنے پہ کر رہا ہوں' وکیل کے سامنے ان کے علم میں آجانا چاہیے کہ میں تقریباً سب کارروائی پہلے سے کر چکا ہوں۔"

"صحیح کہا آپ نے۔۔۔ انہیں یہ بھی پتا ہونا چاہیے کہ ہم نے تو اپنی پراپرٹی میں سے بھی ام ہانی کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔" اتنے میں سالار کو آتے دیکھ کے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"السلام علیکم۔" تیور کی طرح اس کا لہجہ بھی خشک اور سرد تھا۔

"آؤ بیٹا۔۔۔ میں تمہارا ہی ویٹ کر رہا تھا۔۔۔ اعظمی صاحب بھی آنے ہی والے ہوں گے۔۔۔ بیٹھو۔"

"میں بیٹھنے نہیں آیا اور آپ اپنے وکیل کو بھی آنے سے منع کر دیں تو بہتر ہے۔ بلاوجہ آپ کا اور ان کا وقت ضائع ہو گا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں کسی قسم کی وضاحت نہیں دوں گا کہ اماں نے یہ بات آپ سے کیوں کی۔۔۔ کیا مقصد تھا ان کا۔۔۔ مگر میں اپنی بات کہوں گا میں سالار اعظم اس بات سے انکار کرتا ہوں اگر ام ہانی میری زندگی اور میرے گھر میں آئے گی تو اپنے والد کا تمام ترکہ اس حویلی میں چھوڑ کے آنا ہو گا۔" اس کے لہجے میں پتھریلی سی جنونیت تھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو سالار۔۔۔ تم بیٹھو تو سہی۔ آرام سے بات کرتے ہیں۔ ابھی تم جذباتی ہو رہے ہو۔"

"میں جذبات کو کبھی ساتھ لے کر نہیں چلتا۔ جذباتی فیصلے ناپائیدار ہوتے ہیں اور میرا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ اگر ہانی کو یہ جائیداد عزیز ہے تو اسے میری امید ترک کرنا ہو گی۔" اس نے فیصلہ کن نظروں سے سامنے ہکا بکا کھڑی ام ہانی کو دیکھا۔

"یہ کوئی ایشو نہیں ہے بیٹا۔ جس پہ تم بگڑ گئے۔۔۔ یہ ام ہانی کا حق ہے۔ جو اسے کل یا آج ملنا ہی ہے۔"

"کیا آپ کو لگتا ہے میں اس کے کسی بھی حق کو ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں؟" اس نے پلٹ کے سوال کیا۔

"ایسا نہیں ہے۔۔۔ مگر۔۔۔"

"یا ام ہانی کو اندیشہ ہے کہ میں اس کی ذمہ داری ٹھیک سے نبھا نہیں سکوں گا اس لیے وہ جائیداد کی بیساکھیاں لے کر آنا چاہتی ہے۔"

"سالار تم بات کو الجھا رہے ہو بیٹا۔"

"نہیں میں وہ مسئلہ سلجھا رہا ہوں جو اماں نے الجھا دیا تھا۔ یہ تو طے ہے کہ ام ہانی میرے گھر خالی ہاتھ آئے گی۔ رہا اس کا حق تو آپ اسے وہ تب دیجیے گا جب میں نہ رہوں۔ کم از کم میری زندگی میں یہ ممکن نہیں۔"

"سالار۔۔۔" ام ہانی تڑپ اٹھی تھی۔

اور پھر رضوان اور نائلہ کو دیکھتے ہوئے نظر جھکا کے بولی۔

"اس جائیداد اور دولت کی ضرورت مجھ سے زیادہ ہمارے ٹرسٹ اسکول اور اسپتال کو ہے۔ میں اسے وہاں دینا پسند کروں گی۔" سالار کے ہونٹوں پہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ آگئی۔

"سن لیا آپ نے اس کا فیصلہ۔"

"اب ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔" نائلہ نے بے بسی سے کہا۔

"شکریہ۔" وہ جانے کے لیے مڑا۔ اور پھر رک کر دوبارہ کہنے لگا۔

"ایک اور بات۔۔۔ میں چاہتا ہوں شادی تین ہفتے بعد کے بجائے اگلے ہی جمعے کو ہو۔"

"کیا۔۔۔ مگر اتنی جلدی؟ صرف پانچ دن ہیں درمیان میں۔"

"کچھ مسئلہ نہیں ہے۔ میں ویسے بھی سادگی کا قائل ہوں اور شادی تو ہے ہی ایک پرسنل معاملہ اس میں سینکڑوں افراد کو شامل کرنا ضروری نہیں ہے۔ اگلے جمعے میں نکاح کے لیے چند قریبی لوگوں کے ساتھ حاضر ہو جاؤں گا۔" وہ حتمی انداز میں کہہ کر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

میں مسجد سے بھاگا آ رہا تھا سالار کے آنے کا سنتے ہی مگر حویلی کے گیٹ پہ ہی اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔۔۔ چند لمحے کے لیے ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل سرد نگاہوں کا تبادلہ کرتے رہے اس وقت کوئی پاس تو تھا نہیں جو میں مروت کے مارے اس کا لحاظ کرتے ہوئے سلام دعا ہی کر لیتا۔ میری نظروں میں اس کے لیے جو بھی تھا وہ یقیناً "خوشگوار" نہیں ہو گا مگر اس کی نظروں میں میرے لیے۔ جو حسد، رقابت اور جھلسا دینے والی کیفیت تھی اس کی وجہ جاننے سے میں قاصر تھا۔

پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گیٹ کے اس طرف کھڑی اپنی سرکاری گاڑی کی جانب بڑھا اور میں اندر۔۔۔
"کوئی تک ہے بھلا۔"
اندر مہ پارہ پھوپھو جلی بیٹھی تھیں اور امی پریشان۔
"صرف پانچ دن ہیں جمعے میں اتنی جلدی شادی کی تیاریاں سالار نے بھی حد کر دی۔" اور میرے قدم وہیں ساکت ہو گئے۔
"بھابھی آپ لوگ بھی تو اس کے سامنے ایسے بے بس ہو کر ہتھیار ڈال دیتے ہیں کہہ دیتے کہ شادی مقررہ تاریخ کو ہو گی۔"
"بھئی میں ان معاملات میں بالکل کورا ہوں۔۔۔ پہلی بار ایسا فرض نبھانا پڑ رہا ہے۔"
ابو جھنجلا اٹھے۔
"ڈرتا ہوں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ ہو جائے اور کوئی اونچ نیچ۔۔۔ میں یہ تاثر کیسے دوں کہ ہم اتنے گئے گزرے ہیں کہ ایک ہفتے میں شادی کے انتظامات تک نہیں کر سکتے۔"
"مگر میں اکیلی۔۔۔ یہ سب ہو گا کیسے؟"
امی کی پریشانی میں ڈوبی آواز بہت دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ میں بے جان قدم گھسیٹتا اپنے کمرے کی جانب جانے لگا۔
"واہ بھابھی۔۔۔ کیسے خود کو اکیلی کہہ کر مجھے کنارے سے لگا دیا۔ جیسے میں تو کچھ ہوں ہی نہیں۔"
"چلو تم دونوں اصل مسئلے کو چھوڑ کے اب اپنی بحث شروع کر دو۔" ابو نے دونوں کو ڈپٹ کے چپ کرایا تھا اور شاید۔۔۔ شاید مجھے پکارا بھی تھا مگر میرے کمرے کا دروازہ ایک بار پھر بند ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اماں پہ گھبراہٹ اور خوف دونوں طاری تھے۔ سالار تھا ہی اتنا غصے میں۔
"آپ نے زندگی کے ہر موڑ۔۔۔ ہر قدم پہ مجھے مایوس اور شرمندہ ہی کیا ہے۔"
"سالار۔۔۔ میں نے۔۔۔ میری نیت تو صرف اتنی تھی کہ۔۔۔" انہوں نے کہنا چاہا مگر سالار نے بات کاٹ دی۔
"بس۔۔۔ کچھ نہ کہیں۔۔۔ میں سب جانتا ہوں آپ نے یہ سب کس لیے کیا۔۔۔ آپ چاہتی تھیں اس کے آنے سے پہلے ہی اس کے قدم جمے ہوں۔۔۔ آپ خود کبھی مجھ پہ حاوی نہ ہو سکیں۔ اس کے بدلے اسے مجھ پہ حاوی دیکھنا چاہتی ہیں۔"
"سالار۔۔۔" وہ اس درجہ بدگمانی پہ دنگ رہ گئیں۔
"میں ماں ہوں تمہاری۔۔۔ میں ایسا کیوں چاہوں گی بھلا۔"
"آپ نے آج تک جو بھی کیا ہے۔ کیا اس کی کوئی وجہ ہے آپ کے پاس؟" اور غصے میں ٹیبل کو ٹھوکر مارتا آگے بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

مجھے شعیب کے علاوہ کون ملتا جس کے سامنے میں اپنی حالت بیان کرتا۔
"شعیب جو کرتا ہوں الٹا ہو جاتا ہے ایسا لگتا ہے قسمت کے ہر چکر میں بس میں لپیٹا جا رہا ہوں۔ جتنا سالار سے اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تقدیر ان کو اور بھی پاس لے آتی ہے۔ اب تو مجھے اپنی دعاؤں پہ بھی بھروسا نہیں رہا شعیب۔"
شعیب نے جواب میں کچھ کہا تھا۔ مگر اس کی آواز باہر سے آتی ڈھولک کی تھاپ اور گیتوں کی آواز میں دب گئی۔
"یہ پیلا جوڑا۔۔۔ یہ ہری ہری چوڑیاں۔" میرے ہاتھ مردہ سے ہو گئے۔ اور فون پھسل کے گود میں آ گرا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا ہنگامہ ہے بھئی۔"
مہ پارہ جوڑے میں بال لپیٹتی ہال میں نکلی۔ جہاں حویلی کی سب ملازمائیں سلمیٰ کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھیں گیت الاپ رہی تھیں اور سلمیٰ کے سانولے ہاتھ دھپا دھپ ڈھولک۔ پڑ رہے تھے۔

"سوچا تھا... شادی سے ہفتہ پہلے ڈھولک رکھوں گی۔ اب اتنے دن رہے نہیں تو سلمیٰ کو بٹھا دیا ڈھولک پہ... کل سے بلواتی ہوں۔ آس پڑوس اور برادری کی بچیوں کو... سب رشتے داروں کو اب فون پر ہی مدعو کرنا پڑے گا... خود جا کے کیسے دعوت دیں اور بہت سے کام بھی تو ہیں۔"

"ہونہہ... یہ سوچیں رشتے داروں کو وجہ کیا بتائیں گے اتنی آنا" فانا "شادی کی؟"

مہ پارہ نے نائلہ کے اطمینان کو فکر میں جھونکنا چاہا۔

"یہ کام رضوان کے سپرد۔ اور تو رک کیوں گئی سلمیٰ بجا... اور جا کے اور بھی لڑکیوں کو بلا کے لاؤ شادی والا گھر ہے پتا چلنا چاہیے۔"

"بابل تیرے محلاں دے رنگلے بوہے۔"

سلمیٰ کی چنچل آواز مہ پارہ کو اداس کر گئی۔ اس نے جوڑے میں سے باہر نکلی لٹ کو پیچھے اڑسا... جس میں بہت سے سفید بال اب صاف جھلکنے لگے تھے' وہ بوجھل قدموں سے پلٹنے لگی۔

بابل تیرے محلاں دے رنگلے بوہے...
تے وچوں میری ڈولی لنگھی
"ساڈا چڑیاں دا چنبا اے...
بابل اساں... اڑ جانا۔

سلمیٰ کی کراری آواز کانوں کے پردے چیرے دے رہی تھی۔ ام ہانی کے کمرے کے کھلے دروازے کے پاس رک کر میں نے دیکھا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ اپنی چوڑیوں سے کھیلتی... ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے... میرے قدم بے اختیار اس کی جانب بڑھے اور دروازہ بند ہونے پہ سلمیٰ کی آواز اور ڈھولک کی تھاپ مدھم ہوئی تو وہ چونک کر مڑی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے کی خوشی دگنی ہو گئی۔

"نکل آئے ناں تم کمرے سے... میں جانتی تھی اب تمہاری خفگی زیادہ دیر چل ہی نہیں سکے گی۔" میں کھنچتا چلا گیا اس کی جانب۔

"دیکھو ناں... سعد میرے ہاتھوں میں یہ چوڑیاں کیسی لگ رہی ہیں۔" اس نے کلائی میرے سامنے لہرائی۔

"زہر لگ رہی ہیں۔" میں نے دل کی بات کہی... سچی بات۔

"تم بہت برے ہو۔" وہ پھر سے خفا ہو گئی۔

"مجھے پتا ہی نہیں تھا ہنی کہ میں تمہیں اتنا برا لگتا ہوں۔" میرے لہجے میں درد تھا اور وہ میرے ہر درد کو محسوس کرنے والی جانے کب سے اتنی بے حس ہو گئی تھی۔

"لگتے نہیں تھے... اب بھی نہیں لگتے... مگر تم ہو گئے ہو برے۔ کیوں کر رہے ہو تم ایسا؟ کیوں اکھڑے اکھڑے کٹے کٹے اور کترائے کترائے رہتے ہو... ملتے بھی ہو تو جلی کٹی باتیں کرتے ہو۔ پتا ہے' تمہاری ان حرکتوں کی وجہ سے میں اپنی زندگی کی اتنی بڑی خوشی کو ٹھیک سے محسوس بھی نہیں کر پا رہی۔"

"تم اس لیے اس خوشی کو محسوس نہیں کر پا رہی تھیں... کیونکہ تم خوش ہو ہی نہیں۔"

"میں خوش کیوں نہیں ہوں گی' یہ شادی میری مرضی سے ہو رہی ہے۔"

"لیکن میری مرضی تو نہیں ہے ناں اس میں اور تمہیں تو عادت ہے میرے ساتھ رونے کی' میرے ساتھ ہنسنے کی تو جب میں خوش نہیں ہوں تو تم خوش کیسے ہو سکتی ہو۔"

"یہ تو میں بھی تم سے پوچھ سکتی ہوں کہ تم خوش کیوں نہیں ہو۔ کیسے دوست ہو تم۔" وہ بگڑ گئی میرے سچ پہ۔

"بولو ناں... ایسے کرتے ہیں دوست؟ ایسے ہوتے ہیں۔"

"میں اس لیے خوش نہیں ہوں کیونکہ... کیونکہ میں دوست نہیں ہوں ہنی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی... بے یقینی تھی۔

بابل اساں اڑ جانا...
ساڈا چڑیاں دا چنبا...

ہم دونوں کے خاموش ہونے پہ سلمیٰ کی گراری آواز پھر سے ماحول پہ حاوی ہونے لگی۔ ہنی کو نجانے کیا ہوا۔ مجھے دیکھتے دیکھتے وہ اچانک گھبرا کے مجھ سے کترا کے وہاں سے جانے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور باقاعدہ گڑگڑا ہی اٹھا۔

"ہنی۔۔۔ مت کرو ایسا۔۔۔ نہ کرو یہ شادی۔"

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟" وہ وحشت زدہ سی ہو کے اپنا ہاتھ چھڑا رہی تھی۔

"ہو جاؤں گا۔۔۔ بہت جلد لیکن بچ بھی سکتا ہوں۔ اگر تم چاہو۔"

"تمہارا تو پتا نہیں۔۔۔ مگر تمہاری ان الٹی سیدھی باتوں سے میں ضرور پاگل ہو جاؤں گی۔"

آخر اس نے غصے سے اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑا لیا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔۔۔ دروازہ پھر سے کھلا رہ گیا۔۔۔ اور سکوت پہ سلمیٰ کی آواز راج کر رہی تھی۔

ساڈی لمبی اڈاری اے ۔۔۔
اساں ہن نئیں آنا ۔۔۔

☼ ☼ ☼

"یہ والا سچے تلے کا ہے۔۔۔ سونے کے تار سے گندھا۔۔۔ اب کہاں ہوتا ہے ایسا کام۔۔۔ دیکھو تو۔"

ام ہانی کا دھیان کسی جانب جا ہی نہیں رہا تھا۔ سوائے اس پہیلی کے جو اس کے دل و دماغ میں کھلبلی مچا رہی تھی۔ وہ کسی کی سن کے بھی نہ سن پا رہی تھی۔

"اماں جان نے یعنی تمہاری دادی نے بڑے چاؤ سے بنوا کے رکھا تھا یہ 'حویلی کی بیٹی کے لیے ایسا ہی جوڑا بنتا ہے ہمیشہ۔ مہ پارہ کے نصیب میں تو تھا نہیں۔۔۔ اب میں اسے تمہارے ناپ کا بنوا دیتی ہوں۔" وہ اسی بے دھیانی میں ہلکے سے اس دوپٹے کو چھو کر رہ گئی۔

"کیا ہوا ہانی 'مہ پارہ نے تو دل جلانے والی کوئی بات نہیں کر دی؟ اسے بھی ذرا لحاظ نہیں کہ تم چند دن کی مہمان ہو۔"

"نہیں تائی اماں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔"

وہ سنبھل سی گئی۔ ویسے بھی صبح سے گھر میں مہمانوں کی آمد جاری تھی۔ دور پرے کے قریبی سب عزیز و اقارب کی سواریاں وقفے وقفے سے اتر رہی تھیں۔ ایسے میں اس کے کھوئے کھوئے انداز کو کوئی بھی کسی بھی رنگ میں لے سکتا تھا۔ اور پھر سب سے بڑھ کے خالہ بتول۔۔۔ جو رشتے میں تو دادی لگتی تھیں۔ مگر پچھلی نسل کی دیکھا دیکھی 'یہ نسل بھی ان کو خالہ کہتی تھی اور تو اور ان کا سگا پوتا علی بھی۔۔۔ ان کی تو ویسے بھی سب پہ نظر ہوتی تھی۔۔۔ کل سے دس بار تو مہ پارہ پھوپھو کو کچوکے دے چکی تھیں کہ سگی بھتیجی کی شادی پہ منہ پھلائے پھر رہی ہے اور۔۔۔ وہ بیلی۔۔۔ نیاز ماموں کی اکلوتی پٹاخا کتنی عادت ہے اسے سوال کرنے کی۔۔۔ یہ کیا؟ وہ کیوں؟ تو۔۔۔

"اچھا۔۔۔ اب یہ زیور بھی دیکھ لو۔"

"اوفوہ۔۔۔ یہ تو بہت بھاری ہے تائی اماں۔"

"ہاں۔۔۔ اب سب تمہاری پسند کے ہلکے پھلکے تو نہیں رکھنے۔" میں نے سیڑھیاں اترتے ہوئے بے زاری سے ہال کے پھیلاوے پہ نظر دوڑائی۔ جسے شاید وہ سب رونق اور ہنگامے کا نام دے رہے تھے۔

"سعد۔۔۔ باہر مت نکلنا۔"

امی نے زیورات کے ڈبے جلدی سے بند کرتے ہوئے مجھے پکارا۔

"اڑے اڑے پھرتے ہو سارا دن۔۔۔ یہ نہیں کہ پوچھ ہی لو کہ کوئی کام ہے؟"

"جی۔۔۔ کوئی کام ہے؟"

میں نے مارے باندھے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔۔۔ ایک ناراض سی نظر ہنی پہ ڈالی۔۔۔ اس کی نظر میں مجھ سے زیادہ ناراضی تھی۔

"بالکل ہے۔۔۔ تم نے اپنے ابو اور نیاز ماموں کے ساتھ سالار کے ہاں جانا ہے۔"

مجھے تو آگ ہی لگ گئی سن کر۔

"کس خوشی میں؟"

"سالار کا ناپ لینے۔"

"کس چیز کا ناپ 'چوڑیوں کا؟"

میں مزید تپ کے بولا تو جہاں ہانی نے نظروں سے

آگ برسائی وہاں امی نے بھی دھپ لگا دی۔

"چپ' بدتمیز شیروانی کا ناپ لینے اور یہ تو رسم ہے کہ اس کے لیے گھر کے سب مرد جاتے ہیں۔"

"تو سمجھیں میں مرد ہی نہیں ہوں۔"

جز بز ہو کے میں نے انتہائی بے تکی بات کر ڈالی جس پہ ام ہانی باوجود خفگی کے بے ساختہ ہنس پڑی۔۔۔ میں نے فوراً" اس کے چہرے سے نظر ہٹائی' کہیں یہ ہنسی میرا غصہ نہ کم کردے۔

"میرا مطلب ہے میں نہیں جا سکتا ایسی بے کار سڑی ہوئی رسموں کے لیے آپ اندازے سے لے لیں۔ ایکسٹرا لارج۔"

چبا چبا کے میں نے جتایا۔ وہ ہنستے ہنستے پھر گھورنے لگی۔ خالہ بتول کا چہیتا بلو نگڑا علی فوراً" نمبر بڑھانے لپکا۔ یہ بچپن کی عادت تھی اس کی۔۔۔ خبیث۔

"آپ فکر نہ کریں آنٹی۔۔۔ میں چلا جاتا ہوں انکل کے ساتھ کوئی اور کام ہے تو بتائیں۔"

"جیتے رہو بیٹا۔۔۔"

"ارے یہ بھی کوئی بات ہے۔"

وہ میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کے خوامخواہ فری ہونے لگا۔ یہ بھی بچپن کی عادت۔۔۔ بلاوجہ چپکو ہونے کی۔

"ویسے بھی سعد کوئی اکلوتا بھائی تو ہے نہیں ہانی آپی کا۔۔۔ میں بھی تو ہوں۔"

اس بری طرح اس کا ہاتھ میں نے اپنے کاندھے سے جھٹک کے اسے پرے دھکیلا کہ امی ہائیں۔۔۔ ہائیں کرتی رہ گئیں۔

میرا سب تلملانا۔۔۔ سارا احتجاج بے کار گیا جانا پڑا مجھے ابو اور ماموں کے ساتھ' سالار کا ناپ لینے۔۔۔ اور وہ چپکو علی حسب عادت ساتھ ساتھ چپکا ہوا۔۔۔ کسی کو احساس نہیں ہو رہا تھا کہ میرے دل پہ کیا گزر رہی ہے۔ جیسے جیسے وقت قریب آ رہا تھا میرا دل کٹ رہا تھا اور سب اس کاٹ پیٹ میں اس چیر پھاڑ میں اپنا اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی ڈیڑھ گھنٹے بعد میں سالار کے گھر میں اس کے سامنے تھا۔ نہ صرف ساتھ جانا بلکہ اس کا ناپ لینے کی منحوس ذمے داری بھی مجھے سونپی گئی' علی مزے سے بیٹھا چائے میں بسکٹ بھگو بھگو کے کھا رہا تھا۔ ماموں اور ابو' سالار کی اماں کو بور ترین خاندانی قصے سنا رہے تھے اور سالار۔۔۔ وہ تن کے میرے سامنے کھڑا تھا۔۔۔ دونوں بازو پھیلائے ایسا لگتا تھا جیسے وہ زندگی میں کبھی بھی نہیں مسکرایا تھا اور اگر کبھی مسکرانے کی زحمت کرے گا تو چہرے پہ یہاں سے وہاں شکنیں پھیل جائیں گی۔۔۔ نہیں' بلکہ شکنیں بھی نہیں۔۔۔ دراڑیں جیسے پتھر میں پڑتی ہیں۔

پتھر سے دل لگانا تھا تمہیں ہنی۔۔۔ خود جو پتھر ہو۔

"اب وہ والا بازو بھی آگے کریں سالار صاحب۔"

دل پہ پتھر رکھتے ہوئے میں نے کہا تو ابو نے فوراً" ٹوکا۔

"یہ سالار صاحب کیا ہوتا ہے۔ سالار بھائی کہو۔"

"بلکہ دولہا بھائی۔"

علی نے آٹھواں بسکٹ چائے میں بھگوتے کہا۔

"ابھی بنے کہاں ہیں یہ دولہا۔۔۔ جب بنیں گے تو دیکھیں گے۔" میرے لہجے میں جو چیلنج تھا۔ شاید اسے صرف سالار نے ہی محسوس کیا۔ اس لیے اسی وقت پوچھ بھی لیا۔

"یہ چیلنج ہے۔۔۔ یا وارننگ؟"

میں جواب دینے کے بجائے سرد نگاہ ڈال کے اب اس کی گردن کا ناپ لینے لگا اور جان بوجھ کے گردن کے گرد فیتہ ذرا کس دیا۔ سالار نے میرے ہاتھ اپنی گردن سے ہٹائے۔

"رہنے دو۔۔۔ تمہارے بس کی بات نہیں' بڑا حوصلہ چاہیے اس کے لیے۔"

"ناپ لینے کے لیے؟"

"نہیں میرے گریبان تک ہاتھ ڈالنے کے لیے۔"

اگرچہ بڑا کرارا جواب تھا میرے پاس۔۔۔ پھر بھی ابو کی تنبیہہ بھری نظروں کا لحاظ کرتے میں چپ رہا۔

گھر واپسی پہ میری حاضری ہوئی دربار میں۔۔۔

"بہت بدتمیز۔۔۔ بدلحاظ اور زبان دراز ہو گئے ہو تم

۔۔۔ کتنی بے مقصد بکواس کی تم نے سالار کے سامنے اگر وہ مائنڈ کر جاتا تو؟"
"تو کیا کیوں نہیں؟"
میں نے تڑپ کے کہا۔ جس پہ مزید ڈانٹ پڑی۔
"شٹ اپ۔۔۔ نالائق۔۔۔ مذاق کا کوئی وقت ہوتا ہے اور یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ مذاق کس سے کیا جا رہا ہے۔ وہ ایک سوبر ڈیسنٹ اور سنجیدہ مزاج انسان ہے۔ خبردار جو تم آئندہ اس کے سامنے اوور ہوئے تو۔"

میں سر جھکائے جھاڑ کھاتا رہا۔۔۔ علی نے نمک مرچ لگا کے سارا قصہ سب کے سامنے دہرا دیا تھا۔۔۔ ایسا کیسے ہوتا کہ بنی تک بات نہ پہنچتی۔۔۔ ابو سے جان بچا کر نکلا تو وہ راستہ روکے کھڑی تھی۔
"راستہ دو مجھے۔۔۔"
میں بے رخی سے کہہ رہا تھا۔۔۔ اس کا چہرہ کھلا پڑ رہا تھا۔ ذرا جو اس پہ میری ناراضی اور بے کلی کا اثر ہوا ہو۔ وہ اپنی ہی خوشیوں میں مگن تھی۔۔۔ مسکراہٹ پھوٹی پڑ رہی تھی۔
"اوہو۔۔۔ بڑی بے تابی ہے' لگتا ہے ببلی سے ملنے جا رہے ہو۔۔۔ ببلی۔"
"یہ ببلی کہاں سے آگئی درمیان میں۔"
"تائی امی کہہ رہی تھیں اس دن۔۔۔ کہ تمہاری اور ببلی کی جوڑی۔۔۔"
"بکواس۔" میں دھاڑا۔
"اور اس ببلی کو تو میں جان سے مار دوں گا۔"
"بنو مت اب۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے۔ خود اس پہ مرتے ہو۔"
"اور مجھے لگتا ہے سالار کوئی بڑا ہی چھچھورا انسان ہے جو جس کی کمپنی میں تم بھی ویسی ہی ہو گئی ہو۔"
بس۔۔۔ سالار کا ذکر۔۔۔ وہ بھی اس انداز میں کرنے کی دیر تھی۔۔۔ وہ بھتے سے اکھڑ گئی ساری مسکراہٹیں غائب۔
"کمال ہے۔۔۔ میں تمہاری بلاوجہ کی ناراضی ختم کرنے کے لیے تمہارے آگے پیچھے پھر رہی ہوں اور تم بدتمیزی کر رہے ہو۔۔۔ لڑنا تو مجھے چاہیے تم سے۔۔۔ پتا چل گیا ہے مجھے کہ تم سالار کے گھر میں ان سے بھی خاصی بدتمیزی کر کے آئے ہو۔"
"ہاں تو؟ کر کے آیا ہوں پھر۔"
"شرم کرو۔۔۔ بڑے ہیں وہ تم سے۔"
"پتا ہے۔۔۔ اور صرف مجھ سے ہی نہیں۔ تم سے بھی خاصے بڑے۔۔۔"
"سعد۔۔۔" وہ احتجاجاً چلائی۔
"ہٹو پرے۔" میں بدتمیزی سے اسے سامنے سے ہٹا کے نکل گیا۔
بڑے دادا کے کمرے میں ابو اور ماموں نجانے کیا مذاکرات کر رہے تھے۔ اوہ۔ ہاں۔ علی نے بتایا تو تھا۔
نیاز ماموں بڑے شوقین مزاج انسان تھے۔ ابو کے صرف سالے ہی نہیں۔۔۔ کزن اور بچپن کے دوست بھی تھے اس لیے بنا کسی جھجک کے ان سے فرمائش کر دی تھی۔
"رضوان بھائی۔۔۔ کوئی گانے بجانے کا بھی پروگرام رکھا ہے کہ نہیں؟"
"ہاں ہاں۔۔۔ کیوں نہیں مہندی تو سراسر زنانہ فنکشن ہے۔ ہم یہاں مردانے میں محفل غزل رکھیں گے۔۔۔ اور شادی والے دن بڑے مشہور قوال کو بلایا ہے۔"
"غزل؟۔۔۔ قوال؟" انہوں نے برا سا منہ بنایا۔
"ہاں۔۔۔ سالار کو بھی غزل کا کافی ذوق اور شغف ہے۔"
"رضوان بھائی۔۔۔ کچھ ہمارے ذوق اور پسند کا بھی خیال کر لیں۔" ابو سمجھ گئے کہ ماموں کی نیت کیا ہے۔
"یار۔۔۔ بٹی کا معاملہ ہے۔۔۔ بیٹے کی ہوگی تو سارے چاؤ پورے کر لیں گے۔۔۔ ابھی برا لگتا ہے۔"
"سعد تو ابھی بچہ ہے۔۔۔ اس کی شادی کے وقت ہماری عمر کہاں رہے گی رونق میلے کی۔۔۔ پلیز رضوان بھائی۔"
"یار نیاز۔۔۔ ایک تو تمہاری رنگین مزاجی جوں کی

توں... ٹھیک ہے دادا جی کو منالو۔"
"بھئی... دادا جی کے زمانے سے ہی تو چلا آرہا ہے یہ سب۔ سنا ہے ان کے وقتوں میں تو لکھنؤ اور بنگال سے رقاصائیں آیا کرتی تھیں۔"
اب سارا معاملہ سمجھ آیا۔ یہ دونوں اس وقت اس مشن پہ کام کر رہے تھے۔ میں سیدھا اندر گھسا اور میسنا سا بن کے بڑے دادا کے پیر دبانے لگا۔
"چلو... ہن بکو وی دیو۔"
میرے آنے پہ ابو جزبز ہو کے لحاظ اور شرما شرمی میں چپ کر گئے تھے جس پہ بڑے دادا نے ہنکارا بھرا... نیاز ماموں نے مدعا بیان کیا۔
"بس دادا جی... آپ سے ایک اجازت لینا تھی... خوشی کا موقع ہے... وہ بھی اتنے عرصے بعد کوئی ہلچل کوئی ہنگامہ... کوئی رونق ہونی چاہیے۔"
"ہاں تو ٹھیک ہے کوئی کسر نہ چھوڑو... ایسے عالی شان طریقے سے شادی کرو امانی کی کہ سارا زمانہ یاد کرے۔"
"جی... ضرور، ضرور ان شاء اللہ مگر ہم نہیں... نیاز چاہ رہا تھا کہ کچھ نیا... کچھ الگ ہو۔"
"تے فیر میںوں مار دیو... کڑی دے ویاہ والے دن دادے دے قل رکھ لو... سب توں نئی گل۔"
بڑے دادا سے ہی تو لی تھی میں نے کڑواہٹ۔ ان کی بات پہ میں نے بڑی مشکل سے ہنسی روکی۔
"اللہ نہ کرے دادا جی۔ کیسی بدشگونی کی باتیں کر رہے ہیں۔ خدا آپ کو لمبی عمر دے۔ ہمارا مطلب تو تھا کوئی شغل میلہ کوئی... رونق کوئی ناچ گانا۔"
"ہاں تو میراثنیں بلا لو۔" بڑے دادا کی پیشکش پہ نیاز ماموں منہ بنا کے بڑبڑائے۔
"اوں ہوں... اپنی دفعہ لکھنؤ اور بنگال... ہماری دفعہ میراثنیں۔"
"کوئی اسٹینڈرڈ ہونا چاہیے دادا جی... سنا ہے آپ کے زمانے میں مہندی کی رات مردانے میں محفلیں سجتی تھیں۔"
"اچھا... تے سدھی طراں بول کہ مجرا کرانا ہے۔"
ان کے صاف صاف کہنے پہ ابو میری موجودگی کی وجہ سے ذرا خجل سے ہو گئے... اور مجھے موقع مل گیا۔
"لاحول ولا بڑے دادا... آپ یہ سب ہونے دیں گے؟ یہ سب... یہ تو غیر شرعی اور غیر اسلامی کام ہیں۔"
"تم اتنے شرعی کب سے ہو گئے برخوردار؟" ابو کو میرے دخل اندازی کرنے پہ تاؤ آگیا۔
"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں... ان سب خرافات کی ضرورت کیا ہے۔ سادگی سے بھی تو ہو سکتا ہے سب کچھ... سنت کے مطابق نہ جہیز... نہ دکھاوا... مسجد میں شربت اور چھوہاروں پہ نکاح۔"
"پاگل ہو گئے ہو کیا لوگ کیا کہیں گے؟" ابو میری بے وقت کی راگنی پہ چیں بہ چیں ہوتے گئے۔
"آخر کمشنر آرہا ہے بارات لے کر۔ اسے مسجد میں بٹھا کے چھوہاروں پہ ٹرخا دیں گے تو دنیا کیا سوچے گی حویلی والوں کے بارے میں۔"
"لیجیے بڑے دادا... اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ لوگ، یہ شادی جہیز اور شو شا کے لیے کر رہے ہیں۔ اب آپ خود سوچیں ایسے لوگوں سے رشتہ جوڑنا ٹھیک ہے؟"
"سعد... یہ کیا بدمزگی پھیلا رہے ہو۔" ابو کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔
"چپ کر رضوان... جھڑک نہ میرے سعد شنزادے کو، منڈا بالکل صحیح کہہ رہا ہے... اوئے نیاز رضوان پھڑو قلم، دوات تے کاغذ... لکھو میری وصیت۔"
"وصیت؟" ماموں بھونچکا رہ گئے۔
"آہو... وصیت نکاح مسجد میں ہو گا۔"
"دادا جی۔"
وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور میں زیادہ زور و شور سے ان کے پیر دبانے لگا... ہل ہل کے۔
"آہو... نہ ناچ گانا... نہ شور شرابا... نہ جہیز... نہ مہندی بس شربت تے نکاح... تے چھوہارے یہی ہے میری وصیت۔ ایسے ہی ہونا ہے ویاہ... میرے

سعد کا۔"

انہوں نے بات مکمل کر کے محبت سے مجھے دیکھا تو میں سٹ پٹا گیا۔ میرے ہاتھ ان کی پنڈلی پہ جم گئے۔

"مم... میرا؟"

"آہو... اپنے پڑپوتے کا۔ اپنے ولی عہد کا ویاہ میں ایسے ہی کروں گا جیسے وہ چاہتا ہے۔ چاہے دنیا کچھ بھی سوچے تسی لوگ ابھی کر لو اپنے شوق پورے سجالو مجرے... بس میرے سعد کی شادی برکت والی ہوگی۔ سادگی نال۔"

☼ ☼ ☼

"شکل دیکھنے والی تھی سعد کی... لگتا ہے اسے اندازہ ہو گیا ہے کہ تائی امی کے اور بیلی کے حوالے سے کیا سوچ رہی ہیں۔"

امہانی اپنے کمرے میں سالار سے فون پہ بات کر رہی تھی اور حسب سابق وہ سعد کے ذکر پہ الجھن سی محسوس کر رہا تھا۔

"قسم سے بھاگتا ہے وہ بیلی کو دیکھ کر۔"

"اور بھاگ کر کہاں جاتا ہے؟" سالار کے چبھتے ہوئے سوال کو وہ اپنی سادگی میں محسوس ہی نہ کر سکی اور اپنی دھن میں بولے گئی۔

"ویسے میں سوچ رہی تھی... کیسا لگے گا وہ دولہا بن کے؟"

"تمہیں نہیں لگتا اس وقت تمہیں اپنے ہونے والے دولہا کے بارے میں سوچنا چاہیے۔"

"ہاں... وہ تو ہے... مگر سعد..."

"کیا تمہارے پاس سعد کے علاوہ کوئی بات نہیں ہے کرنے کو۔"

بالا خر وہ تلخ ہو ہی گیا تو امہانی بھی سنبھل گئی۔

"کمال ہے سالار... میں نہیں بتاتی تو بھی آپ گلہ کرتے ہیں۔ بات کرتی ہوں تب بھی غصہ ہوتے ہیں۔ کیا شادی کے بعد بھی آپ یونہی بلاوجہ مجھے ڈانٹا کریں گے۔"

"ہاں... شاید اس سے بھی زیادہ۔" وہ سنجیدہ تھا۔

گھبرانی نے اسے ہلکے پھلکے انداز میں لیا۔

"ارے... آپ مذاق بھی کر لیتے ہیں واہ۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں... ابھی دو تین دن ہیں سوچ لو۔" "اب کے وہ سچ میں رونے والی ہو گئی۔

"پلیز... سالار ایسی باتیں نہ کریں۔ مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔"

"ابھی سے؟ اچھا سنو۔" اس نے فون میں سرگوشی کی۔

"گھبراہٹ حد سے بڑھ جائے تو کیا کرتی ہو؟" وہ چپ رہی تو خود ہی بولا۔

"روتی ہو؟"

"بس کریں ناں سالار... کیوں ڈرا رہے ہیں مجھے یہ کیا مذاق ہے بھلا۔"

دروازے کے قریب آنے پہ مجھے اس کی روہانسی آواز سنائی دی... میں نے دھڑ دھڑ دروازے پہ دستک دی۔

چند لمحے اندر خاموشی رہی تو میں نے بلند آواز میں کہا۔

"میں ہوں... دروازہ کھولو ہنی۔"

چند سیکنڈ بعد وہ بال جوڑے میں لپیٹتی چہرے پہ حیرت لیے دروازہ کھول رہی تھی اس نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر مڑ کے وال کلاک کو... جو رات کے دو بجا رہی تھی۔

"سعد؟"

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ہنی۔"

"ابھی؟ مگر... صبح بات کرتے ہیں سعد... ابھی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"دیر ہوئی نہیں ہے... لیکن اگر... میں نے کچھ نہ کہا تو واقعی بہت دیر ہو جائے گی" "ایسی بھی کیا بات ہے۔"

"تم یہ شادی کیوں کر رہی ہو ہنی؟ کیوں؟ کس لیے؟" میں نے لگی لپٹے بنا... بغیر کسی تمہید کے چھوٹتے ہی کہہ دیا۔

"سعد؟" وہ حیران کم ناراض زیادہ ہوئی۔

"سیریسلی ہنی... ایسا کچھ نہیں ہے اس میں... میں ملا ہوں سالار سے... وہ کتنا بڑا ہے تم سے عمر میں اور بہت ہی سڑیل کھڑوس... ایک بار بھی ہنستے نہیں دیکھا میں نے اسے۔" میں ایک ایک کر کے اس کی خامیاں گنوانے لگا۔

"مجھے ہر وقت ہنسنے والے مرد پسند بھی نہیں ہیں" میں لمحہ بھر کے لیے چپ ہوا... پھر اس کے ہاتھ تھام کے کہا۔

"تو تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"کیا نہیں بتایا؟"

"یہی کہ تمہیں..."

میں رک گیا... سخت بے بسی تھی کیسے سمجھاتا اسے کہ وہ ایک بار کہتی تو میں عمر بھر کے لیے ہنسنا بھول جاتا صرف اس کے لیے۔

"سعد... تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" اس نے اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں سے چھڑائے۔ جس پہ میں بپھر گیا۔

"میرا مسئلہ یہ ہے کہ تم یہ شادی کیوں کر رہی ہو... مت کرو ہنی تم کیسے کر سکتی ہو میرے ساتھ ایسا... سالار کے ساتھ شادی کے بارے میں سوچتے ہوئے تمہیں ایک بار بھی میرا خیال نہیں آیا؟ میرا... میری محبت کا... کبھی سوچا تم نے کہ میں تمہارے بغیر کیا کروں گا؟ کیسے سہ پاؤں گا... کیسے رہ پاؤں گا تمہارے بغیر۔"

وہ حیرت سے میرا چلانا... میری آنکھوں کا ڈبڈبانا دیکھتی رہی۔

"کیوں؟ کس لیے؟ کیا بنے گا میرا؟ کیسے رہوں گا میں تمہارے بغیر تم مجھے چھوڑ کے کیسے..."

میں طیش میں ابل ابل کے چلا رہا تھا کہ ایک دم جھاگ کی طرح ٹھنڈا شانت ہو کے رہ گیا... اس کے دونوں ہاتھ میرے رخساروں پہ ٹھہر گئے تھے... میرا چہرہ ہاتھوں میں لیے وہ اب نم آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"اتنا چاہتے ہو مجھے؟" میں صرف اقرار میں گردن ہلا کے رہ گیا۔

"میں بھی تمہیں بہت پیار کرتی ہوں سعد... بہت زیادہ میں ہوا میں اڑنے لگا... بنا پروں کے...

"مگر جانا تو ہو گا ناں... نہیں رک سکتی۔"

"مگر کیوں..." میں بڑی تکلیف میں کراہا۔

"تم بچے نہیں ہو سعد... جو سمجھ نہ سکو۔ بھلا میں ساری عمر یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔" وہ جھنجلا اٹھی۔

"رہ سکتی ہو اور بچی تم بھی نہیں ہو ہنی۔ جو یہ نہ سمجھ سکو کہ کیسے رہ سکتی ہو۔"

شاید اب کے میرے لہجے میں کچھ تھا' جو وہ چونکی تھی۔ اس کے ہاتھ دھیرے سے میرے چہرے سے پھسل کے نیچے آگرے تھے۔ جو میں نے فوراً" ہی دوبارہ تھام لیے تھے اور اب باقاعدہ گڑگڑا کر اس کی منت کرنے لگا تھا۔

"ہنی... پلیز... پلیز مت کرو تم یہ شادی' وہ شخص بالکل بھی تمہارے قابل نہیں ہے۔ تم جلد بازی میں فیصلہ کر رہی ہو۔ تمہیں اس سے کوئی محبت وحبت نہیں ہے... وہم ہے یہ تمہارا... منع کرو اس شادی سے' وہ جھنجلا اٹھی تھی۔ اور دوبارہ اپنے ہاتھ چھڑا کے دو قدم پیچھے ہٹی۔

"تم پاگل ہو گئے ہو سعد کیوں کر رہے ہو ایسی باتیں

اب میں خود کو مزید سمیٹ کے نہیں رکھ پا رہا تھا... رو اٹھا اس کے سامنے باقاعدہ آنسوؤں سے سسک سسک کے رو پڑا۔

"تمہیں کیوں نہیں سمجھ آتا کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں۔ تم کیوں نہیں سمجھتیں۔"

وہ جو ناراض۔ اکھڑی اکھڑی سی دو قدم پرے ہٹ گئی تھی۔ میرے آنسوؤں پہ تڑپ اٹھی اور فوراً" آگے بڑھ کے میرے آنسو صاف کرتے ہوئے خود بھی رو پڑی۔

"بدھو میں سب سمجھتی ہوں سب پتا ہے مجھے تم کیوں کر رہے ہو ایسا؟"

میں رونا بھول کے اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"تم نہیں چاہتے ناں کہ میں یہاں سے جاؤں تم

سے دور ہو جاؤں مگر سعد 'سالار کے میری زندگی میں آنے کے بعد تمہاری حیثیت تو نہیں بدل جائے گی۔ تم 'تم ہی رہو گے۔ میرے سب سے اچھے دوست۔۔۔ میرے بچپن کے ساتھی۔ پلیز ایسامت کہا کرو۔ سالار کے بارے میں مجھے تکلیف ہوتی ہے میں جانتی ہوں تم اسے اس لیے پسند نہیں کرتے کہ وہ تمہاری دوست کو تم سے دور لے کر جا رہا ہے مگر سعد یقین کرو اس سے شادی کے بعد بھی میں تم سے۔۔۔"

اس نے مجھے مایوسی کے ایسے اندھے کنویں میں گرایا کہ دوبارہ نکلنے کی امید بھی کھو بیٹھا۔

"بس۔۔۔ بس ہنی تمہیں تو واقعی سب پتا ہے۔ تم تو سچ میں میرے دل کے حال سے واقف ہو۔"

روٹھ کے جانے کے لیے مڑا تھا میں۔۔۔ مگر ابھی دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ وہ دوڑ کے لپکی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

"نہ جاؤ سعد۔۔۔ یوں ناراض ہو کے تو نہیں 'مجھے خوشی خوشی وداع کرو۔۔۔ میں تمہیں اداس نہیں کر سکتی۔"

میرے بازو اٹھے اور اس کے گرد مضبوطی سے حائل ہو گئے۔۔۔ میں نے اس کے کاندھے پہ سر رکھا اور سرگوشی کی۔

"اور میں تمہیں جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔"

فضا میں بانسری کی لے گونجی۔۔۔ میں مزید کھو سا گیا۔ اور اس کی کمر کے گرد گرفت اور سخت کر دی۔ جیسے۔۔۔ جیسے اسے سب سے چھپا کے اپنے اندر سمونا چاہتا تھا۔۔۔ مگر میرے لمس میں۔۔۔ میری اسے 'خود میں سمونے کی شدت میں کچھ ایسا تھا کہ وہ کپکپا سی گئی۔۔۔ میں نے اس کی کپکپاہٹ اور تیز ہوتی دھڑکن کی گھبراہٹ کو اپنے ہر مسام میں پھوٹتے محسوس کیا۔۔۔ اگلے ہی لمحے وہ تڑپ کے مجھ سے الگ ہو چکی تھی۔ میں نے پھر سے اسے خود کے قریب کرنا چاہا۔ تو اس نے وحشت بھرے انداز میں میرے ہاتھ جھٹکے اور پرے ہٹ گئی۔

میں کسی خواب کے ٹوٹنے کے عالم میں اسے بے خود ہو کے دیکھ رہا تھا اور وہ۔۔۔ وہ ہراساں جیسے کسی ڈراؤنے خواب کے زیر اثر ہو۔ اچانک وہ پھر سے آگے بڑھی اور پوری قوت کے ساتھ مجھے ادھ کھلے دروازے سے باہر دھکیلنے لگی۔۔۔ میں اس وقت روئی کے ایک معمولی ذرے سے بھی کم وزن تھا۔۔۔ مزاحمت تک نہ کر پایا۔۔۔ اور یونہی لڑکھڑاتا۔ ڈگمگاتا باہر نکل گیا۔۔۔ اس نشے سے چور کیفیت میں اسے دیکھتا رہا۔۔۔ یہاں تک کہ دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔ پھر میں نے چٹخنی لگانے کی آواز سنی۔۔۔ اور بے جان قدموں کو گھسیٹتا اپنے کمرے میں آیا۔

میرے بیڈ پہ کچھ تھا۔ جس نے میرے دماغ سے وہ نشہ بھک سے اتار دیا۔ بہت سے شادی کے دعوت نامے جو شاید ابی اس لیے رکھ گئی ہوں کہ میں اپنے دوستوں کو دے سکوں۔۔۔ میں نے ایک کارڈ اٹھایا سالار کا نام ام ہانی کے نام کے ساتھ لکھا دیکھ کے میرے اندر کئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔۔۔ میں نے وحشیانہ طریقے سے قلم پھیر کے اس نام کو سیاہی میں چھپایا۔۔۔ پھر اس پہ اپنا نام لکھنے لگا کہ شاید کچھ تسکین ملے۔۔۔ مگر 'مگر میں۔۔۔ میں ان چنگاریوں کو اب بھانبڑ کر چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

ام ہانی اس طاؤسی تخت پہ اسی طرح سر جھکائے گم صم بیٹھی تھی جس کیفیت میں اس نے پوری رات کاٹ دی تھی۔ آس پاس کیا ہو رہا تھا۔۔۔ وہ اسے نظر آتے ہوئے بھی دکھ نہیں پا رہا تھا۔۔۔ اک شور برپا تھا 'جو اس کی سماعتوں سے ٹکرا ضرور رہا تھا مگر وہ کچھ سن ہی نہ پا رہی تھی۔

"یہ سلمٰی کہاں ہے؟ اسے کہا بھی تھا کہ ابٹن سویرے ہی گھول کر رکھ دے۔"

مہ پارہ پھوپھو کا واویلا۔

"اور یہ سعد۔۔۔ نجانے کیا دریافت ہو گیا ہے۔ اس کے کمرے میں یکایک کہ اب سارا سارا دن پوری پوری رات دروازہ بند کیے اندر مراقبہ کرتا رہتا ہے 'بے چارہ علی ہی بھاگا پھر رہا ہے ہر کام کے لیے۔" یہ

نائلہ کا گلہ تھا۔

اور سعد کے نام پہ اس کی سماعتیں جھنجھنا اٹھیں۔۔۔ اس کے تصور میں گزشتہ رات کے وہ جان لیوا لمس پھر سے تازہ ہوئے اور وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔۔۔ آس پاس دیکھتے ہوئے ہڑبڑاہٹ کے عالم میں اب وہ اپنے حواس قابو میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

سلمیٰ کو ڈرے ڈرے سہمے سہمے انداز میں اندر داخل ہوتے دیکھ کے مہ پارہ نے جیسے اپنی دو دھاری زبان سے ہی اس کی گردن دبوچ لی۔

"لو آگئی۔۔۔ سر پہ خاک ڈال کے۔"

"وہ۔۔۔ جی میں جی۔۔۔ میں ناں ذرا۔"

"بس بس کہانیاں نہ گھڑ ناب سب پتا ہے۔ اسی کمہاروں کے لفنگے سپوت سے ملنے گئی ہوگی۔ بھابھی آپ اس کے دو بول پڑھوا کے رخصت کیوں نہیں کر دیتیں۔۔۔ چوبیس گھنٹے کی چوکیداری کون کرے۔"

"وہی کرتا تھا۔" نائلہ بھی اس چوکسی سے عاجز آگئی تھیں۔ مگر کیا کرتیں۔ سلمیٰ نامراد کام کاج میں بڑی پھرتیلی تھی۔

"یہ ام ہانی کی شادی جو آگئی۔ اب ایسے موقعے پہ اسے بھی لال جوڑا پہنا کے بٹھا دیتی تو یہ سب کون کرتا۔"

"سن سلمیٰ۔" مہ پارہ نے اب ذرا اس کو اپنی نصیحتوں سے مستفید کرنا چاہا۔

"چھوڑ دے یہ عشق بازیاں۔۔۔ یہ سب موسمی بخار ہوتا ہے۔ جوانی کی مستی۔ کوئی محبت پیار عشق کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ نری بکواس۔ یہ جو مرد ذات ہے ناں۔۔۔ جوانی آتے ہی جو سب سے پہلے نظر آئے، اسی پہ لٹو ہو جاتا ہے۔"

ام ہانی بڑے غور سے مہ پارہ کے تجزیے سن رہی تھی۔

"اسی لیے تو مرد عورت کو ملنے جلنے میں احتیاط بتلائی ہے۔ پرانے وقتوں میں یونہی تو لڑکی کو قد نکالتے ہی پردے میں نہیں بٹھا دیتے تھے۔ سیکے والوں کی نظر تک نہیں پڑنے دیتے تھے کہ یہ آگ اور تیل کا میل ہے۔ لڑکے تو یوں بھی دل ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہیں۔ ذرا چھوٹ ملی۔۔۔ ہو گئے فدا۔۔۔ جو قریب ہوا اسی کی جانب کھنچے اور نام رکھ دیا عشق ہو نہ ہو۔" ہانی کے دل کو بڑی لگ رہی تھیں باتیں۔۔۔

"علی ذرا سعد کو تو نکالو کمرے سے۔" رضوان نے کتنے بہت سے کام سونپے تھے اسے آج مایوں ہے۔۔۔ سر پہ کھڑا ہے وقت۔"

"ابھی جگا کے آیا آنٹی۔۔۔" علی مستعدی دکھاتا فوراً ہی میرے کمرے کے دروازے کو پیٹ رہا تھا۔

"نکل باہر سعد۔۔۔ کتنا کام پڑا ہے۔۔۔ سعد سن رہا ہے۔ انکل کا پارہ ہائی ہو رہا ہے۔" میں بے حس و حرکت بیڈ پہ چت پڑا ہے۔

"انکل بھی آ۔۔۔ اور ہاں وہ ڈی جے کو تو تو نے ہی لانا تھا۔ ہو گیا انتظام؟ تمہارے نیاز ماموں کی رگ موسیقی در قص پھڑک رہی ہے۔ بار بار پوچھ رہے ہیں ڈی جے کا۔" میں نے تکیہ کانوں پہ رکھ لیا۔

"سعد۔۔۔ سو رہا ہے یا مر گیا ہے؟ اٹھ جا۔۔۔ جا کے ڈی جے کو لا۔۔۔ میوزک ارینج منٹ ساری تیرے ذمے ڈالی تھی انکل نے۔" بھنا کے میں اٹھا اور وہی تکیہ دروازے پہ مار کے چلایا۔

"جاتا ہوں۔۔۔ بجواتا ہوں شادیانے۔"

جلتا کڑھتا میں کمرے سے نکلا۔۔۔ سامنے علی بتیسی نکالے کھڑا تھا جسے توڑنے کی اشد خواہش کو میں نے بڑی مشکل سے ٹالا اور اسے بدتمیزی سے سامنے سے ہٹاتے ہوئے سیڑھیاں اترا۔۔۔ یہ جا۔۔۔ وہ جا۔

اس منحوس پیلے دانتوں اور جامنی ہونٹوں والے ڈی جے کو لایا۔۔۔ اس نسواری رنگت اور بھورے بالوں والے مووی میکر کو لایا اور لائٹنگ۔۔۔ میوزک ارینج کرنے والے سب منحوسوں اور لعنتوں کو کام پہ لگا کے میں ان سے بھی دس گنا زیادہ منحوس اور لعنتی شکل بنا کے ایک طرف کھڑا تھا اور وہاں بیلی زنانہ پنڈال میں کمر پہ دوپٹا کس کے باندھے اپنے فن کے مظاہرے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

اور مردانہ حصے میں نیاز ماموں کی لاہور سے بلائی

رقاصائیں گھنگھرو باندھ رہی تھیں۔
"اللہ۔۔۔ مہ پارہ آنٹی۔۔۔ یہ میوزک کیوں نہیں آن ہو رہا۔ میں نے اتنا زبردست ڈانس تیار کیا ہے۔" مہندی گھولتی سلمیٰ نے بھی حصہ ڈالا۔
"میں نے بھی گدا ڈالنا ہے جی۔ مسرت شاہین کا گانا لگواؤں گی سعد صاحب سے۔"
وہاں بڑے دادا کی وہیل چیئر بھی مردانہ پنڈال میں دھکیل کے لائی جا رہی تھی۔ کیا نظارہ تھا۔ واہ واہ۔۔۔ دو دو ملازم وہیل چیئر کے ساتھ ساتھ۔۔۔ ایک نے ڈرپ تھام رکھی تھی۔۔۔ دوسرے نے یورین بیگ۔۔۔
"دادا جی۔۔۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں آپ کمرے میں آرام کرتے۔" ابو جز بز ہو رہے تھے۔
"وڈا سیانا۔" بڑے دادا مائنڈ کر گئے۔
"ناں تو اکیلا ہی موجیں کرے۔۔۔ ویسے بھی ایسی محفلوں میں کسی وڈے اور سیانے کا ہونا ضروری ہے' ورنہ ایسے ہلکی عمر کے منڈے شوخے اور ہوچھے ہو کے آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے علی کے پاس سے وہیل چیئر گزارتے ہوئے اس کی جانب اشارہ کیا' جو ہونقوں کی طرح منہ کھولے نارنجی شرارے والی رقاصہ کو دیکھ رہا تھا۔ نیاز ماموں بڑے دادا کے لیے گاؤ تکیے سیٹ کرنے لگے اور بڑے دادا چشمہ درست کرتے ہوئے نارنجی شرارے والی اور ہرے غرارے والی رقاصاؤں کا جائزہ لینے لگے اور پھر منہ بنا کے تبصرہ کیا۔
"بے سوادی۔۔۔ کون لایا ہے ان میراثنوں کو؟؟"
"نیاز دادا جی۔" ابو نے اکتاہٹ سے کہا۔ وہ ویسے ہی ان سارے کے حق میں نہیں تھے۔
"اس کھوتے کو کیا پتا۔۔۔ جرائیں خرید لے وہ ہی بڑی گل ہے۔"
"میوزک آن کرو جی۔"
نارنجی شرارے والی نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ پنڈال کے پرے میں ڈی جے کے پاس کھڑا سب سن رہا تھا۔
"کونسا لگاؤں پہلے؟"

ڈی جے نے اپنے پیلے دانتوں اور جامنی ہونٹوں کا لشکارا مجھ پہ مارا تو میں فوراً آگے بڑھا۔
"ہٹو پرے۔۔۔ میں لگاتا ہوں۔۔۔ خود۔"
اور جیب سے سی ڈی نکال کے لگائی۔۔۔ ماحول میں عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی آواز گونجی۔
ہم تو تنکے چن رہے تھے آشیانے کے لیے
آپ سے کس نے کہا۔۔۔ بجلی گرانے کے لیے
نیچے جھک کے گھنگھرو باندھتی نارنجی شرارے والی تڑپ کے سیدھی ہوئی۔۔۔ باقی سب بھی ہڑبڑا اٹھے ہوں گے۔
ہاتھ تھک جائیں گے کیوں پیس رہے ہو مہندی
عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی تنبیہہ پہ مہندی کے تھال میں موم بتیاں لگاتی سلمیٰ چونک کے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
خون حاضر ہے ہتھیلی پہ لگانے کے لیے
بلی اور اس کی شوخی سہیلیاں جو کمر پہ دوپٹے کسے لڈی ڈالنے کے لیے تیار تھیں۔۔۔ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔ اب خیلوی صاحب پورے جوش میں آگئے۔
ادھر زندگی کا جنازہ اٹھے گا
ادھر زندگی ان کی دلہن بنے گی
ام ہانی نے بھی گوٹے سے لپا پیلا دوپٹا فٹ الٹ دیا۔
میری موت پریوں کے جھرمٹ میں ہوگی
جنازہ حسینوں کے کاندھے پہ ہو گا
اور خیلوی صاحب کی دردناک آواز پہ خالہ بتول نے سینے پہ دوہتڑ مارے۔
"بیڑہ ترجائے۔۔۔ شگناں والے گھر جنازے؟"
کفن مرا ہوگا۔ انہی کا دوپٹہ۔۔۔
بڑی دھوم سے میری میت اٹھے گی
اور گیت کے ان بولوں نے تو بڑے دادا کو وہیل چیئر سے ہی اٹھا دیا ابو لپکے۔
"دادا جی۔۔۔ نیاز علی ان کو پکڑو۔"

"مہندیاں گانئیں... ایدی نے۔"

وہ لڑکھڑاتے ہوئے غصے میں بھرے نیاز ماموں اور علی کے سہارے شاید میری ہی تلاش میں نکلے تھے اور میں لان کے پچھلے تاریک گوشے میں فوارے کے سنگی چبوترے پہ لیٹا بازو آنکھوں پہ موڑ کے رکھے 'کھلوی صاحب' کے دکھ میں برابر کا شریک تھا یا شاید وہ میرے دکھ کو اپنے دل پہ لے گئے تھے۔

ادھر میرے ارمان کفن پہن لیں گے
ادھر ان کے ہاتھوں پہ مہندی لگے گی

ادھر میں نے ایک دردناک سرد آہ بھری۔ ادھر میرے سر پہ بڑے دادا کی چپل زوردار طریقے سے رسید ہوئی۔

"نا ہنجار... بے غیرت۔" میں ہڑبڑا کے کھڑا ہوا۔ ابو بھی غصے میں تھے۔

"یہ کیا شرارت ہے سعد... حد ہے بدتمیزی کی۔"

"شرارت... نیستی گانے لگا کے پھوڑی والا ماحول بنا دیا۔"

وہ اب چھڑی سے مجھے پیٹ رہے تھے اور میں خود کو بچانے کی کوشش کرتا یہاں وہاں کود رہا تھا۔

"بڑے دادا... ہائے بڑے دادا۔" اور کھلوی صاحب کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

ادھر میرے دل پہ خنجر چلیں گے
ادھر ان کے ماتھے پہ بندیا سجے گی

مارتے مارتے اب بڑے دادا ہانپنے لگے تھے... نیاز ماموں نے ہی آگے بڑھ کے ان سے چپل اور چھڑی کے ہتھیار لیے۔

"دادا جی... بس کریں آپ کی طبیعت۔" اور طبیعت کا یاد دلاتے ہی بڑے دادا غش کھا کے نیاز ماموں کے بازوؤں میں جھول گئے... ایک ہاتھ سینے پہ رکھ کے۔

اب ابو کے بھی ہاتھ پاؤں پھولے ورنہ اب تک وہ مزے سے میری خاطر تواضع کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

"دادا جی... ارے سعد منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جلدی جاؤ... ڈاکٹر کو بلا کے لاؤ۔"

"میں؟" میں نے چوٹیں سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری وجہ سے ہی دادا جی کی یہ حالت ہوئی ہے... جاؤ جلدی کرو پتا نہیں اتنی رات کو ڈاکٹر ملتا بھی ہے یا نہیں۔" میں بھاگا... بھاگتے بھاگتے بڑے دادا کی آواز سنی۔

"اوئے... میں نئیں بچنا..."

"یا اللہ... بچ جائیں بڑے دادا... جہاں اتنے سالوں سے بچتے آ رہے ہیں اس بار بھی بچا لیں اللہ میاں... ورنہ سارا ملبہ میرے اوپر گرنا ہے۔"

دعائیں مانگتے میں نے جیپ اسٹارٹ کی... مگر رہ رہ کے بڑے دادا کا فق ہوتا چہرہ... سینے پہ رکھا ہاتھ... ایک جانب کو جھولتا بدن اور ان کی کپکپاتی آواز تصور میں آ رہی تھی۔

"اوئے... میں نئیں بچنا۔"

اور میں جیپ کی اسپیڈ اور بڑھا دیتا... پھر اچانک... پتا نہیں کہاں سے دو تین دن پہلے والی بڑے دادا کی بات یاد آ گئی۔

"تے فیر مینوں مار دیو کڑی دے ویاہ والے دن اودھے دادا دے قل رکھ لو۔"

میرے پاؤں بے اختیار بریک پہ جا پڑے تھے۔

ایک زبردست چرچراہٹ کے بعد اب مکمل سناٹا۔

بس دور سے جھینگروں کے ٹرانے کی... یا گیدڑوں کی آواز... اور اس سنسان ویران سڑک پہ جیپ روکے میں اپنے اندر اٹھنے والے مکروہ خیالات سے لڑ رہا تھا۔

"نہیں نہیں... بڑے دادا کے بارے میں میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہوں... ڈوب کے مر جا سعد۔"

میں نے بڑی لعنت ملامت بھی کی خود کو... مگر بے سود میرے اندر کا خبیث جیت گیا... میں نے اسٹیرنگ سے ہاتھ ہٹائے جیب سے فون نکال کے آف کیا اور مزے سے سیٹ سے ٹیک لگا کے آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

ام ہانی نے آہستگی سے ہینڈل گھمایا۔ رات کے

سناٹے میں دروازہ کھلنے کی بڑی ہلکی سی آواز بھی بہت زیادہ محسوس ہوئی۔ لائٹس پہلے سے آن تھیں۔ ایک ہی نظر میں ساری بے ترتیبی ظاہر ہو رہی تھی۔ جو ام ہانی کے لیے بڑی جانی پہچانی تھی۔ بکھرے کپڑے۔۔۔ جوگرز۔۔۔ جرابیں۔۔۔ کتابیں ڈی وی ڈیز۔۔۔

اس کے پیروں میں ایک میلی ٹی شرٹ آئی' جو جھک کے اٹھاتے ہوئے جیب میں کچھ غیر مانوس سا وزن محسوس ہوا۔ نکال کے دیکھا تو یہ وہی چکنا سرمئی پتھر تھا۔ جیسا پتھر وہ دونوں کھیلتے ہوئے استعمال کرتے تھے اور ہر بار چاک سے بنائے گھیرے کے اندر کھڑے ہوئے جب وہ اس پتھر کو چوم کے آنکھیں بند کر کے پیچھے اچھالتی تھی تو ہر بار وہ پتھر غائب ہو تا تھا۔

الجھے ہوئے انداز میں وہ اس پتھر کو ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے رک گئی۔ کچھ سوچ کے دراز میں رکھنے لگی۔ مگر جیسے ہی دراز کھولا وہاں اس جیسے درجنوں پتھر دیکھ کے دنگ رہ گئی اور ان بہت سے چکنے سرمئی پتھروں کے درمیان اس ٹوٹی ہوئی سیاہ چوڑی کا ایک ٹکڑا اور کچھ بھی تھا ان پتھروں تلے دبا ہوا۔ ام ہانی نے نکال کے دیکھا۔ وہ اس کی اور سالار کی شادی کا کارڈ تھا۔ مگر سالار کا نام بڑی بے دردی سے کاٹا گیا تھا۔

صرف یہ ہی نہیں بلکہ اس پہ سعد کا نام۔۔۔

ام ہانی نے وہ کارڈ گھبرا کے ایسے دراز میں پھینکا جیسے دہکتا انگارہ چھولیا ہو۔ اس کے ذہن میں کوئی دنوں سے ڈنگ مارے اور کلبلاتے سوالوں کو جیسے ایک ایک کر کے جواب ملتے گئے۔

"کیونکہ میں دوست نہیں ہوں۔"

"مگر تم مجھے نہیں ملیں۔"

"اس وقت تمہاری آواز سن لینا ایسا ہی ہے جیسے گرمیوں کے روزے میں مغرب کی اذان سننا۔"

"تم سامنے ہو۔۔۔ مگر ساتھ نہیں۔۔۔ ساتھ ہونے اور سامنے ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

"شادی کے بعد یہ نام یہاں لکھے دیکھ کے ہمیں کیسا لگے گا؟"

"تمہیں ایک بار بھی میرا خیال نہیں آیا؟"

"میرا نہیں سوچا تم نے۔"

"میں کیسے رہوں گا تمہارے بغیر۔" یہ سب جواب کھلتے ہی وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے سسک پڑی۔ اس کی سسکیاں تب تک ویران کمرے میں گونجتی رہیں جب تک کھلی کھڑکی سے آنے والی بانسری کی صدا اان پر غالب نہ ہوئی۔

وہ دم سادھے چند لمحے بانسری سنتی رہی۔ سسکیاں اگرچہ تھم چکی تھیں۔ مگر آنسوؤں پہ بند نہیں باندھا جارہا تھا۔

"کیوں سعد۔۔۔ کیوں۔۔۔ اب میں کیا کروں تمہارا۔۔۔ بدھو کیسے تمہیں۔۔۔" وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کے رودی۔

☼ ☼ ☼

پتا نہیں کب یوں ہی جیپ میں بیٹھے بیٹھے میری آنکھ لگ گئی۔

اذان کی آواز پہ میں ہڑبڑا کے اٹھا۔ جیب سے فون نکال کے دیکھا تو لاتعداد میسجز تھے۔ ان گنت مسڈ کالز۔۔۔ میں نے جلدی سے جیپ اسٹارٹ کی اور ذہن میں وہ سب بکواس قصے دہرانے لگا جو مجھے وہاں جا کے بیان کرنے تھے۔

"جیپ کی خرابی۔۔۔؟"

"راستہ بھٹک جانا۔"

"ڈاکٹر کا نہ ملنا۔"

جیپ خراب ہونے کا بہانہ سب سے موثر لگا اور وہاں بڑے دادا کے کمرے میں ابو ان کو دوا کھلانے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے اور وہ مسلسل مزاحمت۔۔۔

"رضوان۔۔۔ رہن دے دوائیاں۔۔۔ میں ہن نئیں بچنا۔۔۔ او دیکھ سامنے دروازے تے۔۔۔ میرے ابا جی کھڑے تے فرشتاں نال۔۔۔ مینوں لینے آئے ہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں دادا جی۔۔۔ کوئی بھی نہیں ہے دروازے پہ۔"

"ہاں چاچا جی۔۔۔ فرشتے اکیلے آتے ہیں۔" خالہ بتول نے بھی تسلی دی۔

"آپ کو اپنے ابا جی کا ہلکھا (مغالطہ) لگ رہا ہے۔ غور سے دیکھیں 'وہ فرشتے ہوں گے۔"

"رضوان بھائی صاحب وہ بزرگ ہیں۔ ان کو زیادہ پتا ہے ان باتوں کا۔ ہم لوگوں کو تھوڑا ہی نظر آئیں گے فرشتے۔ سنا ہے جن کا وقت آجاتا ہے ان کو نظر آجاتے ہیں۔"

مہ پارہ پھوپھو کے لہجے میں امید اور آس کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

فرشتے۔۔۔ موت۔۔۔ آخری وقت۔۔۔

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے یہ الفاظ میرے کانوں میں پڑے اور میں نے خود کو ذہنی طور پر تیار کرلیا۔

"بڑے دادا۔" غمگین سی صدا لگاتے میں نے انٹری دی جہاں ابو اب بڑے دادا کے منہ سے زبردستی سیرپ بھرا چمچہ لگاتے کہہ رہے تھے۔

"کو ہو دادا جی! کچھ نہیں ہوا آپ کو' سنا نہیں؟ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ ہارٹ اٹیک نہیں ہے 'گیس ٹربل ہے۔ اب ٹھیک ہیں آپ۔" میں مایوس ہوگیا۔

"ٹھیک ہیں اب؟" مرے مرے انداز میں' میں نے کہا اور ابو پلٹ کے مجھے گھورتے ہوئے ڈانٹنے لگے۔

"اور تم اب آرہے ہو۔۔۔ رات پونے دو کے نکلے صبح کے پانچ بجے شکل دکھا رہے ہو۔ کیا مریخ پہ چلے گئے تھے ڈاکٹر کو لینے۔۔۔ اور فون بھی بند۔"

"وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ جیپ خراب۔۔۔ فون کی بیٹری۔" سارے رٹے لگائے بہانے ٹھس ہوگئے۔

"بڑے دادا واقعی ٹھیک ہوگئے۔" آخری امید کے طور پہ میں نے پوچھنا چاہا۔

"ہاں۔۔۔ وہ تو شکر ہے علی بھاگ کے ڈاکٹر کو لے آیا۔۔۔ اب واپس چھوڑنے بھی گیا ہے۔ بڑا اچھا بچہ ہے۔"

"اس اچھے بچے کی تو میں۔۔۔" میں نے دانت کچکچائے۔

"سوچو۔۔۔ چاچا جی لگے جاتے تو شادی تو کھوہ میں چلی جاتی۔" خالہ بتول کی بات پہ ابو نے ناگواری سے ٹوکا۔

"اللہ نہ کرے۔۔۔ اللہ دادا جی کو لمبی عمر دے۔"

"پھر بھی کتنی لمبی آخر۔" مہ پارہ پھوپھو کی بڑبڑاہٹ تھی۔

"کوئی نئیں۔۔۔ میں نئیں بچنا ہن۔" بڑے دادا کا وہی واویلا۔۔۔ وہی دہائی۔

"ہائے ہائے چاچا جی۔۔۔ جہاں نوے سال گزار لیے۔۔۔ چار دن ہور نکال لو۔۔۔ ویاہ تے ہون دیو خیر نال۔"

"آپ خالہ بتول کی باتوں کو دل پہ نہ لیں دادا جی۔" ابو نے بڑے دادا کا ہاتھ محبت سے ہلایا۔

"آپ نے تو ابھی سعد کی بھی شادی کرنی ہے۔ اس کے بچے بھی کھلانے ہیں۔"

"چھلو۔۔۔ اور سنو۔" مہ پارہ پھوپھو نے کڑوا زہر منہ بنایا۔

"اور ہاں دادا جی۔۔۔ آپ کو اس سال حج پہ بھی تو لے جانا ہے۔" ابو نے انہیں زندہ رہنے کے مزید لالچ دیے۔

"پلے ایہہ دس۔۔۔ مجرا ہونا ہے آج کہ وہ لاہور والیاں واپس چلی گئیں۔۔۔ ہائے۔۔۔ میں تے کج ویکھا ہی نئیں۔" بڑے دادا کی دہائی پہ خالہ بتول نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"لو کرلو گل۔۔۔ تسی کرالو چاچا جی کو حج۔۔۔"

"میں چھوڑ آیا ڈاکٹر کو۔" علی نے اندر داخل ہوتے ہوئے فخریہ اعلان کیا۔ جس پہ میں نے اس بری طرح اسے گھورا کہ وہ گھبرا اٹھا۔

"کیا ہوا سعدی۔"

"ذرا تو باہر چل۔۔۔ میں بتاتا ہوں کہ کیا ہوا۔" دانت پیستے ہوئے میں نے کہا اور اس کے گلے میں بازو ڈال اسے باقاعدہ گھسیٹتے ہوئے باہر لے گیا۔ برآمدے میں لے جاکے اس کی گردن کے گرد اس کے بازو کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے دے لگائی اس کی گدی پہ دھپا دھپ۔

"ارے سعد۔۔۔ کیوں پیٹ رہا ہے مجھے۔۔۔ ارے

چھوٹ۔۔۔ بول تو سہی۔۔۔ ارے۔۔۔ نہ مار۔۔۔" میں نے اسے دیوار کے ساتھ لگایا اور اب دے گھونسے پہ گھونسا اس کے مٹکا سے پیٹ پہ۔

"بڑی جلدی ہوئی ہے نا تجھے ہر بات کی۔۔۔ بڑی آگ ہوتی ہے نمبر بنانے کی۔" اس کا اچھی طرح بھرتہ بنانے کے بعد میں پسینہ پونچھتا ہال سے گزر رہا تھا۔ جب امی اور ابو کو خود پہ ہی تجزیے کرتے سنا۔

"سعد اپنی عجیب و غریب حرکتوں کی وجہ سے دن بہ دن مجھے پریشان کرتا جا رہا ہے۔"

"صحیح کہہ رہے ہیں۔۔۔ پتا نہیں کب بڑا ہوگا۔۔۔ اور ادھر میں اس کی شادی کی بات چلانے کا سوچ بیٹھی تھی۔"

"کیا۔۔۔ سعد کی شادی۔۔۔ تم پاگل ہو گئی ہو نائلہ۔۔۔ اس کی عمر تو دیکھو۔۔۔ انیس سال کے بچے کی شادی ہوتی ہے کیا۔"

مجھے ابو کی اس بات پہ تاؤ آگیا۔ انیس سال کی عمر میں کیا میں فیڈر لیتا ہوں ابھی تک۔

"اوفوہ۔۔۔ شادی کہاں۔۔۔ صرف رشتے کی بات۔۔۔"

"وہ بھی نہیں۔۔۔ یہ کوئی مناسب وقت نہیں ہے۔۔۔ پڑھائی کے دوران ایسے سلسلوں سے بچوں کا ذہن ڈسٹرب ہوتا ہے۔" پیر پٹختا میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"ذمے داریوں کے بنڈل میرے سر پہ ڈالتے ہوئے میری کم عمری نہیں نظر آتی۔ شادی کی بات پہ آجاتی ہے۔"

ہال میں اب وہی شور شرابا پھر سے شروع ہو چکا تھا۔ ڈھولک۔۔۔ ڈانس کی پریکٹس۔۔۔ شادی کے گیت۔۔۔

میں نے دروازہ بند کر دیا۔ کھڑکی کے پاس آکے نیچے جھانکا۔ لان میں رات ہونے والے فنکشن کی تیاریاں عروج پہ تھیں۔ کرسیاں لگ رہی تھیں۔ شادیانے۔۔۔ مہندی کا فنکشن کل رات ہونے والے مایوں کی تقریب سے ذرا بڑے پیمانے پہ ہو رہا تھا۔

"سعد صاحب۔۔۔" سلمٰی حسب عادت بنا دستک دیے اندر داخل ہوئی۔ میرا موڈ اتنا خراب تھا کہ اسے ڈانٹنے تک کو جی نہ چاہا۔ میں ماتھے پہ بل لیے اسے دیکھتا رہا۔

"سعد صاحب۔۔۔ وہ آپ کو۔۔۔"

"مجھے نہیں آنا۔ جو بھی بلا رہا ہے اسے کہو سعد سو رہا ہے۔ تین دن تک اٹھے گا۔" اس کی بات کاٹ کر میں نے کہا۔

"اچھا جی۔۔۔" وہ حیرت سے کہتی مڑی۔

"میں کہہ دیتی ہوں ہانی بی بی سے۔۔۔" میں چونکا۔

"ایک منٹ۔۔۔ ایک منٹ۔۔۔ ہنی بلا رہی ہے؟؟"

"ہاں جی۔۔۔" یہ سنتے ہی میں پاگلوں کی طرح باہر بھاگا۔ یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ وہ کہاں ہو سکتی ہے۔ وہ سوائے اس جگہ اور ہو بھی کہاں سکتی تھی۔ میں یوں ہی سرپٹ بھاگتا کھنڈر میں چلا آیا۔

وہ وہیں تھی۔

بے حد سنجیدہ۔

کچھ کچھ رنجیدہ۔

اسے دیکھ کے میں رکا۔ سانس ہموار کرنے کی کوشش کی مگر وہ دھڑکنوں کی طرح قابو میں نہ تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا۔۔۔ ہزارہا خوش فہمیوں سے دامن بھرتا میں اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"یہ کیا ہے سعد۔۔۔" اس نے شادی کارڈ میرے سامنے کیا۔ جس پہ سالار کی جگہ میرا نام لکھا نظر آرہا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس بھری سکون کی، سر سے ایک بوجھ کے اتر جانے کی۔۔۔ یعنی جو بات میں اسے اتنے دنوں سے سمجھانا چاہ رہا تھا، جتلانا چاہ رہا تھا وہ خود بخود جان گئی۔

"میری خواہش ہے۔۔۔ اور کیا؟؟"

"تمہیں شرم نہیں آتی ایسی فضول بات کرتے۔"

اس کے غصے سے کہنے پہ میں نے چاروں جانب کھنڈر کی دیواروں پہ لکھے اپنے اور اس کے نام کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ دیکھو۔۔۔ ہر جانب تمہارا اور میرا نام لکھا ہے۔ کئی بار تو تم نے خود لکھا ہے۔ پھر یہاں کیوں نہیں؟؟"

"یہ نام میں نے دوستی کے نام پہ لکھے تھے، مگر اب تم میرے وہ دوست نہیں ہو... تم بالکل کوئی اجنبی ہو... تم کوئی اور ہی ہو سعد۔" اس کے لہجے میں تاسف دیکھ کے میں بھی دکھی ہو گیا۔ "کیا محبت کرنا غلط ہے ہنی؟"

"اس قسم کی محبت غلط ہے۔"

"کس قسم کی؟"

"دیکھو سعد... اگر تمہارے آس پاس میرے سوائے اور کوئی لڑکی نہیں بھی تھی... تب بھی اس ایڈونچر کے لیے تمہیں اپنے اور میرے تعلق کا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ عمر کا یہ حصہ خطرناک ضرور ہوتا ہے، مگر ایسا بھی بے لگام نہیں... کہ انسان رشتوں کا لحاظ کھو دے۔" اس کے نصیحت کرنے پہ میں تڑپ اٹھا۔

"کون سے رشتے کا لحاظ... کون سی خالہ... تائی یا پھوپھی لگتی ہو تم میری... بولو..." میرے چلانے پہ اس کے چہرے پہ افسوس مزید گہرا ہوا

"تم واقعی وہ سعد نہیں ہو... تم بالکل کوئی اجنبی ہو... اور میں اجنبیوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔" کے لیے مڑی۔

مگر میں اسے ایسے جانے کیسے دے سکتا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کے روک لیا۔

"آخر میرا قصور کیا ہے ہنی... تمہیں چاہنا... تم کیسے کہہ سکتی ہو صرف اپنی عمر کے تقاضے کے مطابق میں تمہاری جانب کھنچ رہا ہوں۔ جسے تم جوانی کا ابال سمجھ رہی ہو وہ تو بچپن سے کسی سائے کی طرح میرے ساتھ ہے۔" اور مجھ سے ہاتھ چھڑانے کی مسلسل کوشش کرتی ہنی یہ سن کے حیرت سے ٹھنڈی پڑ گئی۔

"بچپن سے..."

"بچپن کے جذبات میں تو کھوٹ نہیں ہوتا ہنی... تب تو دل ہر بے ایمانی... برائی اور ہوس سے پاک ہوتا ہے... میں بچپن سے تمہیں یوں ہی چاہتا آرہا ہوں۔" اس نے ایک گہری سانس لی... اب وہ ہاتھ چھڑانے کی مزاحمت ترک کر چکی تھی۔

"سعد۔۔۔ میں بھی تمہیں بچپن سے چاہتی ہوں۔۔۔ لیکن خدا کے لیے اس چاہت کو بچپن کی چاہت ہی رہنے دو۔۔۔ اس پہ نئے نئے لیبل مت لگاؤ۔۔۔ کیوں اس رشتے کو خراب کررہے ہو۔۔۔ وعدہ کرو۔۔۔ آئندہ یہ بات نہیں کروگے۔" اس کے یوں مجھے بچہ جان کے پچکارنے پہ میں ہمیشہ کی طرح ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"کیوں نہ کروں۔۔۔ ہمارے درمیان اگر کچھ ہے تو بس یہ ہی ہے۔۔۔ ورنہ کچھ نہیں۔۔۔ آئی لو یو۔۔۔ سنا تم نے۔۔۔ آئی لو یو۔۔۔" اس کی نظروں میں چنگاریاں سی ہوئیں۔۔۔ پھر وہ میرا ہاتھ کھینچ کے ایک جانب لے جانے لگی۔۔۔ مغربی ٹوٹی دیوار کے اس جانب کھائی تھی۔ گہری کھائی۔۔۔ وہاں پہ جاکے وہ رکی۔

"اب بولو۔۔۔ کیا کہہ رہے تھے تم؟"

"آئی لو یو۔" کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت کے عالم میں۔۔۔ میں نے وہ الفاظ دہرائے۔

"اونچی۔۔۔ اور اونچی۔۔۔"

"آئی لو یو۔۔۔" میں پوری طاقت کے ساتھ چلایا۔۔۔ اور میری آواز کی بازگشت کھائی میں گونج کے رہ گئی۔

"تمہارے یہ تین الفاظ۔۔۔ ان بوسیدہ دیواروں سے ٹکرا کے اس کھائی میں گر چکے ہیں۔ ان کی اتنی ہی اوقات تھی۔" میں آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اسے جاتا دیکھتا رہا اور پھر کھائی میں جھانکا۔۔۔ شاید وہیں کہیں گری تھی میرے دل کی وہ بات جو کب سے سنبھالے بیٹھا تھا۔

☆ ☆ ☆

وقت جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ بالکل کھائی میں گرے ان لفظوں کی طرح۔ وقت سے رات کاٹی تھی۔ اب دن نہیں کٹ رہا تھا۔ لان کے ایک کونے میں کھڑا میں بھسم کردینے والی نظروں سے رات ہونے والے فنکشن کی تیاریاں کررہا تھا۔ ابو کی سخت ترین لعنت ملامت پہ میں پانچ بجے کمرے سے نکل ہی آیا۔

"سعد۔۔۔ تم کیا مہمانوں کی طرح کونے میں کھڑے ہو۔ لڑکے والے راستے میں ہیں۔" نیاز ماموں نے پاس سے گزرتے ہوئے ٹوکا۔

"تمہاری بہن کے سسرال والے ہیں۔۔۔ تمہیں ان کے استقبال کے لیے آگے آگے ہونا چاہیے۔" ان کے "بہن" کہنے پہ میں تڑپ ہی تو اٹھا۔۔۔ مگر وہ میری تلملاہٹ دیکھے بغیر آگے جاچکے تھے۔ سر جھٹک کے میں نے دھیان دوسری جانب لگانا چاہا۔۔۔ علی مووی میکر کو ہدایات دینے میں مصروف تھا۔

"اب سب سمجھ لیا۔۔۔ مہ پارہ پھوپھو پہ بار بار کیمرہ لانا ہے' ورنہ وہ مائنڈ کرجائیں گی۔ نائلہ آنٹی نے منع کیا ہے کہ ان کے کلوز اپ نہیں لینے۔۔۔ ان کی ڈبل چن۔۔۔ اور ہاں۔۔۔" لپک کے وہ میرے پاس آیا اور بڑا دوستانہ گانٹھتے ہوئے میرے کاندھے پہ بازو رکھ لیا۔

"ہم دونوں کی بھی مووی زیادہ بنانی ہے۔ آخر ہم دلہن کے بھائی ہیں۔" میں نے اس بے دردی سے اس کا بازو جھٹکا کہ وہ خود بھی ایک جانب گرتے گرتے بچا۔

"ارے کیا ہوا؟ ناراض کیوں ہورہا ہے؟ اچھا یار۔ میں نہیں ہوں بھائی۔۔۔ تو ہی ہے اکلوتا بھائی۔۔۔ بس خوش۔" اب کے میں نے اس کا گریبان پکڑ کے گھونسا تان لیا۔

"کیا کررہا ہے؟" اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ میں نے بھی یہاں وہاں دیکھا۔ ہر کوئی اس طرف متوجہ ہورہا تھا۔ بالآخر میں نے اس کا گریبان چھوڑا۔

"سن۔۔۔ تو پرسوں کی گیم ہارا تھا۔۔۔ یاد ہے؟"

"ہاں۔۔۔ یاد ہے۔" مرے مرے لہجے میں اس نے کہا۔ "اور تو نے کہا تھا ہارنے والے کو جیتنے والے کی بات ماننا ہوگی۔۔۔ اب بھونک۔"

"وہی کرنے والا ہوں۔" میں خباثت سے مسکرایا اور سامنے سے آتے مہمانوں کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ جو نیلے دوپٹے والی ہے نا۔۔۔ اسے چھیڑ۔"

"مروائے گا کیا؟" وہ بدک اٹھا۔

"وہ تو لڑکے والوں کی طرف سے ہے۔"

"تو بے غیرت۔۔۔ کیا اپنی طرف کی بچیوں کو چھیڑے گا؟ شرط تو ایسے ہی پوری ہوگی۔ دولہے والوں کی طرف سے آئی لڑکی کو ہی چھیڑنا ہوگا۔"

"پاگل ہے کیا؟ لینے کے دینے پڑ جائیں گے' اگر کوئی بدمزگی ہو گئی تو۔" اس کے خدشے پہ میری آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

"ہونے دو۔" میں نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا۔

"لو۔۔۔ دولہا والے سب آ گئے۔" علی سامنے دیکھتے اور ہاتھوں کے توتے اڑاتے بولا۔

"میں نہیں کرنے والا یہ فضول کام۔۔۔ چاہے تو کتنا بھی مار لے۔" وہ کورا سا جواب دے کر میرے نئے منصوبے پہ پانی پھیرتا چلا گیا اور میں مایوسی سے کچھ اور پلان کرنے پہ غور کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہ مہندی کے سبز لہنگے میں ملبوس سر جھکائے کلائی کی پیلی چوڑیوں کو سہلاتی اسی بازگشت کے سحر میں تھی۔

"آئی لو یو ہنی۔۔۔ آئی لو یو۔۔۔" ہر بار یہ الفاظ اسے نئے سرے سے ایک اذیت میں مبتلا کر دیتے تھے۔ تب ہی تکلیف سے کروٹ لی اور سالار کی فون کال کے روپ میں نیا کچوکا لگانے آئی۔

"میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہوتا ام ہانی کہ میں بار بار تمہیں فون یا میسج کروں۔۔۔ اور اگر میں ایسا کرتا ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ مجھے تم سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔" وہ شدید غصے میں تھا۔

"تم نے کل رات اچانک فون بند کیا۔ اس کے بعد میری کوئی کال پک نہیں کی۔"

"وہ میں کچھ بزی رہی۔"

"ساری رات۔۔۔ سارا دن۔" اس نے چبھتے لہجے میں پوچھا تو وہ کچھ بول نہ سکی۔

"میسج کا ریپلائی کرنے کا بھی وقت نہیں تھا یا ضرورت نہیں سمجھی۔" "دراصل میں کچھ اپ سیٹ تھی۔" اتنا کہہ کر وہ خود ڈر گئی کہ اگر سالار نے اس پریشانی کی وجہ پوچھ لی تو کیا کہے گی۔ مگر اسے توفیق نہ ہوئی۔ الٹا بگڑ گیا۔

"تم اپ سیٹ ہو۔۔۔ یا کچھ بھی۔۔۔ قیامت ہی کیوں نہ ٹوٹ رہی ہو تم پہ۔۔۔ تم مجھے نظر انداز نہیں کر سکتیں ام ہانی۔" اس کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔

"تم نہ مجھے سوری کہہ رہی ہو۔۔۔ نہ انتظار کروانے پہ معذرت کا ایک بھی لفظ۔۔۔ اب انتظار تم کرو گی۔"

"جی۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ میں مہندی کی تقریب میں نہیں آ رہا۔۔۔ اور کل بارات لے کر بھی تب تک نہیں آؤں گا جب تک تم خود چل کے میرے پاس نہیں آؤ گی۔۔۔ مجھے سوری کہنے۔"

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

نایاب جیلانی

شام ملے

گرما کی طویل دوپہروں میں یہ ایک بے رنگ دوپہر تھی۔ دھوپ میں تپش اور حدت معمول سے بڑھ کے تھی۔ اس دن ہوا بھی بند تھی۔ درخت یوں خاموش اور ساکت تھے جیسے کبھی ہلیں گے نہیں۔ ماحول میں رائی بھر خوش گواریت یا ٹھنڈک نہیں تھی۔

باہر پھیلی حدت کی طرح اندر کا ماحول بھی گرم' روکھا اور پر حبس تھا۔ یا پھر اس کے "اندر" رمیثی کا اثر زیادہ تھا جو ہر چیز میں اسے وحشت دکھائی دیتی تھی۔ وہ کئی دن سے اتنی ہی گم صم' ویران' خاموش اور بے سکون تھی۔ برآمدے کے سامنے لگی جالیوں میں پہروں باہر پھیلی دھوپ کو دیکھنا اس کا جنونی معمول بن گیا تھا۔

پہلے وہ ایسی ہی طویل گرم اور پر تپش دوپہروں میں پورے صحن میں چکرایا کرتی تھی۔ اب اس معمول میں ذرہ بھر تبدیلی آچکی تھی۔ صحن میں چکراتے رہنے کا نتیجہ اسے سرسام کی صورت میں بھگتنا پڑا تھا۔ اب یوں تھا کہ دھوپ میں پاگلوں کی طرح چلنے سے بہتر برآمدے میں کھڑے ہو کر جالیوں کے پار منظر دیکھنا زیادہ مناسب تھا۔ ان جالیوں کے پار کچھ فرلانگ کے فاصلے پہ اس کے تایا کا سفید ماربل سے لشکتا مکان تھا۔ وہ منزلہ نہیں' تین نہیں' چار نہیں... پوری سات منزلہ۔

یہ مکان تایا کے بہت اچھے دنوں کی کاوشوں میں سے ایک تھا۔ جب تایا کویت سے بیس سال کما کر وطن واپس آئے تو انہوں نے سب سے پہلے یہ سات منزلہ عالیشان ماربل کا مکان بنایا تھا۔ پوری سات منزلیں تھیں۔ ہر منزل ایک مکمل پورشن ایک مکمل گھر کا منظر پیش کرتی تھی۔ تایا نے اپنے ساتوں بیٹوں کے لیے الگ الگ پورشن بنوادیے تھے' تاکہ ان کے بیٹے ہمیشہ ایک ہی مکان کی چھت تلے الگ الگ رہیں۔ نقشے کے لحاظ سے یہ ایک عالیشان مکان تھا۔ ہر پورشن کی بیرونی سیڑھیاں اور راستے الگ تھے اور باہر کی طرف بھی تھے۔ تایا کی ساری کمائی صرف اسی ایک مکان کی صورت میں نظر آتی تھی۔ اس مکان کے علاوہ تایا کا نہ کوئی جمع جتھا تھا اور نہ ہی کوئی پراپرٹی۔ اس کی پروفیسر ماما ہمیشہ ہی ناک بھوں چڑھا کر جتایا کرتی تھیں۔

"عمر بھر تمہارے تایا نے بنایا ہی کیا ہے؟ محض یہ ایک مکان...؟" تب ماما کے انداز میں عجیب سی نخوت اور غرور ہوا کرتا تھا۔ اور یہ غرور کوئی بے جا نہیں تھا۔ اس کی ماما' بابا کے پورے خاندان میں پہلی اعلا تعلیم یافتہ "کماؤ" خاتون تھیں۔ اور اس پورے خاندان میں بابا پہلے کوالیفائیڈ انتہائی لائق فائق انسان تھے۔ فضائیہ کے انتہائی قابل ترین آفیسر۔ گروپ کیپٹن علیم ڈار۔

وہ زندگی کا ایک لمبا حصہ بڑے شہروں اور گلیمر ورلڈ میں گزار کر آئی تھی۔ بابا کی ہر مختلف اسٹیشن پہ پوسٹنگ کے دوران اس نے زندگی کو بہت انجوائے کیا تھا۔ سرکاری بنگلوں میں مزے لوٹتے تھے تاوقتیکہ بابا ریٹائر ہو کر اپنے اس آبائی چھوٹے سے شہر میں ہمیشہ کے لیے آن بسے تھے۔

جب وہ چھوٹی تھی تو بابا کے اس شہر' ہمیشہ "سعیدوں" پہ آیا کرتی تھی۔ تب بھی اس کی ماما سجیلہ ہمیشہ اس کی تائی اور تایا کی "فیملی" سے عاجز نظر آتیں۔ ان سے خار کھاتی تھیں اور حتی المقدور کوشش کرتی تھیں کہ ماہ مبین اپنی حدود میں رہتے ہوئے تایا کی فیملی سے دور رہے۔

ماما کو تایا کی "لمبی فیملی" سے بھی عجیب الجھن ہوتی تھی۔ وہ اس دور میں سات بچوں کو پیدا کرنے والی تائی سے بہت چڑتی تھیں جو ماما کو انتہائی اجڈ اور جاہل لگتی تھیں' جنھوں نے سات لڑکے پیدا کرکے ماما کی گڈ بک سے نکلنے کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ کرلیا تھا۔ اور پھر سات لڑکوں پہ صبر نہیں کیا تھا۔ ایک بیٹی کے لیے مزید بھی عبادتیں' وظائف اور منتیں وغیرہ مانی تھیں۔ اور یہ تو بہت بعد میں پتا چلا تھا تائی صرف بیٹی کی خواہش پوری کرنے کے چکر میں اوپر تلے سات بیٹے پیدا کرچکی تھیں۔

ان کی یہ خواہش بڑے عجیب انداز میں اچانک پوری ہوگئی تھی جب ماہ مبین کی سالوں سے دوہا مقیم اکلوتی پھوپھی اور پھوپھا کی ڈیڈ باڈی تابوت میں بند ہوکر آگئی۔ تب اس چھوٹے سے شہر میں کہرام مچ گیا تھا۔

پھوپھی اور پھوپھا کے بے جان جسموں کے ساتھ ایک زندہ وجود بھی آیا تھا۔ ایک گم صم' ڈرا سہما خوف زدہ وجود تب پہلی مرتبہ ماہ مبین کا اپنی پھوپھی زاد "فجر" سے تعارف ہوا۔

ہاں وہ "وقت فجر" تھی۔ ایک چاندنی میں نہائی ان چھوئی خوب صورت اور شیشے جیسی شفاف صبح۔ ماہ مبین کو یوں لگتا جیسے اسے چھوا تو وہ "میلی" ہوجائے گی۔ ہاتھ لگایا تو ٹوٹ جائے گی۔ وہ کوئی شیشے کا نازک سا مجسمہ لگتی تھی۔

اس کا ددھیالی خاندان اپنے گورے رنگ اور اونچی ناک کی وجہ سے پہلے ہی بہت مشہور تھا۔ کوئی اور خوبی ماما تسلیم کرتی یا نہ کرتیں' لیکن اتنا ضرور مانتی تھیں کہ اس کا خاندان خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ خاص طور پر اس کی تائی اور تایا۔ ان کے ساتوں ایک ہی سائز کے لمبے' اونچے اور صحت مند لڑکے۔ ساتوں کے ساتوں جس کمرے میں داخل ہوتے پورا کمرہ جگمگ جگمگ کرنے لگتا تھا۔

ساتوں بھائیوں کی ایک جیسی ڈارک براؤن آنکھیں تھیں۔ ایک جیسے قد' ایک جیسے رنگ اور ایک جیسا ناک نقشہ تھا۔ انہیں دیکھ کر ہر کوئی ورطہ حیرت میں مبتلا ہوجاتا۔ جیسے اللہ پاک نے انہیں ایک ہی "سانچے" میں رکھ کر بنایا ہو۔ ایک ہی مٹی سے ان کا خمیر اٹھایا ہو۔ ایک ہی رنگ سے ان کی "پالش" کی ہو۔

براؤن بال اور براؤن آنکھوں والے سارے تایا زاد ماہ مبین کے لیے "براؤنش بوائز" تھے۔ ان سات لڑکوں میں ایک لڑکی اچانک آگئی تھی۔ کالی آنکھوں اور کالے بالوں والی ننھی سی لڑکی۔ تائی کی اپنی بیٹی تو ہوئی نہیں تھی اللہ نے تائی کے لیے آسمانوں سے نہیں دوہا سے بیٹی بھیج دی۔

وہ عمر میں ماہ مبین جتنی تھی' لیکن وہ ماہ مبین جتنی پراعتماد' بولڈ اور لبرل نہیں تھی۔ وہ اداس تھی۔ وہ اداس رہتی تھی۔ اداس اس کے اندر رچ بس تھی۔

اس نے چھوٹی عمر میں اپنے ماں باپ کو کھو دیا تھا۔ وہ ایک طویل مدت تک اس صدمے کے اثر سے نہیں نکلی تھی۔ تاوقتیکہ گزرتے سمے کی تیز لپکتی لہروں نے اس کے دل کو ماں باپ کی دائمی جدائی میں سہارا دیا تھا اور بلاشبہ اس میں تائی کا بڑا کمال تھا۔ انہوں نے فجر کو اپنے پرشفقت پروں میں ہمیشہ کے لیے سنبھال لیا تھا۔

فجر ان کی نرم گرم محبت بھری آغوش میں پلی بڑھی تھی۔ تائی کی محبتوں کا اس کے گرد بڑا مضبوط اور لمبا چوڑا حصار تھا۔

تائی اور تایا کی وجہ سے وہ جلدی اس گھر میں ایڈجسٹ کرگئی تھی اور تب ماہ مبین اپنے بابا اور ماما کے ساتھ واپس چکلالہ آگئی۔

ان دنوں بابا چکلالہ پوسٹڈ تھے۔ پھر ایک طویل مدت تک ماہ مبین کسی "سعید" پہ بھی اپنے آبائی گھر نہیں
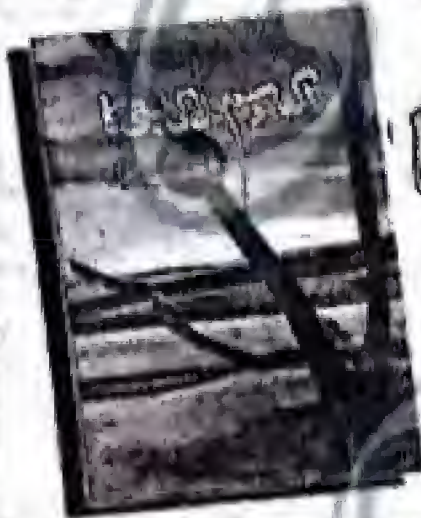
آسکی تھی۔ کچھ تو کالج اور یونی ورسٹی کی مصروفیات تھیں اور کچھ اس کی ماما بھی نہیں چاہتی تھیں کہ وہ اپنے پینڈو کزنز سے گھلے ملے۔ کبھی کبھار جبر سے فون پہ بات ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ بھی ختم ہوگئی۔ ماہ مبین اپنی سوشل لائف، اسٹڈیز اور مصروفیات میں کھو گئی تھی۔ اس کی تیز رفتار زندگی کو پہلا دھچکا تب لگا تھا جب ایک صبح تایا کی لمبی ترین کال آئی۔

اس دن بابا بہت پرجوش اور خوش تھے۔ اتنے خوش کے حد نہیں۔ جب وہ تایا کا فون سن کر دوبارہ ڈائننگ روم میں آئے تو ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ان کی رنگت سرخ تھی اور وہ بے ساختہ ماما سے مخاطب ہوئے تھے۔

"معجلہ! فواد نے فوج میں کمیشن لے لیا۔" اپنے سب سے بڑے بھتیجے کی کامیابی نے بابا کو خوشی سے نہال کررکھا تھا۔ ان کی آنکھیں فخر و انبساط سے روشن تھیں۔ تب ماما نے بڑے آرام سے کندھے جھٹک کر کہا۔

"تو اس میں کیا کمال ہے؟"

"بھائی جان کے بیٹے کی یہ پہلی کامیابی ہے۔ تم انہیں کال کرکے مبارک باد دو اور بھابھی سے بھی بات کرو۔" بابا کے فورس کرنے پر طوعا" کرہا" ماما کو فون کرنا ہی پڑا تھا۔ گو کہ وہ تائی کے بچوں کی کامیابیوں سے جلتی نہیں تھی تاہم اتنا خوش بھی نہیں ہوتی تھیں۔

تقریبا" آٹھ ماہ بعد تایا کے دوسرے بیٹے فائز نے بھی فوج میں کمیشن لے لیا تھا۔ فواد اور فائز دونوں کاکول چلے گئے تھے۔ یکے بعد دیگرے بیٹوں کی کامیابیوں نے یقینا" تایا کا سینہ بھی فخر و انبساط سے پھلا دیا ہوگا اور جب فاتح کے پاک فضائیہ جوائن کرنے کی اطلاع ماما کو ملی تب حقیقی معنوں میں ماما کو جھٹکا لگا تھا جب فواد اور فائز سیکنڈ لیفٹیننٹ ہوئے تب فاتح کو پہلا رینک پائلٹ آفیسر کا لگ چکا تھا اور ان ہی دنوں میں بابا بھی فضائیہ سے ریٹائرڈ ہوگئے تھے۔ تب بابا نے ایک روز ایسے ہی گالف کھیلتے ہوئے ماہ مبین اور ماہ نور کو بتایا۔

"میں سوچتا تھا۔ میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میرا جانشین

بنتا۔ میری جگہ فضائیہ میں آتا۔ ہم تو چراغ آخر شب ہیں اور فاتح طلوع صبح ہے۔ میری دعا ہے اللہ اسے ہمیشہ سربلند رکھے۔" بابا کے لہجے میں فاتح کے لیے عجیب سی نمی اور محبت تھی اور سچ تو یہ ہے۔ تایا کے بیٹوں میں بابا کو سب سے زیادہ فاتح سے محبت اور قلبی لگاؤ تھا۔ بابا کو وہ اپنا پرتو لگتا تھا حالانکہ اپنے سارے "برونش" کزنز میں ماہ مبین کو فاتح خاصا "نک چڑھا" دکھائی دیتا تھا۔ باقی سب تو بہت سویٹ تھے۔ انتہائی جولی اور ہنس مکھ' بس فاتح ریزروڈ لگتا تھا اور کچھ کچھ مغرور بھی۔

جیسے بابا کی باتوں میں اکثر ذکر فاتح کا کہیں نہ کہیں سے نکل آتا تھا۔ اسی طرح ماہ مبین بھی ماہ نور سے اکثر گوسب کے درمیان فاتح کی غیر ارادی طور پر باتیں کرنے لگتی تھی۔

ماہ نور اس کی بیسٹ فرینڈ تھی اور اس کے پیرنٹس بھی حیات نہیں تھے۔ ماہ نور ایک لمبے عرصے سے ماہ مبین کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ بہت ذہین اور زندہ دل لڑکی تھی۔ ماما کے فرسٹ کزن کی اکلوتی بیٹی تھی یوں وہ ماما کی لاڈلی بھتیجی بھی تھی اور ماہ نور بھی ماما سے بہت اٹیچ تھی۔ جب فواد کپتان سے میجر ہوا تب ایک دن تایا خود بہ نفس نفیس فواد کی شادی کا کارڈ لے کر آئے تھے۔ تب بھی ماما نے اعتراض کا پہلو کہیں نہ کہیں سے نکال لیا تھا۔

"رشتہ طے کیا۔ منگنی کی۔ ہمیں نہ پوچھا نہ بلایا۔ بس شادی کا کارڈ اٹھا کر لے آئے۔" ماما کا شکوہ سن کر تایا کچھ خفیف ہو گئے تھے۔

"اچانک رشتہ طے ہوا ہے۔ منگنی وغیرہ تو کی نہیں۔ ڈائریکٹ شادی طے کر دی ہے۔" تایا کی وضاحت بھی ماما کا موڈ بحال نہیں کر سکی تھی اور ماما نے بابا کو صاف صاف جتا دیا تھا۔

"میرے کالج میں سیکنڈ ٹرم چل رہے ہیں۔ چھٹی ملنا ناممکن ہے۔ آپ اور مبین چلے جائیں۔" ماما کی "کھولن" کو بابا صاف محسوس کر چکے تھے اسی لیے انہوں نے اصرار نہیں کیا تھا اور پھر ماہ مبین اور نور دونوں کو "تیاری" کا آرڈر دے دیا۔

وہ دونوں شادی سے دو ہفتے پہلے جا رہی تھیں۔ بابا نے مہندی سے ایک دن پہلے آنا تھا۔ مبین اور نور نے "جی بھر" کے شادی کی تیاری کر لی تھی۔ پھر اسی اتوار فاتح کا "جڑواں" فائق ان دونوں کو لینے چلا آیا تھا۔ فائق ان دنوں اے ایم سی میں میڈیکل کے آخری پراف میں تھا۔

پورے رستے نور' فائق اور مبین نے ایک ہنگامہ مچائے رکھا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا فائق فیوچر کا ڈاکٹر ہے۔ انتہائی "جوکر" اور ایک نمبر کا میراثی لگتا تھا۔ اتنا ہنساتا تھا کہ پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ راستے میں مبین نے بار بار پورے گھر والوں کا "احوال" پوچھا تھا۔

"تائی امی کیسی ہیں؟ غلام فرید؟ فراز احمد فراز؟ اور فیضان سنت۔؟" اس نے باری باری فرید' فراز اور فیضان کے بارے میں پوچھا تھا' گھر میں سب ان تینوں کو چڑانے کے لیے ایسے ہی "القابات" سے پکارتے تھے۔ جواباً" وہ تینوں ایسے گلے پڑتے کہ پڑوسی بھی ان کی چیخ و پکار۔ بنا مانگے ہوں گے۔

"سب ٹھیک ہیں۔ تم دونوں کی راہ میں آنکھیں' دل' سر بچھا کر بیٹھے ہیں۔" وہ بھی فائق تھا۔ انسانوں کی طرح جواب نہیں دیتا تھا۔

"دل' جگر بچھانے کی کیا ضرورت تھی۔ ان کی "کڑاہی" بنا لیتے۔ کچھ پیٹ میں جاتا تو فائدہ بھی ہوتا۔" نور نے چٹکلا چھوڑا تو مبین کی ہنسی نکل گئی تھی۔

"گھر میں غلام فرید' فراز احمد فراز اور فیضان سنت کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں جن کا تم نے حال نہیں پوچھا؟" فائق نے ترچھی نگاہ سے اسے گھورا تو وہ جلدی سے بول پڑی تھی۔

"فواد بھائی' فائز' فاتح' تایا ابو سلمیٰ (نوکرانی) اور فجروہ سب کیسے ہیں؟" اس نے شرارتی انداز میں کہا تھا۔ فواد بھائی کے علاوہ گھر میں کوئی بھی کسی کو "بھائی" نما عزت سے نہیں بلاتا تھا۔ سب ایک دوسرے کا نام بلاتے تھے۔

"باقی سب ٹھیک ہیں۔ فائح کی طبیعت ناساز لگتی ہے۔ ابھی تک "کامرہ" میں سڑ رہا ہے۔" فائق نے مسکرا کر بتایا تھا۔

"تو کیا فائح کو چھٹی نہیں ملی؟" مبین کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ نجانے وہ کیا احساس تھا۔ وہ سمجھ نہ پائی تب فائق نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

"محترمہ! شادی سے دو ہفتے پہلے آکر اس نے "بیوٹی سیلون" جوائن کرنا تھا۔ وہ بھی اس صورت میں وہ "دولہا" بھی نہیں ہے۔ نہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔"

"اوہ..." مبین جیسے سمجھ کر اپنی عقل کو کوسنے لگی۔

"مہندی تک پہنچ جائے گا۔" فائق نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ تب ہی فائق کی کرولا اس ماربل کے خوب صورت اور دور سے ہی حیران کرتے اونچے بلند مکان کے اندر داخل ہونے لگی۔ مبین نے اک خواب آگیں کیفیت میں اپنا پہلا قدم ماربل کے فرش پہ دھرا تھا۔ یوں کہ سامنے ہی تائی امی اپنی بانہیں پھیلائے مسکراتی ہوئی دکھائی دے گئی تھیں۔ ماہ مبین نے لمحہ بھی نہیں لگایا تھا اور تائی امی کی محبت بھری بانہوں میں سما گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ ایک مصروف ترین دن کا آغاز تھا۔

صبح ہوتے ہی سلمیٰ اور کاکا رہائشی ایریا کی صفائی میں جت گئے تھے۔ اوپر والے سارے پورشن جگر جگر چمک رہے تھے۔ اوپر اتنا آنا جانا بھی نہیں تھا۔ اس لیے گندگی اور بے ترتیبی نہ ہونے کے برابر تھی، جبکہ نیچے تایا کے سارے سپوت "پھیلاوا" ڈالنے میں ایک سے بڑھ کے ایک گرینڈ ماسٹر تھے۔ سوائے فواد بھائی اور فائز کے باقی سب کو گندگی پھیلانے میں کمال حاصل تھا۔ جوتیاں کہیں ہوتی تھیں، شرٹس کہیں، بنیانیں کہیں، جرابیں کہیں۔ یہی حال ان کی کتابوں کا تھا۔ جہاں بیٹھتے نوٹس، کتابیں، قلم، سیاہی، کاغذ بکھیر کر اٹھ جاتے تھے۔ سلمیٰ آتی یا کاکا کی نظر پڑتی تو وہ سب کچھ "لپیٹ" کے ٹھکانے لگا آتا۔ پھر ان سب کی الگ الگ دہائیاں... کوئی بھی سلمیٰ یا کاکے کو نہیں پکارتا تھا۔

"فجر! میرے نوٹس کہاں گئے؟"

"فجر! میری شرٹ نہیں مل رہی۔"

"فجر! میری میچنگ ٹائی؟"

"فجر! میری فلاں کتاب...؟" اور فجر جہاں بھی ہوتی جس کونے میں بھی ہوتی... دوڑتی، بھاگتی، ہانپتی "مطلوبہ" چیز دریافت کر کے لے آتی تھی۔

اگر فجر نہ ہوتی تو اس گھر میں "اندھیر" مچ جاتا۔ کسی کو کچھ نظر ہی نہ آتا۔ کسی کو کچھ ملتا ہی نا۔ اور یہ سب چیزوں کی تلاش میں اودھم مچا ڈالتے۔ اس وقت فرید ریلنگ سے لٹک کر سارے زمانے کی یتیمی چہرے پہ طاری کر کے چیخ رہا تھا۔

"فجر! مجھے بچاؤ..." وہ آدھا ریلنگ سے لٹکا دہائیاں دے رہا تھا۔ فجر کچن میں مصروف تھی۔ جیسے ہی فرید کی آواز سنی دوڑتی ہوئی لاؤنج کی طرف بھاگی، لیکن فرید اوپر آدھا لٹکا ہوا تھا اور فراز اس کی شرٹ اتارنے کے چکر میں اس کی گردن دبوچ کے جھٹکے دے رہا تھا۔ فجر کا دماغ ہی گھوم گیا۔

"فراز۔۔۔ رکو تو! کیا کرتے ہو؟ کیا مار کے دم لو گے؟ ٹھہو میں پوچھتی ہوں تمہیں۔۔۔" وہ لکڑی کی ڈوئی ہاتھ میں لیے سیڑھیاں تیزی سے چڑھ رہی تھی۔

"میں کہہ رہا ہوں فجر! اس للو کے معاملے میں مت آنا۔ یہ میرے ہاتھ سے نہیں بچے گا۔ یہ پوستی گندا' میلا۔ عید کے عید نہانے والا میری تیسری نئی نکور شرٹ پہن کر پلیت کر چکا ہے۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔۔۔" فراز نے للکار کر فجر کو "جنگ" میں کودنے سے باز رکھا تھا۔ فجر اس کی للکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ڈوئی سمیت آگے بڑھی تھی۔

"اس کی گردن چھوڑتے ہو یا لگاؤں ایک ڈوئی۔۔۔؟" فجر نے لہجے میں زمانے بھر کا رعب لانے کی کوشش میں آواز کو اونچا کرتے ہوئے کہا تھا۔ پنکھے صاف کرتا کاکا اپنا کام چھوڑ کر دلچسپی سے اسٹول کو ٹانگ مار کے قریب آگیا۔

"فجر باجی! ڈوئی مت مارنا۔ میری اماں کہتی ہے جسے ڈوئی ماری جائے اسے "بکھوڑا" (بھوک) لگ جاتا ہے۔ وہ بندہ آٹے کی بوریاں تک کھا جاتا ہے۔ فراز پائی جان پہلے ہی دیگیں ڈکار جاتے ہیں۔ پراٹھیں نگل جاتے ہیں۔ وڈا جگ بھر کے دودھ کا پی جاتے ہیں۔ فرتے پوری مبج (بھینس) کو گھر باندھنا پڑے گا۔ فجر باجی! تو اڈی یا اوپچی خانے میں رات بھی کٹے گی۔ روٹیاں پکا پکا کر آپ فنا ہو جائیں گی۔ میں ترکاری بنا بنا کر فوت ہو جاؤں گا۔۔۔ پر فراز پائی جان کا ٹڈ (پیٹ) نہیں بھرے گا لکھوا لو' مجھ سے۔ ڈوئی لگتے ہی ان کو بکھوڑا لگ جائے گا۔" کاکے نے ایک فلمی چیخ مار کر فجر کو اس کے خطرناک ارادوں سے باز رکھنا چاہا تھا۔ ڈوئی لگنے کے اتنے "مضر اثرات" سن کر فجر سچ مچ اپنے خطرناک ارادوں سے باز آگئی تھی بلکہ کچھ خوف زدہ ہو کر کاکے کو مخاطب کیا تھا۔

"کاکے! کیا واقعی ڈوئی لگنے سے بندہ بھوک سے اتاؤلا ہو جاتا ہے؟"

"فجر باجی! لو دسو' میں کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔۔۔" کاکا سخت برا مان گیا تھا۔ ان دونوں کی بحث کے دوران فراز نے زبردستی فرید سے شرٹ اتروالی تھی۔ اب وہ چیلنجنگ انداز میں اسے گھور رہا تھا۔

"اب لگانا میرے کپڑوں کو ہاتھ۔ میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گا۔ ہر نئے کپڑے پر تمہاری "نظر" ہوتی ہے۔ کوئی کپڑا پہننا مجھے نصیب نہیں ہوتا۔ سارے کپڑے تم میرے جھوٹے کر دیتے ہو۔" فراز نے اسے کھولتی نظروں سے گھورا تو فجر بھی دوبارہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"شرم کرو فراز! چھوٹے ہو تم فرید سے۔۔۔ مگر "چھوٹا پن" کہیں بھی نہیں۔ ذرا بھی بڑے بھائی کی عزت کا خیال نہیں۔۔۔ بے چارے کو بے عزت کر کے رکھ دیتے ہو۔" فجر نے بری طرح سے فراز کو گھر کا تھا۔

"تو یہ عزت داروں والا کام کرے نا۔۔۔ میرے کپڑوں کو کیوں پہنتا ہے؟ پھر پسینے سے تر گول مول کر کے الماری میں چھپا آتا ہے۔ مشین میں رکھنے کا تردد بھی نہیں کرتا۔" فراز جیسے پھاڑ کھانے کو دوڑا تھا۔ فجر نے اب کہ فرید کو گھورنا چاہا تھا اور فرید نظر چراتا کاکے کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"غدار! یہ بے پر کی تو نے اڑائی ہے۔" اس نے چبا چبا کر کہا تھا۔ کاکا آئیں بائیں کرنے لگا۔

"میری مجال ہے جی؟ کسی دشمن نے ہوائی اڑائی ہے۔ فراز پائی جان کی غیر موجودگی میں آپ ان کی الماری سے استری شدہ کپڑے نکال کر پہنتے ہو۔ پھر ان کو گول مول کر کے کونوں کھدروں میں چھپا آتے ہو۔ ان کا پرفیوم بے دریغ استعمال کرتے ہو۔۔۔ بلکہ پرفیوم میں نہاتے ہو اور تو اور ان کی شیونگ کٹ کو بھی نہیں بخشتے۔ آفٹر شیو لوشن تھوبا تھوبا منہ پہ رگڑتے ہو۔ میں نے تو جی کبھی ان کو نہیں بتایا۔ فراز پائی جان کو آپو آپ پتا لگ جاتا ہے۔" کاکے نے چہرے پہ یتیمی لا کر بڑی رقت سے کہا تھا۔ ادھر فراز کا پارہ ان "انکشافات" پہ اور بھی اٹھ اٹھ آیا۔

فجر نے آگے بڑھ کر کاکے کا کان مروڑا تو زور زور سے دہائیاں دینے لگا تھا۔

"تم چغلیاں کرنا کب چھوڑو گے؟ میں تمہارے

یہ لمبے لمبے دانت توڑ دوں گی۔"

"یہ تو تمہارا احسان ہوگا ہم پر۔ کل کی توڑتی آج توڑ دو اس کے سارے دانت۔" فراز کاکے کو گھورتا فرید کو ایک ٹھڈا مارتا سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ پیچھے سے فرید حملے کے لیے لپکنا چاہتا تھا جب فجر نے عجلت میں اس کا بازو دبوچ لیا۔

"جانے بھی دو فرید۔" فجر کے انداز میں ملامت تھی۔ فرید غصے میں کھولتا رک گیا۔

"تمہاری خاطر بدلہ نہیں لیتا۔ ورنہ اس ٹھڈے کے بدلے اسے اتنے گھونسے لاتیں مارتا کہ اسے اپنی ساس کی ساس بھی یاد آجاتی۔" فرید نے قلمی سی بھبکی ماری تھی۔ جس پہ کاکا دانت نکوسنے لگا۔

"جب بھی کوئی لڑائی کا سین ہوتا ہے تم فوراً" کام چھوڑ کر بیچ میں کود پڑا کرو۔ بہت ہڈ حرام ہو۔ جلدی سے صفائی ختم کرکے کچن میں آؤ۔" فجر نے فرید کو بہلا پھسلا کر نیچے بھیجا اور کاکے کے کان کھینچتی کچن میں آگئی تھی۔ کاکا بھی سلنی کو ڈسٹر پکڑا کر پیچھے ہی بھاگا بھاگا آگیا۔

"فجر باجی! دیکھو نا ذرا۔ یہ ماہ مبین باجی بڑے لمبے عرصے بعد نہیں آرہی؟" کاکے نے لوکی کو کدو کش کرنے کے لیے کٹر شلف سے اتارتے ہوئے فجر کو مخاطب کیا تھا۔ وہ جو بریانی کی تہیں لگارہی تھی لحہ بھر کے لیے رکی۔

"ہاں۔ تقریباً" چار سال بعد۔" اس کے انداز میں کلام ختم کرنے کی عجلت تھی۔

"آپ کی مبین باجی سے بہت دوستی تھی۔" کاکے کو خاصی پرانی باتیں یاد آگئیں۔ فجر بھی کہیں دور کھو سی گئی۔ جب وہ نئی نئی اس گھر میں آئی تھی۔ تب اس کی ماڈرن سی ماں کے ساتھ ان کی اکلوتی بیٹی بھی آئی تھی۔ تب فجر کی مبین سے اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ جو کلائی سالوں کے ٹیلی فونک رابطوں تک برقرار رہی۔ پھر وقت کی گرد نے سب کچھ غبار آلود کردیا تھا۔

معاً" باہر سے مہمانوں کی آمد کا شور اور آوازیں سنائی دیں تو فجر اچانک چونک گئی تھی۔ پھر کاکے کو ہدایات دیتے ہوئے جیسے ہی مہمانوں سے ملنے کے لیے وہ باہر نکلی اچانک غیر محسوس انداز میں اس کے دل نے ایک "بیٹ" مس کی تھی وہ آگے بڑھتی بڑھتی ایک دم رک گئی۔ کاکا اسے رکتا دیکھ کر حیرت سے بولا۔

"باجی! کیا ہوا۔؟" اس کا رکنا بڑا غیر معمولی ہوا کرتا تھا۔ وہ جب بھی اس انداز میں رکتی تھی اچانک کوئی "چونکا" دینے والی بات کرتی۔

"سنو کاکے! بریانی، رائتہ، کوفتے اور میٹھا تو ہوگیا۔ یوں کرو، تھوڑا سا آٹا بھی گوندھ لو۔ میں مبین سے مل کر کھانا ٹیبل پہ لگاتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے روٹی بھی پکانا ہوگی۔ کامرو سے فاتح چل پڑا ہے۔ اسے چاول پسند نہیں اور نہ گوشت پسند ہے۔ لوکی کا تازہ سالن بنا کر روٹی تازہ بنادوں گی۔ وہ ہمیشہ کی طرح بغیر بتائے آرہا ہے۔" وہ ایک ہیجان آمیز کیفیت میں بول رہی تھی۔ چہرے پہ انوکھی سی خوشی تھی اور آنکھیں ان کہے جذبوں کی حدت سے لودیتی تھیں۔ فاتح کی "آمد" کا سن کر کاکے نے خوشی سے باچھیں کھلا کر سر ہلایا تھا۔ اسے یقین تھا اگر فجر باجی کے دل نے فاتح کی آمد کا اعلان کردیا تھا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت فاتح کو آنے سے روک نہیں سکتی تھی۔ کیوں کہ فجر کا دل فاتح کے حوالے سے کبھی جھوٹ نہیں کہتا تھا۔ نہ غلط قیاس کرتا تھا۔

اس گھر میں کسی کو بھی فاتح کے حوالے سے بات پوچھنا ہوتی تو وہ فجر سے پوچھنے کے بعد یقین کرلیتے تھے۔ کیوں کہ فاتح گمان نہیں فجر کا یقین تھا۔

فاتح کامرو میں ارادہ کرتا اور فجر کے اندر اس کے ارادے سے ہی "آمد" کی آہٹیں ابھرنے لگتی تھیں۔

وہ چلتا تو فجر کی سماعتوں میں اس کے قدموں کی "چاپ" سنائی دیتی۔

وہ بولتا تو فجر کے اندر مٹھاس اترنے لگتی۔

وہ دیکھتا تو فجر کو "مسحور" کردیتا۔

اس کی نظر کا حصار اسے محسوس کروتا تھا۔

ان دونوں کے درمیان ایسا ہی ان کہا ان چھوا اور

سارے اپنوں کو باور کرواتا ایسا ہی خاص اور انوٹ رشتہ تھا۔ وہ راہ محبت میں ایک دوسرے کی ہم قدم تھے۔ وہ شاہراہ محبت پہ ایک دوسرے کے "ہم سفر" تھے۔

☼ ☼ ☼

یہ ایک روئیدہ سی صبح تھی۔ ہریاول سے بھری۔ سبز سبز، سورج بادلوں کے پہلو میں اونگھتا تھا۔ اور سرمئی گولوں نے دھوپ کے سنہرے پن کو ڈھانپ رکھا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ایک قطار میں لگے درختوں کے سایوں نے گھنیری پلکیں بچھا رکھی تھیں۔ گھاس کا چھوٹا سا قطعہ آنکھوں کو تراوٹ بخش رہا تھا۔ اس کی بے قرار نظریں گیٹ پہ "نظربند" تھیں۔ کبھی دوسری طرف اٹھتی تھیں نہ کسی اور طرف ہٹتی تھیں۔ اس وقت عالم پہ سکوت طاری تھا۔

معزز مہمان لڑکیاں ایک پر شور اور ہنگامہ پرور پروٹوکول کے بعد آرام کر رہی تھیں۔ لڑکے سب اپنے اپنے "دھندے" پہ نکل گئے تھے۔ امی اور ابی دونوں بازار گئے تھے شاید جیولر کے پاس۔ سلمٰی اور کاکا لاؤنج میں "خراٹے" لے رہے تھے۔ شاید ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر پر سکون تھا سوائے فجر کے۔ جس پہ "عصر" چڑھ رہی تھی۔ قلب بے سکون کو "سکون لطیف" کی آرزو تھی اور "سکون دل و سرور" قلب سے خالی تھا۔ جانے فجر کا "سکون" آج کی تاریخ میں ہی کیوں "دل آباد" سے ہجرت کر گیا تھا؟

اس پہ "چپ خاموشی" طاری تھی۔ سرمہ در گلوسی یہ کیفیت آمد محبوب سے پہلے سر کو چڑھتی تھی جانے کیوں؟ زندگی میں پہلی مرتبہ فجر کے دل میں ایسی کیفیت نے کروٹیں بدلی تھیں۔

اس کی جلتی آنکھوں میں کچھ گھنٹے پہلے کے منظر عکس بناتے اور مٹاتے تھے۔ جب اس کے دل کی آہٹوں پہ ایک ایک قدم دھرتا فاتح اچانک بغیر بتائے گھر آگیا تھا۔ پورا گھر ہیجان آمیز خوشی میں مبتلا ہو گیا۔ کیوں کہ فاتح کی اپنی اکیلی ذات ہی رنگ و نور اور ہنگاموں کا مرکز تھی۔ اس کے دم سے ویرانوں میں بھی بہار آجاتی تھی۔ وہ انتہائی زندہ دل فسوڑ اور خوش گوار طبیعت کا مالک تھا۔ اس کے آتے ہی سارے سوئے ہوئے ہنگامے جاگ اٹھے تھے۔ وہ بھی دو ہفتے پہلے چھٹی لے کر آیا تھا۔ حالانکہ فائق نے اسے کتنی دفعہ بھگو بھگو کے ماری تھی۔

"کیا تمہاری شادی تھی جو دو ہفتے پہلے یہاں آکر ڈیرہ جمالیا ہے۔۔۔؟"

"تم میرے آنے سے "سڑ" کیوں رہے ہو؟" فاتح نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"اس لیے کہ آپ کے آجانے سے ان کی "ویلیو" خوب صورت لڑکیوں کے سامنے کم ہوتی ہوئی زیرو پہ آگئی ہے۔" کاکے نے اس کار خیر میں حصہ لینا ضروری سمجھا تھا۔ اس کی حاضر جوابی پہ فاتح نے جی بھر کے کاکے کو سراہا۔

"جیو میرے کالے بجنگ شہزادے، ہمیشہ میرے دل کی بات کرتے ہو۔ اسی لیے میرے جانشین ہو۔" فاتح نے اس کی کمر تھپکی تھی۔ وہ شہ پا کر کچھ اور پھیل گیا تھا جبکہ فائق نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

"اپنی شادی پہ تو دو مہینے پہلے ہمارے سروں پہ سوار ہو جاؤ گے۔" فائق کو بھی کسی نہ کسی طریقے بدلہ اتارنا تھا۔ کیوں کہ مبین اور نور کے سامنے خاصی سبکی ہو چکی تھی۔

"صرف دو؟" فاتح نے ایک بھیانک چیخ ماری تھی۔

"کم از کم چھ مہینے کہو۔"

"تو تم ایک ہی دفعہ میٹرنٹی لیو لے لینا۔" فرید نے اسے مشورہ دیا تھا۔ مبین اور نور کا ہنس ہنس کے برا حال ہو گیا تھا۔ ان کی تکرار اور ہنگامے کی آوازیں کچن تک بھی آرہی تھیں۔ سبز قہوہ بناتی فجر نے کئی مرتبہ مڑ مڑ کر لاؤنج کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی بے قراری مچل رہی تھی۔ مبین اور نور کا منٹوں میں سب گھر والوں سے گھل مل جانا۔ رونق، ہنگامہ اور ہنسی مذاق۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں

برسوں سے اسی گھر میں رہتی آرہی تھیں۔ اور یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا جو فاتح فجر کے سر پہ سوار ہونے کی بجائے لاؤنج میں موجود تھا۔ مبینہ اور نور کو کمپنی دیتا۔ ہنستا۔ رونق لگاتا۔

"کیا کبھی پہلے بھی ایسا ہوا تھا؟۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔

وہ تو گھر میں آنے کے بعد ہمہ وقت فجر کے اردگرد گھومتا تھا۔ وہ کچن میں ہوتی' فاتح کچن میں آجاتا۔ چاہے جتنی بھی شدت کی گرمی ہوتی۔ وہ فجر کے کام ختم کرنے تک وہیں کھڑا رہتا تھا۔ اپنے دوستوں کی باتیں سناتا۔ میس کے قصے دوہراتا۔ فجر کو ہنسا ہنسا کر پاگل کردیتا تھا۔ فاتح کے پاس اتنی باتیں ہوتی تھیں۔ جو ختم ہونے میں نہ آتیں۔ ایک کے بعد ایک قصہ شروع کردیتا تھا۔ وہ لانڈرنگ کررہی ہوتی۔ فاتح اس کے ساتھ لانڈرنگ کرواتا۔ وہ کپڑے استری کرتی۔ فاتح ہینگ کرواتا۔ الماریوں میں رکھواتا۔ اور ساتھ ساتھ اس کی لامحدود باتیں اور قصے جاری رہتے تھے۔ ان دونوں کے "تعلق" دوستی اور بے تکلفی پہ کبھی کسی نے اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔ اعتراض کا کوئی پہلو نکلتا بھی نہیں تھا۔ امی اور ابی نے برسوں پہلے ان دونوں کو ایسے بے نام بندھن میں باندھا تھا جو گزرتے وقت کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا تھا۔ ایک واضح ہوتا "رشتہ" بن گیا تھا۔ حتی کہ کاکا اور سلمٰی بھی جانتے تھے۔

"فاتح پائی جان فجر بی بی پہ مرتے ہیں۔۔۔" ان دونوں کی زبان میں محبت کی بس یہی کل تشریح تھی۔ خیر اچھی ہی تشریح تھی۔ رسالپور جانے سے پہلے کے "عرصے" پر اگر نگاہ ڈالی جاتی تو فاتح کی صبح فجر کے نام کی پکار سے ہوتی تھی۔ وہ صبح ہی صبح اودھم مچاڈالتا تھا۔

"فجر! میری ٹائی' میرے جوتے؟ میرا کالج بیگ؟ اور میرا ناشتا۔۔۔؟" اس کی ہر "پکار" فجر کو گھن چکر بنائے رکھتی تھی۔ وہ "پھیلاوا" ڈالنے میں بھی کمال رکھتا تھا۔

فجر جتنی سلیقہ مند ویل ڈسپلنڈ تھی۔ فاتح اسی قدر بے سلیقہ' بے ترتیب اور بدنظم تھا۔ اس کا کمرہ پورے گھر میں سب سے زیادہ گندا اور بے ترتیب ہوتا تھا۔ کوئی بھی چیز ٹکانے پہ نہیں ملتی تھی جب وہ شور مچا مچا کر کالج چلا جاتا تب فجر کو دو گھنٹے لگتے تھے اس کا کمرہ سنوارتے ہوئے۔ تب ہی امی اسے بہت ناراض ہوتی تھیں۔

"تم نے اس کی عادتیں بگاڑدی ہیں فجر! یہ بعد میں تمہیں بہت ستائے گا۔ ابھی سے اس کی لگامیں کس لو۔"

"امی! کوئی بات نہیں۔۔۔ میں مینیج کرلیتی ہوں نا۔۔۔" وہ سادگی سے مسکرادیتی تھی۔ فاتح کے کام کرنا اسے کس قدر پسند تھا۔ اس کے پھیلاوے کو سمیٹنے میں کتنا سکون تھا؟ وہ کس طرح امی کو بتاسکتی تھی؟ فاتح کی زندگی بھی ایک ہی دائرے میں گردش کررہی تھی۔ ائیرفورس کی گلیمرس لائف نے بھی اسے اپنے مدار سے بھٹکایا نہیں تھا۔ اس کی دنیا بھی بس "فجر" تک محدود تھی' لیکن اس محدود دنیا کا دائرہ "وسیع" ہونے کے قریب آرہا تھا۔۔۔ سلطنت دل کی سرزمین کے قطعے وسعت پارہے تھے۔ دل کے سنگھاسن (تخت) پہ کوئی اور "تخت نشین" بیٹھنے کے لیے آرہے تھے۔ اور کیا یہ ٹھیک تھا؟ اور کیا یہ واقعی ہی ٹھیک تھا؟

☆ ☆ ☆

تایا کے سفید مکان کی ٹھنڈی راہداریوں میں چلنا اور ان کے ساتوں لڑکوں کی محفل میں پہروں بیٹھ کے ہنسنا دنیا کا حسین ترین "تجربہ" بنتا جارہا تھا۔ ماہ مبین کو لگتا تھا جو وقت اس نے مختلف اسٹیشن کے سرد کلبوں اور سڑکوں پر ضائع کیا تھا۔ کاش اس وقت کو گرفت میں لے کروہ تایا کی ان راہداریوں کے ٹھنڈے سکون کا مزا لیتی۔ اس گھر میں اتنا سکون اور امن تھا جو دنیا کے کسی خطے میں نظر نہیں آسکتا تھا۔ نور تو ببانگ دہل اعلان کرتی تھی۔

"تم شادی کے بعد جاتی ہو تو جاؤ۔۔۔ میں تو یہاں سے نہیں جانے والی۔۔۔"

"ایں؟ یہ تمہارا اٹل فیصلہ ہے۔۔۔؟" مبین حیرت

سے پوچھ رہی تھی۔ ابھی انہیں آئے ہوئے سات دن ہوئے تھے اور نور عمر بھر کے لیے یہاں بسیرے کا ارادہ ظاہر کر رہی تھی۔

"یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" نور صاحبہ کی ترنگ ہی الگ تھی۔

"کیا تم نے میرے تایا کا کوئی لخت جگر تو پھانس نہیں لیا۔۔۔؟" مبین کے مشکوک انداز نور کو گڑبڑانے پہ مجبور کر رہے تھے۔

"تم مجھے ایسا سمجھتی ہو؟" وہ برا مان گئی تھی۔

"مجھے گھمانے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں بھی تمہاری کزن ہوں' مبین نام ہے میرا۔" اس نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا تھا۔ تب نور نے کانوں کو ہاتھ لگالیے۔

"میری ماں! مجھے معاف کر۔"

"ایک شرط پہ۔۔۔؟" مبین نے اسے آنکھیں دکھائی تھیں۔

"کیا؟" نور کا لہجہ تھوڑا مدھم ہوا۔

"تایا کے ایک لڑکے کو چھوڑ کر باقیوں میں سے جس کے ساتھ مرضی محبت کی "پینگیں" "ڈال لو۔" وہ شان بے نیازی سے بولی تو نور نے چیخ کر اس کا بازو دبوچ لیا تھا۔

"گھنی میسنی! خود مجھ سے ہر بات چھپاتی ہو؟ کس سے دل اٹکایا ہے تم نے۔۔۔؟" نور تو اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔

"کیوں بتاؤں۔۔۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔ تب نور نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

"تم نہ بتاؤ۔۔۔ میں خود پتا لگالیتی ہوں۔۔۔" اس نے کنپٹی ٹھکور کر پر سوچ انداز میں کہا تو مبین کی آنکھوں میں قوس و قزح کے رنگ اتر آئے تھے۔ لمحہ بھر کے لیے نور جیسے مبہوت ہوگئی تھی۔

"جس قدر میرا اندازہ ہے۔ اسی تناسب سے کہہ رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے تمہاری فاتح کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ بن رہی ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔۔۔؟" نور کے سنجیدہ انداز میں مبین کا سر اثبات میں ہل گیا تھا۔

"کیا تمہیں لگتا ہے فاتح بھی مجھ میں انٹرسٹڈ ہے۔۔۔؟" مبین کے انداز میں واضح جھجک تھی۔

"ان سات دنوں میں کیا پتا لگے گا؟ ابھی تو یہ سب لوگ ہمیں مہمان سمجھ کر بہت پروٹوکول اور کمپنی دے رہے ہیں۔" نور نے حقیقت میں ٹھیک تجزیہ کیا تھا۔

"کیا تمہیں نہیں لگتا فاتح مجھ میں انٹرسٹڈ ہے۔ اس کا بی ہیویئر' ایٹی ٹیوڈ؟ اس کا کیئرنگ انداز۔۔۔؟" مبین نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا تو نور کو بھی سوچنا پڑا۔ پچھلے سات دن سے جس قدر فاتح نے ان دونوں کو ٹائم دیا تھا یہ کوئی بھلانے والی بات نہیں تھی۔ وہ انہیں ہر چھوٹی بڑی جگہ پہ گھمانے لے کر گیا تھا ہر چھوٹے بڑے کیفے میں کھانا کھلایا تھا۔ شاپنگ' آؤٹنگ' ہلا گلا۔۔۔ کیا وہ اپنی ہر مہمان کزن کے ساتھ ایسا رویہ رکھتا تھا؟ اتنا ہی ٹائم دیتا تھا؟ اتنا ہی خیال رکھتا تھا؟ یہ باتیں سوچنے والی تھیں۔ نظرانداز کرنے والی نہیں تھیں۔ پھر نور کے ساتھ چاہے "مروتاً" ہی سہی تاہم مبین کے لیے اس کا لہجہ' انداز بہت ملائم ہو جاتا تھا۔

ان دونوں کی کیمسٹری بھی مل گئی تھی۔ ان دونوں کا مزاج بھی ایک تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ دونوں بہت ساری عادتوں میں ایک دوسرے کا پرتو تھے۔ ان کے شوق' دلچسپیاں' عادتیں بہت مشترک تھیں۔ نور تجزیہ کرتی تو بہت سے انکشافات ہوتے۔ ابھی کل کی بات تھی۔ وہ انہیں "فروٹی" میں آئس کریم کھلانے لے کر گیا تھا۔ سارے رستے ہنسی مذاق چلتا رہا۔ فرید اور فیضان بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے فجر کو بہت ساتھ چلنے کے لیے کہا' مگر اس نے نماز پڑھنا تھی سو معذرت کرلی' لیکن فاتح نے با آواز بلند ضرور کہا۔

"یہ حجرہ نشین ہے۔ کبھی بھی نہیں آئے گی۔۔۔ چاہے ناک کی لکیر کھینچ لیں۔۔۔" فجر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر وہ لوگ "فروٹی" پہنچ گئے تھے' مگر ہوا کچھ یوں کہ مبین کے فیورٹ فلیور کی آئس کریم دستیاب نہیں تھی اور مبین کو کوئی اور فلیور پسند نہیں تھا۔

یوں پورا شہر گھوم گھوم کر ہر چھوٹے بڑے پارلر کے سامنے گاڑی روک کر مبین کے لیے آئس کریم ڈھونڈنے کی فاتح نے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ حتیٰ کہ مبین نے کتنا ہی کہا تھا۔

"میں یہی کھالوں گی۔"

"خود پہ جبر کیوں۔۔۔؟ جب ہم تلاش کرسکتے ہیں تو کیوں نہ کریں۔۔۔؟" وہ بھی تو فاتح تھا۔ پوری شام اور آدھی رات گھماتا رہا۔ حتیٰ کہ ایک چھوٹے سے کون کارنر سے مبین کی فیورٹ آئس کریم "دریافت" ہوگئی تھی۔ تب انہیں اندازہ ہوا تھا۔ فاتح دھن کا پکا تھا اور کسی پہ "جبر" کرنا اور اس کی مرضی کے خلاف اسے مجبور کرنا قطعا" پسند نہیں تھا۔

نور اور مبین کو بھی اندازہ ہوگیا تھا جب فجر ایک دفعہ انکار کردیتی تھی تب پورا گھر اسے چاہے کتنی مرضی دلیلیں دے کر مجبور کرتا' فاتح بالکل بھی فجر کے خلاف اسے مجبور نہیں کرتا تھا بلکہ وہ سب کو سمجھاتا۔

"فجر کا موڈ نہیں۔۔۔ اسے تنگ نہ کریں۔۔۔ اس کی مرضی پہ اسے چھوڑ دیں۔" ایسے کئی واقعات نور اور مبین نے ان سات آٹھ دنوں میں دیکھے اور نوٹ کیے تھے۔ فجر آدم بے زار نہیں تھی تاہم شور شرابے سے بے زار ہوتی تھی۔ اسے ہوٹلنگ کرنا' گھومنا پھرنا' شاپنگ پہ جانا گھنٹوں تکرار کرنا ہرگز پسند نہیں تھا۔ وہ ایک خاموش کردار تھی۔ خاموش رہنا پسند کرتی تھی۔

اور اس وقت مبین اپنے اور فاتح کے مابین پانے والے اس ان چھوئے سے احساس نما رشتے کو پنپتا دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل جو محسوس کررہا تھا۔ وہ احساسات انتہائی کورے اور منفرد تھے۔ اس کی اب تک کی زندگی میں یہ موڑ نہیں آیا تھا۔ ایسا موڑ بالکل نہیں آیا تھا۔

اسے لگتا تھا۔ فاتح بھی اسے پسند کرنے لگا ہے۔۔۔۔

وہ اسے وقت دیتا تھا۔ اس سے بے تکلف ہوگیا تھا۔ ان دونوں کے مابین دوستی کا تعلق بن گیا تھا۔ اتنے مختصر دنوں میں یوں لگتا تھا وہ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں ان کی پسند ناپسند' عادتیں' مزاج سب یاد تھا۔

مبین کو یقین تھا۔ جس شاہراہ پہ وہ چل رہی ہے۔ جس سفر کو وہ "ہم سفر" کے لیے صدق دل سے قبول کررہی ہے۔ اس سفر میں ماہ مبین تنہا نہیں۔۔۔ فاتح اس کے ہمراہ ہے۔ اس کا یہ یقین باطل نہیں تھا۔ کیوں کہ اگلے آنے والے دنوں میں ماہ مبین کے ہر یقین پر مہر لگ رہی تھی۔ فواد بھائی کی مہندی کا فنکشن اپنے عروج پہ تھا۔ باہر کھلی جگہ پر شامیانے لگے تھے اور ایک دن پہلے ان کا پورا گھر مہمانوں سے بھر گیا تھا۔ بابا اور ماما بھی آچکے تھے۔ ویسے تو بابا ریٹائرڈ ہوچکے تھے۔ انہیں اپنے آبائی شہر مستقل آجانا تھا' لیکن ان دنوں مبین کے پورشن میں کچھ تبدیلیاں اور تزئین و آرائش چل رہی تھی۔

یقین واثق تھا کہ شادی کے فورا" بعد شفٹنگ ہوجاتی۔ گو کہ ماما کا ارادہ تھا مبین کی شادی کرکے ہی واپس آیا جاتا' لیکن بابا کی ضد تھی کہ شادی وہ یہیں کریں گے۔ اپنے شہر اور اپنے گھر میں۔

ماما کو بابا کی اکثر باتوں کو ماننا پڑتا تھا۔ جس طرح بابا' ماما کی باتیں مان جایا کرتے تھے۔ شاید اسی لیے ان کی گاڑی با سہولت چل رہی تھی اب تک۔ کیوں کہ جہاں سمجھوتہ کرنا پڑتا۔ بابا اور ماما سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ایک ہی بات پہ ایگری کرلیتے تھے۔

ماما نے بھی واپس یہاں آنے پہ کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اسی لیے بابا گھر فرنشڈ کروا رہے تھے اس دفعہ ماما کی آمد بھی یہاں سالوں بعد ہوئی تھی۔ اسی لیے تایا اور تائی کا بدلتا لائف اسٹائل دیکھ کر وہ بے انتہا متاثر لگ رہی تھیں۔ یوں کہ ان کے لبوں کو ایک قفل لگ گیا تھا۔

اب تائی بھی پہلے والی تائی کہاں تھیں؟ وہ تین تین فوجی آفیسر بیٹوں کی ماں تھیں اور باقی بیٹے بھی سب پروفیشنل ڈگریاں لے رہے تھے۔

تائی کے سمدھی بھی فوجی آفیسر تھے۔ فواد بھائی کے کور کمانڈر کی بیٹی تائی کی بہو بن رہی تھی۔ اس کے باوجود تایا اور تائی کی عاجزی اول روز کی طرح سلامت تھی نہ ان کی گردنوں میں سریا فٹ ہوا تھا اور نہ ان میں

غرور آیا تھا۔ شاید اللہ ایسے ہی درختوں کو پھل لگاتا ہے۔ جو جھکتے ہیں اکڑتے نہیں۔

اس رات جب مبین مہندی کے فنکشن میں تیار ہو رہی تھی۔ ماما نے اس سے عجیب بات کی۔

"تم نے لبنیٰ کی بیٹی دیکھی۔ کس قدر خوب صورت ہے۔" ان کا انداز بڑا عجیب سا تھا۔ اپنے کانوں میں جھمکا اڑستی مبین کچھ چونک گئی۔

"لبنیٰ؟ اچھا لبنیٰ پھوپھو؟ آپ فجر کی بات کر رہی ہیں۔؟" مبین نے سر ہلا کر پوچھا۔

"ہاں۔ وہی۔" ماما کا انداز زیر سوچ قسم کا تھا۔

"میں نے ایک چیز بہت نوٹ کی ہے۔" کچھ دیر بعد ماما نے مزید کہا تھا۔ مصروف انداز میں اپنے میک اپ کو فائنل ٹچ دیتی مبین چونک گئی۔

"کیا؟"

"فجر کا اس گھر پہ اور ان لوگوں پہ بہت ہولڈ ہے۔" ماما کا انداز اب بھی عجیب تھا۔ سوچتا ہوا مبین آئی لائنر لگاتی ماما کی طرف مڑ نہیں سکی تھی۔

"ہولڈ سے مراد۔؟" اس نے لائنر لگا کر ماما سے آنکھیں موندے موندے پوچھا تھا۔

"تم نے دیکھا نہیں۔ بھابھی تو اس کے بغیر قدم بھی نہیں اٹھاتیں۔ ہر جگہ فجر کو آگے آگے رکھتی ہیں۔ اسے واضح پروٹوکول دیتی ہیں۔ در پردہ وہ ان کو یہ جتانا ہوتا ہے کہ فجر کی اہمیت اس گھر میں بہت ٹھوس ہے۔" ماما کے الفاظ مبین کے لیے الجھے کا باعث نہیں تھے۔ وہ اس پہلو پہ بہت مرتبہ غور کر چکی تھی۔

"اگر وہ بھائی جان کی بھانجی ہے تو تم بھتیجی ہو۔ اس کے باوجود جو اہمیت وہ فجر کو دیتی ہیں۔ تمہیں نہیں دے رہیں۔ تم نے دیکھا نہیں۔ کس طرح پیار لڑوالی کو بلا کر زبردستی فجر کو مہندی لگوائی ہے۔ حالانکہ تمہارے ہاتھ بھی صاف ہیں۔ انہوں نے تمہیں تو نہیں کہا۔" ماما ایک واضح نکتے کی طرف اشارہ کرتی مبین کو بہت کچھ سوچنے پہ مجبور کر رہی تھیں۔ اس کے اندر ایک پھانس سی چبھ رہی تھی۔ واقعی تائی نے ایک مرتبہ بھی اسے مہندی کے لیے نہیں کہا تھا۔ مبین کو اندر ہی اندر افسوس ہوا۔ پھر اس نے سوچا تھا شاید وہ بھول گئی ہوں۔

"فجر کا اس گھر پہ سکہ چل رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے۔ فائز یا فاتح میں سے کسی ایک کو فجر کے ساتھ باندھ دیا جائے گا گو کہ وہ خوب صورت ہے، لیکن اس میں چارم نہیں۔ اس کی ڈریسنگ میں گریس نہیں۔ پرسنالٹی ایسی نہیں جو اتنے شاندار لڑکوں کے ساتھ یہ موو کر سکے۔ دونوں کے ساتھ زیادتی ہو گی۔" ماما کو اچانک فائز اور فاتح کے ڈوب جانے کے خیال نے بے چین کر دیا تھا۔

اور ایسی ہی کروٹ لیتی بے قراری نے مبین کا احاطہ کر لیا تھا۔ فاتح کے نام پہ اس کا دل ڈوبتا ابھرتا رہا۔

"ہرگز نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے آنکھیں بھینچ لی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دل کو کسی نے تلوار کے ساتھ دو حصوں میں تقسیم کر لیا ہو۔

"ایک بات سنو مبین۔!" ماما کچھ بے چین سی اس کے قریب آ گئی تھیں۔ مبین نے خالی خالی نظروں سے ماما کا چہرہ دیکھا۔

"بیٹا! میں چاہتی ہوں۔ تمہاری اپنے تایا کے گھر ہی بات بن جائے۔ تمہاری تائی بھی بائی نیچر نائس خاتون ہیں (اپنے مطلب کے لیے ماما نے تسلیم کر ہی لیا تھا) باہر رشتوں میں بہت چھان بین کرنا پڑتی ہے۔ اپنے ہر حال میں اپنے ہوتے ہیں۔ اس لیے تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ کچھ نہ کچھ کوشش کرو۔" ان کا واضح اشارہ سمجھ کر مبین کچھ اور گم صم ہو گئی تھی۔ کیا یہ جو کچھ کہا تھا ماما نے کہا تھا؟ کیا وقت ایسے بدل جاتا ہے؟ کیا حالات اس طرح پلٹ جاتے ہیں؟ اور رسی کے "بل" اس طرح نکل جاتے ہیں؟

ماما اسے اپنے تئیں سارے گر سمجھا کر باہر نکل گئی تھیں۔ تب مبین بھی گہرا سانس کھینچتی باہر آ گئی۔ اپنے مطلب اور مفاد کی خاطر ماما کچھ بھی کر سکتی تھیں۔ جتنا مرضی جھک جاتیں۔ اور کیا اپنے مفاد اور حق کے لیے کچھ کرنا غلط تھا؟ اور کیا غلط تھا؟ شاید نہیں۔ اور بالکل نہیں۔

زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔ اسے اپنی پسند سے گزارنا چاہیے۔ داؤ ایک ہی دفعہ چلتا ہے۔ سوچ سمجھ کے چلانا چاہیے۔ بازی ایک ہی مرتبہ ہاتھ میں آتی ہے۔ ذہانت سے کھیلنا چاہیے۔

وہ کیل کانٹوں سے لیس جیسے ہی راہداری میں آئی سامنے سے فاتح آتا دکھائی دیا تھا۔ وہ کافی عجلت میں لگ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں دو پھولوں کے گجرے تھے۔ چونکہ پیکٹ میں نہیں تھے اس لیے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ مبین کو آتا دیکھ کر رک گیا تھا۔ پھر اس کے چہرے پہ ستائش بھرے تاثرات ابھر آئے تھے جو مبین کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکے۔

بلاشبہ مبین کی پرسنالٹی بہت چارمنگ تھی۔ وہ اپنی ڈریسنگ سے بہت ماڈ لگتی تھی۔ اوپر سے ماڈرن ہیئر کٹ' خوب صورت انداز' اسٹائل وہ بہت اسمارٹ نظر آتی تھی۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں۔۔۔؟" اس نے اپنے ازلی پر اعتماد انداز میں بڑی بے تکلفی سے پوچھ لیا تھا۔ جواباً" فاتح نے اس کی کھل کر تعریف کی تھی لیکن اس تعریف میں اس کا انداز اسے گول مول لگا تھا۔

"اچھے لوگ ہر روپ میں ہمیشہ اچھے لگتے ہیں۔"

"اور میرا ڈریس۔۔۔؟" مبین نے ایک ادا سے مسکرا کر کہا تھا۔ اپنی ڈریسنگ کی طرف واضح اشارہ کرکے وہ اپنی ویل ڈریسنگ کی اس پر دھاک بٹھانا چاہتی تھی۔ اور پھر فجر کے "عام حلیے" اور "رف اسٹائل" کو جتانا بھی مقصود تھا۔ کیوں کہ مبین پہ اندر ہی اندر ایک "انکشاف" ہو چکا تھا کہ اس کے مقابل جب بھی آئی فجر ہی آئے گی۔ اور فجر کسی بھی طرح گلیمر' اسٹائل اور اپنی کیٹس میں اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی وہ ایک معمولی اور عام لڑکی تھی جس میں گلیمر نہیں تھا۔ چارم نہیں تھا۔ گریس نہیں تھا۔ وہ فاتح کے افسرانہ لائف اسٹائل اور اس کے سرکل میں کبھی موو نہیں کر سکتی تھی۔

"اور تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔۔۔؟" مبین نے اسے جانے کے لیے پر تولتے دیکھ کر جلدی سے پوچھا۔

"پھول' مطلب گجرے ہیں۔" مبین نے وضاحت کی۔

"کس کے لیے۔۔۔؟"

"فجر کے لیے۔۔۔"

"بس فجر کے لیے۔۔۔؟" مبین کو جھٹکا لگا۔

"امی نے دیے ہیں۔ ایک تم لے لو۔" اس کا انداز سادہ تھا۔ اور اس سادگی پہ کون نہ مرجاتا؟

"میں کیوں لوں؟ جس کے لیے تائی امی نے لیے ہیں یا بھیجے ہیں اسی کو دو۔۔۔" مبین بمشکل مسکرا کر کہا تھا۔

"آئی تھنک تمہارے اور نور کے لیے بھی منگوائے ہیں۔ باہر جاؤگی تو مل جائیں گے تمہیں۔۔۔" فاتح نے مسکرا کر جتایا۔

"تم لے آتے یہاں۔۔۔" جانے اس نے کیا سوچ کر کہا تھا۔ فاتح بھی لمحہ بھر کے لیے چپ ہوا جیسے کچھ سوچنے لگا تھا یا اس کے لفظوں کی گہرائی ناپنا چاہتا تھا۔ پھر کچھ سمجھ کر وہ مسکرا دیا۔

"یعنی میرے ہاتھوں سے تم نے لینے تھے۔۔۔؟" وہ اس کی سوچ تک رسائی کرتا اسے ورطہ حیرت میں مبتلا کر رہا تھا۔ مبین لمحہ بھر کے لیے دم بخود رہ گئی تھی۔ وہ اس کی سوچ تک کیسے پہنچ گیا تھا؟

"اس میں کچھ برا ہے۔۔۔؟" وہ ازلی اعتماد سے بولی تھی۔

"اوں۔۔۔ ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"تو پھر لے آتے نا۔۔۔" مبین نے جیسے اندر کی تمنا کو ظاہر کر دیا تھا۔ تب اس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں اس کے سامنے پھیلا دی تھیں۔

"ابھی یہ لے لو۔ امی' فجر کو اور دے دیں گی۔" اس کا انداز خاصا معصومانہ تھا۔

"پھر ایک دے دو۔۔۔" اس نے کہتے ہوئے اپنی کلائی آگے کر دی تھی۔ کیوں کہ گجرا وہ پہن نہیں سکتی تھی۔ فاتح نے سمجھ کر گجرے کی ہک کھولی اور لاک کر دی۔ ایک خوب صورت احساس اس کے آس پاس بکھر گیا تھا۔

"تھینک یو۔" وہ اندر تک مہک گئی۔ پھر یہی احساس اس کے ارد گرد بکھرتا رہا تھا۔ فاتح بھی آگے بڑھ گیا۔ سلمٰی کی تلاش میں فجر کو پکارتا جب وہ اس کے کمرے میں پہنچا تب وہ تیزی سے باہر نکلتی اس سے ٹکرا گئی تھی۔

"یا وحشت!" وہ درد سے کراہ اٹھی۔ اس کا ماتھا اس کے کندھے سے لگا تھا۔ فاتح شرمندہ ہو گیا۔

"بچ گئی ہو نا...؟" اس کے انداز میں فکر مندی تھی۔ وہ ماتھا سہلاتی خفگی سے اسے دیکھنے لگی۔

"سم قاتل ہو... اور پوچھتے ہو 'بچ تو گئی نا؟ سم قاتل سے بچا کون ہے؟" اس کا انداز بہت خفا خفا اور بھرا بھرا سا تھا۔ فاتح سمجھ کے لب بھینچ گیا۔

"فرصت مل گئی مجھ تک آنے کی؟" اتنے دنوں کا غبار تھا جو اسے دیکھ کر نکلنے لگا۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ وہ بھی بہت دن سے فاتح کی "مہمان نوازیاں" دیکھ دیکھ کر برداشت کر رہی تھی۔ آج اس کے سامنے کیا آیا تھا وہ موقع کی نزاکت بھلا کر پھٹ پڑی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" وہ جز بز سا ہوا۔

"بات تو ابھی ہو گی۔ ہوئی کہاں ہے؟" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے تب فاتح کو بے نیازی کا چولا اتارنا پڑا۔

"وہ مہمان ہے یار چلی جائے گی۔"

"مہمان نہیں ہے... وہ لوگ یہاں شفٹ ہو رہے ہیں۔ ہمارے برابر... ان کا پورشن فرنشڈ ہو چکا ہے۔" اس نے فاتح کو لاجواب کر دیا تھا۔

"مگر وہ آئی تو بطور مہمان تھی نا۔" اس کا لہجہ مدہم تھا۔

"وہ صرف تمہاری اکیلے کی مہمان نہیں ہے فاتح! وہ ہم سب کی مہمان ہے۔ اسے انٹرٹین فائق' فائز اور فرید بھی کر سکتے ہیں۔" اس کا لہجہ بلا کا سلگتا ہوا تھا۔ فاتح جیسے تھم سا گیا۔ وہ کہاں تک خفا تھی؟ کہاں تک تپی ہوئی تھی؟ اسے کہاں تک غصہ تھا؟

فاتح کو پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے سب سمجھ آ رہا تھا لیکن وہ کیا کرتا؟ کیوں کہ وہ "بے مروت" نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

ستاروں بھرے آسمان تلے نئی دولہن کو وداع کر کے لے آیا گیا تھا۔ آج فواد بھائی کی برات تھی۔ خوب گھما گھمی اور رونق لگی رہی۔ پورا فنکشن بہت انجوائے کیا تھا۔ واپسی پہ سب لوگ تھک ٹوٹ کر نڈھال ہو گئے تھے۔ پھر بھی فائق اور فرید نے لاؤنج میں محفل لگا لی تھی۔ فاتح آج کھنچا کھنچا سا تھا... لیکن جب محفل عروج پہ تھی تب مبین اسے نہ پا کر ان میراثیوں کے ٹولے سے بچی بچاتی اسے ڈھونڈتی ٹیرس پہ آ گئی تھی۔ وہ ستاروں بھرے آسمان تلے کھڑا تھا۔ عجیب سوچوں میں گھرا ہوا۔

وہ اکھڑی اکھڑی فجر کے رویے کو سوچ رہا تھا۔ اس کا رویہ بجا تھا؟ یا وہ فاتح پہ خفگی کا بار لاد کر زیادتی کر رہی تھی؟

کیا اس کا رویہ مبین سے بہت بے تکلفانہ تھا جو فجر کو کھل رہا تھا؟ یا وہ محض اپنی سلگن نکال رہی تھی؟ پھر مبین سے جلاپا کیوں؟ وہ تو اس قدر نائس تھی جولی' فرینکلی... ہنس مکھ... آہٹ پا کر فاتح کو گردن موڑنا پڑی تھی۔ اپنے پہلو میں مبین کو دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔ مبین ریلنگ پہ ہاتھ رکھے اپنے پورشن کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا پورا پورشن چمک رہا تھا۔ اس وقت ساری لائٹس آن تھیں۔ جالیوں میں سے اندر کا منظر روشن تھا۔

"ہم مہمان بلائے جان بننے سے پہلے اپنے پورشن میں شفٹ ہو جائیں گے۔" وہ مسکرا کر فاتح کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فاتح کو جھٹکا لگا۔ کہیں فجر نے مبین سے کوئی بات تو نہیں کر دی تھی...؟ اسے ایک دم فجر پہ غصہ آ گیا۔ یہ پہلی بدگمانی کی گرد تھی۔ یہ پہلی بدگمانی کی ضرب تھی جو فاتح کے دل میں گرہ سی پڑی۔

"یہ تمہارا اپنا گھر ہے مبین! تم خود کو مہمان کیوں سمجھتی ہو۔" اب کہ وہ کچھ خفگی سے بولا تھا۔

"یہ تو تمہاری محبت ہے۔" وہ مسکرا دی تھی۔

"محبت؟ تسلیم کرتی ہو۔۔۔؟" اس کے تنے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑے تھے۔ محبت کے ذکر پہ اسے فجر کا خیال آگیا۔

"محبت کو کون تسلیم نہیں کرتا۔۔۔؟" مبین نے الٹا سوال داغ دیا تھا۔

"تمہارے نزدیک محبت کیا ہے۔۔۔؟" وہ ایسے ہی برائے بات پوچھنے لگا۔ شاید اس جیسی لاپروا لڑکی کی رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔

"محبت؟" مبین لمحہ بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

"میرے لیے محبت ایک ایسے احساس کا نام ہے جو اچانک دل پہ وارد ہوتی ہے اور ہر چیز کو تہ و بالا کردیتی ہے۔" وہ ایک خواب آگیں لہجے میں کہہ رہی تھی۔ فاتح ذرا دیر کے لیے چونک گیا تھا۔ پھر اس کی فطری شرارت عود آئی تھی۔

"یعنی تم محبت کو "بھونچال" کہہ رہی ہو۔۔۔؟" اس کی آنکھوں میں ڈھیروں مسکراہٹ بھر گئی تھی۔ مبین جو کسی احساس تلے گم صم تھی لمحہ بھر کے لیے بھونچکی رہ گئی۔ پھر اس نے فاتح کو گھور کر دیکھا تھا۔

"حد ہے فاتح! محبت جیسے نرم و نازک احساس کو بھونچال کا نام دے دیا۔۔۔"

"اچھا' پھر تم بتاؤ۔" وہ معصوم بنا۔ مبین کچھ دیر سوچتی رہی تھی۔ پھر آنکھیں موند کر ایک جذب سے بولی۔

"محبت دریا کی شفاف لہروں میں طغیانی کا نام ہے جو سر چڑھ کے بولتی ہیں۔"

"ہوں۔۔۔ یعنی تمہارے نزدیک محبت "سونامی" سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے۔۔۔؟" وہ اتنی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا کہ پہلے تو مبین سمجھی ہی نہیں۔۔۔ پھر اس کے چہرے پہ چھائی شرارت دیکھ کر اس کا موڈ آف ہوگیا۔

"فاتح۔۔۔ بہت پچھتاؤ گے مجھ سے۔۔۔" اسے بری طرح تپ چڑھ گئی تھی۔

"دیکھو' میں تمہارا موڈ ٹھیک کرنا چاہ رہا تھا۔" فاتح نے اس کی خفگی مٹانا چاہی تھی۔

"موڈ تمہارا خراب تھا میرا نہیں۔۔۔ میں تمہارا موڈ ٹھیک کرنے آئی تھی۔" اس نے جتلا کر کہا۔

"ہیں؟ کیا واقعی۔۔۔؟" اس کی دلچسپی بڑھی تھی۔ یعنی مبین کو اس کی کمی محسوس ہوئی تھی اور جسے کمی محسوس ہونی چاہیے تھی اسے پروا نہیں تھی۔ اس کے دل پہ بوجھ سا آیا۔

"ہاں۔۔۔ میں تمہیں نیچے دیکھ رہی تھی۔ تم وہاں نہیں تھے۔ جان محفل جب محفل میں نہ ہوں تو محفلوں کے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں۔" اس کے انداز میں محسوس کیا جانے والا ایک دلنشین احساس بول رہا تھا۔

"ذرہ نوازی ہے جناب کی۔" وہ کورنش بجالایا تھا۔

"ویسے جب ہم چلے جائیں گے تو تم ہمیں مس کرو گے۔۔۔؟" اس نے لہجے کو حتی المقدور سرسری بنا کر پوچھا تھا۔ ریلنگ سے نیچے جھانکتا فاتح کچھ چونک گیا۔ نیچے صحن میں فجر کاکے سے اکا دکا چیزیں' کرسیاں اور قالین وغیرہ سمٹوا رہی تھی۔ کیا اس نے ان دونوں کو ٹیرس پہ دیکھا تھا؟

"تم لوگ کون سا سات سمندر پار جاؤ گے؟ یہیں برابر میں تو آنا ہے۔" اس نے فجر سے نگاہ ہٹا کر مبین کی طرف دیکھا تھا۔ وہ فاتح پہ ہی نگاہ جما کے کھڑی تھی۔ اسی پل فجر نے بھی نظر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لہر سی اٹھی تھی۔ تاریک رات کا ایک سایہ اس کے چہرے پہ لہرا گیا۔ جانے مبین کیا سننا چاہتی تھی؟ ایکدم چپ سی کر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اوائل گرما کی ایک ٹھنڈی اور خوشگوار شام میں ولیمہ بھی ہوگیا۔ ولیمے والے دن بھی مبین پورے فنکشن پہ چھائی رہی تھی۔ اس کی پرسنالٹی میں ایک مقناطیسی سحر تھا جو لوگوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتا تھا۔ پورے فنکشن میں مبین ہر ایک کی پرشوق نگاہ کا مرکز بنی رہی تھی۔ کچھ اسے خود کو نمایاں کرنے کے سارے راز' سارے طریقوں کا پتا تھا۔

لیکشن میں وہ حتی المقدور فاتح کے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ اس کی ماما کا ایک قول تھا کہ

"اپنی ذات کے لیے اپنی راحت اور خوشی کے لیے کوشش کرنا گناہ نہیں۔" سو مبین اپنے دل کی "راحت" اور "چین" کے لیے خود بخود سدباب کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ یہ گمنام سا تعلق بہت سی نگاہوں میں آکر "معنی خیز" بن گیا۔ پورے خاندان میں دبی دبی باتیں ہونے لگی تھیں۔ مبین اور فاتح کے تعلق پہ لوگوں نے "زبان خلق" والی مثال کو ثابت کردیا تھا۔ چونکہ فاتح کا قیام گھر میں تھوڑا عرصہ ہوتا تھا تو اس تک کم کم ہی باتیں پہنچی تھیں۔

جس دن شادی کے ہنگامے سرد ہونے کے بعد فاتح نے واپسی کا ارادہ کیا یہ اسی دن کی بات تھی۔ اس دن مبین بھی واپس جارہی تھی۔ اس کے ماما بابا اور نور تو پہلے ہی جاچکے تھے۔ قریب ایک ماہ بعد انہوں نے ادھر شفٹ ہوجانا تھا۔

فاتح اپنے روم میں تھا جب مبین اسے تلاش کرتی آئی۔ وہ فاتح کے ساتھ ہی واپس جارہی تھی۔

"تمہاری پیکنگ ہوگئی؟" مبین نے اندر آتے ہوئے پوچھا تھا۔ ان دونوں میں اتنی بے تکلفی تو ہوچکی تھی جو وہ بے دھڑک ایک دوسرے سے ہر بات کرلیتے تھے۔

"میری تیاری کا فجر کو پتا ہوگا۔ بیگ وہی تیار کرتی ہے۔ یقیناً اس نے کردیا ہوگا۔" فاتح نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تم اپنے ہاتھ بھی ہلالیا کرو۔" وہ صوفے پہ بیٹھتے ہوئے ڈپٹ کر بولی۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟ جب ہاتھ ہلانے والے موجود ہیں۔" اس کا اشارہ فجر کی طرف تھا۔

"فجر تمہاری "بری" میں تمہارے ساتھ جائے گی۔" مبین نے ناک چڑھا کر کہا۔ "کیا پتا ایسا ہو۔ فجر بری سمیت آجائے۔" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ مبین نے اسے مذاق ہی سمجھا تھا۔

بھلا کہاں فجر اور کہاں فاتح؟ وہ ایک گھریلو سی عام سی لڑکی تھی۔ جسے صبح کے ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک سب کی فکر ہوتی۔ فاتح چاول نہیں کھاتا۔ فرید دال نہیں کھاتا' فائز سبزی نہیں کھاتا۔ فراز روٹی نہیں کھاتا۔ سب کے لیے الگ الگ مینیو ترتیب دینے والی فجر بھلا فاتح جیسے گلیمر بندے کے ساتھ چل سکتی تھی وہ جسے کچن سے ہی فرصت نہیں تھی۔؟ وہ اپنے تمام خیالات کو جھٹک کر فاتح کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ہمیں کب تک نکلنا ہے؟" اس نے احتیاطاً پوچھ لیا تھا۔ ویسے وہ چاہتی تھی جلد از جلد یہاں سے نکل لیں۔ ابھی وہ کچن کی طرف سے ہو کر آرہی تھی جب اس کا فجر سے سامنا ہوا۔ وہ آنکھیں مسلتی شاید رو رہی تھی۔ جانے کیوں؟ مبین بھی رک گئی۔

"ہم لوگ جارہے ہیں فجر!" اس کا انداز اطلاع دینے والا تھا۔ ہم لوگوں سے مراد فاتح اور وہ خود تھی۔ فجر کے اندر پھانس سی اتر گئی تھی۔

"مجھے پتا ہے۔" اس کی آواز بھی بھرا رہی تھی۔ اور مبین جانتی تھی فجر بمشکل خود پہ قابو پا کر کھڑی ہے۔ پھر بھی جان بوجھ کر اسے بولنے پہ اکسا رہی تھی۔ جانے اسے کیا کھوجنا تھا۔ اور فجر کے منہ سے کیا سننا تھا؟

"میرا دل تو چاہتا ہے میں ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جاؤں۔" مبین کا انداز حسرت زدہ تھا۔

"تو رہ جائیں۔" فجر نے جانے کس دل سے کہا تھا۔

"ان شاءاللہ۔" مبین ہلکا سا مسکرادی۔

"میں اس گھر میں واپس آؤں گی۔ آفٹر آل میرے تایا کا گھر ہے۔" جانے فجر پہ یہ کیا جتلانا مقصود تھا؟ وہ کچھ سمجھ نہیں سکتی تھی۔

"اچھا۔ فجر چلتی ہوں میں۔ دیکھو فاتح کے میسج پہ میسج آرہے ہیں۔ آئی تھنک وہ اپنے روم میں ہے اور مجھے بلارہا ہے۔ بے بی بور ہورہا ہو۔" اس نے موبائل کی طرف توجہ دے کر بڑے محسوس کروانے والے انداز میں کہا تھا یوں کہ فجر نے جھٹکا کھا کر اس کی طرف دیکھا۔ گویا اسے مبین کی بات پہ یقین نہ آیا ہو۔

جب کہ مبین ایک دم بے نیاز بن گئی تھی۔ جب وہ فاتح کی تلاش میں اس کے روم کی طرف جا رہی تھی تب بھی وہ جانتی تھی کہ فجر کی "بے یقین" نگاہیں اس کی پشت پہ جمی ہیں۔ اور ان حیرت سے کھلی آنکھوں میں بے انتہائی بھی ہوگی۔

اب مبین اس پہ ترس کھا کر اپنی "ناؤ" کیسے ڈبو ڈالتی؟ اپنے دل کی خوشی کو برباد کیسے کر لیتی؟ فجر کو صبر کرنا چاہیے تھا۔ صبر سے کام لینا چاہیے تھا۔ کیونکہ ہر اچھی چیز قسمت میں نہیں بھی ہوتی۔ اور اس وقت وہ فاتح کے روم میں بڑی شان سے کھڑی تھی۔

"ہم بس نکلتے ہیں مبین! تم امی وغیرہ سے مل لو۔ کاکا تمہارا سامان ڈگی میں رکھ آیا ہے۔" فاتح بھی اپنی جگہ سے عجلت میں اٹھا تھا اور پھر باہر نکل گیا۔ کوریڈور میں فجر کھڑی تھی۔ دو سوٹ کیس اور ایک ہینڈ کیری کو باہر بھجوا رہی تھی۔ شاید یہ ہینڈ کیری فاتح کی تھی۔ مبین اس کے قریب سے گزر کر تائی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ تائی نے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا تھا پھر وہ اردگرد پھیلائے کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔

"جو سوٹ تمہیں پسند ہیں لے لو۔ اور یہ رنگ تمہارے لیے۔ فجر کو بھی دی ہے۔ فواد کی طرف سے۔ اس کی بہنیں تو تم دونوں ہو۔" انہوں نے کمال محبت سے مبین کو سونے کی رنگ پہنائی تو وہ بے انتہا خوش ہوگئی تھی۔

"فواد بھائی اور عزہ بھابھی جانے کب آئیں گے۔ ان سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ اور تھینک یو تائی امی؟" اس نے تائی کے گلے میں بانہیں ڈال کر لاڈ سے کہا تھا۔

"تھینک کیوں؟ یہ تمہارا حق ہے۔" انہوں نے مبین کو کندھے پہ پیار کیا۔

"اب تم جلدی سے یہاں آجاؤ۔"

"میرا تو جانے کو دل نہیں کر رہا۔" اس نے ٹھنک کر اہمیت لینے کی غرض سے جتلایا تھا۔

"تو آجاؤ بیٹا! سجیلہ اور علیم بھی تو آنے والے ہیں۔"

"میرا اپنے پورشن میں نہیں۔ آپ کے گھر میں رہنے کو دل کرتا ہے۔" اس نے اپنے دل میں دلی خواہش کو ظاہر کر دیا تھا۔ تائی امی لمحہ بھر کے لیے چونکی تھیں پھر بے ساختہ مسکرادیں۔

"کیوں نہیں۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ تم بالکل نہ جاؤ۔ میں علیم اور سجیلہ سے بات کر لیتی ہوں۔" انہوں نے ساتھ ساتھ لگا کر نرمی سے کہا تو مبین کے اندر خوشی کی لہر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سامنے درختوں پر رنگ اشہب پھیل رہے تھے۔ عنبر کی سیاہی کا عکس ماحول پہ بھی چھایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ فضا بھی معطر تھی۔ عطر آگیں کا احساس نتھنوں سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ "عنواں زندگی" کو سوچتی بہت دل برداشتہ تھی۔ یوں لگتا تھا عمر بھر کی پونجی لٹنے کے قریب ہے۔ یا کوئی ان چھوا خواب مٹھی سے پھسلنے اور ہاتھ سے گرنے کے قریب ہے۔

معاً "دل میں اٹھتی ٹیسوں کو کسی کے قدموں کی آہٹ نے اندر ہی اندر دبا دیا تھا۔ فجر نے مڑ کر دیکھا وہ "دشمن جان" سامنے ہی استادہ تھا۔ وہ آنکھوں میں تیرتی نمی کو چھپانے کے لیے سر کو جھکا گئی تھی۔ معاً" وہ نپے تلے قدم اٹھاتا اس کے سامنے آگیا۔ یوں کہ فجر کو آنسو "پی" لینے کے بعد سر اٹھا کر اسے دیکھنا ہی پڑا تھا۔

"میں تمہارے اس اکھڑے رویے سے کیا نتیجہ اخذ کروں؟" کچھ دیر بعد اسے فاتح کی آواز سنائی دی تھی۔ یقیناً" وہ جلدی میں تھا۔ اسی لیے بغیر تمہید کے مطلب کی بات پہ آگیا تھا ویسے بھی وہ لمبی بحث میں نہیں پڑتا تھا۔ فجر اس کے لہجے کی سختی پہ لمحہ بھر کے لیے بھونچکی رہ گئی تھی۔ یعنی یہاں تو الٹے چور والی مثال صادق آگئی تھی۔ وہ حیران ہوتی ہوتی غصے میں آگئی۔

"اگر یہی سوال میں تم سے کروں؟" اس کا چہرہ بلا کا سرخ ہو گیا تھا۔

"تو کر سکتی ہو میں جواب دے دوں گا۔" فاتح کا اعتماد

قابل دید تھا۔

"جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ اسے میں کیا سمجھوں؟" فجر کے لہجے میں کیا کچھ نہیں تھا؟ غصہ' اہانت' اپنے نظرانداز کیے جانے کا دکھ۔

"تمہاری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟" فاتح نے بھی تیوری چڑھا کر پوچھا تھا۔

"شاید تم نے کان بند کر رکھے ہیں۔ ہر ایک کی زبان پر سوال۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔ تم اور مبین" شدت ضبط کے باوجود فجر کا اختیار خود پہ نہیں رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ اس کے آنسو دیکھ کر فاتح بری طرح سے جھنجلا گیا تھا۔

"یہ رونا تو بند کرو۔"

"اب رونے پہ بھی اعتراض ہے؟ نجانے آگے کس کس بات پر اعتراض ہوگا۔" فجر بھی پھٹ پڑی تھی۔

"تم انتہائی احمق ہو۔" وہ غصے میں بولا۔

"اب یہی کہو گے۔ مبین جو نظر آگئی ہے۔ اس کے سامنے میں جاہل' احمق' بدھو ہی نظر آؤں گی۔"

"فضول بکواس نہیں ہوگی فجر! اپنی اور میری بات کرو۔ باقی چھوڑو۔" معاً اس کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔

"اپنی اور تمہاری کیا بات کروں۔ بیچ میں جب اور لوگوں کو کھڑے کرلو گے؟" فجر کا لہجہ بھی دھیما پڑ گیا۔

"غلط بات نہیں چلے گی فجر! میں نے کہا نا۔ جو تم سوچ رہی ہو۔ ایسا کچھ نہیں۔ میرے لیے جو تم ہو اور کوئی نہیں۔ کیا اسٹامپ پیپر پر لکھ دوں؟" فاتح کے لہجے میں نرماہٹ بھر گئی تھی۔ اسے اپنی غلطی بھی سمجھ آگئی۔ فجر کی ناراضی بجا تھی۔ اس نے واقعی فجر کو بہت نظرانداز کیا تھا۔ لیکن یہ دانستہ ہرگز نہیں تھا۔

"کیا واقعی؟" فجر کی بدگمانی بس یہیں تک تھی۔

فاتح نے دو میٹھے بول کیا اس کی ساعتوں میں اتارے وہ پچھلی ہر بات بھول گئی تھی۔ فجر اس کی محبت میں ایسی ہی دیوانی تھی۔

فاتح کو بھی احساس ہو رہا تھا مبین کی "میزبانی" کے چکر میں اس نے فجر کے ساتھ زیادتی کی تھی اس کا معصوم دل کس قدر دکھا ہوگا؟

لیکن ایک لحاظ سے وہ فجر کو جتانا چاہتا تھا کہ اسے دوسروں کو دیکھ کر خود سے تبدیلی لانی چاہیے۔ اپنی پرسنالٹی کو گروم کرنا چاہیے۔ گھر کی باؤنڈری وال سے باہر نکلنا چاہیے۔ فجر کسی سے کم نہیں تھی۔

فاتح اسے سمجھاتا تو وہ سمجھ جاتی۔ لیکن یہاں بھی فاتح کی غلطی تھی۔ وہ ہر بات اس سے کرتا تھا۔ لیکن یہ بات نہیں کرتا تھا کیونکہ اس کے اندر کا روایتی مرد فجر کو بس اپنی نگاہ کے "حصار" میں رکھنا چاہتا تھا۔ اپنے دل اور گھر کی باؤنڈری وال کے اندر دیکھنا چاہتا تھا۔ اور اس میں کچھ برا تھا؟

☆ ☆ ☆

"کبھی کبھی لمحوں کی لغزش اور دل کی ذرہ بھر تبدیلی عمر بھر کا روگ بن جاتی ہے۔ مبین کے لیے تایا کے گھر سے واپسی کا سفر بڑا کٹھن اور محال تھا۔ وہ دل پہ نادیدہ بوجھ لے کر آئی تھی۔ وہ اپنے خواب' تمنائیں اور دل پرایا کر آئی تھی۔ اسے فاتح سے محبت ہو گئی تھی۔

ماما کو اس کی کیفیت پہ ہول اٹھتے تھے۔ وہ اس کے اردگرد چکراتی رہتی تھیں۔ مبین ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ اسے ہمیشہ خوش اور شاد باد دیکھنا چاہتی تھیں۔ اسے بولایا بولایا پھرتا دیکھ کر تفکر کے گھیرے میں آجاتی تھیں۔

"مجھے تمہاری بہت فکر ہے مبین! تم ایسی تو نہیں تھی۔"

"مجھے اس نے ایسا ہی بنا دیا ہے ماما! میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔" ایک دن وہ سجیلہ کی گود میں سر رکھ کر رو پڑی تھی تب سجیلہ کو سمجھ میں آیا۔ مبین فاتح کی محبت میں بہت آگے تک جا چکی تھی۔

"کیا فاتح کا تمہارے ساتھ کوئی کونٹیکٹ ہے؟" سجیلہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

"جی۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے؟ وہ تم میں انٹرسٹڈ ہے؟" وہ نجانے کیا پوچھنا چاہتی تھیں۔ اس نے گہرا سانس

بھرا۔

"واضح تو کچھ نہیں۔ لیکن اتنا مجھے یقین ہے۔ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ مجھ سے متاثر ہے۔" مبین نے کچھ سوچتے ہوئے بتایا تھا۔

"تم اس کو کہونا۔ اپنا پرپوزل بھیجے۔" انہوں نے بے چینی دبا کر کہا۔

"میں کیسے کہہ سکتی ہوں۔" ماما! بہت برا لگے گا۔ وہ اتنا بھی لبرل نہیں۔ میری یہ بات ہضم کر جائے۔" مبین کو ماما کے مشورے میں کامیابی کا کوئی چانس نظر نہیں آتا تھا۔ کیا اسے اتنا بولڈ اسٹیپ لینا چاہیے تھا؟ اور جب نور اس کی "کیفیات" پر چونکنا ہوئی تب اس نے نور تک اپنی "بے بسی" کی ہر اذیت پہنچادی تھی۔ وہ اس کی دوست تھی اس کی تکلیف پہ تڑپ گئی۔ تاہم مبین کے جذبات کو دیکھ کر اس کی سوچوں کے کئی ابواب کھل گئے تھے۔ وہ اس گھر میں چند دنوں پہ محیط قیام کے بعد اتنا اندازہ تو کر چکی تھی کہ باقاعدہ طور پر نہ سہی پھر بھی فجر اور فاتح کے درمیان کوئی رشتہ ضرور ہے۔ گھر کے ملازم کاکے کی زبانی بھی نور کو ان دونوں کے غائبانہ رشتے کا پتا چلا تھا۔

"فاتح پائی جان اور فجر باجی کی شادی ہوگی وڈی آپا جی (تائی) نے ان کا بچپن میں رشتہ پکا کر دیا تھا۔" کاکا اتنا زبان دراز نہ ہوتا تو انہیں اس حقیقت کا پتا بھی نہ چلتا۔ پھر فجر کی اس گھر میں بہت مضبوط حیثیت تھی۔ کہیں بھی فجر کی حیثیت کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نور کو نہیں لگتا تھا مبین کی تائی فجر پہ مبین کو فوقیت دیتیں۔ وہ فجر سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اور فجر کی جگہ مبین نہیں لے سکتی تھی۔ مبین کو ایک ہی صورت میں من کی مراد مل سکتی تھی۔ جب وہ فاتح کے دل تک رسائی حاصل کر لیتی اور فاتح کو فجر سے بدگمان کرتی۔ گو مبین مانتی یا نہ مانتی نور نے خود محسوس کیا تھا۔ فاتح کے دل میں فجر کے لیے سوفٹ کارنر موجود تھا۔ اور اس وقت وہ مبین کو یہی بات سمجھا رہی تھی۔

"مبین! تم نے غلط جگہ دل اٹکایا ہے۔ اس گھر میں تمہیں کوئی اور نہیں ملا تھا؟" وہ خاص خفگی سے اسے گھرک رہی تھی۔

"کوئی اور یعنی فائز؟ کیپٹن فائز تھا تو سہی۔" اس نے چمک کر کہا تو نور بے ساختہ نظریں چرا گئی تھی۔

"فائق بھی تو تھا۔ اتنا پیارا اور ہنس مکھ۔" نور کی آواز کمزور تھی مبین ہنس پڑی۔

"یہ دل کے فیصلے ہوتے ہیں میری جان! چھان پھٹک کے نہیں ہوتے۔ ورنہ تم بھی فرید یا فائق پہ نظر رکھتیں فائز پہ نہیں۔"

"جو فائز ہے وہ تو کوئی بھی نہیں۔" نور نے زیر لب بڑبڑا کر کہا۔ وہ جیسے لاجواب ہوگئی تھی۔

"اور جو فاتح ہے اس جیسا بھی کوئی نہیں۔" مبین کے اندر میٹھا میٹھا درد پھیلنے لگا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے فاتح کوئی اسٹینڈ لے گا۔" نور اسے اصل بات کی طرف لے آئی تھی۔ مبین نے گہرا سانس کھینچ لیا۔

"اسے اسٹینڈ لینا پڑے گا۔" مبین کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا جو اسے ٹھٹکا گیا۔ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہاں پر ایک عزم تھا۔ کچھ کر دکھانے کی لگن تھی۔ نور کو عجب سا ڈر لگا۔ اسے مبین کے ارادوں سے خوف آیا تھا۔

"فاتح مان جائے گا۔ کیا اس کی ماں بھی مان جائے گی۔ وہ بھی اس صورت میں جب فجر اس کی منگیتر ہے۔"

"وہ بچپن کی منگیتر۔" نور کے اگلے سوال نے لحہ بھر کے لیے مبین کو بھونچکا کر دیا تھا۔ لیکن یہ کیفیت لحاتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس "دھچکے" سے سنبھل گئی تھی۔

"وہ بچپن کے رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی' یہ توڑے بھی جاسکتے ہیں۔" وہ سفاکی کی حد تک پر اعتماد تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ برسات کے دن تھے۔ انتہائی گیلے گیلے' حبس زدہ۔ بارش کے بعد کچھ ہی دیر تک موسم خوشگوار رہتا

تھا۔ پھر زمین حبس اور حدت چھوڑ دیتی تھی۔ ہوا بند ہو جاتی۔ اور گرمی کا زور بڑھنے لگتا تھا۔

اس چھوٹے سے شہر میں لائٹ بھی بہت جا رہی تھی۔ اور ایکٹوٹیز بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ نہ کلب تھا۔ نہ جم نہ کوئی اور تفریح اس کے باوجود سبین بہت خوش اور مگن تھی۔ قریب قریب تین ہفتے پہلے وہ لوگ اپنے گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ بابا کو تو یہاں بہت مصروفیات مل گئی تھیں۔ یا وہ تایا کے ساتھ دوستوں میں نکل جاتے تھے۔

ماما کی مقامی کالج میں ٹرانسفر ہو چکی تھی۔ وہ اپنے کالج میں بزی رہتی تھیں۔ نور ان دنوں اپنے انکل کے پاس گئی تھی۔ سو سبین اکیلے پن کو انجوائے کر رہی تھی گو کہ اس انجوائے منٹ میں کبھی کبھی بوریت کا عنصر بھی آجاتا تھا۔ لیکن ایک احساس اسے کبھی بھی مایوس نہ ہونے دیتا۔ اور وہ احساس تھا فاتح کی واپسی کا احساس۔

وہ دن میں کئی کئی گھنٹے اس سے فون پہ ان ٹچ رہتی تھی۔ زیادہ تر وہی میسج کرتی تھی۔ وہ جتنا بھی مصروف ہوتا رپلائی ضرور کرتا تھا۔ اور یہ اس کے لیے اعزاز تھا۔ اس کا التفات سبین کے لیے ہفت اقلیم کی دولت تھی۔

اس دن سبین بہت خوب صورت سا ڈریس پہن کر برابر والے گھر آئی تھی۔ اس کا اکثر وقت یہیں گزرتا تھا۔ یوں فجر سے بھی نہ چاہتے ہوئے گپ شپ رہتی۔ جب وہ تایا کی طرف آئی اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا۔ فجر کچن میں مصروف تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سو وہ لنچ تیار کر رہی تھی۔ سبین کو دیکھ کر فجر کچھ سنجیدہ ہو گئی۔ اتنے گرم اور پر حدت ماحول میں سبین کس قدر تروتازہ گلاب کا عکس لگ رہی تھی۔ انتہائی فریش اور کھلی کھلی۔ اوپر سے نت نئے کٹنگ کے اسٹائل۔ انتہائی مہنگے اور دیدہ زیب لباس۔ اوپر سے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا۔ وہ اتنی خوب صورت نہیں تھی۔ مگر لگتی بہت خوب صورت تھی۔ پورے منظر میں رنگ بھر دیتی تھی۔ پورے منظر پہ چھا جاتی تھی۔ فجر کو اپنا آپ اس کے سامنے بہت ہی "میلا" لگا تھا۔ خاصا بدبودار۔ ایک تو سخت گرمی تھی۔ اوپر سے پسینہ بہ رہا تھا۔ سبین کو کچن میں دیکھ کر فجر نے کہا۔

"یہاں بہت گرمی ہے۔ آپ باہر چلیں میں ہانڈی اتار کے آتی ہوں۔"

"اٹس او کے تم بھی تو کھڑی ہو۔" سبین لاپرواہی سے بولی تھی۔ ٹماٹر کاٹتی فجر لحہ بھر کے لیے چپ کر گئی۔ "میں تو عادی ہوں۔" اس کا انداز سادہ سا تھا۔

"تو میں بھی عادی ہو جاؤں گی۔" وہ مسکرا دی تھی۔ اس "مسکراہٹ" میں کیا کچھ جتلانا مقصود تھا؟

"آپ؟" فجر اتنا حیران ہوئی کہ ٹماٹر کاٹنا ہی بھول گئی۔

"ایکچوئلی! تایا جان میرے بابا سے مجھے مانگنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" اس نے اتنی بڑی بات اتنے آرام سے کہہ دی تھی۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر فجر کسی سے پوچھ لیتی؟ لیکن اسے یقین تھا فجر میں ایسے کس بل ہی نہیں ہیں۔ نہ اتنا اعتماد ہے اس سے کوئی سوال جواب کر سکتی۔

"واقعی؟" اب کہ اس کے ہونٹ بے آواز ہلے تھے۔

"تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔" وہ برا مان گئی تھی۔

"نہیں۔" فجر نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ لیکن اس کی حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ ابی اسے اپنے کس بیٹے کے لیے مانگنا چاہ رہے تھے؟ لیکن ازلی جھجک کے باعث چپ رہی۔

"بائی دے وے اس سنڈے کو فاتح آ رہا ہے۔" اب وہ ایک مرتبہ پھر مسکرا کر فجر کے "حواس" اڑا رہی تھی۔ فجر کے ہاتھ سے ٹماٹر گر گیا۔ وہ اتنا حیران ہوئی کہ اس سے اپنی حیرانگی چھپائی نہیں گئی تھی۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" بہت دیر بعد اس نے سوکھے ہونٹوں پہ زبان پھیر کر پوچھا تھا۔ تب سبین جیسے اس کی عقل کو کوستی موبائل سامنے کر کے بولی۔

"اس کا مجھ سے کونٹیکٹ ہے۔ اپنی دن بھر کی

مصروفیات اور شیڈول بتاتا ہے مجھے۔" مبین کے انداز میں واضح طور پر اسے جلانا مقصود تھا۔ فجر کو زور کا چکر آیا۔ یہ ممکن تھا؟ کیا یہ ممکن تھا؟ وہ اپنے آنے اور جانے کی خبریں۔ مبین کو دیتا؟ فجر کو کچھ نہ بتاتا۔ اور اتنے دنوں سے کوئی رابطہ بھی نہیں تھا۔ فجر کو لگا اس کا دل جلتی ریت پر پڑا لوٹنیاں لے رہا ہے۔ اس کے حواس گم ہو رہے تھے۔

"اچھا وے، چلتی ہوں۔ تائی جان کو بتانا میں آئی تھی۔ اور یہ بھی بتانا ڈنر وہ ہمارے ساتھ کریں گی۔" وہ ایک ادا سے اپنے اسٹائلش بالوں کو جھٹکتی باہر نکل گئی تھی جبکہ فجر کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا۔ ہر چیز کو تہس نہس کر دے۔ یا اور کچھ نہیں تو گلا پھاڑ کر اونچی آواز میں رو لے تاکہ دل کی ساری بھڑاس نکل جائے۔ اس کے اندر حبس بھر رہا تھا۔ گھٹن اس کی سانسوں کو دشوار کر رہی تھی۔ آکسیجن ختم ہو رہی تھی۔ فجر جیسے مر رہی تھی۔ معا" کاکے کی اونچی پکار نے فجر کو چونکایا تھا۔

"فجر باجی! جلدی آئیں۔ کال آئی ہے۔ جان جہاں، راحت جان کی۔ کامرہ سے صاحب پکارتے ہیں۔"

"جان فجر! ذرا رات کو پہلو سے نکل۔" کاکا سیم فاتح کے الفاظ دہراتا لمبے لمبے دانت نکالے مسکرا رہا تھا۔ وہ بمشکل فون تک آئی تھی۔ تب کاکے نے ریسیور سے منہ لگا کر دوسری طرف اطلاع دی۔

"ماؤنٹ ایورسیٹ کو سر کر کے آئی ہیں۔"

"پھر کس تمغے سے نوازیں۔" دوسری طرف سے انتہائی بشاشت بھرے لہجے میں پوچھا گیا تھا۔

"تمغہ خاص شادی خانہ آبادی۔" وہ بھی تو کاکا تھا۔ ان ہی کا شاگرد۔ نہلے پہ دہلا۔ سیر پہ سوا سیر۔ فاتح نے اس کی بات کو خوب انجوائے کیا۔

"آبادی یا بربادی؟"

"فجر باجی کے ساتھ ہوئی تو گارنٹی دوں گا آبادی کی۔ کسی اور کی ضمانت میں نہیں اٹھا سکتا۔" کاکے نے اپنی عمر سے بڑی بھڑک ماری تھی۔ فاتح خوب ہی ہنستا رہتا۔

"فجر باجی کے علاوہ اور کون ہے؟" وہ بڑی دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔ "یہ تو آپ کو پتا ہو۔" اس نے صاف خود کو بچایا۔

"بڑی چیز ہے تو کاکے۔" فاتح نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ "ذرا جان فجر کو بلا۔ تیری شکایتیں لگاتا ہوں۔"

"دیکھ لیں میں بھی آپ کے راز آؤٹ کر دوں گا۔" کاکے نے بھی جوابا" دھمکی دی تھی۔

"میرے راز۔" اس نے غصے سے کہا۔

"بھول گئے کیا؟ وہی جو آپ مبین باجی سے مل کر فجر باجی کی سالگرہ کا پلان بنا رہے تھے۔" اب کے کاکے نے آواز دھیمی کر لی تھی۔ وہ نہ بھی آواز دھیمی کرتا تب بھی فجر کا کون سا ان کی طرف دھیان تھا۔ وہ تو ابھی تک ایک ہی سلگتے منظر میں کھوئی تھی۔ مبین کا انداز، لب و لہجہ اور فاتح کے ساتھ "رابطوں" کے انکشافات۔ فجر کا تن من سلگ رہا تھا۔

"خبردار! تو نے "ہوا" بھی نکالی۔ تیرا بھرکس نکال دوں گا کاکے۔" اس نے دھمکی دی تھی۔ کاکا اس کی دھمکی سے ڈر گیا اور ریسیور فجر کو تھما کر نو دو گیارہ ہو گیا تھا۔ اور ادھر فجر کتنی ہی دیر تک ریسیور کو ہاتھ میں پکڑے گم صم کھڑی رہی تھی۔ حتیٰ کہ "ہیلو ہیلو" کی بے چین آوازوں نے اسے گہرا سانس کھینچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس کے سانس لینے سے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ فون پہ موجود ہے۔

"فجر!" اس نے نرمی اور حلاوت کی حد کرتے ہوئے لہجے میں شیرینی گھول کر پکارا تھا۔ فجر کو اس کا انداز گولی کی طرح لگا۔ اس کے اندر سلگتی آگ کچھ اور بھڑک گئی تھی۔

"چپ کیوں ہو۔ بولتی کیوں نہیں۔" فاتح نے سابقہ نرمی بھرے لہجے کو برقرار رکھا تھا تب بڑی ہمت کر کے فجر کو اپنے "حواسوں" میں آنا پڑا۔

"کیا بولوں؟" اس کا انداز سلگتا ہوا پر اذیت تھا۔ وہ پھاڑ کھانے کو نہیں دوڑی تھی۔ اس کے لہجے میں واضح شکستگی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اب کہ فاتح

کچھ متفکر ہو گیا تھا۔

"طبیعت تو تمہاری بگڑ رہی ہے۔ میں تو فٹ ہوں۔" فجر کو لگنا پڑا۔

"اور میں آل ریڈی فٹ ہوں۔" وہ اس کا "طنز" سمجھ نہیں سکا تھا۔

"پر مجھے نہیں لگتے۔"

"لوں گا تو فٹ کر دینا ٹھیک ہے۔" فاتح نے مسکرا کر ماحول کی کثافت کو کم کرنا چاہا۔ اسے لگ رہا تھا فجر کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ یا وہ بہت الجھی الجھی ہے۔

"کیوں؟ تمہارے "مسیحا" چھٹی پہ چلے گئے ہیں؟" اس نے کھرے کاٹ دار لہجے میں "وار" کیا تھا۔ فاتح لمحہ بھر کے لیے کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ شاید وہ اس کے اکھڑے رویے کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔

"میں سمجھا نہیں فجر! مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ۔ تمہیں ہو کیا رہا ہے۔" "اس قدر روکھی کیوں ہو۔ مبین بھی تمہاری وجہ سے پریشان تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے میسج کیا تھا اور کال بھی۔ وہ تمہاری وجہ سے خاصی متفکر تھی۔ تمہیں کیا ہے فجر!" اس نے نرمی سے تفصیلاً جواب دیا اور استفسار کیا تھا۔ اب کہ فجر پوری کی پوری چونک گئی تھی۔

"مبین نے۔ اس نے کیا کہا؟ اور تم اس سے رابطے رکھا کرو۔ ہمیں تو آنے کی اطلاع نہیں دیتے۔" وہ غصے سے پھٹ پڑی تھی۔

"ابھی اطلاع دینے کے لیے کال کی ہے۔" فاتح نے سابقہ حلاوت برقرار رکھی تھی۔

"مجھے "باسی" اطلاع نہیں چاہیے۔" وہ بھڑک کر بولی تھی۔ اسے مبین کی بات بھی یاد آئی۔

"فاتح اس سنڈے کو آرہا ہے۔" اس کا رواں رواں سلگ گیا تھا۔ اسے جی بھر کے رونا آیا۔

"تمہیں پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ ہر وقت گلے پڑتی ہو۔ تم سے اچھی تو مبین ہے۔ اتنی اچھی گفتگو کرتی ہے۔ بندہ بور ہو تا بھی فریش ہو جائے۔" غیر ارادتاً اس کے منہ سے مبین کی تعریف میں الفاظ پھسل گئے تھے۔ اور اتنا کہنا عذاب ہو گیا۔ فجر کو یوں لگا جیسے فاتح نے اسے چابک سے مارا ہو۔ یا وہ مبین کو اس پہ فوقیت دے رہا تھا۔

"کیا مبین اچھی ہے مجھ سے؟ ہاں وہ بہت اچھی ہے۔ تمہیں وہی سوٹ کرتی ہے۔ اس کی تعریفیں کرو۔ میں تو اجڈ ہوں۔ عام ہوں۔ کسی کام کی نہیں ہوں۔ تمہیں میں کیوں اب اچھی لگوں گی۔" فجر کے منہ میں جو آیا وہ بولتی چلی گئی تھی یہاں تک کہ فاتح کا دماغ بھی کھول گیا۔

"تمہاری کھوپڑی کے اندر کھوتے کا بھیجا فٹ ہے اور کھوتے سے کسی "عقل مندی" کی توقع نہیں کی جاتی۔" فاتح نے غصے میں چلا کر کہا۔

"اور مبین بہت اعلا ارفع ذہین "فطین" اور قابل ہستی ہے۔" وہ رونے لگی تھی۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔" فاتح نے جلتی پہ تیل ڈالا تھا۔

"مبین کا اکیڈمک ریکارڈ اتنا شاندار ہے کہ حد نہیں۔"

"اس کے میڈلز کو اپنے گلے میں ڈال لو۔" فجر نے زہر بجھے لفظ پھینکے۔

"کیوں نہیں۔ میرے لیے اعزاز ہو گا۔" اس نے مزید اسے جلایا تھا۔ فجر جیسے ہمیشہ کے لیے "بے دم" ہو گئی۔

"تم بدل گئے ہو فاتح۔" فجر کی آواز بے جان تھی۔ فاتح کو اب کہ کچھ احساس ہوا۔ وہ اس کی شکستگی کو سمجھ گیا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔

"پتا ہے فجر! تمہارے اوپر والے میٹر کی سوئی بہت گرم ہے۔ اسے بدلنا ہو گا۔ تمہاری کھوپڑی کا آپریشن کرنا ہو گا۔ میں آکے کچھ کرتا ہوں۔" اس نے سلگ کر کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا اور فجر وہیں فرش پہ دو زانو بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

لاؤنج میں نیم اندھیرا پھیلا تھا۔

باہر چمکتی دھوپ آنکھوں میں گھستی چبھتی تھی۔

اور باہر سے آنے والے فرد کو اندھیرے سے مانوس ہونے میں وقت لگتا تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے بھی نیم تاریک چادر سی تنی تھی کافی دیر بعد اس کی روشنی بحال ہوئی تو وہ دھپ سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پورا گھر سنسان تھا۔ ابھی تک کوئی بھی گھر نہیں آیا تھا۔ ورنہ اس کے گھر میں خاموشی کا کوئی رواج نہیں تھا۔

اس کے آخری پراف کے ایگزام ختم ہوئے اور وہ تمام تعلیمی کارروائی سے فارغ ہو کر گھر بھاگا چلا آیا تھا۔ آنے سے پہلے اس نے اطلاع بھی نہیں دی تھی۔ ورنہ فرید اسے بس اسٹاپ سے لے آتا۔ اس وقت سفر کی تھکان ستا رہی تھی۔

وہ فجر کی تلاش میں اٹھنے کے لیے پر تول رہا تھا جب اسے کوریڈور سے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آئی تھی۔ وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور کوری ڈور کی طرف آیا۔ وہاں فون اسٹینڈ کے قریب فجر گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھی تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ جیسے وہ رو رہی تھی۔ فین بھی آف تھا۔ اور پسینے سے وہ شرابور تھی۔

فائق کا دل دھک سے رہ گیا۔

فجر کو روتا دیکھنا اس گھر کے ہر فرد کے لیے محال تھا۔ جتنی وہ فواد اور فائز کو عزیز تھی۔ اسی قدر فائق، فرید اور فراز کو پیاری تھی۔ فاتح "محبت" میں ان سے آگے تھا۔ کیونکہ اس کی محبت ان سے مختلف تھی۔

"فجر! رو رہی ہو؟ کیا ہوا؟ بتاؤ مجھے؟ تم ٹھیک تو ہو۔؟"

"فائق!" غیر متوقع اپنے قریب فائق کی آواز سن کر وہ لمحہ بھر کے لیے ڈر گئی تھی۔ فائق اتنا اچانک کہاں سے آ گیا تھا؟

"تم کب آئے۔؟" اس نے بھرائی آواز میں بمشکل سنبھل کر پوچھا تھا۔ "جب تمہارا پہلا آنسو گرا۔ تب ہی میں سوچوں دل اتنا بے چین کیوں تھا؟" فائق تڑپ کر بولتا چلا گیا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور فجر کے لیے پانی کا گلاس لے آیا۔

"اب بتاؤ کیا ہوا؟" فجر دیوار سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس کھینچنے لگی تھی۔ فائق تفکر سے اسے دیکھتا رہا۔ جانے اسے کیا ہوا تھا؟ گھر میں تو کوئی اسے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا؟

"تو پھر فاتح؟" اس کا ذہن جیسے ایک نکتے پہ ٹھہر گیا۔

"تمہیں فاتح نے کچھ کہا ہے؟" اس کا لہجہ پر یقین تھا۔ جس میں جھوٹ سننے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

"پتا نہیں فاتح کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ مجھ سے بدل گیا ہے۔" فجر ایک مرتبہ پھر رونے لگی تھی۔ وہ اتنی مضبوط نہیں تھی۔ وہ اتنا بڑا بار نہیں اٹھا سکتی تھی۔ وہ فاتح کے بے وفائی کا صدمہ نہیں سہ سکتی تھی۔ یہ اس کی برداشت سے بہت اوپر کی بات تھی۔ اس کا دل قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔ وہ متفکر سا سوچتا رہا۔ فی الحال اسے فجر کو تسلی دینا تھی۔

"ایسا نہیں ہے فجر! تمہیں وہم ہو گا۔ فاتح کیوں بدلے گا۔ وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے۔" فائق نے اسے ڈھارس پہنچانی چاہی تھی۔

"تمہارا بھائی ہے تم اس کی سائیڈ لو گے۔" وہ فائق سے بھی بددل ہوئی تھی۔ اس لیے کہ وہ فجر کی بات پہ یقین کرنے کی بجائے۔ مسلسل فاتح کو سپورٹ کر رہا تھا۔

"تم میری بہن ہو۔ تمہاری سائیڈ زیادہ لوں گا۔ اگر فاتح نے کوئی لغزش کی۔ یا وہ رستے سے بھٹک گیا تو عمر بھر یاد رکھے گا۔ ہم چھ کے چھ اس کا جینا حرام کر دیں گے۔ تم کیوں غم کھاتی ہو۔؟ چھ جوان بھائیوں کے ہوتے ہوئے۔" فائق نے اس کا شانہ تھپتھپا کر کہا تھا۔ فجر کے بہتے آنسو تھمنے لگے۔

"وہ راستے سے ہٹ گیا ہے۔" وہ اپنی بات پہ زور دے رہی تھی۔

"دیکھتے ہیں وہ کہاں تک گیا ہے؟ ہم اسے "کنٹرول" کر لیں گے۔ بس تم فکر نہ کرو۔" فائق نے اسے جی بھر کے تسلی اور دلاسا دیا تھا۔

"آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ مگر فاتح کو زبردستی

کی توازفاتح تک محدود رہی تھی۔ اس بات پہ اس کی بھنویں کھنچ گئی تھیں اور ماتھے پہ بل آ گئے تھے۔ یہی فجر کی بات کا مفہوم تھا۔ فرید نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ معین کو رقیب؟ حد تھی بکواس کی؟ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ابھی کے ابھی اٹھ کر فجر کی کلاس لے لیتا؟ وہ کیوں عجیب باتیں کرتی تھی جس کا نہ کوئی سر تھا نہ کوئی پیر۔

پھر اس رات اسے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ ساری رات جاگنے اور سوچنے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا وہ فجر کے بدلتے رویے کا سراغ نہیں جان پایا۔ اسی لیے صبح ہی صبح اس نے کچن میں فجر کو "دھر لیا تھا" لیکن اس سے پہلے فاتح کے متھے کاکا لگ گیا۔

"پائی جان! کیا لینے آئے ہیں صبح ہی صبح۔۔؟"

"تمہارا آشیرواد۔" فاتح جل بھن گیا تھا۔ کاکے کا متھے لگنا کوئی نیک شگون نہیں تھا۔ ابتدا اتنی بری تھی انتہا کیا ہوتی؟

"میں واری جاؤں۔" کاکا قربان ہو گیا۔ "صبح ہی صبح سرکار کا آنا مجھے کھٹک رہا ہے۔ آپ فجر باجی کی تلاش میں تو نہیں؟" وہ بھی تو کاکا تھا۔ کیسے نہ بات کی تہہ میں اترتا۔

"کبھی کبھی تم دماغ چاٹنے کی بجائے عقل کی بات کر لیتے ہو۔" فریج سے جوس کا کین نکال کر اس نے کاکے کو گھور کر کہا۔

"میں تو آل ریڈی بڑا "سیانا" ہوں۔"

"آپ کے اور فجر باجی کے درمیان ناراضی چل رہی ہے نا۔۔؟" اس کا انداز بڑا پر یقین تھا۔ فاتح مکرتے مکرتے رہ گیا۔ پھر اس نے سر کے اشارے سے کہا تھا۔

"ہاں۔"

"فرمن کے ہو مجھے گرو۔ دیکھا لگالیا نا اندازہ۔" کاکا لمحوں میں پھیل گیا۔ تب فاتح نے اسے ناگواری سے گھورا تھا۔

"یہ تو اندھوں کو بھی نظر آ رہا ہے۔ فجر کے تیور میرے ساتھ بگڑ رہے ہیں، میں خود اسی وجہ کی تلاش میں ہوں۔" فاتح سخت الجھن کا شکار زیر لب بڑبڑایا تھا۔

"تو آپ فائق پائی جان سے پوچھ لیں نا۔" کاکے نے سادگی میں فاتح کو بری طرح سے "چونکا" دیا تھا۔

فائق سے پوچھنا؟ کیا فائق فجر کی فاتح سے ناراضی کی وجہ جانتا ہے؟ اور فاتح ہی لاعلم تھا؟ کیا فجر اور اس کے درمیان اتنے فاصلے آ چکے تھے کہ اس کے بھائی تک ان کی چپقلش کی وجہ جانتے تھے اور فاتح ہی بے خبر تھا۔ پہلی مرتبہ اسے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ وہ اس احساس کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ پھر بھی اس نے بمشکل اس فضول احساس سے سر چھڑوا کر باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کے دل پہ ایک عجیب سا بوجھ لد گیا تھا۔

"فجر باجی باغیچے میں ہیں۔" کاکے نے اسے پیچھے سے اطلاع دی تھی۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا تھا۔ فجر پہلے کچن میں تھی۔ فاتح کو آتا دیکھ کر دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی تھی۔ یہ اس کی صاف ناراضی کی طرف اشارہ تھا۔ اس کا دل گھٹتا ہو رہا تھا۔

وہ بیلے کے پودے کو پانی دے کر زمین پہ بکھری بیلے کی کلیاں چنتی بڑی اداس تھی۔ چند ماہ پہلے اس کی زندگی میں کتنا سکون تھا۔ اور اب ایسی بے چینی اور اضطراب نے گھیرا ڈال رکھا تھا کہ سانس بھی لینا محال ہو جاتا۔

وہ گھٹنوں میں سر دیے بہت دل برداشتہ تھی۔ فاتح کا رویہ پہلے سے بھی زیادہ سرد تھا۔ کل سے وہ گھر آیا تھا اور ابھی تک اس نے فجر سے کلام تک نہیں کیا تھا۔ احوال تک نہیں پوچھا تھا۔ وہ ایسی سوچوں میں گم تھی جب جاگنگ کر کے واپس آتا فائق اسے باغیچے پہ بیٹھا دیکھ کر چونک گیا۔ اندر جانے کی بجائے وہ فجر کی طرف آ گیا تھا۔ آہٹ پا کر فجر بھی چونک گئی تھی۔ اس نے سرخ گیلی نگاہوں سے فائق کو دیکھا تو وہ بری طرح سے ٹھٹک گیا۔

"پھر اسی گدھے کی وجہ سے رو رہی ہو۔ کیا کہا ہے اس نے؟ مجھے بتائیے۔ میں اسے وارننگ دے کر آتا ہوں۔ اگر وہ ایک ہفتے تک اپنے تیور نہیں ٹھیک کرتا تو میں امی اور ابی سے اس کی شکایت کر دوں گا۔ پھر دیکھنا"

کیسے سیدھا ہوتا ہے۔" فائق غصے میں بول رہا تھا جب فجر نے بے ساختہ کہا۔

"نہیں، تم کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ پھر سب کچھ بگڑ جائے گا۔ فاتح کا تمہیں پتا ہے نا۔ وہ اسی بات کو ایشو بنالے گا۔" فجر بری طرح گھبرا گئی تھی۔

"اس کی عقل بھی تو ٹھکانے پہ لانی ہے۔ جو گھاس چرنے جاچکی ہے۔" وہ تلخی سے بولا تھا۔ یعنی مبین اور فاتح کے بڑھتے التفات فائق کی نگاہ سے بھی اوجھل نہیں تھے۔ فجر ہونٹ کاٹتی رونے لگی۔ تب فائق اس کے برابر بیٹھ کر اسے تسلی دینے لگا تھا۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میرا وعدہ ہے۔ میں تمہیں کبھی رونے نہیں دوں گا۔" فائق کے لہجے میں ملائمت تھی اس لمحے برآمدے کا دروازہ کھول کر فاتح بھی باہر نکلنے لگا تھا۔ مگر ان دونوں کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک گیا۔ ایک دم اس منظر میں اسے عجیب سا بدلاؤ نظر آیا تھا۔ یہ تبدیلی کا عمل کیوں ہوا؟ اسے ہر چیز الٹ پلٹ دکھائی کیوں دے رہی تھی؟ اس کا دماغ چکرا کیوں رہا تھا؟ اسے سب کچھ بدلتا کیوں نظر آرہا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے بھونچکا ہو گیا۔

"فائق اور فجر؟ فجر کے رویوں میں تبدیلی؟ فاتح سے اس کا اکھڑنا؟ اس کے سرد انداز؟ بات بہ بات غصہ اور بے زاری؟ پھر فائق کے الفاظ "میرا وعدہ ہے، میں تمہیں کبھی رونے نہیں دوں گا۔" فاتح کو لگا۔ اس کے دماغ میں گرم سیال بھر گیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چڑھ گئی تھی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر نفی میں سر ہلایا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا؟ بھلا فائق اور فجر..." وہ خود کو یقین دلا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

برسات کے یہ دو مہینے جولائی اور اگست رینگ رینگ کر گزر رہے تھے۔ ان دونوں راتوں کو انرجی سیور اور گلوبوں کے گرد پروانے اور مکوڑے جھنڈ کے جھنڈ اکٹھے ہو جاتے تھے۔ ساون کی بارشوں کا بھی بھروسہ نہیں تھا۔ ابھی آتیں، ابھی برستیں، ابھی دھوپ چمک کر پھر سے حبس اور بھڑاس اکٹھی کر لیتی۔ بارش کے بعد والی گرمی برداشت کرنا محال ہوتا تھا، لیکن آج صبح سے جھڑی لگی تھی۔ بادل بھی اُمڈ اُمڈ کر آتے تھے۔ پورا دن دھوپ نے شکل نہیں دکھائی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی۔ یعنی موسم آج خوش گوار تھا اور دل کے موسموں کی کیا ہی بات تھی۔ باہر خوش گواریت تھی تو اندر حد سے بڑھ کے خوش گواریت تھی۔

کبھی کبھی من چاہی خواہش کی تکمیل کا ہونا ایک احساس منفرد کو جاگزیں کر دیتا ہے۔ ایک ایسی خواہش کا مکمل ہو جانا جس کی امید بھی باقی نہ ہو۔

کبھی اس نے یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ جس کام کا وہ ارادہ کرتی ہے کبھی وہ ناکامی سے بھی دوچار ہو گی۔ اس نے ہمیشہ کامیابی کو مکمل طور پر اپنی دسترس میں کرنے کے بعد ہی "کام" کا ارادہ کیا تھا، لیکن اسے یہ خبر نہیں تھی۔ کسی ایک مقصد کے حصول کا نام "کامیابی" نہیں تھی۔ بڑے غیر محسوس انداز میں دبے قدموں کسی کی بھی زندگی میں گھس کر اس کا عمر بھر کا "چین" چھین لینا کیا کامیابی کے زمرے میں آتا ہے؟

اس وقت اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑی وہ تایا کے گھر کی "اونچائیوں" کو دیکھ رہی تھی۔ اس گھر کی راہداریوں میں پورے استحقاق سے فاتح کے ہم قدم چلنا اس کا اولین خواب تھا۔

ماما کچن میں برسات کی مناسبت سے اسنیکس تل رہی تھیں۔ یقیناً "برابر والے گھر میں پکوان بن رہے تھے خوشبوئیں یہاں جالیوں کے اندر تک گھس رہی تھیں۔

ماما جب چائے اور اسنیکس لے کر آئیں تب تک وہ اپنا اگلا لائحہ عمل سوچ چکی تھی۔ ماما اسے چپکے چپکے مسکراتا دیکھ کر چونک گئیں۔

"کیا بات ہے مبین! تم بہت خوش دکھائی دے رہی ہو۔" ماما کے لہجے میں محسوس کی جانے والی خوشی تھی۔

وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو ہر دم مسکراتا دیکھنا چاہتی تھیں۔
"تو میں کیا ناخوش دکھائی دوں؟" اس نے چمکتی آنکھوں سے پوچھا۔
"تم ہمیشہ مجھے مسکراتی نظر آؤ میری جان!" وہ ممتا بھری نگاہوں سے اسے دیکھ کر دعائیہ بولی تھیں۔
"تو پھر فاتح کے لیے دعا کیا کریں۔ وہ مجھے مل جائے۔" اس کا لہجہ خواب آگیں سا ہو گیا تھا۔ ماما سے بہت بے تکلفی تھی۔ وہ ہر بات ان سے کھل کر کرلیتی تھی۔
"وہ تمہیں کیوں نہیں ملے گا؟ میری بیٹی میں کمی کیا ہے؟" ان کے انداز میں واضح غرور در آیا تھا۔
"بیچ میں فجر کھڑی ہے ماما!" وہ پہلی مرتبہ کچھ بے چین نظر آئی تھی۔
"تم نے خوامخواہ فجر کو سر پہ سوار کر رکھا ہے۔ وہ معمولی سی لڑکی ہے۔ تمہارا اس سے کیا مقابلہ۔" ماما نے نخوت سے کہا تھا۔
"اس معمولی لڑکی سے فاتح کی انیج منٹ ہے ماما!" مبین کو بتانا پڑا تھا۔ اب کی دفعہ سجیلہ چونک گئیں۔
"تو پھر؟" ان کی پیشانی پہ سلوٹیں تھیں۔
"آپ دیکھتی رہیے گا۔ فاتح، فجر کے ہاتھوں چوٹ کھا کر جلدی میری طرف پلٹ آئے گا۔ مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ فجر سے محبت کرتا تھا یا نہیں۔۔۔ میرے لیے اہم یہ ہے کہ میں اسے چاہتی ہوں۔" وہ اسنیکس کھاتی بڑے گہرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ سجیلہ سمجھ گئی تھیں کہ مبین اب پیچھے ہٹنے والی نہیں۔ وہ فاتحہ کے معاملے میں بہت آگے نکل گئی تھی۔ جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ اب کسی ایک کو تو "کھونا" ہی تھا یا فجر فاتح کو کھو دیتی؟ یا مبین فاتح کو کھو دے؟
بچپن سے لے کر اب تک اس نے جو چاہا تھا پالیا تھا۔ جب اسے کوئی چیز پسند آجاتی تھی تب دنیا کی کوئی طاقت اسے اس چیز کے حصول سے روک نہیں سکتی تھی۔ چاہے وہ کوئی معمولی سا شوپیس ہی کیوں نہ ہوتا۔ پھر یہاں تو ایک جیتے جاگتے انسان کا معاملہ تھا۔ ایک ایسا انسان جو اس کی تکمیل کا پہلا اور آخری عنصر تھا۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ وہ کیسے فجر کے لیے اپنی محبت سے دستبردار ہو جاتی؟ اور فجر کے لیے ایثار کرنے کے چکر میں اپنے اولین خوابوں کا خون کرلیتی؟ اس گھر کے ہر فرد تک رسائی کچھ ناممکن نہیں تھا، لیکن پہلے اسے فجر اور فاتح کے درمیان فاصلے بڑھانا تھے کیوں کہ اس گھر میں آنے کے پہلے روز ہی مبین جان گئی تھی کہ فجر اور فاتح ایک دوسرے سے منسوب ہیں۔ نورا سے نہ بھی بتاتی وہ تب بھی ان دونوں کی ایک دوسرے سے محبت اور چاہت سے واقف ہو گئی تھی۔ ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں۔ پھر اسے فائق نے بھی بتا دیا تھا۔
"فجر اور فاتحہ کی عنقریب شادی ہو گی۔" تب مبین کو پہلا دھچکا لگا تھا۔
لیکن وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھی۔ جو بغیر کوشش کے ہتھیار پھینک دیتے ہیں۔ وہ میدان عمل میں کود آئی تھی، کیوں کہ فاتح تک پہنچنا مشکل ہی نہیں تھا۔ اس کی عادتیں بہت اچھی تھیں، طبیعت بہت چونچال تھی۔ ایسے لوگ لاپرواہی میں بہت کچھ کرسکتے تھے۔ اپنا نقصان بھی۔ اس کی بے نیازی اور لاپروا طبیعت سے مبین نے بہت سے فائدے اٹھائے تھے۔ حتیٰ کہ اسے خبر بھی نہیں ہوسکی تھی۔ فجر کو فاتح سے بدگمان کرنے کے لیے وہ غیر محسوس انداز میں فاتح کے قریب آگئی تھی اور وہ اتنا "لاپروا" تھا کہ مبین کی چال کو سمجھ ہی نہیں سکا۔
اس نے بہت طریقوں سے فجر کو فاتح سے بدظن کیا تھا۔ مبین کو یاد تھا اپنے قیام کے دنوں میں وہ کس کس طرح فجر کو ٹارچر کرتی تھی۔ اکثر فاتح کو شاپنگ پہ لے جانے کے لیے مجبور کرتی۔ کیوں کہ وہ چھٹی پہ آیا ہوا تھا۔ اور باقی لوگ فارغ نہیں تھے۔ اس لیے خواتین کو بازاروں میں لے جانے کی ساری ذمہ داری اس کے سر تھی۔ وہ بطور ڈرائیور استعمال ہو رہا تھا، لیکن مبین اس کا استعمال کسی اور نیت سے کر رہی تھی۔ مبین کو اکثر فجر کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا پسند نہیں آتا تھا۔

"بہت اسپائس ہے' میں نہیں کھا سکتی۔" وہ کھانے کی ٹیبل سے سوں سوں کرتی اٹھ جاتی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوتا تھا اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ تب تایا اور تائی انتہائی متفکر ہو جاتے۔

"فاتح! جاؤ کسی چائنیز ریسٹورنٹ سے مبین کے لیے کھانا لے آؤ۔ کیا یہ بھوکی رہے گی۔" تایا بہت فکر مند نظر آتے تھے۔ فاتح بھی تابعداری سے اٹھ جاتا تھا۔ مبین اسے اٹھتا دیکھ کر معصومیت سے کہتی۔

"اٹس اوکے تایا جان!" اس کا لہجہ بلا کا ملائم ہو جاتا تھا۔

"فاتح جائے گا۔ پھر کھانا لے کر آئے گا۔ یوں تو بہت دیر ہو جائے گی۔ مجھے بھوک لگی ہے' میں فاتح کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔" وہ اتنے بھولپن سے کہتی اور بھوک سے نڈھال نظر آتی کہ تایا تائی دونوں کا دل پسیج جاتا۔

"ہاں' جاؤ تم۔ اب بھوکا تو نہیں رہنا۔" تائی کا انداز بہت سادہ تھا۔

"تمہاری ماں کہے گی میری بیٹی کو "فاقے" کروا کر کروا کر سوکھا دیا ہے اور فجر بیٹا! جب تک مبین ادھر ہے مسالے تھوڑے ہلکے ڈالا کرو۔" وہ مبین سے بات کرتی گم صم کھڑی فجر کو بھی ہدایات دیتی تھیں۔ تب مبین ایک کمینی سی خوشی کے ساتھ فاتحانہ انداز میں فاتح کے ہمراہ چلی جاتی تھی۔

اسی طرح جب اسے اندازہ ہوتا تھا یا پھر وہ فجر کو لمبے چوڑے کاموں میں الجھا دیکھتی تب اسے اچانک آؤٹنگ خیال آجاتا اور اس کے سر پہ بوریت کا بھوت چڑھ جاتا تھا۔ خاص طور پر جب فجر کھانا پکا رہی ہوتی یا کپڑے دھونے کے لیے مشین لگاتی تب مبین اونچی آواز میں تائی کو سنانے کی غرض سے کہتی تھی۔

"تائی امی! بہت بور ہو رہی ہوں۔ اس وقت میں جم جایا کرتی تھی۔ یہاں تو کوئی ایکٹوٹی نہیں۔" مبین کا اترا منہ دیکھ کر تائی کو ہول پڑ جاتے تھے۔

"بچی کو گھما لاؤ۔ بور ہو رہی ہے۔ گھر میں اس کے کرنے کا کام دھندا جو نہیں۔" ماں کے حکم پر فاتح فوراً" تیار ہو جاتا تھا اور اس کی نگاہیں فجر کو ڈھونڈنے لگتی تھیں اور مبین سے یہ منظر برداشت نہیں ہوتا تھا۔

"فجر کو بھی لے جاتے ہیں۔" وہ دل پہ پتھر رکھ کے فجر کو آواز دیتی تھی۔ تب فجر کپڑے الگنی پہ ڈالتی چبا چبا کر جواب دیتی۔

"میں فارغ نہیں ہوں۔ آپ جائیں۔" فجر کی آنکھیں سلگ جاتی تھیں اور وہ فاتح کی طرف دیکھے بغیر تڑختی۔

"دیکھا تم نے۔ ایسے کرتی ہے یہ میرے ساتھ۔ شکر ہے تم نے پوچھا۔ مجھے تو سات پتھر مارتی تب جواب دیتی۔" فاتح جل بھن کر کہہ رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں فجر کو ساتھ لے جانے کے لیے جلتی جوت بجھ جاتی تھی۔

"اس کے پاس میرے لیے فرصت ہی نہیں۔" فاتح کو بھی جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے عرصے بعد ایک سامع ملا تھا۔

"واقعی۔" مبین جان بوجھ کر تائید کرتی اور پھر چیدہ چیدہ فجر کے خلاف باتیں یاد کر کے دہرانے لگتی تھی۔

ایک دن فاتح کے سر میں شدید درد تھا۔ فجر تھکی ہاری کپڑے استری کر کے سب کی الماریوں میں رکھ رہی تھی وہ سیڑھیاں اترتا "فجر فجر" پکار رہا تھا۔ فجر نے کمرے کی کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

"کیا ہے؟"

"سر میں درد ہے۔ چائے بنا دو۔ کوئی ٹیبلیٹ دو۔" وہ کنپٹیاں دباتا درد سے بے حال تھا۔ صوفے پہ بیٹھی مبین نے گردن اچک کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"کاکے سے کہو' وہ چائے بنا دیتا ہے۔ میں تمہارے کپڑے پریس کر رہی ہوں۔ کام سے ڈھیر اٹھا کر لے آتے ہو۔ لائٹ چلی گئی تو پھر رات کو آئے گی۔ مجھے کھانا بھی بنانا ہے۔" اس نے نرمی سے جواب دیا تھا' لیکن فاتح کو تپ چڑھ گئی تھی۔

"تم کس مرض کی دوا ہو۔ مجھے چائے تم بنا کر دو میں نے کاکے سے نہیں بنوانی۔" وہ ضدی انداز میں گویا

ہوا تھا۔ کچھ سوچ کر فجر نے استری کا پلگ نکال دیا۔ پھر کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی تھی۔

"میں تمہاری نوکرانی نہیں ہوں۔" اس کا انداز دھیما اور سلگتا ہوا تھا۔ "اپنی مہارانی سے کوئی کام نہیں کہتا۔ وہ تو سر کا تاج ہے۔ پھولن دیوی ہے۔ کچن میں جائے گی تو پگھل جائے گی ہونہہ......" اس کا رواں رواں تپ رہا تھا۔ فاتح کچن کے ڈور فریم میں آکھڑا ہوا۔ اس کے سر میں شدید درد تھا۔ کنپٹیاں پھڑک رہی تھیں۔ وہ لڑائی اور بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔

"و تمہیں "نوکرانی" سمجھ کر کام کے لیے نہیں کہتا۔ ورنہ کاکا اور سلمیٰ بھی موجود ہیں۔ تمہاری تو عقل عمر بھر کے لیے ہجرت کر گئی ہے۔ کچھ بھی کھوپڑی میں سماتا نہیں ہے۔" وہ خاصا بے دلی سے کہہ رہا تھا۔ فجر کا دل بھر آیا۔ جانے کس قدر تکلیف ہے اسے۔ وہ کنپٹیاں دبا رہا تھا۔ آنکھیں بھی سرخ تھیں۔ فاتح کو ایسے ہی شدید درد ہوتا تھا اس نے چائے بنائی اور ٹیبلٹ بھی نکال لی۔

جب وہ لاؤنج کی طرف آرہی تھی۔ تب مبین نجانے کہاں سے تیل کی شیشی اٹھا لائی۔ اب وہ اصرار کر رہی تھی کہ فاتح کے سر میں مالش کر دیتی ہے جبکہ وہ مسلسل جھجک کی وجہ سے انکار کر رہا تھا۔ اگر فجر ہوتی تو وہ کبھی انکار نہ کرتا۔ مگر مبین سے؟ کبھی نہیں، لیکن وہ مبین تھی کبھی ہار نہ ماننے والی۔ اس نے فجر کو دیکھ لیا تھا۔ اس لیے جان بوجھ کر ہتھیلیوں میں تیل الٹ لیا جب لمبی لمبی دھاریں فرش پہ بہنے لگیں تب مجبوراً "اوئے اوئے" کرتے فاتح کو سر میں تیل ڈلوانا پڑا تھا۔

کپ میں بھری چائے سنک میں الٹ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی جبکہ مبین کچن کا سین گردن اچکا کر دیکھتی فاتح سے مخاطب ہوئی۔ اس کے انداز میں واضح طنز کی کاٹ تھی۔

"تمہاری فجر تو عشاء کے بعد چائے بنا کر لائے گی اور عشاء ہونے میں سترہ گھنٹے باقی ہیں۔" اس کا انداز بڑا پُراثر، گہرا کاٹ دار تھا۔ فاتح کو دل میں پھانس چبھتی محسوس ہوئی تھی۔

"تمہاری فجر تو تم سے بے زار لگتی ہے۔" اس نے جلتی پہ تیل ڈالنے سے گریز نہیں کیا تھا۔ اس طرح کے بہت سے واقعات تھے جو فجر کو فاتح سے بدظن کرتے تھے۔ کچھ وہ اس کو جتا جتا کر پاس سے فرمودات جوڑ کر بتاتی تھی۔

"فاتح نے مجھے آج بھی کہا۔۔۔ میں ہمیشہ تروتازہ لگتی ہوں۔ وہ میری ڈریسنگ اور چوائس کا فین ہے۔" وہ ہر نیا جوڑا پہن کر خوشبو میں نہاتی اور فجر کے حواسوں پہ بم گراتی تھی یا تو اسے خود پہ مان بہت تھا یا پھر واقعی ہی فاتح اس کے دام میں آچکا تھا۔ فجر دکھی دل کے ساتھ سوچتی تھی۔ ان دنوں اس کا چین سکون غارت ہو گیا تھا اور اگر فائق کی تسلیاں نہ ہوتیں تب تو فجر شاید خودکشی کر لیتی۔ خود کو مار لیتی۔ یہ گھر چھوڑ کر چلی جاتی۔ خود کو ختم کر لیتی اس سے فاتح کی "بے وفائی" کا بوجھ اٹھانا محال تھا۔ کبھی مبین اس کے چھکے چھڑوانے کو ایک نیا بیان جاری کرتی تھی۔

"فاتح نے کہا ہے۔ اسے مجھ جیسی اپ ٹو ڈیٹ، کانفیڈنٹ ایجوکیٹڈ لڑکیاں پسند ہیں۔۔۔" مبین کا غرور اس وقت سر چڑھ کر بولتا تھا اور فجر کو بلندی پہ کھڑی نظر آتی تھی۔ اس کے سامنے فجر کو اپنا آپ اور بھی حقیر لگتا تھا۔ وہ اتنی غم زدہ اور زرد رنج رہتی تھی کہ فواد بھائی کی شادی کا ایک بھی فنکشن انجوائے نہ کر سکی۔ پھر ایک دن خود بخود مبین نے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیا تھا۔ اس دن کے بعد مبین نے فجر کو بولتے نہیں دیکھا وہ اندر ہی اندر کٹ کٹ کر مرنے لگی تھی، لیکن اس کی زبان پہ قفل لگ گیا تھا۔

"فاتح نے مجھے پرپوز کیا ہے۔ وہ مجھے پسند کرتا ہے فجر۔!" اس کا انداز خاصا دھیما تھا۔ اسے خوف بھی تھا کہ فجر ڈائریکٹ فاتح سے باز پرس نہ کر لیتی، لیکن اس کے خدشے بے بنیاد رہے تھے۔ فجر اس کی سوچوں سے بڑھ کر بے ضرر ثابت ہوئی تھی۔ وہ انتہائی بدھو لڑکی تھی۔ اس نے مبین کی بات پہ یقین کر لیا تھا اس نے بڑے آرام سے ہتھیار پھینک دیے تھے۔ اور بڑے صبر، ضبط اور حوصلے سے کہا تھا حالانکہ مبین کو خوف

تھا۔ وہ ایک ہنگامہ کھڑا کردے گی، لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی سوچوں کے برعکس کمال ضبط سے بولی تھی۔

"اگر فاتح کی "خوشی" آپ سے وابستہ ہے تو آپ کو مبارک ہو فاتح۔" اس کا لہجہ بڑا رواں تھا۔ بڑا مستحکم تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر دہرایا تھا۔

"آپ کو مبارک ہو فتح بھی اور فاتح بھی۔۔۔"

☼ ☼ ☼

جالی کے پار اب بھی برسات کی جھڑی لگی تھی۔ رم جھم بارش برس رہی تھی۔۔۔ ایک تواتر سے گرتی بوندیں فرش پہ بکھر رہی تھیں۔ چائے کا کپ خالی ہوچکا تھا۔ اسنیکس جوں کے توں پڑے تھے۔ ماما کوئی ضروری فون سننے جاچکی تھیں۔ اس وقت مبین اکیلی تھی اور تایا کے مکان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ برابر سے آتی خوشبوئیں اب معدوم ہوچکی تھیں۔ معاً کسی کے قدموں کی آہٹ نے اسے چونکا دیا تھا۔ شاید یہ اس کا وہم تھا۔ وہ سر جھٹک کر سوچتی رہی۔ فجر کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ رستہ اب بالکل صاف تھا، لیکن فاتح کو فجر سے بدظن تو کرنا تھا۔ اسے کوئی ٹھوس ثبوت دینا تھا؟ فجر کے رویے کا بدلاؤ، اس کا اکھڑپن، غصہ، بے زاری اس کی "وجہ" تک فاتح کو کھینچ کر لانا تھا۔ پھر وہ فجر سے بددل ہوجاتا۔ بدظن ہوجاتا۔ اس کا دل ٹوٹ جاتا اس لیے کہ اس کا لگاؤ فجر سے آج کا نہیں تھا بہت پرانا اور اٹوٹ تھا۔ اتنی آسانی سے فاتح فجر کو بھلا نہ پاتا؟ لیکن اس دنیا میں بھلا کیا ناممکن ہے؟

اور ابھی وہ اپنا اگلا لائحہ عمل ترتیب دے رہی تھی۔ جب اس کے پیچھے کوئی چپکے سے آکھڑا ہوا تھا۔ اس کی خوشبو اتنی حاوی ہوجانے والی تھی کہ مبین کو جھٹکا لگا۔ بنا دیکھے بھی اس کے منہ سے بلند آواز میں نکلا تھا۔

"فاتح۔" اب وہ مڑ کر اپنے قریب کھڑے فاتح کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پندرہ دن بعد آیا تھا۔ اس دوران ان کا فون پہ رابطہ تھا بلکہ مبین ہی زیادہ رابطہ بحال رکھتی تھی۔ وہ تو صرف اس کے میسج کا ریلائی کرتا تھا خود سے اس نے کبھی بھی فون کرنے یا میسج لکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"تم کب آئے؟" مبین نے سنبھل کر بڑی مشکل سے پوچھا تھا۔ فاتح کو دیکھ کر اسے ایک خوشی محسوس ہورہی تھی جو اس کے "قابو" سے باہر تھی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے۔۔۔" وہ بہت الجھا الجھا سا بول رہا تھا۔ وہ خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ پھر اس نے خالی گھر کے سناٹے کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"آنٹی کہاں ہیں؟"

"وہ اپنے روم میں ہیں۔۔۔" مبین نے اسے سٹنگ روم کی طرف آنے کو کہا۔ پھر وہ اس کے لیے چائے بنا کرلے آئی تھی جب وہ واپس آئی تب بھی فاتح بہت پریشان اور الجھا الجھا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بے خواب لگتی تھیں جیسے وہ بہت سی راتیں جاگ کر آیا ہو۔ مبین کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔

"کہیں فجر نے تو کچھ بتا نہیں دیا؟" مبین کو ساری محنت اکارت جاتی محسوس ہورہی تھی۔ اس کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے لگا؟ کیا بازی الٹنے لگی تھی؟ وہ شدید متوحش تھی اور بار بار فاتح کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بہت دیر کی خاموشی کے بعد فاتح نے خود ہی مبین کو مخاطب کیا تھا۔

"میں بہت اپ سیٹ ہوں مبین! اسی لیے چھٹی لے کر آگیا ہوں۔ گھر کی طرف حالات اچھے نہیں۔ فجر اپنے اور میرے ساتھ بہت عجیب کررہی ہے۔" مبین اس کے اگلے الفاظ سن کر قدرے مطمئن ہوئی تھی۔

"پہلے میں سمجھتا تھا۔ وہ میری اور تمہاری دوستی سے خار کھاتی ہے۔ غصہ کرتی ہے۔ تو میں اسے جلانے کے لیے جان بوجھ کر اسے ستایا کرتا تھا، لیکن اس کی بے زاری اور اکھڑے پن کی یہ "وجہ" نہیں تھی۔ کیا تمہیں بھی ایسے لگتا ہے؟" وہ بڑے الجھے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ جیسے فجر کے بدلنے کی وجہ اور کوئی "سرا" پکڑنا چاہتا تھا۔ وہ شدید ذہنی کشمکش میں تھا اور

مبین کی محبت کا تقاضا تھا کہ اسے اس ذہنی کشمکش سے نکال لیتی۔

"اگر تم میری رائے لینا چاہتے ہو تو میں تمہیں رائے دے سکتی ہوں۔ اگر تم تصدیق کرنا چاہتے ہو تو میں فجر کے "رویے" کی تصدیق بھی کر سکتی ہوں۔ وہ میری اچھی دوست ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا۔ وہ مجھ سے اپنی ہر بات شیئر کرتی ہے۔" اس نے کمال چالاکی سے بڑے تھکے تھکے انداز میں فجر کے ساتھ "نبھانا پہ" ظاہر کیا تھا۔

"میں تمہیں کبھی نہ بتاتی۔ کبھی تمہیں اپ سیٹ نہ کرتی۔" مبین نے مزید بھی ٹکڑا لگایا تو فاتح اس دفعہ ٹھنک گیا تھا۔

"بتاؤ مبین! تم نے کہا تھا مجھے کال پہ... جب میں آؤں گا تو تمہیں فجر کی "تبدیلی" کا راز بتاؤں گی... اب وقت آچکا ہے، میں خود اس شکنجے سے نکلنا چاہتا ہوں... پلیز میرے ضبط کا امتحان مت لو۔" فاتح کی سرخ آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ مبین کافی دیر سوچتی رہی۔ ہر نکتے پہ غور کرتی رہی، ہر پہلو پہ نظر رکھتی رہی۔ پھر اس نے گلا کھنکار کر فاتح کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

"میں تمہارے گھر میں پھوٹ نہیں ڈلوانا چاہتی۔ تمہارے گھر میں بدمزگی ہو۔ مجھے یہ گوارا نہیں۔

"تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا پھر۔ میری بات سن کر صبر اور ضبط سے کام لوگے؟ کوئی "فساد" نہیں ہوگا۔ کوئی لڑائی نہیں ہوگی؟" اس نے پکا وعدہ لینے کے لیے ہتھیلی پھیلا دی تھی۔

"تم فکر مت کرو مبین! تم بے جھجک بتا دو۔ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ فجر کی "بے وفائی" کا سن کر کوئی سوال نہیں کروں گا۔ جھگڑا تو بہت دور کی بات ہے، میں اس کے راستے سے ہٹ جاؤں گا، بہت خاموشی کے ساتھ، بہر حال وہ جیسی بھی ہے، میں اس کی "خوشی" کو مقدم رکھتا ہوں۔" وہ بہت ضبط کے ساتھ ٹھہرے لہجے میں بول رہا تھا۔ یوں کہ مبین کے اندر گھٹن سی بھر گئی تھی۔ اس نے بمشکل خود پہ قابو پایا تھا۔

"یہ بات کرنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ اگر تم مجھے فورس نہ کرتے۔ تو میں کبھی منہ سے بھاپ تک نہ نکالتی۔ جو میں نے یہاں رہتے ہوئے فیل کیا ہے۔ یا جو کچھ فجر نے مجھے بتایا ہے۔ وہ انتہائی دکھ دینے والا ہے۔ مجھے فجر کی بدقسمتی پہ افسوس ہوتا ہے۔ وہ تم جیسے بندے پہ فائق کو ترجیح دے رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ فائق کو پسند کرتی ہے کیوں کہ میں نے ایسے بہت سے منظر دیکھے ہیں۔" اس نے فاتح کے حواس اڑا ہی دیے تھے۔ لمحہ بھر کے لیے وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ پھر اس کے چہرے پہ تنفر کی تیز لہر اٹھ آئی تھی۔

"یہ بات میرے ذہن میں بھی آچکی تھی مبین! پھر بھی میں نے اپنے ذہن سے "شک" کو نکال دیا۔ میں فجر کو ہرجائی نہیں سمجھتا تھا۔" بہت دیر بعد اس نے ٹوٹے لہجے میں کہا تھا۔ یوں کہ اس کی آنکھیں لہو سے بھر گئی تھیں۔

کیا اس کے بھائی نے ہی اس کے دل پہ "نقب" لگا دی تھی؟ اس کا دل یقین کرنے کو مانتا ہی نہیں تھا۔ وہ ہزار دفعہ سوچتا اور اپنے منفی خیالات کو جھٹک دیتا۔ فجر اور فائق ایسے نہیں تھے۔ وہ فاتح کے ساتھ ایسا کر ہی نہیں سکتے تھے۔

"میں اسی لیے تمہیں نہیں بتانا چاہتی تھی۔ تمہیں تکلیف میں دیکھنا میرے "بس" میں نہیں..." اس دفعہ مبین حقیقتاً رو پڑی تھی اور اس کے آنسوؤں کی شدت فاتح کو حیران کرتے کرتے اپنے "حصار" میں جکڑ ہی لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

یہ انکشاف اتنا معمولی نہیں تھا کہ وہ ہنس کر سہہ جاتا۔ اسے سنبھلنے میں پورا ایک مہینہ لگا۔ اس دن وہ مبین کے پاس سیدھا کامرے آیا تھا پھر پہلی مرتبہ گھر والوں سے ملے بغیر واپس چلا گیا۔ اور اس کی اچانک آمد اور پھر واپسی کی "خبر" مبین نے اپنے ہی انداز میں فجر تک پہنچائی تھی۔

"فاتح کو پتا چلا میری طبیعت خراب ہے۔ وہ سیدھا

کامو سے ایک گھنٹے کے لیے آیا اور واپس چلا گیا۔" یہ بات بتاتے ہوئے اس کی آنکھوں لشکارے مار رہی تھیں۔۔۔ مبین یہ ان دونوں "تازگی" کا سایہ تھا۔ وہ ہواؤں میں اڑتی نظر آرہی تھی۔ بات یہ بات ہنستی تھی۔

اور فجر اندر تک خاموشی میں ڈوب گئی تھی۔ اسے ایسی چپ لگی تھی جو تائی امی اور فائق' فراز' فرید کے انتہائی کے اصرار پہ بھی نہ ٹوٹی تھی۔ وہ اس سے پوچھ پوچھ کر تھک چکے تھے' لیکن وہ بتاتی کچھ نہیں تھی۔ بس ایک خاموشی کی بکل میں دبکی رہتی۔

پھر جب فاتح دو مہینے تک بھی گھر نہ آیا تو ایک دن تائی نے اس کی فون پہ سخت کلاس لی تھی۔ ان کے دھمکانے پہ جانے کس دل کے ساتھ وہ اسی اتوار گھر آگیا تھا۔ وہ اتنا خاموش' تنہا' الجھا اور اداس تھا کہ پورا گھر انہ ہکا بکا رہ گیا۔

ادھر فجر پہ چپ تانی گئی تھی۔ ادھر فاتح غم کی عملی تفسیر دکھائی دیتا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ کچھ تو گڑبڑ تھی۔

فاتح کا رویہ فجر کے ساتھ "اجنبی" تو تھا ہی فائق کے ساتھ بھی انتہائی سرد تھا۔ وہ جو بھائی سے ملنے کشاں کشاں آیا تھا فاتح کی بے زاری دیکھ کر خفیف سا ہو گیا۔

فاتح نے اسے دیکھا بھی نہیں۔۔۔ سلام کا جواب تو بہت دور تھا۔ فائق سخت شرمندہ ہو گیا۔ جب وہ نیچے آیا تو فجر تخت پہ بیٹھی تھی۔ سوچوں میں گم۔ اداس' غمگین' ویران۔ فائق اس کے قریب رک گیا تھا۔

"تم دونوں کو آخر ہو کیا گیا ہے؟ مجھے تو ابھی تک کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" فائق شدید الجھن کا شکار تھا۔

"میرا دماغ تپ رہا ہے۔"

"تمہارا دماغ لے لو۔ یہ تو بہت ٹھنڈا ہے۔" فجر نے رنجیدگی سے کہا تھا۔

"مجھے اس ساری سچویشن کی کچھ سمجھ نہیں آرہی۔" فائق جھنجلایا ہوا بے حد متفکر تھا۔ معا" کوئی نے دھڑک اندر آگیا۔ فائق اور فجر نے بے ساختہ نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہ نور تھی جو ان دونوں کے قریب آرہی تھی۔

"جلدی سمجھ آجائے گی۔ دعا کرو' وقت ہاتھوں سے نہ پھسلے۔" نور بہت سنجیدہ تھی۔ فجر سے مل کر تخت پہ بیٹھ گئی تھی۔ فائق اور فجر کو نور سے مل کر اپنے انداز بدلنا پڑے تھے۔ وہ بمشکل اپنے چہروں پہ بشاشت لا رہے تھے۔

"آپ کا ابھی سے اس گھر میں آنا بنتا نہیں تھا۔۔۔؟" فائق کا انداز معنی خیز تھا۔

"ابھی تو ہم پڑوس میں آپ کے لیے باقاعدہ رشتہ بھی لے کر نہیں گئے۔" فجر کو بھی لب کشائی کرنا پڑی تھی۔ تب نور نے ان دونوں کو دیکھ کر کہا۔

"تم دونوں مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔۔۔؟" اس کا انداز کچھ کھوجتا ہوا تھا۔ ان دونوں نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔

"ہرگز نہیں۔۔۔ ہم نے کیا چھپانا ہے؟ بتا تو دیا ہے۔ ہم آپ کا پرپوزل لے کر آنا چاہتے تھے اپنے فائز کے لیے۔" فائق نے شوخی کا مظاہرہ کیا تھا۔ نور جھنجلا سی گئی تھی۔

"یہ بات مجھے بھی پتا ہے۔۔۔ آنٹی نے میرے انکل کو فون کیا تھا۔ تم مجھے کوئی نئی بات بتاؤ۔" وہ بلا کی سنجیدہ تھی۔ فجر نے گھٹنوں میں منہ دے لیا۔ فائق نے گہرا سانس کھینچا۔

"فاتح گھر آیا ہوا ہے۔"

"کیا واقعی۔۔۔؟ میں جاتی ہوں پھر' کہاں ہے وہ اپنے کمرے میں۔۔۔؟" نور اچانک اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ فجر نے بھی گہرا سانس خارج کیا۔

"آپ کے جانے سے کچھ اچھا نہیں ہوگا۔ اس نے جو کرنا تھا کر دیا۔۔۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے امی اس کے کمرے سے نکلی ہیں۔ ان کا چہرہ سرخ تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بہت دیر تک روتی رہی ہیں۔۔۔" فجر کے بتانے پہ نور بے چین ہو گئی۔ کیا فاتح نے آنٹی سے ہر انتہائی بات کر لی تھی؟ اگر ایسا ہو چکا تھا تو بہت برا تھا۔ بہت برا ہو چکا تھا؟ اسے آنے میں دیر ہو گئی تھی۔

وہ اندر آئی تو فاتح نیم اندھیرے میں بیٹھا تھا۔ کمرے میں انتہا کی گھٹن تھی۔ اس نے اندر آنے کی اجازت لی تو فاتح چونک گیا۔ پھر نور کو دیکھ کر اسے کرنٹ لگا تھا۔ امی کا ارادہ تھا نور کو بہو بنانے کا۔ اس ضمن میں اندر ہی اندر تیاریاں بھی چل رہی تھیں اور ساتھ فاتح کے نکاح کی بھی۔ کچھ دیر پہلے امی اسے یہی بتانے کے لیے آئی تھیں۔ انہوں نے اس کی رائے نہیں لی تھی۔ انہوں نے اپنا حکم سنایا تھا۔

"تم نے بہت من مانی کرلی ہے اور میں تمہارے چال چلن بھی دیکھ رہی ہوں۔ بہتر ہے کہ سدھر جاؤ۔ خود کو ٹھیک کرلو۔ میں تمہارے نکاح کا ارادہ رکھتی ہوں۔" ان کا لہجہ بہت سخت دو ٹوک اور حکمیہ تھا۔ فاتح کے نکاح کا سن کر حواس اڑ گئے تھے اور ان کے الفاظ سن کر فاتح کو بھی غصہ آگیا تھا۔

"میرے چلن کو کیا ہوا ہے؟ یہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں؟" وہ جو پہلے ہی اذیت اور تکلیف کے شکنجے میں ادھ موا ہو رہا تھا۔ امی کے الزام پہ بھونچکا رہ گیا۔

"فجر کا معصوم دل توڑا ہے۔ اسے نظر انداز کیا ہے۔ اس پہ کسی اور کو فوقیت دی ہے۔ میں تمہارے مبین کے ساتھ بڑھتے التفات دیکھ رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا تم اتنا گر جاؤ گے۔ یہ جانتے ہوئے بھی تم فجر کے ساتھ منسوب ہو۔" امی اسے چاروں طرف سے گھیر رہی تھیں۔ وہ تو ہکا بکا رہ گیا۔ یعنی الزام در الزام۔۔۔ حد تھی۔۔۔ فجر سب کچھ کرکرا کے معصوم بن گئی تھی اور الزام فاتح پہ آگیا تھا۔ کیا کوئی اتنا مکار ہوتا ہے؟ اسے فجر کی بھولی صورت پہ زہر چڑھ گیا تھا۔

"میں نہیں چاہتا تھا آپ کی لاڈلی فجر کے کرتوت آپ کے سامنے کھولوں۔ آپ جس کو معصوم سمجھ رہی ہیں۔ وہ انتہائی مکار ہے۔ اس نے ذرا بھی بچپن کی منگنی کا لحاظ نہیں کیا۔ کسی رشتے کا پاس نہیں رکھا۔ وہ خود فائق میں انٹرسٹڈ ہے۔ میرے پاس ثبوت بھی موجود ہیں۔" اس کی چلتی زبان کو امی کی کڑک نے لمحہ بھر کے لیے روک دیا تھا۔ وہ مبین کی بھیجی ویڈیوز امی کو دکھاتا تھا۔ موبائل ہاتھ میں لیتا رک گیا۔ اس موبائل میں ثبوت تھے۔ فائق اور فجر کے تعلق کی گواہی تھی۔ ایک ویڈیو کوری ڈور کی تھی جس میں فائق روتی ہوئی فجر کو چپ کروا رہا تھا۔ دوسری باغیچے کی تھی۔ جب فائق فجر سے وعدہ لے رہا تھا۔ حد تھی۔۔۔ وہ اس ویڈیو کو دیکھ کر کھول اٹھا۔ یہ منظر اس نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ رکھا تھا اور بھی کئی ایسے مناظر تھے۔ پھر اسے مبین کی بات پہ یقین تھا مگر امی کو کون یقین دلاتا؟ وہ فاتح کو جھوٹا سمجھ رہی تھیں۔

"خبردار۔۔۔ جو تم نے اپنا "معاشقہ" چھپانے کے لیے فجر اور فائق پہ الزام لگانے کی کوشش کی۔ وہ کل بھی بہن بھائی تھے، آج بھی بہن بھائی ہیں اور فائق اپنی کلاس فیلو سے لگاؤ رکھتا ہے۔ یہ بات فجر کو بھی معلوم ہے اور مجھے بھی۔۔۔ تم اپنا گریبان بچانے کے لیے ان پہ بہتان نہ لگاؤ۔ کیا میں نہیں جانتی تمہارے مبین سے تعلق اور رابطوں کو۔" امی نے لمحہ بھر میں ہی اسے "لتاڑ" کر رکھ دیا تھا۔

"میرا کسی سے معاشقہ نہیں ہے۔ آئی سمجھ میں بات۔ یہ بھی جھوٹ ہے۔ میں حلفیہ کہتا ہوں۔ میں نے مبین کو بھی اس نگاہ سے نہیں دیکھا۔ بس کزن کے ناطے دوستی کا تعلق ہے اور بس۔۔۔" وہ جیسے چیخ پڑا تھا۔

"اور آپ فائق اور فجر کی بے جا حمایت مت کریں۔ اس ویڈیو کو دیکھیں۔" اس نے غصے کے عالم میں دونوں کلپس ماں کے سامنے کردیے تھے اور امی کو ایسا تاؤ چڑھا کہ اس کا قیمتی موبائل اٹھا کر دیوار سے دے مارا تھا۔ فاتح اپنا ٹوٹا موبائل دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔

"یہ کس نے گھٹیا حرکت کی ہے؟ چھپ کر ویڈیو بنائی؟ تم میں عقل نام کی نہیں فاتح! جس نے یہ ویڈیو بنا کر تمہارا "جی" الٹایا ہے، تمہیں اپنے سگے بھائی سے بدظن کیا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ کہاں تک مخلص ہے؟ کون ہے یہ فسادن؟ میں ابھی اس کا منہ توڑ کر آتی ہوں۔ دونوں بھائیوں میں پھوٹ ڈلوا دی۔ میرے معصوم بچوں پہ بہتان باندھا۔" امی کا پارہ اور بھی آسمان پہ چڑھ گیا تھا۔

"خناس بھرا گیا ہے تمہارے دماغ میں۔ کیا فائق نے پہلے کبھی فجر کے آنسو نہیں پونچھے؟ پیار نہیں کیا؟ وہ بہن ہے اس کی۔ تم نے اتنی گھٹیا بات سوچی بھی کیسے؟" امی کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اپنا جوتا اتار کر اس کا سر ہلا کر دیتیں۔

"غضب خدا کا۔۔۔ بے کار "شک" کی وجہ سے اپنا پورا گھر ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہو۔ کوئی اور سنے گا تو کیا کہے گا۔" امی نے تلملا کر فاتح کو دیکھا تھا۔ جو غصے میں بل کھاتا شدید بے بسی کا شکار تھا۔

"سن لو تم۔۔۔ میں تمہارا نکاح کرنے والی ہوں فجر سے۔ خبردار جو تم نے زبان کھولی۔" ان کی دھمکی پہ فاتح بلبلا اٹھا تھا۔

"یہ نوبت ہی نہیں آئے گی۔ آپ کی فجر صاحبہ خود انکار کر دیں گی۔ ایک مرتبہ اس سے پوچھ تو لیں۔" اس کا لہجہ گہرا کاٹ دار طنزیہ تھا۔

"انکار نہیں کرے گی' میں گارنٹی دیتی ہوں۔" امی نے اسے چیلنج کیا تھا۔

"لیکن وہ دل سے تو راضی نہیں ہو گی۔" اس کا ذہن مبین کی باتوں میں ہی پھنسا ہوا تھا۔

"اس لیے میری طرف سے "انکار" ہے۔ صاف انکار۔ کیونکہ مجھے عمر بھر کے لیے کسی پر مسلط نہیں ہونا۔" وہ لمحوں میں اپنے دل کی بات ماں تک پہنچا کر پرسکون ہو گیا تھا۔ امی بھی جیسے گم صم رہ گئیں۔ یعنی اتنا "لتاڑنے" کے باوجود بھی اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہو رہی تھی۔ امی کا دل بھر بھر آیا۔ ان کے آنسو گرنے لگے اور فاتح کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ وہ خود کہاں فجر سے دستبردار ہونا چاہتا تھا اور اب امی کے آنسو۔ فاتح عجیب "بے بسی" کے حصار میں جکڑا گیا۔ ہر طرف اندھیرا ہی نظر آ رہا تھا۔ امی کی بات مانتا تو اس کی انا پہ ضرب تھی اور اسے اپنی "انا" ہر صورت بچانا تھی۔

"فاتح! تجھے کھرے کھوٹے کی پہچان نہیں ہے۔ اللہ کرے وقت گزرنے سے پہلے تو "کھوٹے" کو پہچان جائے۔ سچائی تمہارے سامنے آ جائے۔ کسی نے تجھے فجر سے اور فجر کو تجھ سے "بدظن" کر رکھا ہے۔" امی کے الفاظ آنسوؤں میں ڈوب گئے تھے۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پایا تھا۔ لیکن امی کو روتا ہوا دیکھ تو رہا تھا۔ امی کے آنسو اس کی "آزمائش" بن گئے تھے۔ ماں کو رولا کر وہ اور بھی بے چین ہو گیا تھا۔

امی فائز کی شادی کے لیے سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ کیونکہ نور کے انکل نے رشتہ منظور کر لیا تھا۔ تاہم سجیلہ کی طرف سے حوصلہ افزا رسپانس نہیں آیا۔ یعنی سجیلہ کو نور کے رشتے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ ڈیٹ فکس ہونے سے پہلے نور خود یہاں آ گئی۔ اس کا آنا بڑا پراسرار تھا۔ وہ امی سے الگ سے ملی تھی اور فاتح سے الگ۔ وہ خاصی سنجیدہ تھی۔ اس نے فجر سے بھی بہت لمبی بات کی تھی۔ امی نے کہا تھا' وہ فجر کو سمجھائے۔ نور نے فجر کو سمجھایا تو اسے سمجھ آ گئی۔ پھر نور امی کے پاس آئی۔ وہ اکیلی بیٹھی تھیں اور انتہائی پریشان تھیں۔ فاتح نے پورے گھر کو "نچا" کر رکھ دیا تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ الجھے ہوئے تھے۔ نور نے امی سے کہا۔

"آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیسے ٹھیک ہو گا بیٹا! برا مت ماننا۔ تمہاری سجیلہ پھوپھو کی بیٹی کے ہوتے ہوئے تو کچھ ممکن نہیں۔" یعنی امی اس ساری "گڑبڑ" اور کارروائی کرنے والے ماسٹر مائنڈ کا سراغ لگا چکی تھیں۔ نور نے گہرا سانس خارج کیا۔

"گو کہ مبین میری دوست ہے امی اور کزن بھی۔۔۔ اور دوستی کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں اس کے "راز" کو اپنے تک محدود رکھتی۔۔۔ لیکن مجھے لگتا ہے اتنی بڑی بات چھپا کر میں فجر اور فاتح کے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں۔" بالآخر نور نے بادبان کھولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گو کہ یہ مشکل فیصلہ تھا' پھر بھی اس کی "اچھائی" اور نیک نیتی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ فاتح کی امی کو "باخبر" کر دیتی۔

"اس سچویشن میں جہاں جہاں گڑبڑ ہوئی ہے۔ وہ مبین کی اس محبت کی وجہ سے ہوئی ہے جو اسے فاتح

سے اچانک ہوگئی تھی۔ نور نے ہالا کرنا شروع کردیا تھا اور امی بکا بکا سی سن رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

دن اسی طرح بے زار سے گزرتے جارہے تھے۔ فاتح اگلے ہی دن واپس چلا گیا تھا۔ برسات کے دن بھی ٹھہرا گئے تھے۔ ہر روز وقفے وقفے سے بارش ہوتی تھی۔ سڑکیں کیچڑ سے بھر جاتیں اور گھر کے صحن پانیوں میں ڈوب جاتے۔ بارش کا گیلا پن ہر شے میں جھلکتا تھا۔ اب تو آنکھیں بھی گیلی گیلی نظر آتی تھیں۔ ایک ہفتہ پہلے نور اور فائز کی منگنی بھی ہوگئی تھی۔ شادی بقر عید کے بعد تھی۔ جب سے نور کی منگنی ہوئی تھی ماما کو پتنگے لگ گئے تھے۔ نور واپس اپنے انکل کے پاس چلی گئی تھی اور ماما پورا پورا دن سلگتی رہتی تھیں۔

"تمہاری تائی کو تمہارا خیال تک نہیں آیا۔ نور کو مانگ لیا۔ حد ہے بے مروتی کی۔ تمہارے بابا کو احساس تک نہیں۔ بندہ خود ہی اپنے بھائی سے بات کرلیتا ہے۔" ماما تلملا رہی تھیں۔ نور جو جاچکی تھی اپنے جانے کے بعد بھی ان کی باتوں میں اردگرد چکراتی رہتی۔ مبین، نور نامے سے تنگ آچکی تھی۔ اب اس کی نور سے پہلے والی دوستی بھی نہیں رہتی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ نجر کی ہمدردیاں کرنے لگی تھی۔ اب وہ مبین کو پہلے کی طرح سراہتی بھی نہیں تھی بلکہ ہر وقت اسے صحیح غلط میں لیکچر دیتی۔ یوں مبین، نور سے خود بخود بور ہوچکی تھی۔

"تائی کو خیال نہ آئے۔ مجھے ان کے خیال کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے فاتح کی کال کا انتظار ہے۔ اب کہ وہ آئے گا تو کوئی فیصلہ کرکے ہی آئے گا۔" مبین کی خوش رنگ آنکھوں میں خواب تیر رہے تھے۔

اور پھر ایک سہانی صبح جب باہر ساون ٹوٹ کے برس رہا تھا مبین کے نمبر پہ فاتح کی پہلی مرتبہ از خود کال آئی تھی۔ ورنہ اس تمام عرصے میں مبین ہی اپنی انا کو جھکا جھکا کر فاتح سے رابطہ بحال رکھتی تھی۔ جن دنوں
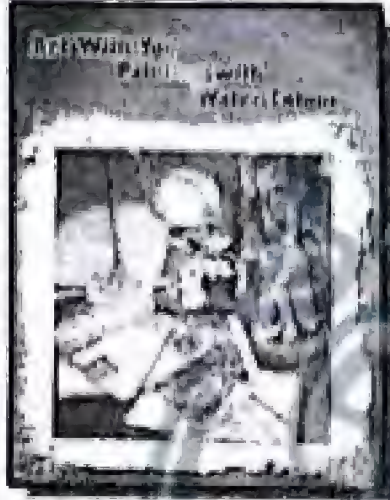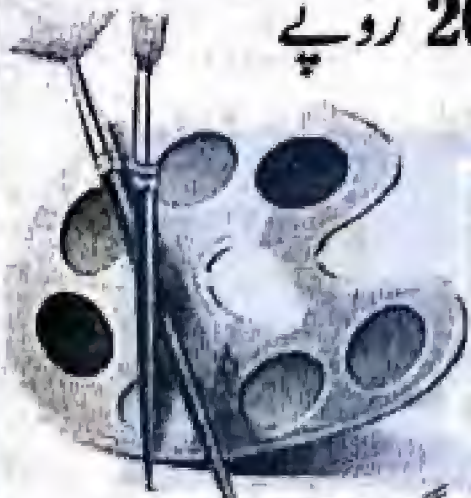
وہ بہت زیادہ ڈسٹرب تھا۔ ان دنوں میں میسج کا جواب تک نہیں دیتا تھا۔ تب مبین ہی اسے جذباتی سہارا دینے کے لیے لمبی لمبی کالز کرتی تھی اور ان گنت میسج بھیجتی تھی۔ وہ فاتح کی کال پہ نہال ہو گئی تھی۔ وہ ایسی خوش نصیب تھی؟ یا اس کی تمام محنت رنگ لے آئی تھی۔ کو کہ اس نے تھوڑی دیر کے لیے فون کیا تھا۔ پھر بھی مبین بے انتہا خوش تھی اور اس نے اپنی اس خوشی کا برملا اظہار بھی کر دیا تھا۔

"زہے نصیب۔۔۔ میری تو قسمت جاگ گئی ہے، تم نے مجھے کال کی؟ مجھے یقین نہیں آرہا۔" وہ خوشی سے بے حال ہو رہی تھی۔

"یقین کر لو۔۔۔ آئندہ تمہیں کال نہیں کرنا پڑے گی۔ میں خود تمہیں فون کروں گا۔" وہ جیسے ایک نتیجے پہ پہنچ کر بڑے ٹھہرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مبین پہ تو شادی مرگ طاری ہو چکی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ فون کو کان سے لگا کر ہی ناچنا شروع کر دے۔

"تم مجھے بے ہوش کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" مبین خوشی بھرے لہجے کو بمشکل رواں کرتے ہوئے بولی تھی۔ فاتح دوسری طرف اداسی سے مسکرا دیا۔

"نہیں۔۔۔ میں چاہتا ہوں تم اپنا دل مضبوط کر لو۔ میں آکر ایک "دھماکا" کرنے والا ہوں۔" اب کہ فاتح کا لہجہ بھی مسرور اور چہکتا ہوا تھا۔ مبین کو جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔ وہ خوشی کے مارے بے حواس ہونے لگی۔ فاتح کے لہجے میں چھپی خوشبو اسے بتا گئی تھی کہ فاتح اسے ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے آرہا ہے۔

وہ پاگلوں کی طرح کمرے میں چکرانے لگی تھی۔ پھر اسے اچانک خیال آیا۔ اس کو شکرانہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ اس پہ سجدہ شکر واجب تھا۔ وہ پہلے شکرانے کے نوافل ادا کرتی تھی۔ عموماً" اس وقت جب رزلٹ بہت اچھا آتا تھا اور اس وقت وہ فاتح کے مل جانے کی خوشی میں نفل ادا کر رہی تھی۔ بڑے خشوع کے ساتھ۔ بڑے خضوع کے ساتھ۔ اس بات کو جانے بغیر کہ اللہ کو ایسے سجدوں کی ضرورت نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

باہر حبس بھری دوپہر پھیل رہی تھی۔ ماحول میں تپش اور حدت معمول سے بڑھ کے تھی۔ اس دن ہوا بھی بند تھی۔ درخت یوں خاموش اور ساکت تھے جیسے کبھی ہلیں گے نہیں۔ ماحول میں رائی بھر خوشگواریت یا ٹھنڈک نہیں تھی۔ باہر پھیلی حدت کی طرح اندر کا ماحول بھی گرم، روکھا اور پر حبس تھا یا پھر اس کے اندر رمیدگی کا اثر زیادہ تھا تو چیز میں اسے وحشت دکھائی دے رہی تھی۔ دل کو عجیب سی بے چینی کے پنکھ لگے تھے۔ سامنے تایا کا مکان ایستادہ تھا۔ تو برآمدے کی جالیوں سے نظر آتا تھا۔ بجائے دل کے خوش ہونے، جھومنے ناچنے کے عجیب بے قراری پھیل رہی تھی۔ شاید یہ نور کی کال کا اثر تھا۔

"تم دو دلوں کے بیچ میں آکر جو گناہ کر چکی ہو، اللہ تمہیں معاف نہیں کرے گا۔" نور نے کچھ دیر پہلے اس کا دماغ خوب تپا دیا تھا۔ "میں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ اپنے دل کی خوشی اور چین کے لیے سب ہی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے بھی ایک کوشش کی اور اپنے دل کا چین پالیا۔ وہ فجر کے نصیب میں نہیں تھا۔ اس لیے اسے نہیں ملا۔ وہ میرے نصیب میں تھا۔ اس لیے وہ میرے پاس آرہا ہے۔" اس نے نور کو کھری کھری سنا کر فون بند کر دیا تھا اور تب سے لے کر اب تک وہ برآمدے میں چکراتی اپنی پوری زندگی کے گزشتہ سارے واقعات سوچ رہی تھی۔ اسے اپنا عمل کہیں سے بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے نور پہ غصہ آرہا تھا۔ تب ہی ماما بھی کچن سے نکل آئی تھیں۔ پھر ماما سے باتوں میں لگ کر وہ نور کی بکواس کو فراموش کر گئی۔ ماما فاتح کے لیے اہتمام کر رہی تھیں۔ کچن سے رنگ رنگ کی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ ماما اسے کچھ بے چین نظر آرہی تھیں۔ مبین کے پوچھنے پر بول پڑیں۔

"کیا تمہیں لگتا ہے فاتح کبھی جان نہیں پائے گا کہ تم نے کس طرح پہلے فجر کو اس سے بدگمان کیا۔ پھر فاتح کے دل میں بدگمانی بھری۔ اس کے اندر رفائق اور فجر کے حوالے سے شک کا بیج بویا۔ اگر فجر نے کچھ بول دیا؟"

''ماما! ایک بات کی گارنٹی ہے۔ فاتح کبھی بھی اس بات کا پول نہیں کھولے گا۔ کیونکہ جب بھی وہ فجر یا فائق کے سامنے جوابی طلبی کرے گا تو اس کی انا ڈسٹرب ہوگی' بہت ہرٹ ہوگی۔ اینڈ یو ڈونٹ وری مام! کہ فجر اس ''بہتان'' کو جان پائے گی جو فاتح اور فجر کو الگ کرنے کا سبب بنا تھا۔ اپنے آرام' سکون اور محبت کی خاطر اپنا سا حق تو میرا بنتا تھا۔ پھر بابا کی ریٹائرڈ لائف کے بعد ایر فورس کا گلیمر بھی ختم ہوگیا۔ آپ نے کیا سمجھا ہے۔ میں ساری عمر یہیں تایا کے مکان میں تائی کی چاکری کرتی رہوں گی۔ اس فضول سی فجر کی طرح۔۔۔

ایسا ہرگز نہیں۔ میں نے فاتح کا انتخاب اسی لیے کیا تھا۔ ایک تو مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی اور دوسرا مجھے ایر فورس کی ''سپر گلوری لائف'' دوبارہ چاہیے تھی۔ ویسے بھی فجر فاتح کو ڈیزرو ہی نہیں کرتی تھی۔ اب عمر بھر فاتح کی محبت کے مزار پہ ''فاتحہ خوانی'' کرتی رہے۔ جب تک تائی اسے کسی کلرک سے بیاہ دیں گی۔ تب تک سوگ میں رہنا اس کا بنتا ہے اور یہ آپ نے پھر کیوں قصہ چھیڑ دیا۔ فاتح بس پہنچتا ہی ہوگا۔ آپ نے اضافی کھانا بنا لیا نا۔ فاتح بتا رہا تھا آج رات ہی تایا' تائی پرپوزل لے کر آئیں گے۔ انہیں کھانا کھلانا تو بنتا ہے نا؟'' مبین کی کھلکھلاتی آواز برآمدے کی جالیوں کے پار تک آرہی تھی۔ اس سے آگے ایک ستون تھا۔ جس کے ساتھ گملا رکھا تھا۔ وہ گملا اچانک گرا اور ٹوٹ گیا۔ گو کہ یہ اچانک ٹوٹنے والا نہیں تھا۔ جب تک اسے ٹھوکر نہ لگتی اور اسے ٹھوکر لگائی گئی تھی۔ جان بوجھ کر' بہت شدت کے ساتھ' یوں کہ گملا اڑتا ہوا برآمدے کے دروازے سے جا لگا تھا۔ یہ ایک خطرناک دھماکا تھا۔ اندر موجود وہ دونوں خواتین دہل کر چیخی تھیں اور یقیناً ''لپک کر باہر بھی آئی ہوں گی۔ کاش وہ اتنی تیزی سے باہر نکل کر نہ آتا۔ ان دونوں کے تاثرات دیکھ سکتا اور اس مکار مبین کا منہ توڑ سکتا۔

اس وقت اپنے ہی گھر کے سامنے موجود بینچ پہ بیٹھ کر وہ غصہ' آگ' نفرت' زہر اور ہر چیز کو تہس نہس کرنے والی تمام تر کیفیات پہ قابو پا رہا تھا۔ ورنہ جی تو چاہ رہا تھا ہر چیز کو آگ لگا دے۔

''اچھا تو فلائٹ لیفٹیننٹ صاحب! آپ سے زیادہ کھوتا' الو کا پٹھا کوئی دنیا میں نہ ہوگا۔ بالشت بھر کی چھوری تمہیں انگلی پہ نچا گئی اور تم اس کے ہاتھوں الو بن گئے۔ تم فلائٹ لیفٹیننٹ بن کر بھی کھوتے ہی رہے اور پتا نہیں کب تک کھوتے رہتے۔'' وہ خود کو کوستا شدید غصے اور اہانت کا شکار تھا۔ جی چاہ رہا تھا ایک مرتبہ مبین کے سامنے چلا جاتا' تاکہ اسے خبر ہوتی۔ فاتح سب کچھ جان چکا ہے۔ اس کا تمام ڈرامہ' پورا کھیل' جو عین کلائمکس پہ فلاپ ہوگیا تھا۔ لیکن پھر اسے اچانک خیال گزرا۔ وہ مبین کو کبھی نہیں بتائے گا۔ وہ سب کچھ جان چکا ہے۔ ہر وہ سازش جس نے اسے فجر سے دور کردیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پٹی ہٹ گئی تھی اور جب ہر منظر روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا تب وہ اپنی چچازاد کی شاطرانہ چالوں کو سراہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ بڑی کمال کی چال باز تھی۔ کس طرح ہر جگہ ڈبل گیم کرتی

رہی۔ حتیٰ کہ اس کی سہیلی نور نے بھی اسے سمجھایا تھا۔ اس دن جب وہ اس کے کمرے میں آئی تھی۔ نور نے زیادہ لمبی بات نہیں کی تھی۔ بس ایک جملے میں اسے بہت کچھ باور کروادیا۔

"مبین بہت سیلفش اور خود پرست ہے فاتح۔" نور نے مزید کچھ نہیں کہا تھا' لیکن فاتح تب کسی کی نہیں سمجھتا تھا۔ اس پہ فجر کو مزا چکھانے کا بھوت سوار تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے مبین سے طوفانی محبت ہوگئی تھی اور وہ اس کے گھر رشتہ بھجوانے کے لیے مر رہا تھا۔ دراصل مبین کے علاوہ اس کے پاس کوئی آپشن ہی نہیں تھا۔ کوئی اور لڑکی بھی ہوتی تب بھی وہ اتنا ہی امی کو مجبور کرتا۔ اسے فجر سے بدلہ لینا تھا۔ فجر نے اسے ٹھکرایا تھا۔ وہ بھی اسے ٹھکرا کر کچھ ثابت کرنا چاہتا تھا۔ یہ کہ اگر فجر نے اس کے جذبوں کی قدر نہیں کی۔ اس کی محبت کو دھتکارا تھا۔ تو اسے بھی فجر کی کوئی پروا نہیں تھی۔ محض فجر کو اذیت دینے کے لیے اس نے مبین کا انتخاب کرلیا تھا۔ وہ فائق اور فجر کی شادی سے پہلے اپنی شادی کروانا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ فجر کو ذلیل کرسکے' جلا سکے' مبین کو سکھ دے کر اسے تڑپا سکے اور اس وقت وہ اپنی چالوں پہ خود ہی شرمندہ بیٹھا تھا اور مبین کے منصوبوں پہ عش عش کر رہا تھا۔

ایک سپر گلوری لائف۔۔۔ باپ کے بعد شوہر کے ساتھ ہر اسٹیشن پہ رنگا رنگ زندگی کے مزے۔۔۔ پھر فاتح خوب صورت بھی تھا اور مبین کو اچھی شکلوں سے محبت تھی۔ فاتح خوب صورت نہ ہوتا تو مبین اسے گھاس بھی نہ ڈالتی اور اگر اپنی ٹف جاب کے دوران وہ کسی سیریس انجری کا شکار ہو کر معذور ہو جاتا تو مبین اس پہ لعنت ڈال کر چلی جاتی۔ کیونکہ وہ ایک خود غرض لڑکی تھی اور اللہ نے بروقت اس کی آنکھیں کھول کر اس خود غرض لڑکی سے اسے بچالیا تھا۔ تین گھنٹے اپنا احتساب کرنے' غصہ پینے خود کو کوسنے کے بعد اس نے گھر جا کر فجر اور امی کا سامنا کرنے ان سے بات کرنے' معافی مانگنے کا حوصلہ پیدا کر ہی لیا تھا۔ اس دوران ایک سو چالیس کالز اور پچیس میسج مبین کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔ اس نے موبائل کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

ادھر ٹیرس پہ فجر کپڑے پھیلانے کے لیے آئی تو سامنے ہی بینچ پہ فاتح کو بیٹھا دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ بالٹی وہیں چھوڑ کر وہ بھاگتی ہوئی نیچے آئی تھی۔ فاتح سر تھامے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھا تھا۔ فجر کو یوں لگا اسے سر میں شدید درد ہے۔ سر کا درد اسے بے حال کردیتا تھا اور شاید تکلیف اتنی زیادہ تھی کہ اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ ورنہ وہ چل کر گھر تو آسکتا تھا۔ فجر کی جیسے جان پہ بن آئی۔ وہ اندھا دھند بھاگتی سارے سابقہ اختلاف اور ناراضی بھلا کر فاتح تک پہنچ گئی تھی۔

"فاتح! تم ٹھیک ہو۔" اس نے جھپٹ کر اس کا کندھا ہلایا تھا۔ فاتح اس افتاد پہ چونک گیا۔ سامنے فجر کھڑی تھی۔ فاتح کا دل دھڑکنے لگا۔ اتنا غیر متوقع فجر سے سامنا ہوا تھا۔ ابھی تو وہ ہمت مجتمع کر رہا تھا۔ اس سے بات کرنے کا سوچ رہا تھا اور وہ سوچوں سے نکل کر سامنے آگئی تھی۔

"سر میں درد ہے؟ چلا نہیں جارہا؟ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ گھر کیوں نہیں آئے۔" فجر جیسے مرنے کے قریب ہوگئی تھی۔ ایک ایک لفظ میں بے قراری پوشیدہ تھی۔ ایک ایک لفظ میں محبت چھلک رہی تھی اور وہ اتنا احمق' الو' کھوتا تھا کہ اس محبت سے نگاہ چرا کر بھاگا جارہا تھا۔ اندھا دھند اور اگر اتنی بڑی ٹھوکر نہ لگتی تو اس کا انجام کیا ہوتا؟ اس نے جھرجھری لے کر خود کو سنبھالا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں فجر تم پریشان نہ ہو۔" عرصے بعد وہ اتنی ملائمت سے بولا تھا۔ یوں کہ فجر کو اس نرمی پہ غش آنے لگا۔

"اب تو بالکل طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" اس کا اشارہ فاتح کے نرم لہجے کی طرف تھا۔ فاتح بری طرح نادم ہوگیا تھا۔

"آئم سوری فجر!" اس کے لہجے میں ٹوٹ پڑتی شرمندگی تھی۔ فجر ہکا بکا رہ گئی۔ "مجھے معاف کردو فجر!

میرے ہر ہر رویے پہ۔ یقین کرو' میں غلط نہیں تھا۔ نہ میری زندگی میں تمہارے علاوہ کسی اور کا دخل ہوا۔ مجھے بدگمان کیا گیا تھا۔" وہ اسے پوری تفصیل بتانا چاہتا تھا' لیکن فجر نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ وہ خود بھی خاصی نادم کھڑی تھی۔

"اور مجھے بھی۔" اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

"اگر نور مجھے سب کچھ نہ بتاتی تو میں کبھی نہ جان پاتی۔"

"پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ کوئی ہماری زندگی کے ساتھ گیم کر گیا تھا۔" وہ فجر سے خفا نظر آیا۔

"امی نے کہا تھا۔ اسے کھرے اور کھوٹے کی خود پہچان کرنے دو۔" اب کہ فجر مسکرا دی تھی۔ فاتح تھوڑا ناراض ہوا۔ یعنی امی بھی ملی ہوئی تھیں۔ اسے ہی بے خبر رکھا گیا۔

"وہ غلطی مبین کی نہیں' ہماری ہے۔ ہم دونوں اس امتحان میں فیل ہو گئے ہیں۔ کوئی ہمیں الو بنا گیا۔ دراصل ہماری محبت کمزور نہیں تھی۔ بس یقین کمزور تھا۔ اسی لیے دوسروں کو بیچ میں آنے کی جگہ مل گئی۔" فجر نے گہرا سانس کھینچ کر تجزیہ پیش کیا تھا۔ فاتح نے تائید میں سر ہلایا۔ دھند تو چھٹ گئی تھی۔ بدگمانی کی دھند۔ ورنہ کس میں دھند کہاں تھی؟ ہر طرف چبھتی ہوئی دھوپ پھیلی تھی اور وہ دونوں مسکراتے ہوئے گھر کی طرف جا رہے تھے اور ٹیرس پہ کھڑی امی ان دونوں کو ایک ساتھ اندر آتا دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں جگمگاہٹ تھی اور لبوں پہ مسکراہٹ۔ ان کا دل سجدہ شکر بجا لایا تھا۔ ان کے دونوں بچے بدگمانی کے شکنجے سے نکل آئے تھے اور بدگمانی کا جال بچھانے والے منہ کی کھائے بیٹھے تھے۔ پھر اسی ہفتے فجر اور فاتح کی تقریب نکاح منعقد ہو گئی تھی۔ جبکہ دوسری طرف مبین اس کایا پلٹ پر دنگ رہ گئی تھی۔ ساری گیم الٹ گئی۔ شطرنج کی بساط بکھر گئی۔ مہرے سب ہاتھ سے نکل گئے۔ منصوبے فیل ہو گئے تھے۔ چال الجھ گئی تھی۔ پلان بگڑ گئے تھے۔

آخر ہوا کیا تھا؟ وہ رات دن پاگلوں کی طرح فاتح کے نمبر پہ میسج کرتی تھی اور اس کے ہر میسج پہ ایک سوال چیخ رہا ہوتا؟

"آخر ہوا کیا تھا؟" فاتح نے نمبر نہیں بدلا تھا۔ بلکہ وہ ہر میسج کو پڑھتا اور ڈیلیٹ کر دیتا تھا۔ وہ اسے جواب بھی نہیں دیتا تھا۔ اس نے بڑی آسان سزا مبین کے لیے تجویز کی تھی؟ وہ عمر بھر اسی سوال کے گرد چکراتی رہتی؟

"آخر ہوا کیا تھا؟"

اس دن ہوا کیا تھا؟ جب وہ ماما سے بات کر رہی تھی۔ اپنی سازش کی کامیابی پہ ہنس رہی تھی۔ خود کو عقل کل کا مالک سمجھ رہی تھی' تب ہوا کیا تھا؟ ایک گملا اڑتا ہوا برآمدے کے دروازے سے ٹکرایا تھا۔ بھلا کیسے؟ کس طرح؟ ایک دھماکا ہوا اور سب کچھ فنا ہو گیا؟

اس دن ہوا بھی بند تھی۔ درخت ساکت تھے۔ پتا تک ہل نہیں رہا تھا۔ پھر کون تھا جس نے گملے کو ٹھوکر سے اڑایا تھا اور اندر بھی نہیں آیا؟

کیا فاتح؟ کیا وہ سب کچھ سن چکا تھا؟ مبین ایسی ہی پر تپش گرم اور سلگتی دوپہروں میں پورے صحن میں چکرایا کرتی تھی۔ کبھی برآمدے کے اس دروازے کو پہروں تکتی' کبھی ٹوٹے گملے کو ہاتھوں سے چھوتی' کبھی جالیوں سے تایا کے مکان کو دیکھتی۔ اسے اپنا ہر سوال اس ٹوٹے گملے کو دیکھ کر بے معنی لگتا تھا۔ اسے اپنا ہر جواب اس ٹوٹے گملے کو دیکھ کر مل جاتا تھا۔

فاتح نے کبھی نہ جتا کر' کبھی نہ دہرا کر اس کے لیے اچھی سزا تجویز کی تھی۔ وہ ہمیشہ اس سے پرتپاک ملتا تھا' لیکن مبین۔ اس کا سر خود بخود فاتح کے سامنے جھک جاتا۔ شرمندگی کے اس احساس سے کہ مات کرنے والوں کو شہ مات ہونا کبھی گوارا نہیں ہوتا۔

☆ ☆

سحرش فاطمہ

ردا جوگ کے قیدی

وہ لڑکی کتنی حسین ہوگی میں نہیں جانتا تھا۔ہاں مگر دل میں اسے دیکھنے کی تمنا ضرور تھی۔

"اے لڑکی چل جلدی جلدی جھاڑو دے۔ ابھی برتن بھی پڑے ہیں دھونے والے... کام چور نہ ہو تو ...ہونہہ!"

اماں آسیہ نے اس کام والی کو درشت اور حقارت بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔

پتا نہیں کون تھی وہ لڑکی... کیا تھی... ایک عجیب سا اسرار جھلکتا تھا اس کی شخصیت سے... لیکن وہ جو کوئی بھی تھی۔ ضرور کوئی حسین ترین قسم کی لڑکی تھی۔ نقاب زدہ چہرے سے جھانکتی اس کی آنکھیں یہی تاثر دیتی تھیں۔ اس کا چہرہ ہمہ وقت نقاب میں ڈھکا رہتا تھا۔ بس اس کی بلوری آنکھیں ہی میرا دل لبھاتی رہتی تھیں۔

"اے سنو!سنو۔ برتن دھونے کے بعد چائے بنا کرلے آنا میرے کمرے میں۔ واپس اپنے کوارٹر میں مت گھس جانا۔ پتا نہیں ادھر گھس کے کیا کیا پڑھتی رہتی ہو۔" یہ آپا برجیس تھیں۔ جن کے لہجے میں اماں سے بھی زیادہ حقارت اور سختی تھی۔ اور جو نجانے کس پڑھائی کی بات کر رہی تھیں۔

اس لڑکی نے خاموشی سے سرہلا دیا تھا۔ اللہ جانے کس مٹی کی بنی تھی جس پہ کسی کا سخت لہجہ اور کڑوی باتیں اثر انداز ہی نہیں ہوتی تھیں۔

"سنو..." آپا اپنے کمرے میں گئیں تو میں نے آہستگی سے اسے پکارا۔ جواب ندارد...

"میرے لیے بھی چائے بنا دینا۔"

اور اس نے خاموشی کے ساتھ محض سرہلا دینے پہ اکتفا کیا۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ سوچتا رہا کہ وہ نہ کسی کی طرف دیکھتی ہے نہ کسی کی بری بھلی بات پہ کسی قسم کے رد عمل کا اظہار کرتی ہے۔ آخر ایسی کیا مجبوری ہے اس کی جو وہ یوں چپ چاپ سب برداشت کرنے پر مجبور ہے 'خیر مجھے کیا' سر جھٹک کر میں نے اس کے خیال سے دامن چھڑانا چاہا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"آجاؤ..."

میں نے بلند آواز سے کہا تو وہ چائے کی ٹرے کے ساتھ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئی اور ٹرے ٹیبل پر رکھ کر جلدی سے واپس جانے کو مڑی۔

"سنو" اس سے پہلے کہ وہ جھپاک سے باہر نکلتی۔ میری آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"تم یہ چہرہ کیوں ہر وقت ڈھانپ کر رکھتی ہو؟ کیا خوف لاحق ہے تمہیں؟"

"مجھے اس نے کہا ہے چہرا ڈھکنے کو صرف اس کا خوف لاحق ہے مجھے۔"

اس کی آواز میں عجیب سی نرمی۔ شائستگی اور ایسا رعب تھا کہ میں نا چاہتے ہوئے بھی مرعوب ہو گیا۔ اور اپنے حواسوں پہ ایک پاکیزہ سی مدہوشی طاری ہوتی ہوئی محسوس ہوئی مجھے... اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھتا۔ میرے سیل فون کی بجتی ٹون مجھے اس کے سحر سے نکال کھینچ لائی۔ میں فون کی طرف متوجہ ہوا تو وہ فوراً" کمرے سے باہر نکل گئی۔

"اس نے کہا ہے چہرہ ڈھکنے کو۔" مگر کس نے؟ کون

ہے اس کی زندگی میں؟ جو اس کے لیے اتنا اہم ہے کہ وہ یوں اس کے حکم کی پاسداری کرتی پھر رہی ہے۔ کافی دیر تک اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میں خود سے الجھتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کا وقت تھا۔ سب کھانے سے فارغ ہو کر اپنی اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے تھے۔ کوئی ٹی وی میں گم تھا تو کوئی اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے چلا گیا تھا۔ میں ایسے ہی ہوا خوری کے لیے لان میں نکل آیا۔۔۔ ٹہلتے ٹہلتے میں گھر کی پچھلی طرف آنکلا جس طرف اس پراسرار لڑکی کا کوارٹر تھا۔ جسے دیکھ کر میں پھر سے اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ میری سوچیں بے لگام ہوتیں میں ٹھٹک کے رک گیا۔ کچھ آوازیں آرہی تھیں کوارٹر کی کھڑکی سے۔۔۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں اس کے کوارٹر کی کھڑکی کی طرف آگیا۔

"ہاں۔۔۔ میں جانتی ہوں آپ نے منع کیا ہے مجھے۔ پر میں بھی کیا کروں آخر تو بولنا ہوگا جواب دینا ہوگا ایسے میں اگر نادانستہ لہجہ نرم پڑ جائے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔"

اندر سے آتی آوازیں مجھے حیرت کے سمندر میں غرق کرنے کے لیے کافی تھیں۔ مجھے اس کی نرم مگر بارعب آواز یاد آگئی۔ کون ہے اس کے پاس۔۔۔ آخر کس سے باتیں کرتی ہے یہ۔۔۔ وہ بھی رات کے اس پہر۔

"اس نے مجھ سے پوچھا تھا میرے نقاب کا میں نے تو کہہ دیا کہ آپ نے کہا ہے۔ وہ سمجھے گا تو نہیں پر مجھے تو آپ نے حکم دیا ہے نا، جس کی تعمیل میں مرتے دم تک کروں گی۔۔۔"

ایک بار پھر اس کی آواز نے میری سوچوں کے تسلسل کو توڑا۔ وہ نجانے کس سے بات کر رہی تھی، کسی اور کی آواز تو آ ہی نہیں رہی تھی۔ اس کی باتیں سن کر دن کو اس کے ساتھ ہونے والی مختصر گفتگو یاد آگئی۔۔۔ جس میں کسی غائبانہ فرد کا ذکر تھا۔

خیر اس رات کے بعد اب میں روز اسے بغور دیکھتا۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے اور اس کا زیادہ تر چپ ہی رہنا۔ ضرورت کے تحت جواب دینا اور چہرہ ڈھکا ہوا اور روز رات کو میں اس کے کوارٹر کی طرف جاتا اور وہ کسی سے باتیں کرتی ہوئی سنائی دیتی مجھے نجانے کس سے۔

☼ ☼ ☼

"میرا نام شمائل ہے۔ میرا تعلق لاہور سے ہے۔ آج کل آپ کے شہر آیا ہوا ہوں۔۔۔ میں ایک لکھاری ہوں اور مجھے آپ بیتیاں لکھنا کا بہت شوق ہے۔ آپ کے ادارے کے لیے کچھ لکھنے کا خواہش مند ہوں اگر آپ۔۔۔"

"دیکھو۔۔۔! ٹھیک ہے آپ لکھ کے بھیج دیں دیکھ کے بتادیں گے کیا ہوتا ہے" اس سے پہلے کہ میں اپنی بات مکمل کرتا۔ رسالہ کے ایڈیٹر نے میری بات کاٹ کر دوٹوک جواب دیا۔

"جی ضرور۔۔۔ چلیں اللہ حافظ۔۔۔ اللہ حافظ۔" دوسری طرف سے بھی رابطہ منقطع ہو گیا تو میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

☼ ☼ ☼

دن پر دن گزرتے گئے۔ اس لڑکی کے بارے میں میرے تجسس اور الجھن کا وہی حال تھا۔ وہ آخر کس سے بات کرتی ہے اگر تو وہ خود سے بھی کرتی ہوگی تو وہ خود کو مخاطب کرتی، یہاں وہ کسی آپ سے ہی گفتگو کر رہی ہوتی تھی۔ اس کی ذات کا اسرار میرے لیے دن بدن ایک چیلنج بنتا جا رہا تھا اور میں نے طے کیا تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور اس الجھن بھرے معاملہ کا سرا معلوم کر کے رہوں گا۔

اس رات بھی میں حسب عادت باہر نکلا اور پیچھے کی طرف آیا اور مجھے اس کی سسکیوں کی آواز آئی۔۔۔ وہ رو

رہی تھی اور بے تحاشا رو رہی تھی۔ اس کی آواز میں ایک عجیب سا درد اور کرب محسوس ہوا مجھے... روتے ہوئے مسلسل کچھ بول رہی تھی... میں نے کھڑکی کے قریب ہو کر اس کی باتوں کا متن جاننے کی کوشش کی۔

"آپ پہ بہت ظلم ہوا اور آپ نے پھر بھی برداشت کیا آپ بہت صابر تھے۔ عظیم تھے میں تو آپ کے پیروں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہوں اور جس وقت مجھ پہ اتنا بڑا ظلم ہوا میرے تو فرشتوں کو بھی اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ اپنے ساتھ ہونے والے معاملہ کی سنگینی کا اندازہ کرپاتی.... اس وقت میرے مولا کیوں نہیں آئے مجھے بچانے؟ کیوں نہ اس ظلم کے خلاف ان ظالم و جابر لوگوں پر عذاب نازل کیا؟ میں تو آج بھی ان سے اپنے دل کی ہر بات کرتی ہوں ان ہی کا حکم مانتی ہوں... بے پناہ محبت کرتی ہوں ان سے... آپ ان کے محبوب ہیں... میں آپ سے بھی بے پناہ پیار کرتی ہوں۔ پر میں اب تھک گئی ہوں۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی میں کیا کروں... کہاں جاؤں... جہاں مجھے کسی کی الجھن بھری نظروں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جہاں کسی کے حیرت بھرے سوالوں کا جواب نہ دینا پڑے۔ کیا کروں میں... کیا کروں...."

وہ روتی جاتی اور کہتی جاتی مجھے اس کی گفتگو کی کچھ سمجھ نہ آئی بلکہ میری الجھن پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔

اگلے روز وہ باورچی خانے میں چائے بنا رہی تھی میں نے بھی اپنے لیے بنوائی اور کمرے میں لے آنے کا کہا۔

وہ آئی' چپ چاپ چائے رکھ کے جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ میرے سوال نے اس کے قدم وہیں ساکت کردیے۔

"کل رات تم رو کیوں رہی تھیں؟" وہ میری جانب مڑی۔ اور میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ عجیب سا خوف نظر آیا مجھے۔

"وہ میں... وہ جی میں۔" گھبراہٹ کے مارے اس کی زبان ہی لڑکھڑا گئی تھی۔

"اچھا دیسے تم روز کس سے بات کرتی رہتی ہو؟" اب یہ ہی سوال میری سمجھ میں آیا۔

"میں ان سے بات کرتی ہوں۔"

گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس نے لب کشائی کی۔

"ان سے کن سے؟"

"نہیں بتا سکتی صاحب..." اس نے اتنا ہی کہا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی فوراً" کمرے سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"میرا نام پاکیزہ ہے اور میرا تعلق اندرون سندھ سے ہے۔ میں بہت چھوٹی سی تھی مجھے یاد ہے جب میرے علاقہ کے لوگوں میرے آگے پیچھے عقیدت سے پھرا کرتے تھے اور مجھے پاک بی بی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ جب میں راستے پہ چلتی تو مجھے آتے دیکھ کر لوگ میرے لیے راستہ چھوڑ دیتے کہ پاک بی بی آ رہی ہے۔ اسکول جاتی تو وہاں لڑکیاں میرا احترام تو بہت کرتی تھیں۔ پر میرے ساتھ دوستی کرنے کو کوئی بھی تیار نہیں ہوتی تھی۔ وہ کہتی تھیں آپ پاک بی بی ہو ہم آپ کی دوستی کے قابل نہیں ہیں... مجھے ان کی باتوں کی کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔

شروع شروع میں تو میں اتنی پزیرائی اور عزت افزائی پر پھولے نہ سماتی تھی' پر آہستہ آہستہ میں اس ساری صورت حال سے بے زار ہونے لگی تھی... خیر... جب کوئی بھی میری دوست بننے پہ تیار نہ ہوئی تو میں نے کتابوں کے ساتھ دوستی کرلی۔ ایک تو مجھے پڑھنے کا شوق تھا دوسرے ہر وقت کتابوں میں گھسے رہنے کی وجہ سے میں کلاس میں ہمیشہ اول آتی۔ میرے گاؤں کے لوگ کہتے کہ میں پاک بی بی ہوں مجھ پہ اللہ کا خاص کرم ہے جس کی وجہ سے میں پہلی پوزیشن کے ساتھ

کامیاب ہوئی ہوں۔"

اگلے روز میری ہدایت پر وہ مجھے چائے دینے آئی تو خود ہی اپنی کتھا شروع کر کے مجھے اچنبھے میں ڈال دیا۔۔ کہاں تو وہ منہ ہی نہیں کھولتی تھی اور کہاں۔۔۔ خیر' میرے لیے یہی بات بہت خوشی اور اطمینان کا باعث تھی کہ پتھر میں جونک پڑ ہی گئی تھی یقیناً" اس کی پر اسرار شخصیت کا راز کھلنے والا تھا۔

"میں نے میٹرک شاندار نمبروں کے ساتھ پاس کیا مگر مجھے آگے پڑھنے کی اجازت نہ ملی۔ بلکہ میرے کہیں آنے جانے پر بھی پابندی لگا دی گئی اور مجھے گھر کے ایک کونے میں بٹھا دیا گیا۔ اب بس گھر تھا اور میں۔۔۔ مجھے قرآن پاک اور تسبیح ہاتھ میں دے دیئے گئے اور مجھ سے کہا گیا کہ تمہیں یہی پڑھنا ہے اب۔۔۔ یہی تمہارا اوڑھنا بچھونا ہیں اب۔

مجھے لگا مجھے یا تو حافظہ بنانا ہے یا عالمہ۔۔۔ میں بھی شوق میں قرآن اور اس کا ترجمہ پڑھتی رہتی دن رات۔۔۔ عام لڑکیوں کی طرح مجھ سے گھر کا کوئی کام نہ لیا جاتا بلکہ مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا۔۔۔ کچھ ماہ گزرے ہی تھے کہ مجھ سے آکر قرآن کا پوچھا گیا۔ میں جوش و خروش سے ایک ایک سورت سناتی گئی۔ بس مجھے پورے گاؤں میں مشہور کرا دیا کہ پاک بی بی تیار ہیں۔" میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

"اب روز میرے گھر میلا سا لگتا لوگ آتے میرے ہاتھ چومتے اور اپنے لیے دعا کرواتے۔ میں عجیب سے احساسات کا شکار رہتی۔"

"عجیب کیوں۔۔؟"

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی میرے سوال سے گویا وہ ماضی سے حال میں پلٹ آئی۔۔۔ اور اچانک گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"پتا نہیں۔ اچھا میں اب چلتی ہوں' بہت کام ہیں۔" تیزی سے کہتی ہوئی یہ جا اور وہ جا۔ میں روکنے کی بہت کوشش کی پر۔۔۔ وہ چلی گئی تھی پر مجھے مزید کشمکش میں ڈال گئی۔۔۔ میں سوچ سوچ کر الجھتا رہا کہ اسے آخر پاک بی بی کا درجہ کیسے ملا اور اگر وہ قرآن کی حافظہ ہے تو کیا وہ روز رات کو قرآن سے بات کرتی ہے؟ یا اللہ سے؟ اس کی باتوں سے میں کڑی سے کڑی ملانے لگا۔

☆ ☆ ☆

"پاکیزہ۔"

"جی اماں" میں اماں کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میری بات اچھی طرح گرہ سے باندھ لے۔"

میں اگرچہ اماں کی کسی بات کے پس منظر سے واقف نہیں تھی پر اماں کا غیر معمولی لہجہ مجھے ٹھٹکا گیا۔

"جی بولیں اماں۔"

میں پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"جو میں کہوں اسے غور سے سن اور اپنے دل و دماغ میں بٹھا لے۔" اماں کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ مجھے خوف محسوس ہوا۔

"جی اماں کہیں۔"

"دیکھو بیٹا۔ لوگ یہاں آتے ہیں تم سے دعائیں کروانے اور تمہیں زندگی بھر یہی کرنا ہے بہت نصیبوں والی ہو تم' جو تمہیں یہ درجہ ملا ہے اس کی لاج بھی رکھنی ہو گی اور بھول کے بھی شادی کا نہیں سوچو گی!" اماں نے اتنی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ دی کہ میں ان کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

"اماں مجھ سے لوگ آ آ کر اپنی بچیوں کی اچھی قسمت اور شادی وغیرہ کی دعائیں کراتے ہیں اور خود میں شادی کا نہ سوچوں۔۔۔!" اماں کی منطق نے مجھے بری طرح الجھا دیا تھا۔ میں بھی تو آخر لڑکی ہی تھی۔ بھلے میری زندگی صاف ستھری گزری ہو۔ اس میں کسی شخص کا بھی گزر نہ ہوا ہو پر شادی تو ایک شرعی مسئلہ تھا۔ آخر کو قرآن پڑھا تھا سب جانتی تھی۔

"اچھا اب زیادہ بحث نہیں جو کہہ دیا کافی ہے آرام کر لو شام میں پھر لوگ آئیں گے تم تھک جاؤ گی۔"

"کیا میں تھوڑی دیر کے لیے گھر سے باہر نہر کنارے جا سکتی ہوں؟"

میں نے اماں کو دیکھا جنہوں نے میری بات کو سختی

دکھا کر رفع دفع کر دیا تھا۔ مجھے عجیب سی گھٹن کا احساس ہوا تو اماں سے التجائیہ انداز میں باہر جانے کی اجازت لینی چاہی۔

"ٹھیک ہے میں بشیراں سے کہتی ہوں تم چادر اوڑھ لو اور وہاں چہرہ اچھی طرح ڈھانپ لینا۔ جلدی واپس آنا۔" اماں اتنی آسانی سے مان جائیں گی مجھے اندازہ نہیں تھا پر مجھے اس گھٹن سے چھٹکارا پانے کی اتنی جلدی تھی کہ میں فوراً" اندر چادر لینے بھاگی۔

اتنے عرصے بعد میں باہر نکلی تھی کھلی فضا میں۔ میں اس وقت ہر بات بھول کر بے پناہ خوش تھی۔ آزادی کے احساس سے کھلی فضا میں کھڑے ہو کر لمبے لمبے سانس لیے۔ گویا ایک ایک لمحہ کو اپنے اندر اتار لینا چاہتی تھی میں۔

پر میں پابندی میں جکڑی ہوئی تھی۔ میرا دل بے چین تھا۔ اس بے چینی سے چھٹکارا پانے کے لیے نہر کے کنارے بیٹھ کر میں نے پاؤں نیچے پانی میں لٹکا لیے اور بچوں کے سے پرجوش انداز میں پاؤں کے ساتھ پانی اچھالنا شروع کر دیا۔ مجھے لگا جیسے میری ہر پریشانی اس پانی کے اڑتے چھینٹوں کے ساتھ اڑ گئی ہو۔

اب یہ روز ہونے لگا تھا۔ میں ایک گھنٹے کے لیے نہر کے کنارے چلی جاتی تھی بشیراں ساتھ ہی ہوتی تھی۔ میں بچوں کی طرح پانی سے کھیلتی کبوتر اڑاتی۔ کبھی پگڈنڈیوں میں بھاگتی ہوئی اٹکھیلیاں کرتی۔۔۔ اور یہیں پہ ایک دن۔۔۔

عاصم میرے ساتھ کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ یہ کھیت کھلیان ہماری ملکیت ہیں اس لیے یہاں کسی باہر والے بندے کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے' اس لیے میں وہاں چہرہ کھلا رکھ کر اپنی سرگرمیوں میں مشغول رہتی تھی۔ پر جس بات کو ہونا تھا وہ ہو کر رہی۔ نجانے کب اور کیسے عاصم کی نظر مجھ پر پڑی اور مجھے ایک نظر دیکھتے ہی وہ اپنا سب کچھ ہار گیا تھا اور میری ایک جھلک دیکھنے روزانہ وہ نہر کے کنارے آنے لگا۔۔۔

"السلام علیکم۔۔۔ جی جی میں شمائل ہی بات کر رہا ہوں۔ اوہ اچھا۔۔۔ آپ کو کہانی پسند آئی۔۔۔ شکریہ بہت بہت۔۔۔ جی اللہ حافظ" میں بہت خوش تھا۔ میری کہانی ادارے والوں کو پسند آگئی تھی۔ ویسے میں اپنے شہر کے رسالوں میں تو لکھتا ہی رہتا تھا پر کسی دوسرے شہر کے رسالے میں لکھنے کا یہ موقع پہلا تھا۔۔۔

☼ ☼ ☼

"بشیراں! اے بشیراں۔۔۔ ایسا کرو تم مجھے آج اکیلا چھوڑ دو۔"

میں نے بشیراں کو حکم دیا۔ بشیراں کو نہ چاہتے ہوئے بھی میرا حکم ماننا تھا کیونکہ میں پاک بی بی تھی جس کے حکم سے سرتابی کر کے وہ گناہ گاروں میں شامل نہیں ہونا چاہتی تھی۔

میں نے اپنے اس وہم کا تعاقب کیا۔ اور اس پیڑ کی جانب گئی جہاں مجھے روزانہ کسی سائے کا گمان ہوتا تھا۔۔۔ روزانہ کوئی شخص میری جھلک دیکھنے ایسی مستقل مزاجی سے آتا ہو تو میں اس کی موجودگی سے بے خبر کیسی رہ سکتی تھی۔

چنانچہ میں نے آج طے کیا تھا کہ اس چھپن چھپائی کے کھیل کو کوئی حتمی نتیجے تک ضرور پہنچاؤں گی۔۔۔ درخت کے پیچھے کھڑا عاصم مجھے دیکھ کر بری طرح چونک گیا اور شاید پہلی بار اپنے سامنے اتنے قریب دیکھ کر پلک جھپکنا ہی بھول گیا تھا۔۔۔

اس دن ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بس دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔

عشق کی جس آگ میں عاصم جل رہا تھا اس کی تپش سے میں کیسے اپنا دامن بچا سکتی تھی۔ یہیں سے میری زندگی نے ایک نیا موڑ لیا اور میں اپنی ماں کی ہر نصیحت بھول گئی۔ ہوش مجھے تب آیا جب بشیراں نے آواز دی۔ میں جلدی سے عاصم کو الوداع کہہ کر واپسی کے لیے مڑی۔

جیسے تیسے گھر پہنچی دل بہت زور سے اور بہت انوکھی تال پہ دھڑک رہا تھا۔۔۔ میں مسرور بھی تھی اور خوف زدہ بھی۔۔۔ ٹھنڈے پسینے ماتھے تک آرہے تھے۔

"کیا کیا بات ہے پاکیزہ آج طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی؟" اماں جو مجھے باہر بلوانے آئی تھیں۔ کیونکہ لوگ باہر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے پاک بی بی سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے۔

"اماں میرا آج کسی سے ملنے کا دل نہیں اماں آج سب کو بھیج دو۔" میں نے آنکھوں پر بازو رکھے رکھے اماں کو جواب دیا مبادا اماں میری آنکھوں کے بدلے رنگ نہ پہچان لے۔

"چلو اچھا ٹھیک ہے دوا دے کے بھیجتی ہوں میں بشیراں کو آج آرام کر لو میں کل بلوالوں گی سب کو" اماں باہر چلی گئی تھیں۔

"کل؟ اب کیا کل کا انتظار کروں؟ کیا وہ کل بھی آئے گا؟ روز آتا ہے کل بھی ضرور آئے گا" اماں کے باہر جاتے ہی میں نے پھر سے اپنی سوچوں کا تسلسل وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ مجھے یہ کیفیت اچھی لگنے لگی تھی۔ میری زندگی میں یوں کسی مرد کا آنا جو روز روز میری ایک جھلک دیکھنے آتا ہو ایک بہت انوکھا احساس تھا۔ میں عاصم کو دیکھتے ہی اپنا سب کچھ ہار گئی تھی۔۔۔ میں اگلے دن کا بے چینی سے انتظار کرنے لگ گئی تھی۔

"بشیراں آج میں اکیلی جاؤں گی۔"

میری بات سن کر مارے حیرت کے بشیراں اب منہ کھول کر کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ مجھے نہر کے کنارے تو اکیلا چھوڑ سکتی تھی پر اکیلے آگے تک جانے نہیں دے سکتی تھی اسے خاص ہدایت جو تھی۔

"پر بی بی میں آپ کو اکیلے کیسے؟" بشیراں ڈرتے ڈرتے منمنائی۔

"میری حکم عدولی کرنے کا نتیجہ جانتی ہو نا؟" بھنویں اچکا کر اب کی بار میں نے اپنے درجے کا استعمال کر ڈالا جو یقیناً" بشیراں کی کمزوری تھی۔ وہ بے چاری ڈرتے ڈرتے مجھے آدھے راستے میں ہی چھوڑ گئی تھی۔

اب روز یہی ہونے لگا بشیراں کے ساتھ میں صرف گھر سے نکلتی اور پھر بشیراں اپنے راستے اور میں اپنے راستے۔ روزانہ میں اور عاصم ایک دوسرے کو خاموش اور پیار بھری نظروں سے ایک دوسرے کو تکتے اور پھر اپنا اپنا۔ رستہ ہو لیتے۔

☼ ☼ ☼

"تم نے کبھی اس سے بات نہیں کی؟" میں نے سگریٹ کے کش پہ کش لگاتے ہوئے پاکیزہ سے پوچھا۔ وہ مجھ سے کافی فاصلہ پر حسب معمول نقاب میں چہرہ چھپائے بیٹھی ہوئی تھی۔

"ہاں کی تھی ایک بار بات، روز ملتے تھے ہم۔۔۔ ایک دفعہ ہی بات ہوئی اور وہ ہماری ملاقات کا آخری دن ثابت ہوا۔" پاکیزہ نے اپنا سر گھٹنوں پہ ٹکا دیا۔

"آخری۔۔۔ آخری ملاقات؟ کیوں کیا ہوا تھا؟" مجھے اس کی کہانی واقعی دلچسپ لگی۔

"بشیراں۔۔۔ سارے گاؤں کو پتا چل گیا تھا کیسے ۔۔۔ میں نہیں جانتی شاید بشیراں نے ہی کسی کو بتا دیا ہو اور اس دن ہی مجھ پر اپنے نکاح کا انکشاف ہوا" جتنا میں دلچسپی سے اس کی کہانی سن رہا تھا ایک دم اس کے نکاح کی بات سن کر جھٹکا لگا جلتی ہوئی سگریٹ کی راکھ میری انگلی پہ گری سی کی آواز پہ اس کا دھیان میری طرف ہوا۔ اس کی آنکھوں سے لگا کہ وہ مسکرائی ہو جیسے۔

"نکاح۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں میرا نکاح ہو چکا تھا جب میں پیدا ہوئی تھی۔" پاکیزہ نے اتنا کہا اور خاموش ہو گئی۔

"پھر؟ اوہ بچپن کا نکاح؟ کس سے؟ تم جانتی ہو اسے؟ کیا اسی لیے اماں نے کہا تھا شادی کا مت سوچنا؟ مگر اماں نے ایسا کیوں کہا؟ ہاں اگر وہ یہ کہتیں کہ کسی اور سے شادی۔۔۔" میں نے الجھتے ہوئے پے در پے کئی سوال کر ڈالے۔

☆ ☆ ☆

"کہا بھی تھا میں نے تم سے کہ شادی کا خیال تک نہ لانا دل میں اور تم ایک لڑکے سے ملنے لگ گئیں۔ اپنی عزت، مرتبہ ہماری عزت اور گاؤں والے... کسی ایک چیز کا بھی خیال نہ آیا تجھے۔" غیض و غضب کی عملی صورت بنی اماں بری طرح مجھ پر برس رہی تھیں۔

"ارے تم پاک بی بی ہو جانتی ہو تمہیں کیا رتبہ ملا ہے؟ کیا درجہ ہے تمہارا؟ تم نکاح شدہ ہو سمجھیں ...." اماں نے بری طرح مجھے پھنکارتے ہوئے جو بات کی اسے سن کر میرے پیروں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی تھی۔

"کیا میرا نکاح؟ پر کس سے؟" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ جو میں نے سنا ہے واقعی اماں نے وہی بات کی ہے۔ میں نکاح شدہ تھی اور آج تک مجھے اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی کسی نے۔ اگر میرا نکاح ہوا تھا تو کس سے آخر۔ کون تھا وہ جس کے بارے میں آج تک مجھے نہیں بتایا گیا تھا۔

"اماں یہ تم کیا کہہ رہی ہو...؟ کس سے کیا ہے میرا نکاح جس کی مجھے خبر تک نہیں ہے۔" میں نے روتے ہوئے اماں کا ہاتھ تھاما۔

"ہاتھ چھوڑ میرا" اماں نے غضبناک ہوتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

"اماں۔ یہ تو بتا دو اماں کس سے ہوا ہے میرا نکاح" میں نے شدت سے روتے ہوئے اماں سے التجا کی۔

"آ، ادھر چل میرے ساتھ بتاتی ہوں تجھے" اماں اپنے دونوں ہاتھوں سے بے دردی سے میرے کاندھے دبوچتے ہوئے مجھے ایک کمرے میں لے گئی۔ کمرے کے اندر جا کر اماں نے مجھے چھوڑا اور الماری کی طرف بڑھی۔ الماری میں سے اس نے جزدان سے قرآن نکالا اور کہا۔

"اس... لے... دیکھ لے... اس مبارک کتاب سے ہوا ہے تمہارا نکاح" اماں نے بات کرتے ہوئے اسے عقیدت سے آنکھوں سے لگا لیا۔ مجھے لگا کسی نے اونچے پہاڑ سے دھکا دے کر نیچے گرا دیا ہو میرے وجود کو۔

"یہ... یہ تم کیا کہہ رہی ہو اماں؟ اللہ کا واسطہ اماں ایسی بات کر کے مجھے اور خود کو گناہ گار مت کرو... قرآن سے بھلا نکاح ہوتا ہے کیا؟ یہ کیا بول رہی ہو تم؟ میں نے قرآن پڑھا ہے اتنی بھی جاہل نہیں ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

"مجھے نہ سمجھا کیا صحیح کیا غلط! تو خوش قسمت تھی کہ تجھے پیدا ہوتے ساتھ ہی چن لیا گیا تھا۔ اری میں کہتی ہوں زندگی بھر لوگ تجھے مان دیں گے... عزت دیں گے بدلے میں تو انہیں دعائیں دے گی۔ پاک بی بی کا مطلب بھی جانتی ہو؟"

اماں نہ جانے کس جہالت بھرے دور کی بات کر رہی تھی۔ وہ رسم و رواج میں گھری وہ عورت تھی جس کے پیروں میں پڑی جہالت بھری رواجوں کی بیڑیوں نے خوف خدا ہی بھلا دیا تھا۔ گاؤں میں شاید برسوں سے یہی رواج تھا نجانے کتنی ہی لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہو چکا تھا اور اب میری باری تھی۔

"میں جس گاؤں جس خاندان سے تعلق رکھتی تھی وہاں جس لڑکی کی شادی قرآن سے کرادی جاتی اسے بہت بابرکت اور بزرگ قسم کی ہستی سمجھا جاتا تھا اور اگر کم عمری میں ہو تو پھر نہ کسی عام انسان کے قریب جانے دیا جاتا اور نہ کسی عام انسان سے میل جول کی اجازت تھی اور مردذات کے تو سائے سے بھی دور رکھا جاتا تھا۔ یہ ساری باتیں اماں نے مجھے اس وقت بتادی تھیں۔"

"اماں یہ گناہ ہے اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے شریعت میں۔" ساری حقیقت جاننے کے بعد میں زمین پر ڈھے گئی تھی۔

"تمہاری یہ مجال کہ قرآن کی شادی کو گناہ کہو؟ اری کم بختی ہے تمہاری۔ قرآن سے شادی ہونا بڑے قسمت کی بات ہوتی ہے" اماں نے مجھے بری طرح

جھنجوڑتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی۔ اب مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ مجھے گھر سے باہر تو کیا کمرے سے بھی بلا حاجت باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ لوگ آتے محفل سجتی اور میں گم صم سی بت بنی سب کی بات سنتی اور بظاہر ان کے حق میں دعا کرتی۔ میرا اپنا دل خالی ہو گیا تھا۔

"میں کس سے اپنے دل کی بات کروں؟ ایک بشیراں تھی اس نے بھی دھوکا دیا۔"

"یہ کیا کہہ دیا اماں؟ میرا نکاح قرآن سے؟ اتنا بڑا ظلم... اتنا بڑا گناہ۔ اتنے عرصے مجھے قرآن پڑھنے کو دیا میں دن رات اسی مقدس کتاب کو پڑھتی رہی ہر پہلو سے واقف ہوں حتیٰ کہ مرد اور عورت کی شادی کا ہی ذکر ہے اور یہاں یہ جہالت کہ قرآن سے شادی کرا دی جائے نعوذباللہ میں کہاں جاؤں۔ اے اللہ میری مدد کر میرے مولا..." دن رات میرے لبوں پہ بس ایک ہی دعا تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم۔ کراچی کیسے پہنچی؟" پاکیزہ کی بات پوری ہوئی تو میں نے سوال داغا... میں کشمکش میں تھا کہ کہاں تو اس پہ کڑی پابندی تھی اور کہاں یہ کہ وہ دوسرے شہر آ پہنچی۔

"بشیراں نے ہی ساتھ دیا۔" اب کی بار اس کی آواز میں کافی سکون اور ٹھہراؤ محسوس ہوا مجھے۔

"ارے یہ کیسے؟" میں واقعی حیران ہوا۔

"کچھ دن بعد ایک رات بشیراں میرے ساتھ سو رہی تھی اور میں چپ چاپ اپنے نصیب کو روتے ہوئے خود سے باتیں کر رہی تھی۔ بشیراں کو شاید میرے حال پہ ترس آ گیا تھا... وہ میرے قریب آئی۔ آہستہ سے جھنجوڑا اور روتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"پاک بی بی آپ اکیلی نہیں ہو۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کو یہاں سے نکلنے میں میں مدد کروں گی آپ کی... آپ یہاں سے دور چلی جائیں ورنہ یہ لوگ آپ کی پھول جیسی جوانی مٹی میں ملا دیں گے۔ اللہ آپ کی مدد کرے گا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ جانتی ہو یہ کتنا مشکل کام ہے؟" مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا... میں بھلا کیسے نکل سکتی تھی یہاں سے...

"بس، بی بی یہ آپ مجھ پہ چھوڑ دیں" بشیراں نے مجھے اپنے ساتھ کا یقین دلایا اور مجھے اطمینان سے سو جانے کو کہا۔ پر اب اطمینان کہاں۔ میرے وجود پہ بے تحاشا گھبراہٹ غالب ہو چکی تھی بھاگ جانے کے خیال سے عجیب بے کلی سی ہو رہی تھی۔

میں رات بھر سوچتی رہی کہ بشیراں نے اماں کو سب بتا دیا تھا پھر وہ میرے ساتھ یہ نیکی کیوں کرنے چلی تھی... پھر سوچا شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ باقی سب کے ساتھ وہ بھی قرآن کی بے حرمتی کی مرتکب ہو رہی تھی۔ اللہ جسے چاہے ہدایت دے ورنہ جس معاشرے میں وہ رہتی آ رہی تھی وہاں شروع سے اس نے یہی دیکھا تھا۔"

"اچھا پھر۔ اچھا پھر کیا ہوا؟" وہ خاموش ہوئی تو میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔ میں سب کے سو جانے کے بعد پردے میں گھر سے باہر نکلی۔ دوپہر کا وقت تھا... چونکہ گرمیوں کی دوپہر تھی اس لیے ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ اور چونکہ اب بشیراں میرے ساتھ تھی اس لیے مجھے وہاں سے نکلنے میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

میں نہر کے کنارے پہنچی میرے بعد بشیراں وہاں آئی اور ہم نظر بچا کے گاؤں سے باہر نکل آئے۔" آخری بات کرتے ہوئے اس کی آنکھ میں جگنو چمکے۔ اب پتا نہیں یہ افسردگی تھی یا قید سے رہائی کی خوشی۔

"اور یہاں کیسے آئیں تم؟ میرے گھر تک؟" اس کی اداس سی خاموشی مجھ سے برداشت نہ ہوئی تو ایک اور سوال کیا۔

"بشیراں مجھے کراچی لے آئی تھی۔ ہم بے یار و

مددگار بھٹک رہے تھے۔ ایک دن بھوک کے مارے برا حال تھا۔ بے ہوش ہو گئی تھی اور گرتے ہوئے آپ کی اماں کی گاڑی کے سامنے آگئی تھی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ آپ کی اماں مجھے یہاں لے آئیں کہ ان کے گھر کے کام کروں گی بشیراں پتا نہیں کہاں گئی۔ ہوش میں آنے کے بعد میں نے اس کا پوچھا پر کوئی نہیں جانتا تھا اس کے بارے میں۔" پاکیزہ نے بات کرتے ہوئے گہری سانس خارج کی۔

"تم رات میں کس سے بات کرتی ہو؟" میں نے اپنا پرانا سوال دہرایا۔

"اللہ سے اور قرآن سے۔ اللہ کو مجھ سے بات کرنی ہوتی ہے تو وہ قرآن کے ذریعے بات کرتے ہیں اور مجھے کرنی ہوتی ہے تو میں نماز کے بعد قرآن پڑھ کر پھر اللہ سے باتیں کرتی ہوں۔ آج تک ان سے ہی کرتی آئی ہوں۔ میرے پاس تو کوئی اور ہے ہی نہیں!"

بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے وہ جانے کے لیے اٹھی۔

"پر آج لگا کوئی اور بھی ہے..." یہ بات کہتے ساتھ ہی وہ باہر نکل گئی اور میں اس کی آخری بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

مجھے اس کی باتیں عجیب بھی لگیں اور دل کو بھی لگیں... یہ سوچ کر کہ آج بھی یہ مکروہ رسم چلی آرہی ہے قرآن سے نکاح کر کے دنیا ترک کروا دینا کتنی بڑے اور عظیم گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں وہ۔ کاش وہ لوگ اس بات کو سمجھ کر جہالت کی ان تاریکیوں سے نکل آئیں جس کے خاتمہ کے لیے اللہ نے چودہ سو سال پہلے ہی اپنے محبوب کو بھیج دیا تھا۔

ہمیں اللہ نے عقل دی ہے شعور دیا ہے جب خود پاکیزہ کے ماں باپ نے اسے قرآن کی تعلیم دی تو ایسے کیسے وہ اس رسم و رواج کی پیروی کر سکتے ہیں؟ ہمیں جتنا ہو سکے اسلام کی تعلیم کو عام کر کے ہر کسی کو اس مکروہ رسم کے عذاب سے آگاہ کرنا چاہیے۔ اگر آپ کے اردگرد بھی کوئی جاہلانہ عمل ہو رہا ہو تو اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کریں کیونکہ یہ آپ کا مذہبی فریضہ ہے اور کل تو آپ سے اس بارے میں پوچھا جائے گا۔

شمائل نے کتاب بند کی اور سامنے بیٹھے اپنے طلبا سے مخاطب ہوا۔

"میری اسے صرف ایک کہانی ہرگز نہ سمجھا جائے بلکہ یہ ایک غلط رواج پر مبنی ایک سچی کہانی لکھی ہے۔ اور مجھے امید ہے آپ لوگ بھی اس قسم کے رسوم کے خلاف ہمیشہ آوازیں اٹھائیں گے۔"

سب طلبا نے اس کی بات پہ لبیک کہا اور گھر جانے لگے۔

کلاس کا ٹائم ختم ہو گیا تھا۔

شمائل کو بھی جلدی گھر جانا تھا کیونکہ اس کی بیوی پاکیزہ اس کا گھر پر انتظار کر رہی تھی۔

☆ ☆

ناولٹ

مقدس مشعل

اے نیند کی شہزادی

"نیند کی شہزادی محترمہ ذرا آنکھیں کھولو اور اپنا رزلٹ ملاحظ فرماؤ!" چار پانچ بار زوردار آوازیں دینے کے بعد بھی جب وہ نہ اٹھی تو مدیحہ نے زور سے اس کے بازو پر چٹکی کاٹتے ہوئے کہا تو وہ ہڑبڑا کر جاگی۔ آنکھیں مسلتے ہوئے اپنے سے ڈیڑھ سال چھوٹی مدیحہ کو گھوری چڑھا کر دیکھا۔

"کیا تکلیف ہے؟" پاٹ دار آواز میں دریافت کیا۔

"مجھے کوئی تکلیف نہیں' یہ اپنا بی اے کا رزلٹ دیکھو۔ انگلش میں سپلی ہے۔" مدیحہ نے کمال اطمینان سے بتاتے ہوئے اس کا اطمینان گنوانا چاہا۔ اس نے چونک کر رزلٹ کارڈ ہاتھ میں لے کر دیکھا۔

"ہاں تو جب گھر میں پرائیویٹ پڑھا جائے پھر سپلی تو آتی ہے نا۔" اس نے قابل رشک اطمینان سے کہا۔

"اری اٹھ نکمی' نالائق ابا کی کمائی حرام کی ہے جو داخلے بھرنے میں لگائی اور پھر فیل ہو کر مزے سے نیندیں پوری ہو رہی ہیں۔" اماں کی جوتی دور سے لہراتی ہوئی آئی اور ٹھک کرکے کمر پر لگی۔ وہ بلبلاتے ہوئے اٹھ کر بیٹھی۔ دیکھا تو برآمدے میں اماں سمیت چاروں بہنیں اور اکلوتا بھائی علی خطرناک تیور لیے اسے گھور رہے تھے۔

"کیا کروں اماں۔ سپلی آگئی تو میرا کیا قصور؟ آپ سے کئی بار کہا تھا مجھے شہاموں کے پاس بھیج دیں یا پھر ہوسٹل بھیج دیں میں شہر میں کالج میں ایڈمیشن لے کر پڑھتی تو بورڈ میں ٹاپ کرتی۔" اس نے چھما چھم روتے ہوئے اپنا دفاع کرنا چاہا۔

"اونہہ۔ میٹرک میں سی گریڈ' ایف اے میں بی گریڈ لینے والی نے کرنا تھا ٹاپ۔ نیندیں پوری کرنے سے فرصت ملتی تو پرائیویٹ میں بھی اچھا رزلٹ لے آتی۔" اماں اس کے رواں دواں آنسو دیکھ کر صرف بڑبڑانے پر ہی اکتفا کرسکیں اور وہاں سے چلی گئیں۔

"ہم نے بھی تو میٹرک کے بعد پرائیویٹ ہی پڑھا ہے ہمیشہ فرسٹ ڈویژن لی ہے۔ تم کیا اسپیشل ہو جسے کالج کی ضرورت ہے؟" اس سے دو سال بڑی فریحہ نے اپنے بڑے ہونے کا رعب جماتے ہوئے کہا۔ جسے وہ حسب عادت بالکل خاطر میں نہ لائی۔

"ہاں! ہوں خاص۔" اماں کی غیر موجودگی پاکر بگڑے انداز میں کہا اور دوبارہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ بہنیں چیں بہ چیں ہوتی وہاں سے ہٹ گئیں۔

"کچی نیند سے اٹھا کر رکھ دیا' نیند خراب کردی میری۔ اب آئے' نہ آئے میری تو کسی کو پرواہی نہیں اس گھر میں۔" تین گھنٹوں کی مسلسل نیند لینے کے بعد بھی وہ لیٹے لیٹے بڑبڑا رہی تھی' مگر اس کی یہ بڑبڑاہٹ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی کیوں کہ اگلے چند لمحوں میں وہ اونگھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج صبح ہی صبح آسمان پر گہرے نیلے بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسم نے کافی دنوں بعد انگڑائی لی۔ گھنٹہ بھر بادل خوب جم کر برسے۔ سوکھی زمین تر ہوئی۔ بیرونی طرف سے دیواریں ٹھنڈی ہوئیں تو اندرونی حصوں میں سے بھڑاس نکلنے لگی۔ کمروں میں لگے اے

سی بھی وہ ٹھنڈک مہیا نہ کر پا رہے تھے، جو اس وقت قدرت نے باہر کے ماحول میں بھر دی تھی۔ دوپہر کے بعد موسم کی خوب صورتی عروج پر تھی۔ بارش تھمنے کے بعد آسمان پر اور فضا میں نکھار سا آگیا تھا۔ درختوں کی شاخیں جھولنے لگی تھیں۔ سورج ابھی بھی ہلکے ہلکے سفید بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ فضا میں گرماہٹ اور تپش کے بجائے ٹھنڈک کا احساس تھا۔ "عباسی ہاؤس" کے تمام مکین سوائے جمشید عباسی اور ان کی والدہ صاحبہ کے گھر سے باہر پارک جا چکے تھے۔ موسم کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہونے۔

مختلف حسین پھولوں اور پودوں سے سجے، کارپٹ گھاس بچھی والے لان میں وہ اس وقت اکیلے ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ موسم کے سہانے پن سے یکسر بے نیاز، اپنی ہی فکر انگیز سوچوں میں گم۔ وجہ یہ تھی کہ آج کل وہ اپنے گھرانے کے ماضی کو، حال سے موازنہ کر رہے تھے اور سخت تشویش میں مبتلا ہو رہے تھے۔

ان کا تعلق مڈل کلاس گھرانے سے تھا۔ باپ امجد عباسی واپڈا میں ایماندار ملازم تھے۔ اماں ایک گھریلو سی پرہیزگار خاتون تھیں۔ دو بڑی بہنیں آسیہ اور رضیہ ایک چھوٹی ثریا تھی۔ ماں باپ اور تینوں بہنوں کی آنکھوں کا تارا اور ان کی امیدوں کا وہی مرکز تھے۔
گھر میں تین بہنیں تھیں جن کی تربیت شرم و حیا، نماز روزہ، پردے کی پابندی اور دیگر مذہبی امور کی بنیاد پر کی گئی۔ تینوں کو میٹرک تک ہی تعلیم دلوائی گھرداری اور سلیقہ شعاری میں طاق کرنے کے بعد یکے بعد دیگرے تینوں کی شادیاں کردی گئیں۔
بڑی دونوں سیالکوٹ میں ایک ہی گھر میں بیاہ کر گئیں۔ گھرانہ اپنے جیسا ہی مڈل کلاس مگر لوگ شریف تھے۔ چھوٹی ثریا کی قسمت اسے گاؤں میں لے گئی۔ شوہر اسکول ماسٹر تھا۔ گھر کے سب ہی افراد قناعت پسند اور اپنے حال پر راضی بہ رضا تھے مگر جمشید عباسی کی طبیعت میں بے چینی تھی اور دولت مند بننے کی خواہش کسی جنون کی طرح سر پر سوار تھی۔
بی کام کرنے کے بعد بینک میں اچھی پوسٹ پر جاب مل گئی مگر وہ مطمئن نہ ہوئے۔ آگے تعلیم جاری رکھی۔ پھر ایک بڑی ملٹی نیشنل کمپنی میں ڈائریکٹر منیجر کی جاب ملی۔ اسی دوران کاشفہ سے ان کی ارینج میرج ہوئی۔ کاشفہ کا تعلق اپر مڈل کلاس گھرانے سے تھا۔ کالج سے گریجویٹ تھیں۔ گھرانہ تو ان کا بھی تعلیم یافتہ اور پروقار تھا۔ لوگ ملنسار اور نیک طبیعت کے تھے۔ یہی کچھ دیکھ کے ان کے ماں باپ نے کاشفہ کو پسند کیا۔ جو خوب صورت تو تھیں ہی مگر خاصی حد تک ماڈرن خیالات کی مالک تھیں جو ساس سسر تو شروع میں نہ جان سکے مگر جمشید کو اندازہ ہوگیا کہ ان کی بیگم کچھ آزاد خیال اور فیشن کی دلدادہ ہیں۔
ماں باپ سے چھپا کر وہ اکثر ہی بیگم کی چھوٹی موٹی فرمائشیں پوری کرنے لگے۔ کبھی سینما لے گئے تو کبھی مہنگے شاپنگ سینٹر سے شاپنگ کروادی۔ کبھی ہوٹلنگ تو کبھی سہیلیوں کی گیٹ ٹوگیدر پارٹی میں شرکت۔۔۔ اکلوتی بہو تھیں۔ زیادہ روک ٹوک اور سختی بھی نہ کی گئی۔ اس گھر کے ماحول کو سمجھتے ہوئے پہلے پہل وہ بھی خاصی محتاط رہیں۔ ساس کی دیکھا دیکھی نماز پڑھ لیتیں، گھرداری میں بھی خوب دلچسپی لی۔ میاں کی فرماں برداری کی۔ پھر جمشید صاحب دولت کمانے کے چکر میں دن بدن مصروف ہوتے گئے۔ انہوں نے ڈومسٹک سطح پر امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کیا۔ ان کی دن رات کی محنت کی بدولت کاروبار خوب بڑھا۔ آج وہ کامیاب بزنس مین تھے مگر اس سب کے دوران گھر پر سے ان کی توجہ ہٹ گئی۔
سسر دنیا سے رخصت کیا ہوئے کاشفہ بیگم کے رنگ ظاہر ہونے لگے۔ گھرداری اور بچوں کی تربیت کرنے کی بجائے وہ اپنے شوق پورے کرنے میں لگ گئیں۔ ساس کی نصیحت اور تنقید کو وہ کسی خاطر میں نہ لاتیں۔ کاروباری معاملات میں مصروف شوہر کو مختلف باتوں اور بہانوں سے مطمئن کردیتیں۔ ساس کے ساتھ بدزبانی پر آگئیں تو وہ سائیڈ پر ہوگئیں۔ بچوں کے ساتھ وقت گزارتیں یا جائے نماز پر بیٹھیں کچھ نا کچھ پڑھتی رہتیں۔ بیٹے کو کئی بار متوجہ کرنا چاہا، وہ آگے سے الجھ پڑتا۔ ایک چھوٹی سی کالونی سے نکل کر وہ ماڈل ٹاؤن میں ایک بنگلے میں آگئے۔ بہترین اسکول کالجز میں بچوں کے ایڈمیشن ہوئے۔
بڑی بیٹی سعدیہ کی تعلیم مکمل ہوئی تو ایک امیر گھرانے میں شادی کردی۔ سعدیہ سے چھوٹے جنید نے یونیورسٹی میں حبیبہ کو پسند کرلیا۔ وہ بھی دولت مند گھرانے کی خاصی ایڈوانس لڑکی تھی۔ بیٹے کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے حبیبہ سے ہی اس کی شادی کی۔
پھر عبید تھا جس نے حال ہی میں لمز سے ایم بی اے کیا تھا۔ اس کے بعد نادیہ تھی جس کی منگنی جعفر سے ہوچکی تھی۔ جعفر کے والد کے ساتھ ان کے بزنس کے بھی معاملات تھے۔ بظاہر سب ٹھیک تھا جیسی وہ پرسہولت زندگی چاہتے تھے۔ زندگی ویسی ہی تھی۔ بچے بھی اپنی اپنی جگہوں پر سیٹ تھے۔ پھر نجانے آج کل کیوں انہیں بے چینی لگی ہوئی تھی۔ کہیں کچھ غلطیاں تھیں، جو انہیں احساس شرمندگی میں گھیر رہی

تھیں۔

ان کی اپنی بہنیں کبھی پردے کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلی تھیں۔ آج ان کی بیٹیاں اور بہو' دوپٹا گلے میں لیے بعض اوقات دوپٹے کے بغیر ہی بازاروں میں گھوم رہی ہوتیں۔ نماز' روزے اور دیگر مذہبی امور کی ان کے گھر میں ہر ممکن حد تک پابندی کی جاتی اب سوائے والدہ کے کبھی کسی کو مصلے کے قریب سے گزرتے نہ دیکھا تھا۔ گھر کے اندر کوئی اصول اور نظم و ضبط ہی نہیں تھا۔ بیگم سمیت سب ہی بچے ہر لحاظ سے آزاد اور اپنی مرضی کے مالک تھے۔ گزشتہ کئی روز سے انہیں احساس ہو رہا تھا کہ بچوں کی تربیت کے حوالے سے کاشفہ بیگم پر اندھا اعتماد کر کے انہوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔

"ثرالی یہاں چھوڑ دو اور جاؤ تم!" اماں جان کی آواز سن کر انہوں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ وہ ملازمہ سے کہہ رہی تھیں۔

"آج میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بچے کے لیے چائے اور یہ سب بنایا ہے۔" ان کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ شفقت سے بولیں۔ لہجے میں بچوں سی خوشی اور تسکین تھی۔

"اماں جان آپ نے کیوں کیا یہ سب۔ ملازمہ کہاں تھی اسے کہتیں۔" وہ کچھ کھسیا کر بولے۔

"ارے بچے روز ملازمہ کے ہاتھ کا ہی کھاتا ہے۔ آج ماں کے ہاتھ کا بھی کھالو۔۔۔" اماں نے حسرت زدہ سے انداز میں کہا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ساکت سے ہوگئے۔ انہیں یاد آیا کہ وہ ماں کے ہاتھ کا کھانا کتنے شوق سے کھاتے تھے۔ خاص کر صبح ناشتا اگر کبھی کوئی بہن بنا دیتی تو وہ باقاعدہ ناراض ہو جاتے کہ اماں نے ان کا ناشتا کیوں نہیں بنایا۔

"دنیا والوں کی نظر میں' میں بوڑھا ہو رہا ہوں اور میری ماں آج بھی مجھے اپنا "بچہ" سمجھتی ہے جیسے وہ بچپن میں بہلا پھسلا کر کھانا کھلاتی تھی۔" سوچتے ہوئے وہ مزید غمگین ہوئے۔ اپنے اور اماں جان کے لیے کپوں میں چائے انڈیلی پھر ایک سینڈوچ لے کر کھانا شروع کیا۔

"بیٹا کیا بات ہے؟ میں دیکھ رہی ہوں کچھ دنوں سے تم بہت پریشان سے دکھائی دیتے ہو' کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ شاید میں کوئی مشورہ ہی دے سکوں۔" اماں جان نے چائے کا کپ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ تو وہ سٹپٹا سے گئے۔

"نہیں اماں جان کوئی مسئلہ نہیں۔۔۔ آپ کو وہم ہوا ہے۔" نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ کیا بتاتے ماں کو' ماں تو خود کئی بار انہیں احساس دلانے کی کوشش کرتی رہیں' مگر اس وقت وہ خود ہی بے حس بنے ہوئے تھے۔

"ماں کا دل کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ بیٹا سامنے پریشان بیٹھا ہو اور ماں بے خبر رہے تو سمجھو اس ماں میں ممتا ہی نہیں رہی۔ کیا کاروبار میں کوئی مسئلہ ہو گیا؟" جانتی تھیں بیٹے کو کاروبار کتنا عزیز ہے لہٰذا اسی کے بارے میں پوچھا۔

"نہیں اماں جان۔۔۔ ایسی بات نہیں۔۔۔ دراصل۔۔۔" وہ کچھ ہچکچائے۔۔۔ پھر بولے۔

"مجھے گھر کے ماحول نے بہت اپ سیٹ کر رکھا ہے۔ بچے ایڈوانس ہونے کے چکر میں مذہب اور قواعد و ضوابط سے دور ہو چکے ہیں۔ مجھے دولت مند بننے کا شوق ضرور تھا' مگر معاشرے میں پھیلی بے راہ روی۔ اسٹیٹس کے نام پہ ماڈرنیزم مجھے بالکل بھی پسند نہیں اور میرے گھر میں یہی سب چل رہا ہے۔ افسوس ہوتا ہے خود پر' کیوں کاشفہ پر اس قدر اعتبار کیا اور کیوں آپ کی باتوں پر توجہ نہیں دی؟ ابھی کچھ دن پہلے عبید کو دوستوں کے ساتھ شراب پیتے دیکھا۔ اس دن سے میرا ضمیر مجھے کچوکے لگا رہا ہے' میں نے کبھی سگریٹ ہاتھ میں نہیں لیا اور میرا بیٹا۔۔۔ ایک حرام چیز کو پیٹ میں انڈیل رہا ہے۔ کیا کروں؟ کاشفہ سے کہا تو وہ الٹا مجھ پہ برس پڑی کہ میں نے کبھی توجہ ہی نہیں دی بچوں پر۔ سمجھ نہیں آرہا کیا کروں۔۔۔ آپ ہی کچھ کہیں' آخری الفاظ انہوں نے لاچارگی سے کہے۔

"ہاں۔ یہ تو وہی بات ہوگئی اب کیا ہوت جب

چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ بیٹا یاد ہے تمہارا باپ ہمیشہ تمہیں ایک نصیحت کیا کرتا تھا۔ کہ دولت بذات خود عیب دار نہیں ہوتی یہ دولت مند پہ منحصر ہے کہ وہ دولت کو بے عیب رکھے یا پھر عیب دار کرلے۔ اگر دولت کو ناجائز ذرائع سے حاصل کیا جائے تو بھی وہ عیب دار ہوگئی اور اگر ناجائز طریقے سے خرچ کیا جائے تو بھی عیب دار۔ دولت کو بے عیب رکھنا ہو تو اسے حلال ذرائع سے کماؤ اور جائز کاموں پہ خرچ کرو۔ ایسی دولت ہی اصل معنوں میں دلی تسکین دیتی ہے۔ بے شک دولت اور اولاد دونوں انسان کے لیے آزمائش ہیں۔"

"اماں جان! آپ نے بہت قیمتی باتیں بتائی ہیں' میں کوشش کروں گا ان پر عمل ہو۔ مگر فی الحال اس گھر کے ماحول نے پریشان کررکھا ہے۔ بچے جوان ہیں۔ شادی شدہ بھی۔ کیسے اور کیا سمجھاؤں۔ اگر یہ سب چلتا رہا تو ہماری آئندہ آنے والی نسلوں کا کیا بنے گا۔"

وہ ہنوز فکر مندی سے بولے۔

"ہوں یہ بات کی نا۔ اگر نسلوں کی بات ہے تو پھر گھر میں عورت ایسی ہونی چاہیے جو آنے والی نسل کی اچھی نگران ہو اور بچوں کی بہترین پرورش کرسکے۔ مرد لاکھ گھر پہ توجہ دے' مگر عورت کا کردار گھر کے اندر بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ بچے کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہے۔ اسی لیے تو سیانے بزرگ کہہ گئے بیاہ کرتے وقت لڑکی کی دولت اور خوب صورتی سے زیادہ اس کی تربیت اور نیک سیرتی پر غور کرنا چاہیے۔ اگلی پوری نسل اس کی گود میں پروان چڑھتی ہوتی ہے' مگر آج کل لوگ کہاں سوچتے ہیں یہ باتیں۔ اب تو لوگ دولت کے لالچ میں ہی عقل سے پیدل ہوگئے ہیں۔"

"ہاں جی۔ اماں جان۔ ٹھیک کہتی ہیں۔ کاشفہ کی چھوٹی چھوٹی فرمائش پوری کرتے ہوئے میں اندازہ ہی نہیں کرسکا کہ وہ کن عادات کی مالک ہے اور کیسا ذہن رکھتی ہے' لیکن بہت ہوگیا اب میں اس گھر میں مزید اس طرح کی آزادی نہیں چاہتا جس کی وجہ سے میرے بچے اپنے مذہب اور اصولوں سے دور ہوگئے۔ میرا خیال ہے مجھے اپنے رویے میں سختی لانی چاہیے۔" بولتے ہوئے ان کا لہجہ کشش و پنج کا شکار تھا۔

"نہیں بیٹا اب سختی کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اولاد جوان ہوجائے عورت نڈر ہوجاتی ہے۔ لہٰذا کاشفہ سے امید نہ رکھنا کہ وہ تمہارے رعب میں آئے گی۔ باقی بہو ہے وہ بھی۔ آزاد گھرانے سے ہے۔ بیٹے بھی اب خود مختار ہیں۔ کس پر سختی کروگے؟" اماں جان نے مسکراتے ہوئے سمجھایا۔

"نہیں اماں جان ابھی میں اتنا بھی کمزور نہیں ہوا ہوں اس گھر میں پیسے کے بل بوتے پر ہی یہ سب ہو رہا ہے۔" وہ اپنے ارادے سے ٹلتے نظر نہیں آرہے تھے۔ اماں جان کچھ دیر سوچتی رہیں پھر چند ثانیے بعد بولیں۔

"بیٹا ایک مناسب حل ہے ابھی بھی۔ وہ یہ کہ تم عبید کی شادی کسی امیر اور ماڈرن گھرانے میں کرنے کے بجائے کسی شریف اور اپنے سے نسبتاً" کمتر گھرانے میں کرو۔ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں' بڑا اثر ہوتا ہے ایک دوسرے کا آپس میں۔ لڑکی شریف نیک اطوار والی مل گئی تو یقیناً" عبید بھی سنبھل جائے گا۔ ایک بندہ بھی اس گھر میں سدھر گیا تو باقیوں پر بھی کچھ نہ کچھ اثر تو ہوگا۔ خدانا خواستہ ابھی ہوا تو کم از کم کوئی ایک تو صحیح راستے پر چلے گا' بلکہ میں تو کہتی ہوں نادیہ کی منگنی بھی ختم کرکے کوئی مہذب اور شریف لڑکا ڈھونڈو۔ وہ جعفر تو مجھے بالکل نہیں پسند۔ ساری انگریزوں والی چال ڈھال ہے اس کی داڑھی بھی ویسی ہی رکھی ہوئی ہے۔ شادی کے بعد نادیہ کو مزید بگاڑ دے گا۔" اماں جان نے سنجیدگی سے مشورہ دیا' جسے سن کر جمشید عباسی اثبات میں سرہلانے لگے۔ پھر گویا ہوئے۔

"اماں جان۔! آپ نے بالکل ٹھیک مشورہ دیا۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی اچھی لڑکی ہے تو بتائیں۔ میں چاہتا ہوں عبید مزید نا بگڑنے پائے۔ جنید کے اندر کم از کم اتنی گھٹیا عادتیں نہیں ہیں' مگر عبید تو ہر لحاظ سے بگڑ رہا ہے۔ نہ میرے بزنس میں دلچسپی لیتا ہے۔ نہ

اس کے مشغلے شریفانہ ہیں۔ میرا خیال ہے اس کی شادی کروی جائے تاکہ ذمہ داری تو بھائی آئے۔"

"بیٹا بہت اچھا خیال ہے۔ لڑکیاں تو اچھی سے اچھی مل جائیں۔ نیک لوگ ابھی اتنے بھی کم نہیں ہوئے، مگر غیروں میں ڈھونڈنے میں شک و شبہ والی کیفیت ہوگی۔ کچھ پتا نہیں چلے گا کہ لڑکی حقیقتاً ویسی ہی ہے جو دیکھ کر پسند کی۔ غیروں میں بھول چوک کا خدشہ رہتا ہے۔ اپنوں میں۔ تیری بہن ثریا کی پانچ بیٹیاں ہیں۔ بڑی اچھی تربیت کی ہے ان کی ثریا نے۔ نماز، روزے کی پابند ہیں، نیک اطوار سلیقہ شعار ہیں، ادب و لحاظ والی ہیں۔ گاؤں میں رہ کے ثریا نے سب ہی کو تعلیم دلائی دیکھی بھالی ہیں۔"

"ہاں جی۔ اماں جان۔ مجھے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔ اپنی بہن کی بیٹی تو میں آنکھیں بند کرکے لاسکتا ہوں۔" جمشید صاحب ایک دم خوش ہو کر بولے۔

"بڑی خوش ہوگی ثریا۔ اور تجھے دعا دے گی۔ پانچ پانچ بیٹیوں کے فرض ادا کرنے ہیں۔ بڑی مبیحہ تو خیر سے بیاہی ہے۔ اس سے چھوٹی فریحہ کی منگنی ہو چکی ہے اب وہ زیبا کا ہی کرے گی رشتہ۔ تو کاشفہ سے بات کرلے پھر بات آگے بڑھاتے ہیں۔" اماں جان کے لہجے میں بھی خوشی تھی۔

"ٹھیک ہے اماں جان۔ آپ سے بات کرکے آج میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا ہوں۔ میں آج ہی کاشفہ سے بات کروں گا۔" وہ ایک دم ہلکے پھلکے ہو کر بولے اور سموسہ اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

"ایک اچھی سلجھی ہوئی بیوی مل گئی تو یقیناً عبید بھی اچھائی برائی میں تمیز کرنے لگے گا۔ کچھ نہ سہی عبید کے بچوں کی پرورش تو اچھی ہوگی۔ ثریا خود اچھی خاصی سمجھ دار اور نیک عادات والی ہے۔ زیبا بھی ثریا جیسی ہی ہوگی۔" سموسے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ خوش کن انداز میں سوچ رہے تھے۔ بیٹے کو مسکراتا دیکھ کر اماں جان بھی مطمئن ہوگئیں۔

☼ ☼ ☼

"ثریا تیری ساری بچیاں ماشاء اللہ سے سمجھ دار، عقل مند، سلیقہ شعار ہیں، دیکھ کے دل خوش ہوجاتا ہے۔ پر یہ زیبا کس پہ گئی ہے۔ مرجانی کی شکل و صورت تو باقی بہنوں سے مختلف ہے ہی عادات و اطوار بھی الگ ہی ہیں۔" پروین نے موڑھے پہ بیٹھتے ہی سنجیدہ سے انداز میں کہا۔

"پتا نہیں آپا کس پہ چلی گئی۔ مجھے تو بہت پریشان کر رکھا ہے اس نے۔ جب تک چھوٹی تھی میں سوچتی تھی بڑی ہوگی تو سمجھ دار ہو جائے گی مگر یہ تو مزید بگڑ گئی۔ سختی کروں تو باپ کو بخار چڑھ جاتا ہے "میری بچی کو کچھ مت کہو" کروں تو کیا کروں۔" ثریا فکر مندی سے بولتے ہوئے پالک کے پتے بھی چنتی رہیں۔

"سوچتی ہوں کیا بنے گا اس کا؟" ثریا نے کہا تو پروین کو اپنے آنے کا مقصد یاد آیا۔

"اس کا تو جو بنے گا سو بنے گا ہی۔ اپنی مدیحہ کا کچھ بننے والا ہے۔" وہ ایک دم لہجے کو خوش گوار کرتے ہوئے بولیں۔ انداز سرگوشیانہ تھا۔ "کیا مطلب؟" ثریا نے حیرانگی سے پوچھا۔

"وہ میری جیٹھانی ہے نا صفیہ۔ اس کا چھوٹا بیٹا چھ ماہ ہو گئے بینک میں ملازمت کررہا ہے شہر ہی میں ہوتا ہے۔ صفیہ اس کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے دلہن کو ساتھ ہی شہر بھیج دوں گی، اپنی مدیحہ کے بارے میں کئی بار کہہ چکی ہے مجھے۔ میں ٹال مٹول کرتی رہی آج خاص طور پر بھیجا ہے مجھے۔ وہ شاہد کا رشتہ لے کر آنا چاہ رہی ہے۔" پروین نے بات مکمل کی تو ثریا نے بے ساختہ بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ سر پہ دوپٹا سیدھا کرتی وہاں سے اٹھ گئی۔

"شاہد لڑکا تو قابل اور شریف ہے خاندان بھی اچھا ہے۔ پر بڑی تو زیبا ہے اور مدیحہ تو ابھی چھوٹی ہے۔ مدیحہ ہی کیوں؟" ثریا اچنبھے سے بولیں۔ "تو بات پھر وہیں آگئی نا۔ اب علیحدہ کو دیکھو مدیحہ سے بھی چھوٹی ہے پر رکھ رکھاؤ، طریقہ سلیقہ ابھی سے نظر آتا ہے۔ ذرا بڑی ہوئی تو اس کے بھی رشتے آنے شروع ہو جائیں گے۔ زیبا شکل و صورت میں سب بہنوں

میں پیاری ہے' مگر اور گن تو ہیں نہیں۔۔۔ لوگ رشتہ مانگتے وقت یہ دیکھتے ہیں لڑکی عادات و اطوار کی کیسی ہے۔ زیناکو تو سونے کی بیماری ہے۔ سارا محلّہ جانتا ہے۔ چل خیر اس کے نصیب بھی کھل جائیں گے۔ یہ بتائیں صفیہ سے کیا کہوں؟" پروین بات میں ہی بات بدلتے ہوئے بولیں۔

"میں کیا بتا سکتی ہوں۔ ابھی ان کے باپ سے بات کرنی ہوگی پھر دوسرے بڑوں سے۔۔۔ وہ باقاعدہ رشتہ لے کر آتی ہے تو ہی کچھ سوچیں گے' مگر جب تک زینا کا نہ ہو' میں مدیحہ کا رشتہ کیسے طے کردوں۔۔۔ فریحہ کی منگنی ہو چکی۔ زینا کا بھی کہیں ہو جائے تو دونوں کی ایک ساتھ ہی شادی کردوں!" ثریا کچھ سوچ بچار کرتے ہوئے بولیں۔

"اماں تم سے کئی بار کہا ہے۔۔۔ میری فکر چھوڑ دیں۔۔۔ مجھے تو کوئی شہزادہ آئے گا لینے۔۔۔ شہزادے اب گاؤں دیہات میں یہاں آس پاس تھوڑی رہتے ہیں' کہیں دور سے آئے گا۔ ابھی راستے میں ہے۔" اس نے کمال اطمینان سے جواب دیا۔ پروین تو ہنس پڑیں۔

"اس کی تو ہر بات ہی نرالی ہے۔ نام بھی تو الگ ہی ہے۔ گاؤں میں کسی لڑکی کا نام ایسا نہیں۔ باقی تیری سب بچیوں کے نام ملتے جلتے ہیں۔ اس کا بیچ میں الگ پڑ گیا۔ خیر سے نام کس نے رکھا تھا؟" فریحہ جگ میں شربت بنا کر لائی۔ اس کے ہاتھ سے شربت کا گلاس پکڑتے ہوئے وہ بولیں۔

"اس کے ماموں نے رکھا تھا جس دن پیدا ہوئی اسی دن میرا بھائی آگیا۔ اس نے گود میں لیتے ہی نام بھی دے دیا۔"

"اچھا۔۔۔ ویسے ثریا یہ کیا بات ہے۔ تمہارا بھائی بہت کم آتا ہیں تمہارے یہاں۔"

"آتا کم ہے' مگر فون کر کے حال احوال پوچھتا رہتا ہے۔ ابھی تک تینوں بہنوں کی عیدیاں بنا کر بھیجتا ہے۔ بھانجوں و بھانجیوں کے لیے بہانے بہانے سے تحائف بھیج دیتا ہے' یہی کچھ ہوتا ہے نا۔ اماں بھی ہفتے دو ہفتے بعد فون پہ لمبی بات کرلیتی ہیں۔"

"اماں۔۔۔ اماں نانی جان کا فون ہے' آپ سے بات کرنی ہے۔" ثریا کی بات ابھی جاری تھی جب **علیحہ** کمرے سے بھاگتی ہوئی آئی۔

"لو آگئی اماں جان کی کال۔۔۔" **علیحہ** کے ہاتھ سے موبائل پکڑتے ہوئے ثریا نے کہا۔ پروین مسکرا کر دیکھنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"جمشید یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ عبید اور زینا کا بھلا کیا جوڑ بنتا ہے عبید شہری ماحول میں پلا بڑھا۔۔۔ ہائی ایجوکیٹڈ اور زینا۔۔۔ گاؤں کے اجڈ گنوار ماحول میں پرورش پانے والی بھلا عبید کے ساتھ کیسے ایڈجسٹ ہو سکتی ہے؟" **کاشفہ** بیگم شدید حیرت زدہ لہجے میں بولیں۔ پاؤں پر لوشن لگاتے ہاتھ رک گئے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں کمرے میں آئے تو سونے سے پہلے جمشید صاحب نے بات کرنا لازمی سمجھا جسے سن کر **کاشفہ** بیگم غیر یقینی سے انہیں تک رہی تھیں۔

"شہری ماحول میں پرورش پانا کوئی کارنامہ نہیں اور دیہاتی ماحول میں پلنے بڑھنے سے کوئی انسان جانور نہیں بن جاتا اور ہاں میں نے تم سے کوئی مشورہ نہیں مانگا اس معاملے میں بلکہ اپنا فیصلہ سنایا ہے۔" بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے وہ انتہائی سنجیدگی سے بولے۔

"نہ سنیں میری۔۔۔ مگر یاد رکھیں شادی کے وقت لڑکا لڑکی کی مرضی جاننا ان کا اسلامی حق ہے۔ شریعت اجازت دیتی ہے پھر آپ عبید پر زبردستی نہیں کرسکتے۔ آپ کو اس کی مرضی پوچھے بغیر یہ قدم نہیں اٹھانا چاہیے کیوں کہ زندگی اس نے گزارنی ہے۔" جمشید صاحب کا موڈ دیکھتے ہوئے **کاشفہ** نے اپنا انداز اور الفاظ بدلے۔

"تم سے بہتر جانتا ہوں شریعت کو۔۔۔ مزید میرا سر کھانے کی ضرورت نہیں سو رہا ہوں میں۔" پہلو بدلتے ہوئے وہ بددلی سے بولے۔ ان کے چہرے پر ناگواری کا واضح تاثر تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سو چکے تھے' مگر

کاشفہ بیگم کی نیند اڑ چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بہت انجوائے کیا آج تو۔" میوزک شو ختم ہونے کے بعد ہال سے نکلتے ہوئے روحی نے اس کے بازو کے ساتھ تقریباً" جھولتے ہوئے کہا۔

"واقعی۔۔۔ سنگر بھی وہی اور سونگز بھی کئی بار سنے ہوئے، لیکن شاید تمہارے ساتھ کی وجہ سے میں نے بھی بہت انجوائے کیا۔" پھر ایک دوسرے کو گڈ بائے کہتے ہوئے دونوں اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

روحی ایک بیورو کریٹ کی بیٹی تھی۔ امارت، خوب صورت اور آسائشات کے باعث انتہائی نازک مزاج اور نک چڑھی سی لڑکی تھی۔ لمز میں روحی، نومی اور عبید ایک ہی گروپ کے ممبران تھے۔ کئی لڑکے روحی سے دوستی کے خواہش مند تھے۔ جن میں عبید بھی تھا۔ عبید اس کی دوستی کے دائرہ کار میں داخل تو ہو گیا، مگر دل میں چھپے ارمان کا ابھی اظہار نہ کر پایا تھا کہ روحی اور نومی کا افیئر شروع ہو گیا جو خاصا زبان زدعام بھی رہا، مگر جونہی وہ تعلیم مکمل کرکے پریکٹیکل لائف میں داخل ہوئے۔ نومی کے ارادے بدلنے لگے اپنی لندن پلٹ کزن پہ وہ اس طرح لٹو ہوا کہ شادی کرکے ہی دم لیا۔ روحی ٹوٹے دل کی کرچیاں چننے کے ساتھ احساس ذلت اور نارسائی کے کرب سے گزر رہی تھی، جب عبید آگے بڑھا اور اس کا دکھ سمیٹنے لگا۔ وہ سنبھلتے سنبھلتے پھر دل نہ سنبھال سکی اور عبید کی ہم سفری کے خواب دیکھنے لگی۔ عبید جو پہلے سے ہی اس پر فریفتہ تھا۔ دل و جان سے ساتھ نبھانے کے دعوے کرنے لگا۔

گیراج میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد وہ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا۔ دیکھا ماما صوفے پر براجمان چینل سرچنگ میں مصروف تھیں۔

"ہائے مام آپ سوئی نہیں ابھی تک؟" ان کے قریب کھڑے ہوتے ہوئے وہ کچھ حیرانگی سے بولا۔

"میں اس وقت ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ہوں اور تمہیں حیرانگی ہو رہی ہے۔ تم رات کے دو بجے گھر میں داخل ہو رہے ہو اس بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ سر تاپا بیٹے کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"مما یاروں دوستوں میں ٹائم گزرنے کا پتا کہاں چلتا ہے۔ آپ کے موڈ کو کیا ہوا؟" سرسری سے انداز میں اس نے کہا۔

"میرے موڈ کو چھوڑو تمہارے باپ کا موڈ بہت بگڑا ہوا ہے۔ اپنی حرکتیں سدھارو۔ انہیں فکر پڑ گئی ہے تم خراب ہو رہے ہو اور تمہیں سدھارنے کے لیے وہ اس پینڈو سے بیاہنا چاہتے ہیں تمہیں۔" انہوں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا تو وہ چونکا۔

"کیا مطلب۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔"

"وہ زینا ہے نا۔ ثریا کی بیٹی اس سے تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ پکا ارادہ کرلیا ہے۔ میری تو ایک نہیں سن رہے۔" انہوں نے بتایا تو وہ کھڑا کھڑا یوں اچھل کر پیچھے ہٹا جیسے زینا نامی کسی بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو۔

"مما آپ پورے ہوش و حواس میں ہیں؟" ماں کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بدتمیز۔۔۔ سمجھ نہیں رہے ہو میری بات۔۔۔ میں تمہیں بتانے کے لیے جاگ رہی ہوں اور تم یقین ہی نہیں کر رہے۔" وہ کچھ غصے میں آکر بولیں۔

"مما۔۔۔ وہ دیہاتن لڑکی میرے لیے ہی کیوں۔۔۔ جنید بھائی اور سعدیہ، نادیہ کے رشتے تو بڑے ایڈوانس گھرانوں میں کیے۔۔۔ میرے لیے وہ پینڈو ہی رہ گئی۔ میں پاپا کا سوتیلا بیٹا ہوں کیا؟" وہ ایک دم جھنجلا کر بولا۔

"بس انہیں آج کل یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہمارے گھر کا ماحول بے حد بگڑ گیا ہے اور اس ماحول کو سنوارنے کے لیے وہ ایک "نیک سیرت" بہو لانا چاہ رہے ہیں جو تمہیں بھی راہ راست پہ لائے اور ہمیں بھی۔" کاشفہ نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

"مما آپ نے پاپا کو سمجھایا نہیں ہے۔ وہ میرے ٹائپ کی لڑکی نہیں ہے۔۔۔ میں کسی صورت اس سے شادی نہیں کروں گا۔۔۔ پاپا میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے یہ میری زندگی کا معاملہ ہے۔" اضطرابی انداز میں چابی گھماتے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"یہ سب کہا میں نے۔ مگر وہ میری کوئی بات سننے ماننے کو تیار نہیں کیوں کہ آج کل ان پر تمہاری دادی کی باتوں کا جادو سوار ہے۔ اس لیے تمہیں سمجھانا چاہ رہی ہوں۔ یہ سب تمہاری دادی کا کیا دھرا ہے۔ ثریا کی پانچ بیٹیاں ہیں۔ ایک ہمارے سر منڈھنا چاہتی ہیں۔ باپ سے منہ ماری کرو گے تو وہ مزید بھڑکیں گے۔ دادی سے بات کرو۔ تو ہو سکتا ہے تمہاری جان چھوٹ جائے۔" وہ رازدارانہ انداز میں بات کر رہی تھیں۔ عبید پر سوچ انداز میں اثبات میں سر ہلانے لگا۔

☼ ☼ ☼

"دادی مجھے یاد ہے جب میں او لیول میں تھا تو چھٹیوں میں پھوپھو ثریا کے گاؤں گیا تھا آپ کے ساتھ۔۔۔ پھوپھو کی وہ بیٹی۔۔۔ کیا نام تھا۔۔۔ زینا۔۔۔ وہی موٹی سی اور گول پی سی۔۔۔ وہی کام کرتی تھی۔۔۔ کھانا پینا اور پھر سو جانا۔۔۔ ایک بار میں نے اسے بیر مار مار کر اٹھایا تھا۔ کیسے گلا پھاڑ کے روئی تھی۔ دادی وہ کاہل سی' ست الوجود لڑکی بہت سمجھ دار ہو گئی ہے کیا؟" تخت پر دادی کے قریب بیٹھا ان کے پاؤں دباتے ہوئے وہ بہت سادہ انداز میں بات کر رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ بہت بدل گئی ہے۔ اتنی سوہنی ہو گئی ہے۔ اب تو موٹی بھی نہیں رہی۔ گورا رنگ ہے۔ نیک اور فرمانبردار۔ اسی سال بی اے کیا ہے۔" دادی نے ایک دم جوش میں آکر بتایا۔

"اچھا دادی جان۔ اگر وہ اتنی اچھی ہو گئی ہے پھر اس کی شادی بھی کسی اچھے لڑکے سے ہونی چاہیے۔ گاؤں میں اگر زینا جیسی اچھی لڑکی ہو سکتی ہے تو پھر کوئی اچھا سا لڑکا بھی تو ہو گا۔ جو اس کی قدر کرنے والا ہو۔" اس نے کہا تو دادی نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا مطلب بچے میں سمجھی نہیں۔"

"مطلب یہ دادی جان کہ پاپا زینا سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں جبکہ میں ذہنی طور پر اس لڑکی کو زیرو پرسینٹ بھی قبول نہیں کر سکتا۔ اس کا بھلا میرے ساتھ کیا جوڑ بنتا ہے۔ پلیز آپ پاپا کو سمجھائیں میں کبھی بھی اسے بیوی کا مقام نہیں دوں گا۔ بہتر ہے پاپا زبردستی نا کریں۔" اس نے واضح انداز میں کہا۔

"اماں جان اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتیں۔ فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے۔ مجھ سے بات کرو۔" اچانک جمشید صاحب کی بارعب آواز ابھری۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ پاپا نجانے کب وہاں آکھڑے ہوئے۔ پیچھے ماما بھی کھڑی تھیں وہ تخت پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"پھر آپ میری بات سن چکے ہیں۔ میں زینا سے شادی نہیں کروں گا۔" اضطرابی انداز میں انگلیاں مروڑتے ہوئے اس نے کہا۔

"اگر تمہیں میرا فیصلہ منظور نہیں۔ تم پر میرا حق نہیں تو پھر۔ میری طرف سے مکمل آزاد ہو۔ میری جائیداد اور میری کمائی سے ملنے والی آسائشات پر تمہارا بھی کوئی حق نہیں۔ ڈگری ہے تمہارے پاس جاؤ اپنی محنت کے بل بوتے پہ زندگی کو اپنی مرضی سے جیو۔ میں تمہیں اپنی جائیداد سے عاق کرتا ہوں اور میں تمہارے کسی عمل کا ذمہ دار نہیں ہوں گا" وہ سختی سے کہتے ہوئے خلا میں گھورنے لگے۔ عبید کے ساتھ دادی اور کاشفہ بیگم بھی بری طرح چونکیں۔

"کاشفہ بیگم ایک دو دن میں جعفر کے گھر والوں کو بھی انکار کر دو۔ میں نادیہ کی شادی بھی کسی شریف اور پرہیزگار لڑکے سے کرنا چاہتا ہوں۔" وہ ایک اور حکم صادر کرنے کے بعد بنا کسی کی سنے وہاں سے چل دیئے

"ایں۔۔۔ یہ جمشید کو کیا ہو گیا۔ اولاد پہ زبردستی کاہے کو۔" دادی بوکھلاتے ہوئے بولیں۔

"یہ سب آپ کا ہی کیا دھرا ہے۔ آجاؤ عبید بیٹا۔" غصے سے کہتے ہوئے کاشفہ بیگم بھی چلی گئیں۔

"تو میں نے کیا کر دیا بیٹے کو مشورہ دینے کا بھی حق نہیں رہا کیا؟" عبید بھی چل دیا تو دادی جان فکر مندانہ انداز میں بڑبڑائیں۔

"میری بات پہ ذرا غور کریں۔ رشتے ناطے جوڑنا توڑنا اتنا آسان نہیں ہے۔ جعفر کے والد کے ساتھ آپ کے کاروباری مراسم ہیں۔ اور پھر جعفر اور نادیہ

ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ آپ کے اس طرح کے بے لچک فیصلوں سے ساری اولاد باغی ہو جائے گی۔ کچھ سنورنے کی بجائے مزید خرابیاں پیدا ہوں گی۔ آپ زینا کو اس گھر میں لانا چاہتے ہیں لے آئیں۔ میں عبید کو سمجھالوں گی۔ جب زینا آئے گی۔ دیکھیے گا وہ اس گھر کے افراد کو کتنا متاثر کرتی ہے۔ پھر نادیہ کا بھی سوچ لیں گے۔ میں نے لچک دکھائی ہے۔ اب آپ کو بھی چاہیے کہ اپنے فیصلے میں نرمی لائیں اور نادیہ کے رشتے کو فی الحال خراب نا کریں۔" بیڈ پر ان کے قریب بیٹھی دھیمے لہجے میں وہ بڑی سنجیدگی سے بات کر رہی تھیں۔

"اوکے۔ مگر زینا کے معاملے میں اب تم لوگوں کا منفی رویہ نادیکھوں۔ کچھ لمحوں بعد جمشید صاحب نے تنبیہی انداز میں کہا۔ کاشفہ خاموش رہیں۔

"مما یہ آپ نے کیا کر دیا۔ آخر مجھے ہی کیوں بھینٹ چڑھا رہی ہیں؟" عبید نے رونے والے انداز میں دہائی دی۔ کاشفہ نے فون کر کے سعدیہ کو بھی بلالیا تھا۔ لان میں اس وقت کاشفہ، سعدیہ، نادیہ اور عبید شام کی چائے پی رہی تھے جب کاشفہ نے ساری بات ان کے گوش گزار کی۔

"اپنے باپ کا بے لچک رویہ تم دیکھ چکے ہو۔ کچھ بچانے کے لیے اب کچھ تو گنوانا ہی ہے۔" وہ بے دلی سے بولیں۔"

"مما۔ میں روحی کو پسند کرتا ہوں۔ اور اسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں آخر میرے معاملے میں آپ سب کیوں بے حس ہو رہے ہیں۔" وہ تقریباً" چیخ پڑا۔

"بیٹا۔ سمجھو بات کو۔ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہٹ دھرمی اور ضد کی بجائے ذہانت سے نبٹانا ہوتا ہے۔ جائیداد سے عاق ہو کر خالی ہاتھ روحی کا رشتہ لینے جاؤ گے تو کیا اس کے والدین مان جائیں گے۔ اب تمہیں ترک سے کام لینا ہو گا۔ آجانے دو زینا کو اس گھر میں۔ ایک دفعہ ان سب کا شوق بھی پورا ہو جانے دو۔ اس کے ساتھ ایسا سلوک کریں گے کہ خود ہی بھاگے گی۔ تمہیں ضرورت نہیں باپ کی نظر میں برا بننے کی۔ بس تھوڑا صبر اور برداشت سے کام لینا ہو گا۔ دیکھنا تمہارا باپ خود روحی کو بیاہ کر لائے گا۔" معاملہ اب مجھ پر چھوڑ دو۔ بس اتنا کرنا زینا کو جوتی کی نوک پر رکھنا۔ دیکھوں گی کتنے دن بستی ہے۔ اوقات دیکھی نہیں محل میں بسنے کے خواب دیکھ لیے۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولیں۔

"اونہہ! اس کا تو میں سر ہی پھاڑ دوں گا۔ موٹی بھینس کا۔" تصور میں گول گپی سی بارہ سالہ زینا کو لاتے ہوئے وہ بھی دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔ اسی وقت اس کے فون کی بیل بجی تو وہ موبائل پہ روحی کا نمبر دیکھتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر چل گیا۔

"تھینک یو ماما۔ آپ نے کتنی ذہانت سے معاملہ سنبھالا۔ پاپا کو تو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔" نادیہ مشکور انداز میں بولی۔

"اونہہ۔ مڈل کلاس بندہ جتنا بھی تعلیم یافتہ۔ ترقی یافتہ ہو جائے ذہن کی دقیانوسیت نہیں جاتی۔" وہ طنزیہ انداز میں بولیں۔ اور چائے کا آخری سپ لیا۔

☼ ☼ ☼

میں نے دیکھا جسے باغوں میں بہاروں میں
وہ آگیا میرا سانوریا

"آج تک اس گھر میں ٹیپ ریکارڈ نہیں بجا۔ یہ پتا نہیں کہاں سے گانے سن لیتی ہے گنگنانے کے لیے۔ چلو جا کر دروازے پہ دیکھو کون ہے؟" اپنی دھن میں مست وہ گنگناتی ہوئی برآمدے سے آرہی تھی جب ثریا نے جھڑکتے ہوئے کہا۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے خالہ پروین کھڑی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی سینے سے لگایا پہلے ماتھا چوما۔ پھر بڑی خوشی آگے بڑھیں۔

"مبارک ہو ثریا! میں نے سنا کہ تو نے زینا کا رشتہ طے کر دیا ابھی مدیحہ اور علیحہ مٹھائی دینے آئیں۔ مجھ سے صبر نہیں ہوا فوراً" چلی آئی۔" پروین نے بڑے جوشیلے انداز میں کہا۔

"ہاں ہاں۔ خیر مبارک۔ بیٹھو تو آپا۔" ثریا نے

چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی پرسوں اتوار کو میری اماں اور بھائی آئے تھے۔ بھائی نے اتنی چاہت اور مان سے رشتہ مانگا کہ میں تو سوچنے کا وقت بھی نہیں لے سکی۔ بلکہ وہ تو شادی کی ڈیٹ بھی فکس کر گئے۔ ڈیڑھ ماہ بعد کی تاریخ رکھی ہے۔"

"اچھا بھتیجا خیر سے کیسا ہے۔ زینا جیسا ہی تو نہیں؟" وہ معنی خیز انداز میں بولیں۔

"ارے نہیں۔ لمز سے پڑھا ہے۔ باپ کے ساتھ ہی بزنس میں ہاتھ بٹا رہا ہے۔ بہت ہی پیارا ہے۔ میرا بھتیجا تو۔ زینا کی جو حرکتیں ہیں۔ پریشان ہوتی ہوں سوچ کر کہ وہاں جا کے نجانے کیا کرے گی مگر کیا کرتی بھائی نے نام ہی زینا کا لیا۔" ثریا نے بتایا۔

"چلو بڑے اچھے نصیب کھلے زینا کے۔ تیرا بھائی اتنا دولت مند ہے۔ گھر میں نوکر چاکر ہوں گے۔ زینا کو گھرداری سیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ آرام سے سویا کرے گی۔ پھر جب ذمہ داری پڑتی ہے سر پہ تو انسان بہت کچھ سیکھ لیتا ہے۔" پروین نے جیسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں شاید اسی طرح تھے اس کے نصیب۔ لیکن پھر بھی ڈرتی ہوں بھائی کے سامنے بعد میں شرمندہ نا کرا دے۔" ثریا نے خدشہ ظاہر کیا۔ پروین مسکراتے ہوئے کہنے لگیں۔

"ارے یہ کوئی پاگل ہے۔ بس ذرا عادتیں بچپن ہی سے عجیب ہیں۔ ویسے ہے نصیبوں والی۔ واقعی ہی شہزادہ بیاہنے آرہا ہے۔" پروین نے زینا کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے آگے سے وکٹری کا نشان بنا کر دکھایا۔

"دیکھا ذرا جو اس میں جھجک اور شرم ہو۔" ثریا ناگواری سے اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔ وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"مس زینا تم جمشید عباسی کی بہو تو ہو سکتی ہو مگر عبید عباسی کی بیوی کا مقام کبھی بھی نہیں پا سکو گی۔ تم سے نکاح کرنا میری مجبوری اور میری زندگی کی سب سے بڑی آزمائش ہے۔ لہٰذا اس گھر میں خود کو جز وقتی فرد ہی سمجھنا۔ اپنی اوقات میں رہنا۔ وہ محاورہ سنا ہے نا۔ ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنانا۔ بس یہی سمجھنا کہ میں نے ضرورت کے تحت تم گدھی کو ظاہراً" بیوی بنالیا ہے۔ میرے دل میں کوئی اور لڑکی بستی ہے میں اس لڑکی کو اپنے گھر میں بساؤں گا۔ ابھی سے اپنی حیثیت کا تعین کرلو۔"

پلان کے مطابق کئی بار کی سوچی ہوئی باتیں اس نے ایک بار پھر ذہن میں دہرائیں۔ کھنچے کھنچے تاثرات اور پھولے نتھنوں کے ساتھ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ قہر آلود نظریں اٹھائیں دیکھا تو وہ تازہ پھولوں سے سجے حجلۂ عروسی میں بڑے اطمینان سے سو رہی تھی۔ بھاری بھر کم لہنگے اور جیولری سمیت۔ سونے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ نیند نے بے اختیار کر دیا تھا۔

نظریں اس کے سراپے میں الجھنے لگی۔ ٹی پنک اور لائٹ پرپل کلر کے کنٹراس لہنگے میں ملبوس۔ میچنگ عروسی جیولری۔ نازک سا بے خبر وجود چہرے پہ پر مسرت رنگ لیے گہری نیند کی وادی میں کھویا ہوا تھا۔

"اس کا موٹاپا کہاں گیا۔ اور یہ اتنی حسین کیسے ہوگئی؟؟"

چند لمحوں کے لیے وہ خود سے بے خبر سا ہو گیا۔

"میرا انتظار بھی نہیں کیا جاہل کہیں کی سو بھی گئی۔ یہ تو الٹا میری انسلٹ کر گئی۔ دفع کرو میں کیوں جگاؤں۔ اتنی بھی حسین نہیں شاید میک اپ کا جادو ہے۔" ذہن میں خیال آتے ہی ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"ارے بدھو آج رات ہی کمزور پڑ گئے تو آئندہ کیا کرو گے۔ جو بھی ہے اسے لائف پارٹنر تو کسی صورت نہیں بنانا۔ اس اجڈ کے ساتھ گنواروں کی طرح زندگی بسر نہیں کی جاتی۔ لہٰذا اس کے حسن کو نظر انداز کر دو۔" آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو اپنا ہی عکس سمجھانے لگا۔

"چلو اچھا ہوا سو گئی جان چھوٹی۔" سوچتے ہوئے وہ وارڈروب کی جانب بڑھا۔

"پہلی رات دلہن سے جو بات کہہ دو۔ ساری زندگی گرہ سے باندھ کر رکھتی ہے۔ کبھی بھولتی نہیں۔" دادی جان نے یہ بات نجانے کس سے کہی تھی جو اس نے اچانک ہی سن لی تھی۔ ابھی کھٹ سے یاد آ گئی۔

"ہوں۔ اگر آج ہی میں اسے اس کی اوقات باور کرادوں تو یہ ساری زندگی یاد کر کے انسلٹ محسوس کیا کرے گی۔ واؤ زبردست آئیڈیا۔" خود کو داد دیتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور با آواز پکارا۔

"اے اٹھو!" آواز کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر رہ گئی۔ مگر اس کے کانوں کو چھوئی تک نہیں۔

"ابھی اٹھاتا ہوں بچو! جھنجلاتے ہوئے اس نے پانی کا جگ سائیڈ ٹیبل پر سے اٹھایا اور اس کے چہرے پر چھینٹے مارے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ آنکھیں جھپک جھپک کر اسے دیکھا۔ بھرپور انگڑائی لی۔ پھر خوابیدہ لہجے میں گویا ہوئی۔

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے نہیں سونا چاہیے۔ لیکن کیا کروں کل ساری رات ڈھولک بجتی رہی۔ میں سو نہیں سکی۔ اب کل کی نیند بھی آ رہی ہے۔ پلیز سونے دو۔ ساری زندگی پڑی ہے جاگنے کو۔ سوری ابھی میں۔ نن.... نہیں جا۔ جاگ سکتی۔" آخری الفاظ اس نے بمشکل تمام ادا کیے اور پھر بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

"ارے کچھ دیر اور یہاں کھڑے رہے تو پھر اس سے چھٹکارا نہیں پاسکو گے۔ چھوڑو اسے اس کے حال پہ۔" اندر سے کسی نے تنبیہہ کی۔ وہ پلٹ کر باتھ روم کی طرف بڑھا۔

☼ ☼ ☼

"اپنا بوریا بستر سمیٹو! اور جا کر کہیں اور جگہ سو جاؤ۔ گیسٹ روم ہے۔ ڈرائنگ روم۔ ٹی وی لاؤنج۔ اس کے علاوہ بھی کوئی بیڈ روم خالی ہو گا۔ میں تمہارے ساتھ اپنا بیڈ اور کمرہ شیئر نہیں کرنا چاہتا۔ ابھی تو خود جاؤ کل اپنی چیزیں بھی شفٹ کر لینا!" رواج کے مطابق ولیمہ کے بعد دونوں گاؤں میں دو دن گزار کے آئے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بیشتر اس کے، وہ سونے کی تیاری کرتی عبید نے بڑے خشک اور سرد انداز میں کہا۔ وہ دم بخود سی اسے دیکھے گئی۔

"میری شادی اسی سے ہوئی ہے کیا؟ اتنا غصہ۔ یہ غصہ ہے یا بے زاری۔ یا پھر نفرت۔ یا کچھ اور۔ کشمکش و پیچ میں گھری وہ سوچ رہی تھی۔ جب وہ پھر تقریباً دھاڑا۔

"جاؤ بھی سنا نہیں۔"

"مم۔ میری۔ بات تو سنیں۔" وہ ہمت پکڑتے ہوئے منمنائی۔

"تمہاری بات سنوں میں۔ اتنا جاہل لگتا ہوں میں تمہیں۔" انداز ایسا تحقیر آمیز تھا کہ وہ چاہ کر بھی مزید کچھ نا بول سکی اور ایک سیکنڈ کی تاخیر کیے بنا کمرے سے باہر نکل گئی۔ ذلت کے احساس سے آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔ "کیا کروں۔ نانی جان کے کمرے میں چلی جاؤں؟" سوچتے ہوئے وہ سیڑھیاں اترنے لگی۔ سامنے ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی پر کوئی انگلش مووی چل رہی تھی۔ جنید بھائی۔ ان کی بیگم اور نادیہ کو وہاں بیٹھا دیکھ کر وہ بھی وہیں چلی آئی۔

"ہاؤ آر یو زینا۔ آؤ بیٹھو!" اسے دیکھتے ہی جنید خوشگواری سے بولا۔ جبکہ نازیہ اور حبیبہ کے تاثرات سے واضح ہو رہا تھا کہ انہیں اس کا یہاں آنا بالکل اچھا نہیں لگا۔

"فائن۔" آہستگی سے کہتے ہوئے وہ ذرا سا مسکرائی اور سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھنے کی دیر تھی کہ حبیبہ اور نازیہ یکے بعد دیگرے وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ جنید کی کال آئی تو وہ بھی فون کان سے لگاتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔

"سب کے رویے کتنے عجیب ہیں نئی نویلی دلہنوں کے ساتھ بھلا اس طرح بی ہیو کیا جاتا ہے۔ سوائے نانی جان کے ابھی تک کسی کے چہرے سے خوشی ظاہر نہیں ہوئی۔ سب ہی کے رویے پتھر پھوڑ سے ہیں۔" ٹی وی پر نظریں جمائے وہ سوچ رہی تھی۔ مووی کی اسے کچھ خاص سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

"نانی جان کا کمرہ نجانے کہاں ہے۔ اور مجھے گیسٹ روم کا بھی نہیں پتا کس جگہ ہے۔" اطراف میں دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ پر مختلف سوچوں میں گھری وہیں بیٹھی رہی۔ ان سب کے رویوں سے دماغ کو ایسے جھٹکے لگے تھے کہ فی الحال نیند بھی پاس سے نہیں گزر رہی تھی۔

"زینا بیٹا آپ یہاں بیٹھی ہو اکیلی۔ ابھی آج ہی سفر کر کے آئی ہو جاؤ سو جاؤ جا کر!" ماموں نجانے کب وہاں آئے تھے۔ انتہائی نرمی سے بولے۔

"ماموں جان' نانی جان کا کمرہ کدھر ہے۔" ہمت بندھی تو اس نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اماں جان کا کمرہ تو اس طرف ہے۔" انہوں نے دائیں طرف اشارہ کیا۔

"مگر اس وقت تک وہ سو چکی ہوتی ہیں۔ جلد سونے کی عادی ہیں۔ آپ صبح مل لینا ان سے۔" انہوں نے مزید کہا۔

"ا۔ اچھا تو پھر گیسٹ روم کدھر ہے۔" اس سے پہلے کہ ماموں بھی جاتے وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"گیسٹ روم وہ رہا مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟" نانی جان کے ساتھ والے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ۔ عبید کہہ رہے ہیں تم ادھر ہی سو جاؤ۔" اس نے نظریں جھکاتے ہوئے بتایا۔

"اچھا۔ چلو میرے ساتھ۔" ان کا انداز اچانک ہی بدلا۔ ان کی پیروی میں وہ دوبارہ مجازی خدا کے کمرے کی طرف آئی۔ انہوں نے دروازے پر پہلے ناک کیا۔ چند ثانیے بعد دروازہ کھلا تراؤزر اور بنیان میں ملبوس عبید سامنے کھڑا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر سٹپٹایا۔ پھر ایک طرف ہو گیا۔

"صاحبزادے کیا یہ بھی نئے زمانے کا فیشن ہے یا پھر ایڈوانس ہونے کی علامت کہ میاں بیوی الگ الگ کمروں میں سوئیں؟" وہ وہیں کھڑے طنزیہ لہجے میں بولے۔ وہ جواباً خاموش رہا جھکے سر کے ساتھ۔

"کیا خیال ہے! مجھے اور تمہاری ماں کو بھی اپنے بیڈ روم الگ کرنے چاہئیں اور جنید پر بھی یہ فیشن لاگو ہوتا ہے۔" وہ ایسے بولے کہ عبید کھسیا کر رہ گیا۔

"نن۔۔۔ نہیں پاپا۔ دراصل مجھے کام کرنا تھا کچھ۔ میں نے سوچا یہ ڈسٹرب ہو گی تو اسے گیسٹ روم میں جانے کو کہا۔" بروقت بہانہ بنایا۔ جو کسی کام نا آیا۔

"کونسا کام کرنا تھا۔ پڑھائی تمہاری ختم' آفس مہینہ ہوا تم نہیں جا رہے۔ پھر ایسا کونسا کام تھا۔ جو بیوی کی موجودگی میں نہیں ہو سکتا۔ بہر حال کام جو بھی ہو۔ زینا کا تمہارے بیڈ روم پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ تمہارا اپنا۔ آئندہ میں تمہیں ایسی گھٹیا حرکت کرتے نا دیکھوں۔" انہوں نے لہجے کو سخت کرتے ہوئے کہا۔ اور زینا کو اندر جانے کا اشارہ دے کر وہاں سے چلے گئے۔

کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے عبید نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔ "ناپسندیدہ بیوی کتنی بڑی مصیبت اور آزمائش ہوتی ہے۔ آج اندازہ ہوا۔" وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔ زینا ہولا کر رہ گئی۔

"اچھی بھلی زندگی خراب ہو کر رہ گئی۔" کمرے میں ادھر ادھر چکر لگاتے ہوئے وہ بھنایا۔

"اچھا تو دراصل یہ وجہ ہے۔ اس کے اس طرح کے رویے کے پیچھے۔ لڑکیوں کی شادیاں تو زبردستی ہو جاتی ہیں مگر یہ مرد ہو کر بھلا کیونکر مجبور ہو گیا۔ وہ بھی ماموں جان کا لاڈلا فرزند ارجمند۔" وہ سوچ کر رہ گئی۔

"یہ صوفہ پڑا ہے اسی پر سونا۔ میرے بیڈ تک نا آنا۔ اور خبردار اگر اب پاپا کو شکایت لگائی۔ حشر بگاڑ دوں گا تمہارا۔" وہ تقریباً دھاڑا۔ وہ خوفزدہ سی ہو کر صوفے کی طرف آ گئی۔ عبید نے کمرے کی لائٹ آف کی اور بیڈ پر لیٹ کر کروٹ دوسری طرف لے لی۔ خوف' تجسس' شرمندگی' ہتک اور احساس ذلت جیسی کیفیات سے نبرد آزما ہوتی وہ بھی جلد ہی نیند کی وادی میں اتر گئی۔

☼ ☼ ☼

"پلیز روحی میری بات تو سن لو۔ تین دن ہو گئے تمہاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ تمہارے فون

نمبرز پر دس بار ٹرائی کیا۔ تم فون نہیں اٹھا رہیں۔ تمہارے گھر تک گیا۔ تم نہیں ملیں۔ ابھی ملی ہو تو بات تو سن لو۔" التجائیہ انداز میں بولتا وہ اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ جبکہ وہ تیز تیز پنسل ہیل والے قدم اٹھاتی کلب سے باہر آگئی۔

"کیوں سنو تمہاری بات! تم نومی سے بھی کئی گنا زیادہ کمینے۔ دھوکے باز، فلرٹی اور فراڈیے نکلے ہو۔ اس نے تو پھر لندن پلٹ کزن کو مجھ پر ترجیح دی تم نے اپنی دیہاتن کزن کے ساتھ شادی کرکے مجھے شاید میری اوقات دکھانا چاہی کہ میں کتنی گھٹیا ہوں!" وہ نفرت اور غصے میں پھنکاری۔

"آخر تمہیں یہ بے کار کی انفارمیشن ملی کہاں سے؟" وہ جھنجلا کر بولا۔

"شہر کے مشہور ہوٹل میں تمہارا ولیمہ ہوگا اور کسی کو خبر بھی نا ہو۔ پتا نہیں کس دور میں جیتے ہو۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ اس نے اپنے کسی بھی دوست یا جاننے والے کو اپنی شادی کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ وہ خود بھی ہوٹل میں ولیمہ کروانے کے خلاف تھا مگر پاپا کے سامنے ایک نا چلی۔ پاپا کے جاننے والے شہر کے امیر گھرانوں کے لوگ مدعو تھے۔ اگرچہ ملا، بھابی اور بہنوں میں سے کسی نے اپنے حلقہ احباب میں سے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ مگر پاپا کے کچھ جاننے والے ایسے تھے جن کے بچوں سے عبید کے بھی ریلیشن شپ تھے۔ شاید ان ہی کے ذریعے بھانڈا پھوٹا۔

"دیکھو روحی ایک بار میری بات سن لو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔" اس سے پہلے کہ وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتی عبید اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ چاروناچار وہ کھڑی رہی۔

"زنیرہ سے میری شادی پاپا کے زور دینے پر ہوئی ہے۔ میں اس جاہل کو کسی طور پسند نہیں کرتا۔ یہ سب پاپا دادی اور پھوپھو کی ملی بھگت ہے۔ اس لیے تو میں نے شادی میں اپنے کسی فرینڈ کو مدعو نہیں کیا۔ میں اپنے سارے ارمان تب پورے کروں گا جب تم سے میری شادی ہوگی۔ سامنے نے ہی کہا کہ فی الحال حالات سے کمپرومائز کرلو کیونکہ زنیرہ سے شادی سے انکار کی بدولت مجھے ساری جائیداد سے عاق ہونا پڑتا۔ جو میرے حصے کی ہے۔ میرا تو یقین کرو اس لڑکی سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ ہمارے گھر میں کسی بے کار اور جز وقتی فرد کی طرح رہ رہی ہے۔ موقع ملتے ہی یعنی پاپا کی رائے اس کے بارے میں چینج ہوتے ہی میں اسے طلاق دے دوں گا۔ وہ بے بھی ہو گئی ہی۔ جلد ہی پاپا بھی اکتا جائیں گے یا وہ خود جانے پر مجبور ہو جائے گی۔ میں تو تمہارے لیے راستہ ہموار کرنے کی غرض سے یہ سب کر رہا ہوں۔" اس نے تفصیلاً اپنی صفائی پیش کی۔

"بڑی افسانوی اور ڈرامائی صورت حال ہے۔ اکثر افسانوں میں پڑھا ہے کہ ہیرو کی شادی کسی دیہاتی۔ جاہل اور بدھو سی لڑکی سے ہو جاتی ہے۔ شروع میں وہ خوب جھنجلاتا ہے مگر اینڈ میں خود ہی اس پر فدا ہو جاتا ہے۔" وہ طنزیہ لب ولہجے میں بولی۔

"نہیں ہر افسانے میں ایسا نہیں ہوتا ہوگا۔ اور میری زندگی کوئی افسانہ نہیں۔ جو میں ایک اجڈ لڑکی کی بھینٹ چڑھا دوں۔ پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"اچھا اگر تم اتنے ہی میرے لیے سیریس ہوتے تو میری خاطر اپنے باپ کی جائیداد کو ٹھکرا بھی سکتے تھے۔ میرے پاپا کی دولت کافی تھی ہمارے لیے۔ پاپا تمہیں سیٹ کر سکتے تھے۔ بیرون ملک بھی ہم سیٹل ہو سکتے تھے۔" وہ کچھ لچک میں آکر بولی۔

"نہیں۔ روحی۔ میں گھر دامادی اور سسر کی دولت پر زندگی گزارنے کے خلاف ہوں میرے پاپا بہت خوددار ہیں۔ انہوں نے اپنے زور بازو پہ آج یہ مقام پایا۔ ان کا بیٹا ہو کر میں ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتا۔" اس نے کہا تو روحی نے تمسخر آمیز انداز میں اسے دیکھا۔

"پھر تم بھی اپنے زور بازو پہ کچھ کر لیتے۔ اپنے باپ کی جائیداد کا لالچ نہ کرتے۔" غصے میں کہتے ہوئے وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی اور گاڑی اسٹارٹ کرلی۔ مگر رات کو ڈیڑھ بجے جب عبید کی کال آئی تو

اٹینڈ کیے بنا نا رہ سکی۔ پھر تقریباً" دو گھنٹوں تک وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے۔

☼ ☼ ☼

"واؤ کیسی رنگ رنگیلی سی تتلی ہے۔ یہ کہاں سے آگئی؟" وہ لان میں چیئر پر بیٹھی ناول پڑھنے میں مصروف تھی جب ایک رنگ برنگی تتلی آکر صفحے پر بیٹھ گئی۔ اس نے بلاارادہ اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہ اگلے ہی لمحے اڑ گئی۔ تتلی کے تعاقب میں اس کی نظر پھولوں پر جا ٹھہری جو لان میں چاروں طرف لگے ہوئے تھے۔ "پھولوں کے پودے تو ہمارے گھر میں بھی لگے ہوئے تھے مگر یہ پھول بالکل منفرد اور کتنے اچھوتے ہیں۔ کیسا پیارا لان سجایا ہوا ہے۔ کیا تھا جو یہ لوگ دل کے بھی اتنے ہی پیارے ہوتے۔ ہائے ربا۔ مجھ جیسی معصوم اور سادی سی لڑکی کے لیے اتنی حقارت لکھ دی قسمت میں۔ جس دن سے آئی ہوں کسی نے سیدھے طریقے سے بات نہیں کی مجھ سے سوائے ماموں جان اور نانی جان کے۔ رشتہ لے کر بھی تو یہ ہی دونوں گئے تھے۔ تو کیا یہ رشتہ صرف ان دونوں کی ایما پر ہوا؟" وہ یاسیت زدہ انداز میں سوچ رہی تھی جب ملازمہ وہاں آئی۔

"زینا بی بی آپ کو بڑی بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔" اطلاع پاکر وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑی ہوئی۔ اور آہستہ روی سے چلتی ٹی وی لاؤنج میں آئی۔ وہاں اس وقت گھر کی تمام خواتین موجود تھیں۔ نانی جان گھر کے عام کپڑوں میں ملبوس صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں جبکہ کاشفہ بیگم، حبیبہ اور نادیہ کہیں جانے کو تیار لگ رہی تھیں۔

"زینا ہفتہ ہو چلا تمہاری شادی کو میرا خیال ہے کافی انجوائے کرلیا تم نے فرصت کے دنوں کو ہم نے بہت سنا ہوا تھا کہ ثریا کی بیٹیاں گھرداری میں بہت ماہر ہیں ذرا ہمیں دکھاؤ تو اپنا طریقہ سلیقہ۔ تمہاری اسی خوبی کی وجہ سے تو تمہیں بیاہ کر اس گھر میں لایا گیا ہے۔ چلو آج سے میٹھا پکائی کی رسم کرو۔ کھیر بنالینا۔ میں نے بھی پہلی بار کھیر ہی بنائی تھی۔ پھر رات کا کھانا بھی بنالینا۔ دراصل میں نے باورچی کو چھٹی دے دی۔ اب تم آگئی ہو تو بھلا خانساماں کی کیا ضرورت! حبیبہ کو اس کی ممی کی طرف چھوڑ کر میں اور نادیہ شاپنگ کرنے جائیں گی۔ ہم تینوں کی واپسی رات تک ہی ہوگی۔ تب تک تم سارا کام نبٹا لینا!" کاشفہ شائستگی سے بول رہی تھیں۔ مگر نظروں میں طنز کے تیر نانی اور نواسی دونوں پر چھوڑے جارہے تھے۔ وہ ہونق سی شکل بنائے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"ہاں بھئی تم لوگ اسے بتا تو دو کھانے میں کیا بنائے۔" قدم اٹھانے سے پہلے کاشفہ نے نادیہ اور حبیبہ سے کہا۔

"آنٹی میرا تو آج دل چاہ رہا کہ کھٹا سا ہو کھانے میں۔ میرے لیے چکن اچاری بریانی اور فروٹ ٹرائفل بنالینا۔" حبیبہ کا آٹھواں مہینہ چل رہا تھا اس نے اپنی طبیعت کے مطابق فرمائش کی۔

"میرے لیے قیمہ مٹر اور چپاتی ہونی چاہیے میرے لیے واسٹ قورمہ روٹی چپاتی۔ میٹھے میں کھیر، فروٹ ٹرائفل ہوگا۔ تھوڑے سے گلاب جامن بھی بنالینا۔ باقی سلاد اور رائتہ وغیرہ تو ہونے لازمی ہیں نا۔" نادیہ اور کاشفہ بیگم نے آگے پیچھے تیزی سے اپنی فرمائشیں بتائیں۔

"بہو بیگم آج تم تینوں کی اپنے ہی گھر میں دعوت ہے کیا؟" نانی اماں کچھ غصے سے بولیں۔

"جی اماں جی۔ دراصل آج زینا پہلے دن پکائے گی تو ہم نے سوچا کیوں نا دعوت ٹائپ ہی کام ہوجائے۔ ابھی مردوں کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں وہ کیا کھائیں گے۔ خیر عبید تو آج کل اپنی نئی گرل فرینڈ کے ساتھ زیادہ تر باہر ہی کھانا کھا آتا ہے۔ جنید قیمہ مٹر ہی کھالے گا۔ تمہارے ماموں سبزیاں پسند کرتے ہیں ان کے لیے بھنڈی گوشت کرلینا۔ اور اپنی نانی جان سے پوچھ لو وہ کیا کھائیں گی۔" شان بے نیازی سے کہہ کر اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتی کاشفہ بیگم آگے بڑھیں۔

"اور ہاں کہیں سو نہ جانا کام کرتے کرتے۔" نادیہ

نے کہا تو کاشفہ بیگم اور حبیبہ مضحکہ خیز انداز میں ہنسنے لگیں۔ اس کے وقت بے وقت اور زیادہ دیر گہری نیند سونے کی عادت سے اب تک پورے گھر کے افراد واقف ہو چکے تھے۔ وہ تو آرڈر دے کر چلی گئیں۔ مگر زینا فق چہرے کے ساتھ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ شادی سے پہلے چائے اور سادہ ابلے چاولوں کے علاوہ بھی کچھ نہ بنایا تھا۔ بہنیں جانیں اور ان کا کام۔ ابھی شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی امی نے اور فریحہ نے کتنا زور لگایا مگر کچھ بھی توجہ نہیں دی یہ کچھ سیکھنے پر، یہی سوچتے ہوئے کہ ماموں کے گھر میں ہر کام کے لیے نوکر ہیں۔ لیکن اس کے آتے ہی خانساماں کی تو چھٹی ہو گئی تھی نا۔ اب آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!

"اری زینا کیا ہوا تیرا رنگ کیوں اتنا پیلا پڑ گیا؟" نانی جان بڑی فکر مندی سے بولیں وہ چونکی۔

"نانی جان مجھے ان سب چیزوں میں سے کچھ بھی بنانا نہیں آتا۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"ایں... ثریا نے تجھے کھانا پکانا نہیں سکھایا۔" نانی جان تعجب سے بولیں۔

"وہ تو سکھاتی تھیں مگر میں نے کبھی دلچسپی نہیں لی۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"اچھا۔ ذرا اپنی ماں کا نمبر تو ملا!" نانی جان نے اس اسے اپنا موبائل پکڑاتے ہوئے کہا۔ اس نے نمبر ملا کر فون نانی جان کو پکڑا دیا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو ثریا۔ بچیاں کیسی ہیں؟" ثریا کے سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے مشفق انداز میں پوچھا! پھر ادھر ادھر کی چند رسمی باتوں کے بعد وہ اصل بات کی طرف آئیں۔

"ثریا یہ زینا کو بچپن میں زیادہ دیر سونے کی عادت تھی وہ ابھی ختم نہیں ہوئی! انداز میں تفتیش تھی۔"

"نہیں اماں کہاں ختم ہوئی اس نے لگتا ہے آپ لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے" ثریا نے پریشان انداز میں کہا۔

"پریشان کیا کرنا ہے۔ ماں باپ کے گھر اور سسرال گھر میں فرق تو ہوتا ہے۔ سسرال والے ذرہ برابر غیر معمولی انداز و اطوار بھی نوٹ کرتے ہیں۔ تو نے اس کا علاج وغیرہ تو کروانا تھا' کسی کو دکھاتی تو سہی۔ اور تو اور کھانے پکانے میں بھی وہ کہہ رہی ہے اناڑی ہے؟" اماں نے ہنوز سابقہ انداز میں کہا۔

"جی اماں جان میری ساری بیٹیوں میں اک یہی ذرا نکمی تھی ایک تو سونے کی عادت۔ دوسرے کسی کام میں دلچسپی لیتی ہی نہیں۔ پتا نہیں سو سو کر دماغ ہی غبی ہوا رہتا ہے۔ بچپن میں ہی حکیموں وغیرہ کو دکھایا تھا۔ انہوں نے یہی کہا۔ یہ اس میں قدرتی ہے زیادہ سونا۔ یہ کوئی بیماری نہیں جس کی دوائی دی جاسکے۔ وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی یہ نارمل نیند لے گی ابھی تک تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ اب دیکھیے۔ میں نے اس دن جب آپ اور بھائی جان آئے تھے بتایا بھی تھا۔ آپ کو مگر اس وقت آپ رشتہ کرنے میں ایسی پرجوش تھیں کہ میری بات کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں۔" ثریا نے وضاحت دیتے ہوئے کہا۔

"ہوں بس۔ نصیب کا چکر ہے۔ بگڑوں بگڑوں میں ایک اس نکمی کی کمی تھی جو پوری ہو گئی۔ چلو خیر تو پریشان نا ہونا اللہ بہتر کرے' اماں جان نے مزید چند باتیں کر کے فون بند کیا اور بغور اسے دیکھا۔ جو چہرے پر بے پناہ شرمندگی اور پریشانی لیے بیٹھی تھی۔

"کھیر تو بنا لے گی کہ نہیں۔" انہوں نے لہجے کو ہلکا پھلکا کرتے ہوئے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا۔ چل پھر ایسا کر کچن میں جا۔ وہاں راشدہ سے پوچھ کے چاولوں کا ٹوٹا نکال کے نیم گرم پانی میں بھگو دے۔ باقی میں آ کے بتاتی ہوں۔ وہ سب ہی جو کھانے بتا گئی ہیں وہ بھی تو بنانے ہیں۔ آج تو وہ تجھے امتحان میں ڈال گئیں۔ مگر تو نے گھبرانا نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں سب بتاؤں گی بس تو صبر سے اور شوق سے سیکھنا شروع کر۔" انہوں نے بھرپور اس کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ مشکور انداز میں نانی جان کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ راشدہ سیڑھیوں کے قریب ہی مل گئی۔ کچن میں جا کر چاول نکالے۔ راشدہ

تو پھر باہر آ گئی مگر وہ اپنا کام کرتے ہوئے یاسیت زدہ سوچوں میں پڑ گئی۔

"مجھ سے اچھی تو فریحہ ہے۔ شادی مڈل کلاس گھرانے میں ہوئی۔ شوہر واپڈا میں ملازم۔ مگر کیسا چاہنے والا۔ کتنی خوش ہے فریحہ۔ ابھی وہ اسے مری کاغان گھمارہا ہے۔ میں۔ کیا کر رہی ہوں۔ سب کی نفرت کے مظاہرے دیکھ رہی ہوں۔ فریحہ بتا رہی تھی کہ اس کی ساس کہتی ہیں 'میں ابھی چھ ماہ تک کھانا پکائی کی رسم نہیں کروں گی ساری زندگی پڑی ہے کام کرنے کو مگر دلہناپے کے ناز اٹھوانے کے۔ سجنے سنورنے کے یہی دن ہوتے ہیں حالانکہ ان کے گھر میں تو کوئی ملازم بھی نہیں۔ ہائے ری قسمت۔ کرلو۔ امیر گھرانے کے شہزادے سے شادی۔ میں کوئی سنڈریلا۔ یا سنو وائٹ تو نہیں تھی۔ میں تو عام سی لڑکی ہوں۔ مجھے اسی طرح کا شہزادہ ملنا تھا۔" سوچتے سوچتے چاول بھگوئے۔ پھر وہاں چیئر پر بیٹھ کر نانی جان کا انتظار کرنے لگی۔

ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد نانی جان جب کچن میں آئیں تو دیکھا وہ کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

"لو جو کام ساس بتا کے گئی ہیں وہ ویسے ہی پڑے ہیں اور جس سے منع کیا وہ شروع۔" نانی جان نے سر پکڑتے ہوئے سوچا پھر آگے ہو کر اس کا کندھا ہلایا۔ اس نے زور کا جھٹکا کھایا۔ پھر لڑھک گئی۔ نانی جان نے راشدہ کو آواز دی۔

"جاؤ اسے میرے کمرے تک چھوڑ آؤ۔ ابھی یہ سیڑھیاں چڑھنے کے قابل نہیں کہ اپنے کمرے میں جاکر سوئے۔" انہوں نے اسے کہا۔ بمشکل اسے ہلا جھلا کر کھڑا کیا گیا۔ نیم غنودگی کی حالت میں ڈولتے قدموں کے ساتھ راشدہ کا سہارا لیے 'وہ نانی جان کے بیڈ تک آئی پھر لیٹتے ہی گہری نیند میں کھو گئی۔

نانی جان نے سب سے پہلے چائے کا مگ بنا کر پیا تاکہ اتنے عرصہ سے چھوڑے ہوئے کاموں کو کرنے کے لیے خود کو جسمانی اور ذہنی طور پر ایکٹو کر سکیں۔ پھر ترتیب وار کاموں میں لگ گئیں۔ راشدہ بطور معاون کام کرتی رہی۔ آخر اس نواسی کو لانے کا مشورہ ان ہی کا تھا۔ اب اس کی عزت بھی تو رکھنی تھی۔

رات کو سب ہی افراد کے آنے سے پہلے کھانا تیار تھا۔ نانی جان نے بہتیری کوشش کی کہ کاشفہ بیگم کے آنے سے پہلے زینا کو اٹھا سکیں مگر وہ ہر بات سے بے خبر سوتی رہی۔

رات کے کھانے کا وقت ہوا تو انہوں نے راشدہ سے کھانا لگانے کو کہا۔

ساڑھے نو بجے اٹھ کر فریش ہو کر وہ نانی جان کی تلاش میں نکلی تو دیکھا تو کھانے کے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ جہاں گھر کے باقی تمام افراد بھی موجود تھے۔ ڈائننگ ٹیبل پر وہ تمام کھانے رکھے ہوئے تھے جن کے بنانے کا آرڈر ملا تھا۔

"آجاؤ زینا بیٹے۔ آؤ کھانا کھاؤ وہاں کیوں کھڑی ہو۔" جمشید صاحب نے اسے دیکھا تو نرمی سے بولے وہ حیرت زدہ سی آگے بڑھی۔ قریب جاکر اسی انداز میں گویا ہوئی۔

"نانی جان یہ سب آپ نے کیا؟" اپنا بھانڈا خود ہی پھوڑ لیا تھا۔ نانی جان سر پکڑ کر رہ گئیں۔

"تو تم کیا سوتی ہی رہی ہو؟" کاشفہ بیگم نے مشکوک نظروں سے نانی اور نواسی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جواباً" اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ چیئر پر بیٹھ گئی۔ اپنے دائیں طرف رکھی خالی کرسی کو حسرت سے دیکھا جو آج بھی خالی تھی۔ عبید حسب معمول آج بھی غائب تھا۔ جنید بھائی اور حبیبہ بھابھی ساتھ ساتھ بیٹھے کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ اگرچہ حبیبہ کے چہرے پر اس وقت رعونت اور اس کے لیے تحقیر آمیز مسکراہٹ تھی۔

"دیکھیں جمشید آج میں نے آپ کی لاڈلی بھانجی سے کہا کہ کھانا پکائی کی رسم کرے اور رات کا کھانا تیار کرنے کو کہا' مگر یہ سوتی رہی۔ اماں جان کو سب کرنا پڑا۔ اتنے سال ہو گئے میں نے اماں جان کو خود اٹھ کر پانی کا گلاس بھی نہیں پینے دیا۔ آج اس کی خاطر اماں جان کو اتنی محنت کرنی پڑی۔"

"تو تم کہاں تھیں۔ خانساماں کدھر ہے جو ایک ہفتے کی دلہن کو تم نے کام سے لگا دیا اور اماں جان کو اتنا کام کرنا پڑا۔" وہ کچھ غصے میں آکر بولے۔

"نہیں۔۔۔ مجھے کچھ شاپنگ کرنی تھی اور خانساماں کو میں نے چھٹی دے دی۔ آخر آپ کی سلیقہ شعار اور گھرداری میں ماہر بھانجی اس گھر میں آئی ہے اسے بھی تو اپنا سگھڑاپا دکھانے کا موقع ملنا چاہیے۔"

"بہو۔۔۔ اس کو نیند بہت آتی ہے۔ فی الحال اس پر اتنا بوجھ نہیں ڈالو۔" نانی جان نے پھر ٹوکا۔

"اچھا تو یہ یہاں نیندیں پوری کرنے آئی ہے۔ ثریا نے سوچا ہو گا نوکروں سے بھرا گھر ہے چلو میری بیٹی آرام سے نیندیں پوری کرے گی۔ کسی مڈل کلاس گھرانے میں یا غیروں میں تو اس کا رشتہ ہونا ہی نہیں تھا ہو بھی جاتا تو اگلے دن ہی فارغ ہو کے بیٹھی ہوتی۔" کاشفہ کا لہجہ ایسا زہر خندہ تھا کہ جمشید صاحب کھانا روک کے غصے سے انہیں دیکھنے لگے۔

"زینا کو نیند زیادہ آتی ہے یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔۔۔ میں کل ہی کسی سائیکاٹرسٹ کی اپائنٹمنٹ لیتا ہوں اس کا چیک اپ وغیرہ کرواتے ہیں جہاں تک کوکنگ کا مسئلہ ہے تو اس کا بہتر حل یہ ہے کاشفہ بیگم کہ آپ خود صبح کا ناشتا بنایا کریں، دوپہر کا کھانا حبیبہ بنائے گی اور رات کا کھانا زینا بنائے گی۔" انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور کھانا شروع کیا۔ اماں جان کے چہرے پر طمانیت بھری چمک ابھری جبکہ باقی سب افراد انہیں گھورنے لگے۔ زینا سر جھکائے پلیٹ میں چمچہ گھماتی رہی۔

"یہ سارے گھریلو مسئلے اب آپ نبٹائیں گے۔ حبیبہ کی طبیعت آپ کے سامنے ہے اتنی گرمی میں وہ کچن میں چولہے پہ کام کرے گی؟" کاشفہ نے بڑی بہو کی حمایت لیتے ہوئے کہا۔ حبیبہ نے مزید منہ لٹکایا۔

"کچن میں اے سی ہے اگر ابھی اس کی طبیعت کا بہانہ ہے تو پہلے کون سا پرابلم تھا۔ دو سال ہوئے آج تک تم نے اسے کوئی کام نہیں کہا۔ زینا کو آئے ہفتہ ہوا اور تمہیں بہو کو کام سے لگانا یاد آگیا۔ اس لیے کہ میری بہن کی بیٹی ہے۔" دوبدو جواب دیتے ہوئے وہ کھانا بھی کھاتے رہے۔

"آپ کی بہن کی بیٹی ہے اس لیے آپ خوامخواہ اس کی حمایت کر رہے ہیں۔ اس کے عیب نظر نہیں آئے۔۔۔ خوبیاں پتا نہیں کون سی دیکھ لیں، کان پک گئے ثریا کی بیٹیوں کی تعریفیں سن سن کر۔ گن تو کوئی نظر نہیں آیا سوائے سونے کے۔۔۔ حبیبہ سے اس کا کیا مقابلہ۔۔۔ وہ نازوں پلی ہے اس کے اپنے گھر میں دس نوکر تھے۔" کاشفہ بیگم پوری طرح لڑائی پر آمادہ تھیں۔

"پاپا اٹ از ناٹ فیئر۔ حبیبہ کی طبیعت فی الحال اسے کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی آپ کو اس طرح کا آرڈر نہیں دینا چاہیے۔" جنید نے بگڑے تیور کے ساتھ اپنی بیگم کو بیچ سے نکالنا چاہا۔

"اچھا بچے پریشان نہیں ہو۔۔۔ ایسے ہی کھانے پر بدمزگی پیدا ہوگئی اب خاموشی سے سب کھانا کھاؤ۔" اماں جان نے پھر مصالحت کی کوشش کی۔

"اونہہ۔۔۔ بزنس چھوڑ کے اب گھرداری سنبھال لیں۔ پتا نہیں کیا جادو چلایا ہے۔۔۔ فساد پھیلا کے اب بدمزگی بھی بری لگ رہی ہے۔" اماں جان اور جمشید صاحب کو قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کاشفہ بیگم نے کہا اور کھانے پر سے اٹھ کر چلتی بنیں۔ زینا اس بگڑے ماحول کا ذمہ دار خود کو سمجھتے ہوئے کسی مجرم کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔

"زینا بیٹے کھانا کھاؤ۔۔۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" جمشید صاحب نے اسے کہا تو وہ چونک کر کھانے کی طرف متوجہ ہوئی۔

"زینا آج تمہاری نیند کی وجہ سے اتنا فائدہ تو ہوا کہ اتنے عرصے بعد ہمیں دادی جان کے ہاتھ کا لذیذ کھانا کھانا نصیب ہوا۔" جنید نے ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کی غرض سے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"واقعی میں دادی جان کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔" حبیبہ نے بھی شوہر کی تائید کی۔ دادی جان پیار سے مسکرادیں۔

☼ ☼ ☼

آدھے سے زیادہ دن سو کر گزارا تھا۔ اب نیند کہاں سے آتی تھی۔ عشا کی نماز پڑھنے کے بعد کافی دیر تک وہ قرآن شریف پڑھتی رہی۔ نماز قرآن پڑھنا ان کے گھر میں سب کی بچپن سے ہی عادت تھی۔ سب ہی بہنیں امی ابو بھائی نماز کے باقاعدگی سے عادی تھے۔ وہ صرف ایسی تھی کہ اگر نیند کا غلبہ طاری ہوجاتا تو کئی نمازیں قضا ہوجاتیں، لیکن نیند کے علاوہ وہ بھی کبھی نماز نہ چھوڑتی تھی۔ ابھی بھی وہ تادیر قرآن پاک پڑھتی رہی۔ پھر قرآن پاک غلاف میں لپیٹ کے واپس رکھا اور وال کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کے ساڑھے گیارہ ہورہے تھے۔ عبید ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ پہلے تو وہ اس وقت تک سو چکی ہوتی تھی یا نانی جان کے کمرے میں ہوتی۔ آج نانی جان روٹین سے بھی جلدی سو گئی تھیں۔ دن بھر کام کرکے تھکی ہوئی تھیں۔ اس نے ان کی ٹانگیں اور پاؤں دبائے۔ اسی دوران وہ گہری نیند میں چلی گئیں۔ پھر وہ اپنے روم میں آگئی۔ آج نماز بھی یہیں پڑھی۔

"نجانے کس وقت آتا ہے، میں کیسی بیوی ہوں اس کے بارے میں کچھ جانتی ہی نہیں۔۔۔ میں تو صرف کاغذی بیوی ہوں اس کی دل سے تو اس نے مجھے تسلیم ہی نہیں کیا۔" یاسیت سے سوچا اور پھر کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہوگئی اس نے اے سی آن نہیں کیا تھا۔ فین چلا کر کمرے کی کھڑکی کھول دی تھی۔ اس وقت باہر سے بھی ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ پہلی تاریخوں کا چاند باریک لکیر کی مانند نظر آرہا تھا۔ ستاروں سے آسمان بھرا ہوا تھا۔ اسے اپنے گھر کا آنگن یاد آیا۔ گرمیوں کے موسم میں کھلے صحن میں سب کی چارپائیاں بچھی ہوتی تھیں۔ بعض اوقات وہ رات کو اٹھ جاتی تو کتنی ہی دیر تاروں بھرے آسمان کو تکتی رہتی۔ اس وقت کتنی تسکین ملتی تھی۔ آسمان، فضا سب اپنے اپنے لگتے تھے۔ تاروں کے جہاں پر غور کرتے کرتے وہ اپنے خوابوں کی دنیا میں چلی جاتی۔ اب تو ساری فضا ہی اجنبی سی لگتی تھی، خواب بھی کہیں کھو سے گئے تھے۔

تقریباً" ڈیڑھ گھنٹے تک وہ وہیں کھڑکی میں بیٹھی رہی، سوچوں میں گم، چونکی تب جب گیٹ سے باہر گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ چوکیدار نے تیزی سے آگے بڑھ کر گیٹ کھولا۔ بلیک کرولا رینگتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ زینا کے دل کی دھڑکن اچانک ہی تیز ہوئی۔ کھڑکی میں سے اٹھ کر وہ صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔

"کیا کروں۔۔۔؟ کھانے کا پوچھوں۔۔۔؟ مگر ماسی تو کہہ رہی تھیں آج کل وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ باہر ہی کھانا کھاتا ہے۔ خوامخواہ کی بدمزگی پیدا ہوگی بات بھی کروں گی تو۔۔۔ وہ تو میری شکل دیکھتے ہی چڑنے لگتا ہے۔ بہتر ہے خاموش ہی رہوں۔۔۔ مگر۔۔۔" اس کے قدموں کی چاپ دروازے کے قریب آئی سنائی دی تو وہ

بلا ارادہ ہی لیٹ گئی۔ یہ ٹھیک ہے۔ کسی بھی قسم کی گفتگو سے۔۔۔ خود کو شاباشی دیتے ہوئے آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے اس نے سونے کی ایکٹنگ کی۔ کسی انگلش سونگ کی دھن پر سیٹی بجاتا ہوا وہ خوش گوار موڈ میں کمرے میں داخل ہوا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر مختلف زاویوں سے خود کو دیکھا۔ رسٹ واچ اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی۔ پھر والٹ اور موبائل نکال کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھے۔

"پینڈو کہیں کی۔ اے سی نہیں آن کر سکی کھڑکی کھول دی۔ مچھر اندر آنے کے لیے۔۔۔" کھڑکی پر نظر پڑتے ہی اس نے بڑبڑاتے ہوئے کھڑکی بند کی پھر اے سی آن کیا۔ آنکھ کی جھری سے وہ اس کی حرکات و سکنات دیکھتی رہی۔ وہ واش روم میں گیا تو زینا نے گہری لمبی سانس آزاد کی۔ اپنے تنتے ہوئے وجود کو بے ساختہ ڈھیلا چھوڑا۔ کروٹ بدلی۔ بہتیری کوشش کی نیند آجائے، مگر نہیں آئی۔۔۔ صوفے پر آرام وہ حالت میں سونا ممکن نہیں تھا۔ اسے ابھی اندازہ ہوا یہ تو اس کی نیند ہی ایسی تھی کہ وہ سنگل کرسی پر سو کر ساری رات گزار سکتی تھی۔ واش روم کا دروازہ کھلا عبید نہا کر باہر نکلا تھا۔ وہ اس وقت ٹراؤزر اور ویسٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ آکر ابھی بیڈ پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے موبائل کی میسج ٹون بجی۔ مسکراتے ہوئے اس نے میسج پڑھا۔ پھر کوئی نمبر پریس کیا۔ بات کسی لڑکی سے ہو رہی تھی لب و لہجے سے فوراً" اندازہ ہو گیا تھا اسے۔۔۔ وہ تقریباً" پندرہ منٹ تک اس کی باتیں سنتی رہی۔

"ایسی باتیں تو کبھی میرے سپنوں کے شہزادے نے بھی مجھ سے نہیں کیں تھی جیسی یہ اپنی گرل فرینڈ سے کر رہا ہے۔۔۔ اف اتنی رومانٹک باتیں۔۔۔ وہ لڑکی کتنی جرات مند اور آزاد خیال ہے، جو ایک غیر لڑکے کے منہ سے ایسی بے باک باتیں مزے سے سن رہی ہے۔ عبید کے انداز سے تو لگ رہا ہے کہ اس کی باتوں سے بہت لطف اندوز ہوا جا رہا ہے۔۔۔" عبید کے خیال میں وہ سو رہی تھی۔ اس لیے وہ بڑی لاپروائی اور بے باکی سے اپنی گرل فرینڈ سے باتوں میں بزی تھا۔

بیڈ پر نیم دراز دایاں پاؤں جھلاتے ہوئے وہ بہت مگن تھا۔ فی الحال کال بند ہونے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے، مگر زینا کے لیے مزید باتیں سننا محال تھا۔ اس کے گال تپنے لگے تھے اور بدن پر کپکپی طاری ہونے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کا بدن واضح طور پر کانپتا۔ اس نے وہاں سے اٹھ جانے میں عافیت سمجھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔۔۔ عبید نے چونک کر اسے دیکھا اس کے چہرے کا رنگ واضح طور پر بدلا تھا۔ زینا نے محسوس کیا وہ بھی حیران سا اسے جاتا دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور اٹھتے پاؤں کی کپکپاہٹ عبید کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں آکر صوفے پر لیٹ گئی کچھ دیر لگی خود کو نارمل کرنے میں، پھر کچھ ہی دیر بعد درود شریف کا ورد کرتے ہوئے وہ سو گئی۔

☼ ☼ ☼

کاشفہ بیگم کے حکم کے مطابق اس نے تین وقت کا کھانا بنانے کی پوری کوشش کی، مگر بمشکل تمام ایک ہی وقت کا کھانا بنا پائی۔ ایک دن دوپہر کا کھانا بنایا، ایک دن ناشتا۔۔۔ باقی کا سارا وقت اس کی نیند کی نذر ہو جاتا یا پھر ادھر ادھر چکرانے میں۔۔۔ کھانا بھی ایسا ہوتا جو بعد میں کھانا محال ہوتا کوئی چیز جل کے بدمزا ہوئی ہوتی۔ کسی کے اندر مسالے کی بہتات اور کوئی بالکل پھیکی۔۔۔ کاشفہ بیگم نے اسپیشلی وہ کھانے اپنے میاں کے حضور پیش کیے تاکہ وہ بھانجی کی خانہ داری میں مہارت ملاحظہ فرما سکیں۔

تیسرے دن ہی وہ خود ہی بری طرح جھنجلا گئیں۔ خانساماں کی یاد بڑی شدت سے آئی۔ فوراً" اسے بلاوا بھیجا، مگر زینا کی کلاس لازمی لی۔

"تمہیں کھانے پکانے نہیں آتے یا پھر تم جان بوجھ کر ایسے بدمزا کھانے بنا رہی ہو تاکہ تمہیں رہائی مل جائے، جو بھی ہے اس گھر میں آگئی ہو اتنی آسانی سے "رہائی" بھی نہیں ملے گی۔ اپنی نیند کچھ کم کرو۔ بہت

دیکھ لیے تمہاری نیند کے ڈرامے۔ کل سے تم خانساماں کے ساتھ کچن میں پورا کام کرواؤگی۔ پورے گھر کی صفائی ستھرائی' سب کے کپڑے دھونا اور دیگر کام اب تمہاری ذمہ داری ہیں۔ راشدہ ہماری مستقل گھریلو ملازمہ ہے وہ تو رہے گی صرف ہمارے چھوٹے موٹے کام نپٹانے کے لیے۔ باقی میں تمام ملازماؤں کی چھٹی کروا رہی ہوں۔ اگر تم نے ذرا سی غفلت اور لاپرواہی سے کام لیا تو۔ تمہاری اس گھر سے چھٹی ہوگی اور اگر تم نے اپنے ماموں کو رو دھو کے دکھایا تو یقین کرو۔ میں یہ گھر چھوڑ کے چلی جاؤں گی پھر اس گھر کی بربادی کی ذمہ دار تم ہوگی۔ پھر عبید تو تمہیں کبھی نہیں معاف کرے گا وہ تو پہلے ہی تم سے اکتایا پھرتا ہے۔" نفرت سے کہتے ہوئے انہوں نے دھمکی بھی لگادی چپ چاپ کھڑی زینا مزید سہم گئی۔

اگلے دن وہ اپنی ڈیوٹیز سنبھالنے کے لیے کمر کس چکی تھی۔ سنا تھا چائے یا کافی پینے سے نیند بھاگتی ہے اور اعصاب ایکٹو ہوجاتے ہیں۔ اس نے خود کو چائے پینے کے لیے تیار کیا۔ ورنہ تو کبھی چائے کے قریب بھی نہ پھٹکی تھی۔ بڑا مگ اوپر تک بھر کر پیا۔ اثر تو واقعی ہی ہوا دو گھنٹوں میں اس نے کافی کام نپٹالیے گھر بھر کی صفائی کے علاوہ چھت کی بھی صفائی کروالی۔ بھلی مانس سی راشدہ ہر ممکن حد تک اس کی مدد کرواتی رہی۔ پھر یہ اس کا معمول بن گیا دن میں تین بار تو لازمی چائے بنا کر پی لیتی۔ اس طرح نیند واقعی ہی کم ہوئی مگر۔ پھر بھی غیر معمولی نیند لینا اپنی جگہ برقرار تھا۔ صبح وہ اٹھتی' دن میں سونے کے علاوہ باقی کے تمام وقت کاموں میں گزر جاتا۔ بعض اوقات کام کرتے کرتے وہ کبھی کچن میں ڈھیر ہوجاتی تو کبھی باہر کار پورچ میں۔

"سب ہی کہتے ہیں نیند کا زیادہ آنا بیماری ہے اور بری عادت ہے' مگر آج کل تو نیند مجھے کسی ممتا بھری آغوش کی مانند لگتی ہے۔ تمام دکھوں' مصیبتوں اور پریشانیوں سے کچھ دیر کے لیے تو جان چھوٹ جاتی ہے۔ سب بے کار کررہی ہوں۔ کوئی فائدہ نہیں ہے نحوست ہے تو دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ باقی سب افراد بات بھی ایسے کرتے ہیں جیسے کسی گھٹیا تعلق سے واسطہ پڑ گیا ہو۔ اک ماموں اور نانی جان۔ نانی جان کی اس گھر میں چلتی نہیں اور ماموں سارا دن باہر۔ میرے لیے یہ اذیت ناک۔ تحقیر آمیز رویے۔ شکر ہے میری پیاری نیند کا جو مجھے کچھ دیر کے لیے تو ان سب باتوں اور برے خیالوں و ہموں سے دور لے جاتی ہے۔" اس دن لان میں پودوں کی تراش کرنے کے بعد صفائی کی پھر لان میں بیٹھے سوچتے سوچتے وہیں دراز ہوکر سوگئی۔ تھوڑی دیر بعد جمشید صاحب کی گاڑی گھر میں داخل ہوئی۔ اسے لان میں میلے کچیلے حلیے میں سوتا دیکھ کر بری طرح چونکے۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن انہوں نے آفس سے چھٹی کی اور زینا کو سائیکاٹرسٹ کے پاس لے کر گئے۔ واپس گھر پہنچے تو لاؤنج میں فقط اماں جان موجود تھیں۔

"کہاں ہیں سب افراد؟" سلام لینے کے بعد اماں جان کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے سرسری سا پوچھا۔

"کاشفہ حبیبہ کو لے کر لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی ہے اس کی طبیعت اچانک ہی خراب ہوگئی اور نادیہ بھی ابھی ابھی باہر نکلی ہے بتا کر نہیں گئی۔" اماں نے بتایا تو وہ چونکے۔

"کیوں حبیبہ کو کیا ہوا جو اچانک جانا پڑ گیا؟" انہوں نے استفسار کیا۔

"بیٹا آخری دن چل رہے ہیں طبیعت اوپر نیچے تو ہوگی نا بس اللہ خیر کا وقت لائے۔ یہ بتاؤ زینا کے بارے میں ڈاکٹر سے کیا بات ہوئی؟" اماں جان نے زینا کو سر تا پا دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اگر اس کو پیدائشی زیادہ سونے کی عادت ہے تو یہ کوئی ایسی بیماری نہیں جس کا میڈیسنز سے یا اس طرح سائیکی طریقے سے علاج ہو۔ عموماً" کچھ لوگ غیر معمولی نیند لینے کے عادی ہوتے ہیں جس طرح ڈپریشن اور ٹینشن میں نیند کم آتی

ہے اسی طرح کچھ لوگ حد سے زیادہ زندگی کے حقائق سے لاپروا ہوتے ہیں۔ بہت سی سنجیدہ باتوں کو سر پہ سوار نہیں کرتے۔ ذہنی طور پر ریلیکس اور بے فکرے ہوتے ہیں ایسے لوگ نارمل لوگوں کی نسبت زیادہ نیند لیتے ہیں۔"

"اچھا تو یہ یونہی رہے گی ساری زندگی؟" وہ فکر انگیز انداز میں گویا ہوئیں۔

"نہیں۔۔ ان شاء اللہ۔۔ نارمل نیند لے گی، مگر یہ اس کی اپنی ول پاور پہ منحصر ہے اس میں ڈاکٹر یا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ بقول ڈاکٹر کے اگر یہ خود اپنی زندگی کا کوئی مقصد بنا لے اور اس میں کوئی جستجو یا کچھ کرنے کی امنگ پیدا ہو جائے تو یہ بڑی آسانی سے اپنی غیر ضروری نیند پر قابو پا سکتی ہے اور میرا خیال ہے یہ جلد ہی اپنا علاج کرلے گی۔" آخری فقرہ انہوں نے زینا کی طرف شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اماں جان کسی سوچ میں پڑ گئیں۔ اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ جمشید صاحب نے آگے بڑھ کر فون ریسیو کیا۔ کاشفہ بیگم تھیں۔

"حبیبہ کو ڈاکٹر نے ایڈمٹ کرلیا ہے۔ آپ بچے کے استعمال کا ضروری سامان اور زینا کو لے کر آجائیں۔ سامان حبیبہ کے بیڈ روم میں بیگ میں پیک ہوا رکھا ہے۔ جنید کو فون کر دیا ہے۔ وہ بھی آرہا ہے۔ آپ نے بعد میں آفس جانا ہوا تو چلے جائیں۔" کاشفہ بیگم نے تیزی سے بات مکمل کی۔

"اوکے۔۔ میں آتا ہوں۔" جمشید صاحب نے کہا اسی وقت فون بند ہو گیا۔ جمشید صاحب صورت حال اماں جان کو بتانے کے بعد زینا کی طرف دیکھا تو وہ اونگھ رہی تھی۔ وہیں صوفے پر بیٹھی بیٹھی۔ وہ سر ہلا کر رہ گئے۔

"بیٹا! راشدہ کو لے جاؤ۔۔ باقی کاشفہ تو وہیں ہے نا۔۔ اسے کاموں وغیرہ کے لیے زینا یا راشدہ ہی درکار ہے۔ یہ تو اب نہیں اٹھے گی۔" اماں جان نے کہا تو جمشید صاحب اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اماں جان نے راشدہ کو آواز دی

اس نے آکر پہلے زینا کو تخت تک پہنچایا جو ٹی وی لاؤنج میں ایک طرف رکھا ہوا تھا پھر حبیبہ کے کمرے کی طرف گئی تاکہ بیگ وہاں سے لے آئے۔

❋ ❋ ❋

حبیبہ نوزائیدہ بیٹے کے ہمراہ اسپتال سے کیا لوٹی گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب ہی خوش تھے۔ حتیٰ کہ عبید بھی ان دنوں گھر میں ٹکنے لگا۔ ننھے منے بھتیجے کے ساتھ کافی وقت گزارتا۔ حبیبہ کا ناز نخرا دو گنا ہو گیا اور زینا کا کام تین گنا بڑھ گیا۔ خانساماں کے ساتھ کچن میں کھانے بنوانے، صفائی ستھرائی، کپڑوں کی دھلائی وغیرہ کے ساتھ اب ننھے منے فہد کے کام بھی اس کے سپرد کر دیے گئے۔ وہ اس کے چھوٹے چھوٹے کام بڑی خوشی سے کرتی، مگر باقی کاموں کے بوجھ نے اس قدر تھکایا ہوا تھا کہ وہ خوشی کو بھی ٹھیک سے محسوس نہ کر پاتی۔ حبیبہ کے میکے والوں میں سے بھی کوئی نہ کوئی آیا رہتا۔ ان کی خاطر مدارت الگ ہوتی۔ باقی رشتے داروں اور ملنے جلنے والے عقیقہ کی تقریب میں ہی مبارک باد دے چکے تھے۔ نیند کو بھگانے کے لیے وہ مختلف ٹوٹکے کرتی جو کسی حد تک اثر دیتے، مگر نیند سے چھٹکارا پانا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ یہ بھی اسے کاشفہ کا احسان لگتا ہے کہ کم از کم اس کا سونا برداشت کر لیتی تھیں۔

"ماں باپ کے گھر میں جتنا سکون پایا۔ فرصت اور راحت کے لمحات انجوائے کیے سسرال گھر میں آکر اتنی ہی شامت آگئی۔ بہنیں ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھیں۔ اماں کی ہر بات پر عمل کرتی تھیں۔ آج اپنے گھروں میں سکھی بھی ہیں۔ ان کے ساتھ اماں کی دعائیں ہیں۔ انہوں نے اماں کو سکھ بھی تو دیا۔ اک میں ہی تھی جو ہر وقت اپنی من مرضی کرتی تھی۔ کبھی اماں کی نصیحتوں پر غور نہیں کیا۔ لگتا ہے یہ مجھے سزا ملی ہے۔" عصر کی نماز پڑھنے کے بعد وہ لان میں آگئی۔ ادھر ادھر ٹہلتے مختلف سوچوں میں گم تھی جب اپنے آس پاس اسے کسی دوسرے کی آمد کا احساس ہوا دیکھا

تو نانی جان تھیں۔

"نانی جان آپ..... آئیں ادھر چیئر پر بیٹھیں۔ چائے بنالاؤں آپ کے لیے۔" آج حبیبہ کچھ دیر کے لیے میکے گئی ہوئی تھی۔ کاشفہ بیگم سو رہی تھیں۔ اس لیے وہ فرصت میں تھی۔ نانی جان کو دیکھا تو مسکرا کر بولی۔

"میں نے راشدہ کو بولا ہے وہ ہم دونوں کے لیے چائے بنا کے لا رہی ہے۔ تم ادھر آکے بیٹھو۔" نانی جان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے حکم کی تعمیل میں فوراً" آکر بیٹھ گئی۔ ماتھے تک اچھی طرح دوپٹا لپیٹے سر جھکائے۔

"بہت افسردہ اور ملول سی لگ رہی ہو کئی دنوں سے....." انہوں نے درد مندانہ انداز میں کہا۔ وہ چونکی۔

"نن..... نہیں نانی جان آپ کو وہم ہوا ہے۔" نظریں چرا کر کہا۔

"ارے نہیں بچی۔ مانا بوڑھے لوگ وہمی ہوتے ہیں' مگر ابھی آنکھیں اتنی بھی کمزور نہیں ہوئیں واضح تصویر کو نہ دیکھ سکیں۔ بیٹا میری بات غور سے سننا..... تمہیں اس گھر میں لانے کی تجویز میری تھی۔ جس کو صرف تمہارے ماموں نے ہنسی خوشی قبول کیا۔ باقی سب نے انکار کیا۔ ہم ماں بیٹے کا خیال تھا کہ ایک اچھی سلجھی ہوئی نیک سیرت بیوی عبید کی زندگی میں آئے گی تو یقیناً" اس کی زندگی میں کچھ مثبت تبدیلیاں آئیں گی کیوں کہ نکاح کے رشتے میں بڑی طاقت ہے۔ بظاہر یہ رشتہ باقی سب رشتوں میں نازک' حساس اور کمزور لگتا ہے' مگر یہ بڑا بااثر رشتہ بھی ہے۔ جو دو انسانوں کی زندگی کو ایک دوسرے کے مطابق گزارنے پر اکساتا ہے اور ایک دوسرے کا پابند بنا دیتا ہے۔ انسان بڑا ناشکرا ہے۔ اللہ نے انسان کو ہزاروں' کروڑوں نعمتوں سے نوازا' مگر وہ شکر نہیں کرتا۔ مزید کی تلاش میں حاصل شدہ نعمتوں کی قدر کرنا تو دور کی بات..... وہ جانتا بھی نہیں اسے کیا کچھ عطا کیا گیا ہے۔

مگر ناشکرا انسان غرض' لالچ' حرص اور تنفر کی میل اتار کر دل میں جھانکے تو احساس ہو۔ دل میں اتنی وسعت اور گنجائش ہے۔ ہر چیز رب کی عطا کردہ ہوتی ہے اس کا نہ تو کوئی توڑ ہوتا ہے نہ ہی مول۔ نکاح کے رشتے میں بہت برکت' عزت اور محبت ہے۔ اگر اس پر غور کیا جائے' مگر لگتا ہے تم دونوں میاں بیوی نے نکاح کو ایک رسم کی طرح ادا کیا ہے' پھر بھول گئے۔ نکاح کی حقیقت کیا ہے؟ مانا کہ عبید نے تم پر توجہ نہیں دی وہ راضی بھی نہیں تھا' مگر وہ مرد ہے۔ مرد کی فطرت کو باندھا نہیں جا سکتا۔ اسے باہر ایک نہیں ہزار عورتیں مل سکتی ہیں' مگر تم اس کی شرعی' قانونی' جائز بیوی ہو۔ تم میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ کمی ہے تو صرف شعور کی..... تمہیں شعور نہیں اپنے شوہر کو کس طرح اپنا بناتا ہے۔ تم نے کبھی سوچا اس گھر میں تمہاری حیثیت کیا ہے؟ تم اس گھر کی بہو ہو' مگر عزت ملازمہ جتنی بھی نہیں ملی۔ کیوں کہ تم شوہر کے دل سے دور ہو۔

تمہارے سامنے حبیبہ کی مثال ہے وہ بھی اس گھر کی بہو ہے۔ آج تک اس نے پانی خود اٹھ کر نہیں پیا اس کا راج ہے اس وجہ سے نہیں کہ وہ امیر خاندان سے ہے صرف اس وجہ سے کہ شوہر کے من کو بھا گئی ہے۔ نہ شوہر کو اچھی لگتی تو اربوں کھربوں دے کر بھی شوہر کا دل نہ خرید سکتی۔ اس نے محبت سے شوہر کو اپنا بنایا تو آج راج کر رہی ہے ہر چیز اپنے مقام پر اچھی لگتی ہے۔ تمہارا اس گھر میں واضح مقام ہے اور تمہیں اسی مقام پر ہونا چاہیے۔ ٹھیک ہے گھرداری کرنا' ہر ایک کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا..... مگر یہ سب کام اپنے مقام پر رہ کر کرو گی تو بہت وقار اور عزت پاؤ گی۔

بیٹا تم پڑھی لکھی ہو۔ آج کل کی لڑکیاں تو اتنی ہوشیار ہوتی ہیں۔ خوب صورت ہو' اک نیند لینے کی عادت بری ہے۔ باقی تو تم میں کچھ کمی نہیں۔ دیکھو اگر تم عبید کا دل نہ جیت سکی تو بہت بڑی ناکامی ہوگی تمہاری..... وہ کسی دوسری عورت میں دلچسپی لیتا ہے سب سے پہلے اس کا دھیان اپنی طرف کرواؤ۔ تمہارے ہوتے ہوئے وہ کیوں غیر عورت میں دلچسپی

لے اور کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آتا تو کلام پاک سے مدد لو۔۔۔ کوئی وظیفہ وغیرہ کرو۔ میرے پاس ہیں کچھ وظیفے ابھی شام کو میرے کمرے میں آئی ہو تو دیتی ہوں تمہیں۔۔۔" راشدہ چائے اور بسکٹ لیے آئی تو نانی جان خاموش ہو گئیں۔ چائے ان کے سامنے ٹیبل پر رکھنے بعد وہ خود بھی وہیں نیچے گھاس پر بیٹھ گئی۔ نانی جان بات جاری نہ کر سکیں۔ زینا خاموش بیٹھی ان کی بتائی گئی باتوں پر غور کرنے لگی۔ راشدہ اپنی باتیں شروع کر چکی تھی۔

✲ ✲ ✲

رات کو تقریباً" پونے گیارہ بجے وہ بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ دیکھا تو عبید خلاف معمول آج پہلے سے بیڈ روم میں موجود تھا۔ بیڈ پر لیپ ٹاپ لیے بیٹھا ہوا تھا۔ اس پر ایک بے زار کن سی نظر ڈالنے کے بعد دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ زینا خاموشی سے اپنے صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔ نماز پڑھ کر آئی تھی۔ تسبیح بے خیالی میں ہاتھ میں رہ گئی۔ عبید بیڈ پر اس رخ سے بیٹھا ہوا تھا کہ زینا کی طرف پشت تھی اس نے اس کی پشت کی طرف دیکھا پھر اس کی گردن پر نظر پڑی۔ نانی جان کا بتایا ہوا وظیفہ ذہن میں آیا۔ یہ وظیفہ دوسری غیر عورت کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے تھا۔ جو پڑھ کر گردن کے پچھلے حصے میں پھونک مارنی تھی۔

"یہ بہترین موقع ہے زینا۔ رب نے جلد ہی مدد کردی۔ تسبیح بھی پاس ہے اور بندہ بھی اس رخ پہ بیٹھا ہے کہ پھونک مارنی آسان ہوگی۔ کلام پاک میں بہت اثر ہے اور جائز خواہش کے حصول کے لیے وظیفہ کرنا جائز اور برحق ہے۔" سوچتے ہوئے اس نے وظیفہ شروع کیا جو اتنا بھی چھوٹا نہ تھا۔ آدھا گھنٹہ لگا مکمل کرنے میں اوپر سے عبید کے دیکھ لینے کا خوف اے سی میں بھی ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ شکر تھا کہ وہ فیس بک پر ہی پوری طرح مگن تھا۔ کارپٹ پر انتہائی آہستگی سے قدم رکھتی وہ اس کے قریب ہوئی تین بار پھونک مارنی تھی۔ ابھی پہلی پھونک ہی ماری تھی کہ وہ چونک کر مڑا۔ حیرت سے اسے دیکھا۔ زینا کا رنگ متغیر ہو گیا۔

"دماغ ہل گیا کیا۔۔۔ پھونکیں کیوں مار رہی ہو؟" ناگواری سے پوچھا گیا۔

"وہ۔۔۔ میں۔۔۔ مم۔۔۔ مچھر بھگا رہی تھی۔ آپ کی گردن پر مچھر بیٹھا ہوا تھا۔" ہکلاتے ہوئے بروقت بہانہ بنایا۔

"جاہل پینڈو جب روزانہ کھڑکی کھلی چھوڑو گی تو مچھر تو آئے گا ہی۔" غصے سے کہتے ہوئے اس نے مچھر کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں جو اس کی نظر میں نہ آسکا پھر لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ زینا احساس شکستگی لیے ہوئے واپس اپنے "ٹھکانے" پر آگئی۔

"اتنی دیر لگا کر وظیفہ پڑھا کیا فائدہ ہوا؟ پھونک تو ڈھنگ سے ماری نہیں گئی۔ چلو خیر ابھی سوئے گا تو پھر پھونک مار دوں گی۔" سوچتے ہوئے وہ صوفے پر دراز ہو گئی اس سے پہلے کہ وہ سوتا وہ خود نیند میں ڈوب گئی۔

✲ ✲ ✲

"کیا کسی عذاب کی طرح سر پہ مسلط ہو گئی ہے پینڈو۔ تمہیں پتا ہے اس وقت تم "جمشید عباسی" کی بہو کے درجے پر فائز ہو۔ ویسے تو سارے مشورے دادی جان سے لیتی ہو۔ ان کے ساتھ بازار جا کر اپنے لیے کپڑے بھی لے لیتی۔ میرا قیمتی وقت لازمی برباد کرنا تھا خود ہی شوق ہے گھسے پٹے کپڑے پہننے کا اور ذلیل دوسروں کو کروانے کا۔" تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے بے حد بے زار انداز میں وہ بڑبڑا بھی رہا تھا اور مڑ میں سے گاہے بگاہے غصیلی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

"نانی جان تو کہتی ہیں یہ بالکل فارغ رہتا ہے پھر میں نے اس کا کون سا قیمتی وقت ضائع کر دیا؟" وہ پریشان سی سوچ رہی تھی۔

"اترو۔۔۔ محترمہ۔۔۔!" شاپنگ پلازہ کے سامنے گاڑی روک کر وہ بے دلی سے باہر آیا اور گاڑی کا پچھلا

دروازہ کھولتے ہوئے کھا جانے والے انداز میں بولا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔ وہ ابھی چند قدم ہی چلے تھے جب عبید اچانک رک گیا۔

"ہائے روحی۔۔۔" سامنے سے آتی شاپنگ بیگز اٹھائے ایک ماڈرن سی لڑکی کو دیکھتے ہوئے وہ انتہائی خوش گواری سے بولا۔ بے زاری اور چڑچڑا پن لمحہ بھر میں ہوا ہو گیا۔ زینا نے چونک کر لڑکی کی طرف دیکھا نام سنا سنا سا لگ رہا تھا۔

"یہ تو وہی ہے شاید جس سے اس رات عبید باتیں کر رہا تھا بے ہودہ سی۔۔۔" زینا کے ذہن میں جھپا کا ہوا۔ اس نے بغور لڑکی کی طرف دیکھا۔ ٹائٹ جینز کے ساتھ ریڈ کلر کی شارٹ ٹائٹ شرٹ میں ملبوس' اس کا لباس اس کے وجود کے ایک ایک حصے کو نمایاں کر رہا تھا۔ پاؤں میں پنسل ہیل والے ریڈ شوز تھے۔ رنگت سفید تھی' مگر زینا کی رنگت کے سامنے ماند پڑ رہی تھی۔ شولڈر تک آتے بالوں کی رنگت ہلکی براؤن تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ عبید سے مسکرا کر باتیں کرتی وہ بے حد کانفیڈنٹ لگ رہی تھی۔

"کیا کبھی میں بھی اس طرح عبید سے بات کر سکوں گی؟" اس نے حسرت سے سوچا۔

"یہ ملازمہ تمہارے ساتھ ہے؟" روحی نے شاید ابھی اس کی طرف دھیان دیا تھا کچھ چونک کر بولی تھی۔

"ہوں۔ یہ وہی مصیبت ہے جو پاپا نے میرے سر منڈھی ہے میرا امتحان لینے کو۔ ابھی آرڈر ملا اسے شاپنگ کروانے کا۔" عبید نے بے دلی سے جواب دیا۔ روحی اب اسے گھورنے لگی تھی۔ زینا کچھ کنفیوژ ہوئی۔ بے حد گوری رنگت۔۔۔ منفرد سے تیکھے نقوش بغیر میک اپ کے بالکل بے ریا شفاف چہرہ' آنکھوں میں معصومیت کی جھلک' کھڑے ہونے کا باوقار انداز۔۔۔ صرف کپڑے ایسے تھے جن کی وجہ سے وہ اسے ملازمہ لگی۔

"یہ لڑکی تو خاصی "چیز" لگتی ہے' مگر شاید ابھی اپنی ذات میں موجود "ہتھیاروں" سے بے خبر ہے۔ یہ تو میرے لیے بھی آزمائش ہے۔" روحی نے بلا اختیار سوچا۔

"او کے۔۔۔ تم لوگ شاپنگ کرو۔۔۔ میری شاپنگ تو ہو چکی میں چلتی ہوں۔" روحی نے مسکرا کر کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بظاہر پرسکون تھی مگر اندر سے مضطرب ہو چکی تھی۔

"یہ دوپٹا اوڑھنے اور ڈھیلے ڈھالے لباس پہننے والیاں سیدھی سادی لڑکیاں اندر سے بڑی گھنی ہوتی ہیں مجھے اس معاملے کو سیریسلی لینا چاہیے۔" روڈ پر گاڑی چلاتے ہوئے وہ سوچ میں گم تھی۔

گھر جا کر بھی اتنی بے چینی ہوئی کہ شوق سے خریدی ہوئی چیزیں نکالے بنا ہی الماری میں رکھ دیں۔ کچھ گھنٹے سوچ بچار میں گزارنے کے بعد شام کے وقت اس نے عبید کو فون کیا۔

"کیا ہو رہا ہے۔۔۔؟ بیگم کو شاپنگ کروائی گیا۔" چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اف۔۔۔ کیوں منہ کا ذائقہ کڑوا کرتی ہو اس جاہل کو میری بیگم کہہ کر۔ اس کی شاپنگ تو پندرہ منٹ میں ہو گئی تھی جلد ہی جان چھوڑ دی۔" عبید کچھ تحقیر آمیز انداز میں بولا۔

"جو بھی ہے۔۔۔ تمہارا اس سے قانونی اور شرعی رشتہ ہے۔ وہ تمہاری بیگم ہے بیگم ہی کہوں گی۔" وہ سابقہ انداز میں بولی۔

"ہاں ہے۔۔۔ مگر وقتی ہے۔۔۔" عبید سنجیدگی سے بولا۔

"میں وقتی ہوں یا وہ۔۔۔؟" عبید کو اس کے لہجے کی کرواہٹ محسوس ہوئی۔

"تم وقتی نہیں ہو روحی میں تمام زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔" وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔

"تو پھر انتظار کس بات کا۔۔۔؟ میرا آج کل ایک رشتہ آیا ہوا ہے کوئی ڈاکٹر ہے ممی کچھ کچھ راضی ہیں۔ اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو زینا کو جلد فارغ کرو اور مجھ سے شادی کے لیے اپنے فادر کو مناؤ ورنہ پانی سر سے گزر گیا تو پچھتاؤ گے۔ جب تک تم کوئی حتمی فیصلہ

نہیں کر لیتے میں تم سے رابطہ نہیں کروں گی۔۔۔ اوکے۔۔۔ بائے۔۔۔" دھمکی آمیز انداز میں کہنے کے بعد اس نے موبائل آف کر دیا۔ عبید کو گہری سوچ میں ڈال کر وہ خود ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"چڑیل، کم ذات، کمینی۔۔۔ معصنی میں پتا نہیں کیا نظر آ گیا جناب کو؟" نادیہ غصے میں کھولتی اور بڑبڑاتی ہوئی ٹی وی لاؤنج میں انٹر ہوئی۔ ٹی وی دیکھتیں کاشفہ بیگم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا نادیہ۔۔۔ کس بات پر غصہ آ رہا ہے۔ ادھر آؤ بھلا بتاؤ مجھے۔" وہ فکر مندی سے گویا ہوئیں۔

"مما آپ کو کیا پروا آپ کو تو مفت کی ایک نوکرانی سی ملازمہ مل گئی ہے۔ جسے پیسے بھی نہیں دینے پڑتے مگر وہ میرے لیے کتنی بڑی مصیبت بن رہی ہے آپ کو کیا احساس؟" ان کے نزدیک صوفے پر بیٹھتے ہوئے شکایتی انداز میں بولی۔

"کون کس کے بارے میں بات کر رہی ہو؟" ٹی وی کا والیوم کم کرتے ہوئے وہ متعجب انداز میں بولیں۔

"وہی چڑیل زینا اور کون بھلا؟" نادیہ نے مزید منہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟" کاشفہ کے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات ابھرے۔

"وہ جعفر ہے نا بڑا متاثر ہوا پھرتا ہے اس سے۔ ایک دو بار اسے نماز پڑھتے دیکھ لیا اور پھر کام کرتے۔۔۔ مجھے کہتا ہے نادیہ میرا دل چاہتا ہے کہ تم اپنی بھابھی زینا جیسی ہو جاؤ۔ اسی کی طرح کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنو، اسی کی طرح گھریلو اور سگھڑ ہو جاؤ، اسی کی طرح نماز کی پابند ہو جاؤ اور بھی بڑی تعریفیں کر رہا تھا۔ میرا تو پارہ چڑھ گیا۔ پاپا سمیت سب کو اس میں خوبیاں ہی نظر آتی ہیں۔ اس کی گم صم چال ڈھال اور وقت بے وقت سونا کسی کو نظر نہیں آتا۔ اب بھی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہیں۔ پانچ مہینے ہو چلے ابھی تک نکمی ہوئی ہے۔ عبید تو اسے منہ بھی نہیں لگاتا پھر نا جانے کیوں اسے رکھا ہوا ہے۔ اپنے شوہر پر وار نہیں چلا تو دوسروں پہ نظر رکھ لی ہے۔" نادیہ اس وقت مکمل غصے کی حالت میں تھی۔

"جعفر اتنا دقیانوسی لگتا تو نہیں مجھے تو اس کی نیت ہی ٹھیک نہیں لگ رہی۔" کاشفہ بیگم وہمی سے انداز میں گویا ہوئیں۔

"اونہہ۔۔۔ یہ مرد تو ہوتے ہی عجیب ہیں۔ پتا نہیں ان کے کتنے پرت ہوتے ہیں۔" نادیہ بے زار سے لہجے میں بولی۔ اس وقت سیڑھیوں پر عبید آتا دکھائی دیا۔ وہ دونوں اسے دیکھنے لگیں۔

"مما اس مصیبت نے کب جانا ہے یہاں سے؟" لاؤنج میں آتے ہی وہ بے حد بے زاری سے گویا ہوا۔

"تم بھی زینا کے بارے میں کہہ رہے ہو؟" کاشفہ نے تصدیق چاہی۔

"جی اور کون مصیبت ہے اس وقت گھر میں۔ پلیز مما اب اس ڈرامے کا اینڈ ہو جانا چاہیے۔ مجھے بھی زندگی کھل کے جینے کا حق دے دیں۔"

"تم اسے ڈائیورس دے دو خود ہی دفع ہو جائے گی۔" نادیہ تیکھے پن سے بولی۔

"میں تو شادی ہی نہ کرتا اگر فورس نہ کیا جاتا۔۔۔ مما آپ ہی تو کہتی تھیں کہ وہ مجبور ہو کے خود ہی بھاگ نکلے گی ابھی تک تو ایسے آثار نظر نہیں آتے۔" عبید نادیہ سے بھی زیادہ تلخ لہجے میں بولا۔

"کیا کروں تمہارے پاپا کے خاندان میں رواج ہے کہ لڑکیاں شادی ہو جانے کے بعد میکے سے بہت کم ملنا جلنا رکھتی ہیں اور سسرال میں ہر ممکن حد تک ایڈجسٹ ہونے کی تگ و دو کرتی ہیں یہ تو میری وجہ سے سعدیہ اور حبیبہ اس اصول سے ہٹ کر چل رہی ہیں۔ تمہاری دادی کی ساری پلاننگ تھی۔ وہ اپنے دقیانوسی اصولوں کے مطابق ہی چلنا چاہتی ہیں۔ اسی لیے تو اسے بیاہ لائیں۔۔۔ وہ بھی ایسی، جسے حقائق کی پروا ہی نہیں۔۔۔ نیند پوری کرنے کو جگہ مل جائے یہ ہی کافی ہے اس کے لیے۔"

"تو آپ کا مطلب ہے مجھے یہ سزا ساری زندگی

بھگتنی ہے۔" ان کی بات ختم ہوتے ہی عبید ترش لہجے میں بولا۔

"نہیں... میں کچھ کرتی ہوں... اب کوئی نا کوئی حل تو نکالنا ہی پڑے گا۔ تم پریشان نہیں ہو۔" گہری سانس خارج کرتے ہوئے کاشفہ نے بیٹے کو تسلی دی۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے؟ کیوں کمرے میں ادھر ادھر چکراتی پھر رہی ہو! سکون سے لیٹ کیوں نہیں جاتی ہو؟" جمشید صاحب نے کتاب پر سے نظریں ہٹا کر مضطرب سی کاشفہ بیگم کو الجھن آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سارے گھر کو پریشانی میں ڈال کر آپ سکون دیکھنا چاہتے ہیں؟" وہ تندی سے کہتے ہوئے بیڈ کی پائنتی پہ بیٹھ گئیں۔

"کیوں ایسا کیا ہو گیا؟" وہ عینک اتارتے ہوئے بولے۔

"بچوں کو بلیک میل کر کے انہیں جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکیاں دے کر اپنی بات منوانا کہاں کی دانش مندی ہے۔ شادی زندگی بھر کے لیے فیصلہ ہوتا ہے۔ جب دل ہی راضی نا ہوں کوئی خوش ہی نا ہو تو کیا فائدہ ایسے پھیکے، بے رنگ رشتے بنانے کا۔ آپ کا خیال تھا کہ زینا اس گھر کے ماحول میں تبدیلیاں لائیں گی۔ وہ تو بچپن سے لے کر آج تک اپنی ذات میں تبدیلی نہیں لا سکی۔ اس نے اس گھر کے ماحول میں کیا تبدیلی لانی ہے۔ اور جو تبدیلی آپ چاہتے ہیں وہ جادو کی چھڑی گھمادینے سے نہیں آئے گی۔ زمانے کے ساتھ چلنا کوئی ایسی برائی نہیں کہ اپنی اولاد کی زندگی ہی اجیرن کر دی جائے۔ عبید اگر غلط قسم کی حرکات میں پڑ گیا تو کیا ہوا۔ پیار سے سمجھا سکتے تھے۔ اس کے گلے میں زینا نامی گھنٹی باندھنا ضروری تو نہیں تھا۔ میرا بچہ گھٹ گھٹ کے زندگی گزار رہا ہے۔ مگر آپ کو کیا فکر۔ آپ کو تو اپنے دقیانوسی اصول لاگو کرنے ہیں۔" کاشفہ بیگم تو جیسے پھٹ ہی پڑیں۔ جمشید صاحب جواباً

خاموش رہے۔ کسی سوچ میں گم۔

☼ ☼ ☼

"اے اٹھ کم ذات کمینی۔ اجڈ جاہل۔ نیندیں ہی پوری کرنی تھیں تو ماں کے گھر میں کر لیتی۔ سسرال کے لیے وبال جان ضرور بننا تھا تو نے۔"

غصے اور نفرت سے بولتے ہوئے کاشفہ بیگم نے بے سدھ سوئی زینا کو پاؤں سے زور سے ٹھوکر ماری۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ اطراف میں دیکھا۔ اسٹور روم کی صفائی کرتے کرتے وہ وہیں ڈھیر ہو گئی تھی۔ صفائی ابھی نامکمل تھی۔ مگر اس وقت کاشفہ بیگم کے تیور صرف صفائی نامکمل ہونے کی وجہ سے بگڑے ہوئے نہیں لگ رہے تھے۔ بلکہ وہ کسی اور وجہ سے بھری ہوئی لگ رہی تھیں۔

"میں ابھی صفائی مکمل کرتی ہوں۔ مگر پہلے میں چائے پی لوں۔ میری نیند بھاگ جائے تو ہی...۔" وہ ابھی بات مکمل بھی نا کر پائی تھی کہ کاشفہ بیگم نے وہیں رکھا جھاڑو اٹھا کر اندھا دھند اسے مارنا شروع کر دیا۔

"بڑی نیک پروین بنی پھرتی ہو۔ پہلے میرے گھر میں تیری وجہ سے خرابی پیدا ہوئی اب میری بیٹی کی خوشیاں غارت ہونے لگیں۔ دفع ہو جا۔ دور ہو جا ہماری نظروں کے سامنے سے۔" شدید غصے کی حالت میں بولتے ہوئے وہ اسے تب تک مارتی رہیں جب تک خود تھک نہیں گئیں۔ زینا اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ وہ چاہنے کے باوجود خود کو مار سے بچا نا سکی۔ جھاڑو ایک طرف پھینک کر وہ کمرے سے باہر نکلنے کے لیے مڑیں۔ دیکھا تو نانی جان سمیت حبیبہ بھی وہیں کھڑی تھی۔ بے حد ششدر اور پریشان اماں بی کے چہرے پر جامد سی کیفیت تھی۔ کاشفہ بیگم ان دونوں کو اگنور کرتی وہاں سے چلی گئیں۔

نفرت، حقارت، طنزیہ جملے، تضحیک آمیز رویے اس گھر میں آنے کے بعد اس نے سب برداشت کیا تھا۔ کسی سے شکوہ نہیں کیا تھا۔ نا ہی آنسو بہائے تھے۔ مگر آج برداشت ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ ہمت و

حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ نانی جان کی گود میں سر رکھ کر وہ سسک سسک کر روئی تھی۔ خوب رو چکی تو ان کی ہدایت پر اٹھ کر نہائی۔ پھر ان ہی کے بیڈ پر ان کی گود میں سر رکھے رکھے سو گئی۔

"میں نے کیا حماقت کر دی۔ کیوں جمشید کو مشورہ دے بیٹھی میرا تو کچھ نہیں بگڑا مگر اس معصوم بے قصور بچی کی زندگی خراب ہو گئی۔ مجھے کہاں اندازہ تھا کہ کاشفہ دل کی اتنی سخت اور بے لچک ہو گی۔" اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے نانی جان غمزدہ سی سوچ رہی تھیں۔ اسی وقت ان کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ ثریا کا نمبر دیکھ کر ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ مگر خود پر قابو پا کر انہوں نے ثریا سے نارمل لہجے میں بات کی۔

"اماں زینا کیسی ہے؟" چند ابتدائی باتوں کے بعد ثریا نے بے تابی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی سوئی ہے۔ میرے قریب ہی ہے۔ ثریا ٹائم نکال کے آجا۔ جب سے شادی ہوئی ہے زینا کی ایک بار بھی نہیں آئی تو؟ آ کے بچی کو مل ہی جا۔" انہوں نے کہا تو ثریا کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولیں۔

"جی اماں۔ کچھ دنوں سے میں بھی سوچ رہی تھی کہ یا اسے بلوالوں یا خود جا کے مل آؤں۔ آج ابھی دوپہر میں آنکھ لگی تو خواب میں زینا کو روتے ہوئے دیکھا۔ بڑی پریشان ہوئی تو فون کر لیا۔" ثریا نے فون کرنے کی وجہ بتائی۔ اماں جان چند ثانیے خاموش رہ گئیں۔ بیٹیاں دکھ نا بھی بتائیں تو بھی ماؤں کے حساس دلوں کو خبر ہو جاتی ہے۔ انہوں نے دل میں سوچا مگر زبان سے بیٹی کو تسلی دی۔

"ارے بس ماں کا دل وہمی ہوتا ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں آجاؤ کچھ دنوں تک۔"

"ہاں۔ کوشش کرتی ہوں۔ زینا کو اب سمجھایا کریں۔ اتنا نا سویا کرے اگر ماموں کا گھر ہے پھر بھی سسرال تو ہے نا۔"

"سمجھ جائے گی آہستہ آہستہ حالات خود ہی سب سمجھا لیتے ہیں۔" اماں جان نے جواباً کہا۔ پھر بات کا رخ بدل دیا۔

☆ ☆ ☆

"عبید مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔"

وہ دونوں اس وقت عدنان کے گھر کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شام کی چائے کے لوازمات کے ہمراہ۔

"ہوں۔" اس نے ہوں کہنے پر ہی اکتفا کیا۔

"دو دن پہلے جب میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر گیا تھا۔ میں گھر کے اندر تو نہیں گیا تھا باہر گاڑی میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔" عدنان لحہ بھر کو رکا۔

"تو!" عبید پوری طرح متوجہ ہوا۔ "تو وہاں گیٹ پر ایک لڑکی صفائی کر رہی تھی۔ وائپر مار رہی تھی۔ وہی جو بے حد گوری سی تھی۔ شاید تمہارے گھر کی ملازمہ تھی۔" عدنان نے کہا تو عبید کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اس دن اسے گھر سے ایک ضروری سی ڈی لینی تھی۔ عدنان اس کے ساتھ تھا۔ جونہی اس نے گاڑی گھر کے سامنے روکی سامنے زینا گیٹ سے باہر پانی مار کر وائپر سے صفائی کرتی نظر آئی۔ عدنان گاڑی میں اس کے ساتھ تھا۔ فرنٹ سیٹ پر وہ اسے وہیں چھوڑ کر گھر کے اندر گیا تھا۔ کار پورچ بھی دھلا ہوا تھا۔ اس وقت وہ تو زینا کو مکمل نظر انداز کر گیا تھا مگر عدنان نا کر سکا۔

اس نے پر تجسس انداز میں عدنان کی طرف دیکھا۔ عدنان نے توقف سے پھر بات شروع کی۔

"یار وہ لڑکی کتنی منفرد سی نظر آتی ہے۔ دیکھنے میں تو غیر شادی شدہ ہی لگ رہی تھی۔ پلیز تم کس طرح اس سے میری "میٹنگ" کروا دو۔" عدنان پر شوق انداز میں کہہ رہا تھا۔ عبید کے جبڑے بھینچ گئے۔ چاہنے کے باوجود وہ کچھ نا بول سکا۔ زبان گنگ سی محسوس ہوئی۔

"شٹ اپ عدنان وہ لڑکی میری منکوحہ ہے۔" برداشت اچانک ہی ساتھ چھوڑ گئی تو وہ بے ساختہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ عدنان اس سے بھی زیادہ شاکڈ ہوا۔

"واٹ۔ تمہارا نکاح کب ہوا۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بے یقینی سے بولا۔

”کچھ ماہ قبل ہوا۔ میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔“ برفیلے انداز میں کہہ کر اس نے ناگواری سی نظر عدنان پر ڈالی اور وہاں سے چل دیا۔

اپنی کیفیت اور ردعمل پر وہ خود بھی حیران تھا۔ اس کے اندر کے پوزیسیو اور کٹیلے مرد نے اچانک ہی انگڑائی لی تھی۔ وہ بہت ہی مضطرب سا گاڑی چلا رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل روحی کے رویے پر کڑھ رہا تھا مگر اب منتشر ذہن میں صرف زینا آ رہی تھی۔

”میری منکوحہ۔ ایک ملازمہ۔ یہ کیسا موڑ ہے زندگی میں۔ جس سے کوئی جائز ناطہ نہیں وہ حواس پر سوار ہے اور جس سے رشتہ ہے اس کی خبر نہیں۔“ اس نے بے چینی سے سوچا۔

☆ ☆ ☆

سب کو ناشتا کروا دینے کے بعد وہ کچن میں کھڑی برتن دھو رہی تھی جب زوردار چکر آیا۔ چاہنے کے باوجود وہ سنبھل نا سکی۔ اور زمین بوس ہو گئی۔ کل جھاڑو سے پٹنے کے بعد اعصابی تناؤ اتنا بڑھا تھا کہ بخار نے گھیر لیا تھا صبح نانی جان نے سختی سے منع کیا مزید کوئی بھی کام کرنے سے مگر وہ کسی اور تلخی سے بچنے کے لیے ان کے منع کرنے کے باوجود ناشتا بنانے چلی گئی۔ مگر بخار اور ذہنی دباؤ نے اس قدر مجبور کیا کہ وہ اپنے ہوش ہی کھو بیٹھی۔ راشدہ کسی کام سے کچن میں آئی اسے دیکھا تو شور مچا دیا۔ کچھ ہی دیر میں گھر میں موجود سب ہی افراد اکٹھے ہو گئے۔ جمشید صاحب اور جنید آفس جا چکے تھے۔ عبید رات کو دیر سے سویا تھا سو ابھی ابھی اٹھ کے آیا تھا۔

”ڈرامے باز، مکار اب یہ تماشے شروع کر دیے۔ نیند تو پہلے ہی کافی تھی اب بے ہوش بھی ہونے لگی۔ جگا کے دیکھو کہیں سو نا گئی ہو۔“ کاشفہ بے حد ناگواری سے بولیں۔

”بی بی جی میں پہلے سمجھی سو گئی ہیں۔ مگر پھر غور کیا تو لگا یہ گری ہیں۔ ہلایا جلایا۔ تو بھی نہیں اٹھیں۔ اس لیے شور مچایا۔“ راشدہ نے جیسے اپنی صفائی دی۔

”بس کرو بہو، بہت ہو گئی بچی کے ساتھ۔ تم تو اس کی جان کے درپے ہو گئی ہو۔“ اماں جان غصے میں آ کر بولیں۔

”اونہہ بڑی آئی تھی تبدیلیاں لانے کے لیے۔“ کاشفہ نے حقارت سے کہا اور وہاں سے چلی گئیں۔ عبید آگے بڑھا اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ تپتا گرم ماتھا۔

”دادی جان اسے تو تیز بخار بھی ہے۔“ وہ بے ساختہ بولا۔ پھر اس نے خود ہی اسے اٹھایا۔ اور اٹھا کر گاڑی کی طرف آ گیا۔

”تمہیں کیا مصیبت پڑی ہے۔ دفع کرو۔“ نادیہ اس کے قریب آ کر بولی۔

”انسانیت بھی کوئی چیز ہے نادیہ۔“ اس نے درشتگی سے کہا۔ حبیبہ نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اس نے اسے اندر ڈالا۔ دادی جان کو ساتھ فرنٹ سیٹ پر بٹھایا اور اسپتال کا رخ کیا۔

اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ ٹریٹمنٹ کے بعد شام کو اسے گھر جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ ڈاکٹر کی بتائی گئی تمام میڈیسنز اس نے میڈیکل اسٹور سے لے کر دادی کے سپرد کیں۔ گھر آ کر وہ دادی جان کے کمرے میں ہی ان کے بیڈ پر لیٹ گئی۔ اسے گھر آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی جب ثریا کی آمد ہوئی۔ بیٹی کی حالت دیکھ کر وہ خاصی حیران ہوئی۔

☆ ☆ ☆

”ثریا تم نے تو سوچا ہوگا۔ امیر کبیر گھرانے میں جا رہی ہے میری بیٹی خوب عیش کرے گی مزے سے نیندیں پوری کرے گی۔ مگر یہ بات بھول گئی کہ امیر گھروں میں رہنے والوں کے اپنے بھی کچھ خواب ہوتے ہیں۔ مانا کہ پانچ بیٹیوں کا بوجھ ہے تمہارے کاندھوں پر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی حیثیت سے اونچا اڑنا شروع کر دو۔ اپنے جیسوں میں ہی رشتے ناطے کرنے چاہیے۔“ کاشفہ بیگم ثریا کو بھی طنزیہ باتیں کرنے سے باز نہ آئیں۔ ثریا جو اماں بی کی زبانی سب

سن چکی تھیں۔ بھابھی کی اس بات پر مزید رنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں۔

"بھابھی۔ میں نے رشتہ کرتے وقت حیثیت نہیں دیکھی تھی۔ بس یہ دیکھا کہ میرا بھائی دامن پھیلا رہا ہے۔ بھائی کو خالی دامن لوٹانے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ میری بڑی دونوں بیٹیوں کی جہاں شادیاں ہوئی ہیں۔ بہت خوش ہیں۔ بھائی کی محبت میں بس زینا کا رشتہ کرنے میں کوتاہی ہوگئی۔"

"اس کوتاہی کی اصلاح بھی ہوسکتی ہے۔" معنی خیزی سے کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئیں۔ ثریا کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ اگلے دن انہوں نے بمشکل برائے نام ناشتا کیا۔ پھر ٹی وی لاؤنج میں اخبار پڑھتے بھائی کے پاس آبیٹھیں۔ انہوں نے آج آفس سے چھٹی کی تھی۔

"بھائی صاحب میں زینا کو ساتھ لے جانا چاہ رہی ہوں۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔

"لے جاؤ۔ ثریا۔" انہوں نے اخبار پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"شکر ہے۔ کچھ تو ٹھیک ہوا۔" کاشفہ بیگم اچانک ہی وارد ہوتے ہوئے بولیں۔

"کاشفہ بیگم۔ عبید سے کہو اگر وہ زینا کو طلاق دینا چاہتا ہے تو میری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ میں جس نیت سے زینا کو اس گھر میں لایا تھا وہی غلط تھی شاید۔ زبردستی کے بندھن بھلا کیسے قائم رہ سکتے ہیں۔ میری جو نیت تھی وہ رب جانتا ہے۔ اگر میں اپنی نیت میں درست ہوں تو قدرت اب خود ہی معاملہ سلجھا دے گی۔" جمشید عباسی نے سرد انداز میں کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

ماں کا بازو پکڑے راہداری پہ آہستہ آہستہ چلتے وہ بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی گیٹ سے باہر رکشا کھڑا تھا۔ جمشید نے ثریا کو کہا تھا کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں چلی جائیں۔ مگر وہ نہیں مانیں۔ بلکہ انہوں نے رکشا منگوالیا۔ زینا کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کی نظروں کے حصار میں ہے۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے اس نے غیر ارادی طور پر پیچھے دیکھا۔ سامنے ٹیرس پر عبید کھڑا تھا۔ اس کی مقناطیسی نظروں کے عجیب رنگ اور اتنے فاصلے پر بھی محسوس کر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج چاند کی چودھویں رات تھی۔ سیاہ رات کو چاند کی روشنی نے پر نور بنادیا تا آسمان پر بے حساب ستارے پوری آب و تاب سے ٹمٹما رہے تھے۔ کمرے کی کھڑکی میں بیٹھی وہ خالی الذہن آسمان کو تک رہی تھی۔ مگر نا تو وہ ستارے گن رہی تھی اور نا ہی کوئی خواب بن رہی تھی۔ آج بیس دن ہوچکے تھے اسے ماں کے گھر آئے۔ ان بیس دنوں میں وہ چند راتیں ہی سوپائی تھی۔ سارا دن ماں کے ساتھ گھر کے کاموں میں وقت گزار دیتی۔ راتیں کروٹیں بدلتے گزر جاتیں۔ نیند۔ تو نا جانے کیوں روٹھ گئی تھی۔ کہ اب سونے کے لیے وہ دعائیں مانگتی تھی۔ خواب چکنا چور ہوئے تھے۔ ارمان بکھرے تھے۔ آرزوئیں ترپتی تھیں۔ ذات ہی نظر انداز ہوگئی تھی۔ وجود اہمیت کھو گیا تھا۔ نیند کہاں سے آتی 'کیسے آتی۔ ان نظروں نے چند لمحے اسے حصار میں کیا تھا۔ اور کئی بے چینیاں اس کے وجود میں بھر دی تھیں۔

"تم تو مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ پھر۔ تمہاری نظریں کیوں بلاتی ہیں۔" وہ خیال میں عبید سے مخاطب ہوئی۔

☼ ☼ ☼

آج کافی دنوں بعد موسم خوش گوار تھا۔ ویک اینڈ تھا لوگ لطف اندوز ہونے کافی تعداد میں پارک آئے ہوئے تھے۔ پارک میں جا بجا لوگوں کے گروپ بیٹھے ہوئے تھے۔ کہیں تین چار عورتیں مل کر بیٹھیں پکوڑوں اور سموسوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں تو کہیں بوڑھے دوست مل کے بیٹھے ہوئے تھے۔ بچے

کھیل کود میں مگن تھے۔ کہیں الگ تھلگ کپلز بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں بھی نسبتاً باقی لوگوں سے الگ ہو کر درخت کے نیچے بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"اچھا تو تم نے کیا فیصلہ کیا پھر زینا تو چلی گئی۔" روحی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پر سکون لہجے میں پوچھا۔

"میں کل زینا کو لینے جاؤں گا۔" سامنے دیکھتے ہوئے عبید نے بھی اسی سکون سے جواب دیا۔

"واٹ... کیا مطلب؟" وہ حیرانگی سے گویا ہوئی۔

"وہ میری بیوی ہے۔ میں اسے لینے جاؤں گا۔" اس نے سابقہ انداز میں کہا۔

"تو کیا یہ بتانے کے لیے تم نے مجھے یہاں بلایا۔" وہ صدمے کی کیفیت میں بولی۔

"ہاں۔ تم نے ہی تو کہا تھا اب مجھ سے تب ملنا جب حتمی فیصلہ کر لو۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔ تم ٹھیک کہتی تھی روحی۔ افسانے بھی اسی معاشرے کی عکاسی ہوتے ہیں۔ ہم مشرقی مرد جتنے بھی لبرل اور ایڈوانس ہو جائیں اندر سے "دقیانوسی" ہی رہتے ہیں۔ ایسے دقیانوسی جو بیوی پر صرف اپنا حق چاہتے ہیں۔ جس عورت کو اپنا نام دیتے ہیں۔ اس پر کسی دوسرے کا سایہ بھی برداشت نہیں ہوتا۔ بنی سنوری ٹائٹ کپڑوں میں ملبوس' بازاروں' کلبوں اور پارٹیز کی خوب صورتی بڑھانے والی لڑکیاں آنکھوں کو بڑی اچھی لگتی ہیں جو ان کی دلکشی اداؤں سے دل تو بہلاتی ہیں مگر دل میں بستی نہیں ہیں۔ اگر دل میں بس بھی جائیں تو کچے رنگوں کی طرح جلد اتر بھی جاتی ہیں۔ جب گھر بسانے کی بات آتی ہے۔ تو ہمارے معاشرے کے 80 پرسینٹ مردوں کی خواہش ہوتی ہے۔ لڑکی سادہ اور بے ریا ہو۔ سگھڑ اور وفادار ہو۔

تم بہت ڈپریشن زدہ ہوئی تھیں جب نوی نے اپنی انگلینڈ پلٹ کزن سے شادی کی۔ مگر تم نے غور نہیں کیا کہ اس کی کزن ہے کیسی۔ انگلینڈ میں رہ کر اس نے سادگی کو اپنایا۔ میں نے جب بھی نوی کی بیگم کو دیکھا ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں اسکارف کے ساتھ دیکھا۔ نوی نے تم سے محبت کا دعوا کیا مگر گھر بسانے کی بات آئی تو اسے اپنی سادہ سی کزن زیادہ اچھی لگی۔ مجھے بھی ایسا لگا کہ تم مجھے پسند ہو۔ تم واقعی ہی مجھے پسند ہو۔ مگر بیوی کی حیثیت سے نہیں۔ مجھے زینا پسند نہیں تھی۔ پھر بھی مجھے اسے محبت ہو گئی۔ حالانکہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ مگر ایسا ہو گیا۔

روحی تم ایسا لباس پہنتی ہو جو تمہیں مزید دلکش بناتا ہے۔ دیکھو میری ہی نہیں یہاں موجود کئی لوگوں کی نظریں جان گئی ہوں گی تمہاری کمر کتنی ہے۔ لیگز کیسی ہیں مگر یقین کرو۔ زینا سات ماہ ہمارے گھر میں رہی میں نہیں جان سکا اس کے جسم کے خدوخال کیسے ہیں۔ کیونکہ اس کا وجود سادہ کپڑوں میں اور اوڑھنی میں چھپا رہتا تھا۔"

"یو شٹ اپ عبید تمہیں میری توہین کرنے کا کوئی حق نہیں۔" غصے سے لال پیلی ہوتی وہ کھڑی ہو گئی۔

"روحی مائنڈ نا کرنا۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔" میں تمہارے لیے دعاگو ہوں۔ اور تمہیں مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ خود کو تھوڑا بدلو۔

اپنا احتساب کرو۔ اور خود کو سچائی کے آئینے میں دیکھو۔! اگر تم اپنے لیے مخلص اور وفادار ساتھی چاہتی ہو تو تمہیں خود بھی ایسا ہونا ہوگا۔ اوکے میں چلتا ہوں۔" اس نے الوداعی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور آگے بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

"اگر وہ چڑیل دفع ہو ہی گئی ہے تو تمہیں کیا حماقت سوجھ رہی ہے اسے واپس لانے کی۔" کاشفہ سنتے ہی بھڑک اٹھیں۔

"مما وہ چڑیل نہیں میری بیوی ہے۔" وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو پھر اس گھر میں نا لانا۔ میرے ہوتے ہوئے وہ یہاں نہیں رہے گی۔" وہ درشتی سے بولیں۔

"مما اس سے نکاح میں نے جائیداد کے لالچ میں کیا تھا مگر آج مجھے اسے لانے کے لیے بالکل خالی ہاتھ بھی جانا پڑا تو جاؤں گا۔ اگر آپ اسے یہاں اس گھر میں

برداشت نہیں کر سکتیں تو میں بھی یہاں نہیں رہوں گا۔ میں اپنے لیے الگ سے کچھ کرلوں گا رہنے کا بندوبست۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ جمشید صاحب بیٹے کی بات سن کر اخبار کی اوٹ میں مسکرائے۔

"عبید زینا کو لینے جا رہے ہو۔! مجھے بھی لے چلو میرا تو بیٹا چچی کے لیے اداس ہو گیا۔" سیڑھیوں سے اترتی حبیبہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے پیچھے جنید بھی مسکراتا ہوا آرہا تھا۔

"مما آپ بھی چلیں زینا کو لینے۔" نادیہ نے کاشفہ کے قریب آتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ وہ ایسے بیٹی کو دیکھنے لگیں جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔

"مما جعفر کو بہت لبرل اور فیشن کے پیچھے بھاگنے والی لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔ اسے سادہ اور گھریلو لڑکیاں پسند ہیں۔ مما میں اس کی پسند کے مطابق ڈھلنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ اب میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مما زینا اچھی لڑکی ہے۔ ہماری اتنی نفرتیں سہہ کر بھی ثابت قدم رہی۔ زینا سے بلاوجہ دشمنی نا کریں۔ اس سے دشمنی کا فائدہ ہی نہیں۔ کیونکہ وہ ہماری دشمن نہیں ہے۔" نادیہ کی بات سن کر کاشفہ بیگم کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہوا۔

"میں تیار ہو کر آتی ہوں۔ عبید کے ساتھ چلنے کے لیے۔" آہستگی سے کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں "یا اللہ تیرا شکر ہے۔" جمشید صاحب نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

"اوں۔ ہوں سونے دیں۔ اتنی راتیں جاگ کر گزاری ہیں۔ بہت دنوں بعد میری روٹھی نیند واپس آئی ہے۔" بیڈ پر اس کے قریب لیٹے ہوئے عبید نے اسے بازو کے گھیرے میں لینا چاہا۔ تو وہ کسماتے ہوئے بولی۔

"چلو ٹھیک ہے تم سو جاؤ۔ میں اپنی گرل فرینڈ سے باتیں کرلیتا ہوں۔" اٹھ کر بیٹھتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا۔

"میرے ہوتے ہوئے آپ اپنی گرل فرینڈ سے بے ہودہ باتیں کریں گے تو میں اٹھ کر چلی جاؤں گی۔" وہ بھی فوراً اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"جا کر تو دکھاؤ۔ کیا خیال ہے تم سے کرلوں بے ہودہ باتیں؟ وہ اس کے کان کے قریب سرگوشیانہ انداز میں بولا۔

"نہیں مجھے سونا ہے۔" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

"سو جاؤ۔ میں بھی سو رہا ہوں۔" وہ اچانک پینترا بدلتے ہوئے بولا۔

"عبید آپ نے میری نیند چرالی ہے۔" کچھ دیر لیٹے رہنے کے بعد وہ آہستگی سے بولی۔ "عبید شرارتی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ وہ خود میں سمٹنے لگی۔

چودھویں کا چاند۔ آسمان' ستارے آج اسے سب اپنے ساتھ مسکراتے ہوئے لگ رہے تھے۔ کیونکہ اب سپنے سچ ہونے کو تھے۔

☼ ☼

مکمل ناول

نبیلہ ابر راجہ

گمان ہے عشق میں ہوں

ساتویں قسط

زیان کی آنکھوں میں غصہ جاگا۔ اسے ملک ایبک کا اس وقت مخل ہونا بالکل بھی پسند نہیں آیا تھا۔

"جی کہیے۔ کیا بات ہے۔" اس کا لہجہ خشک اور سرد تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایبک نے کچھ فیصلے آنا "فانا" کیے ہیں۔ اس کا چہرا بے حد سنجیدگی کے حصار میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"زیان آپ کو اچھی طرح علم ہے کہ معاذ کم دنوں کے لیے پاکستان آیا ہے۔ بابا جان اور امی کی مرضی ہے کہ معاذ کی چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہماری شادی ہو جائے۔ خود معاذ بھی چاہتا ہے کہ شادی اٹینڈ کر کے جائے۔ میں اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ عنیزہ چچی سے اجازت لی ہے' باقاعدہ آپ سے بات کرنے یہاں تک آنے کی۔" وہ اس کی مسلسل خاموشی سے تنگ آکر وضاحت دینے لگا۔

"آپ کو کسی قسم کا اعتراض تو نہیں؟" وہ اب بغور اس کے تاثرات جانچ رہا تھا۔ ایبک اسے منتظر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میکانکی انداز میں زیان کا سر بے اختیار نفی میں ہلا۔ حالانکہ دماغ مسلسل انکار پہ اکسا رہا تھا۔ پر دل نے دماغ کو شکست دے دی۔ ایبک کو ایسے محسوس ہوا جیسے زیان کی روئی روئی آنکھیں مسکرائی ہوں۔

"ٹھیک ہے' پھر اب شادی کے دن ہی آپ سے ملاقات ہوگی۔" جاتے جاتے اس نے شریر جملہ اچھالا۔ وہ جا رہا تھا ابھی ابھی زیان پہ اس کی ایک خوبی عیاں ہوئی تھی۔ وہ قائل کرنے کی' منوانے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ بے قراری سے میٹنگ روم کے چکر لگا رہی تھیں۔ ایبک اوپر زیان کے کمرے میں گیا ہوا تھا۔ کچھ منٹ بعد وہ کھڑکی کے شیشوں سے سیڑھیاں اترتا نظر آیا تو وہ اٹھ کر دروازے تک پہنچ گئیں۔

"ایبک اتنے جلدی کیوں آگئے ہو؟" انہوں نے دروازے پہ ہی اسے کندھوں سے تھام لیا۔

"چچی' زیان کو جلد شادی پہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔" ایبک نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جیسے مژدہ جاں فزا سنایا۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" عنیزہ نے بے اختیار شکر ادا کیا۔

"ایبک میری بیٹی نے مجھ سے دور رہ کر زندگی گزاری ہے اور میں تصور کر سکتی ہوں کہ ماں کے بغیر وہ زندگی کیسے ہوگی۔ اسی وجہ سے وہ تلخ ہو گئی ہے۔ اس وجہ سے وہ بے رخی کا برتاؤ کرتی ہے تو تم پریشان مت ہوا کرو' نظر انداز کر دیا کرو۔ ہم سب ایک طرح سے اس کے لیے اجنبی ہی ہیں' اسے گھلنے ملنے میں ایڈجسٹ کرنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟" وہ آس بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"چچی آپ فکر مت کریں۔ میں ان سب باتوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔" اس نے ان کے ہاتھ کو، اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بھرپور یقین دلایا تو عنیزہ کے ہونٹوں پہ پرسکون مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

ملک جہانگیر بہت خوش تھے اور معاذ کی خوشی تو حد سے سوا تھی، ورنہ وہ ایبک بھائی کی طرف سے شادی مؤخر کرنے کے فیصلے سے خوش نہیں تھا۔ ایبک نے سختی سے ہر قسم کے جہیز کے لیے منع کر دیا تھا۔ بیڈ روم فرنیچر اس نے خود پسند کیا تھا۔ باقی پردے، قالین، کلر اسکیم زیان کی پسند کی تھی۔

ان دونوں میں ملک ایبک کا انکار موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ نہناں بھی ان کی باتیں پاس بیٹھی غور سے سن رہی تھی۔

"ایبک بے شک انکار کرتا رہے، ہم اپنی بیٹی کو ہر چیز دیں گے۔" یہ ارسلان تھے۔ ایبک کے منع کرنے کے باوجود زیان کو بہت کچھ دینا چاہ رہے تھے۔

"اس نے دو ٹوک منع کر دیا ہے' ایسا نہ ہو وہ اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالے۔ ویسے بھی اس نے زیان کے لیے سب کچھ خرید لیا ہے۔ صرف ولیمہ کا جوڑا باقی ہے۔ وہ بھی ایک دو دن تک مل جائے گا۔" عنیزہ نے ملک ارسلان کی توجہ اس طرف دلائی تو وہ کچھ سوچنے لگے۔

"ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ ایک اصولوں اور بات کا کھرا آدمی ہے' نہیں مانے گا۔" کچھ توقف کے بعد وہ بولے اور عنیزہ کی بات کی تائید کی۔

"میں بہت خوش ہوں' میری بیٹی کو ایک جیسا ہم سفر مل رہا ہے۔ میرے رب نے اتنی خوشیاں میری جھولی میں ڈالی ہیں۔ میں تمام عمر شکر ادا کرتی رہوں تو بھی کم ہے۔" جذبات میں انہوں نے پاس بیٹھی نہناں کی موجودگی نظرانداز کردی تھی۔ ارسلان بھی بھول گئے تھے کہ نہناں ادھر موجود ہے۔ اس کے کان ان دونوں کی گفتگو کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ملک ارسلان کی نگاہ اس پہ پڑی تو انہوں نے بہانے سے اسے وہاں سے ہٹادیا۔

"ایک کپ چائے کا مل جائے تو۔"

"جی ابھی بنواتی ہوں۔" وہ سعادت مندی سے بولی اور باہر آگئی۔ وہ دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی' سماعتیں اندر سے آنے والی آوازوں کی سمت لگی تھیں۔ ملک ارسلان' عنیزہ کو تسلی دے رہے تھے۔ کسی کے قدموں کی آہٹ اسی طرف آتی محسوس ہو رہی تھی' نہناں فوراً" دروازے سے ہٹ کر آگے بڑھ گئی۔ زیبو نے چائے بنادی تھی' نہناں خود لے کر واپس آئی۔ اندر داخل ہونے سے پہلے وہ چند لمحے کے لیے دروازے پہ ہی ٹھہر گئی۔ ایک اور زیان کی شادی کا موضوع چل رہا تھا۔ وہ ٹرے سمیت اندر داخل ہوئی۔

"ایک بہت خوددار ہے۔" یہ عنیزہ تھیں۔

"تمہاری بیٹی کو اللہ نے بہترین ہم سفر دیا ہے۔" ملک ارسلان کے لہجے میں ہماری بیٹی کہتے وقت عجیب سی مٹھاس اور اپنائیت اتر آئی تھی۔ نہناں ان ہی کی طرف متوجہ تھی۔

☆ ☆ ☆

آج اسے ذرا بھی بھوک نہیں تھی۔ سر میں درد الگ ہو رہا تھا۔ وہ طبیعت میں سستی کی وجہ سے جلدی اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ ملک ارسلان اور عنیزہ کی باتوں پہ غور کر رہی تھی۔ ان کی گفتگو سے نہناں نے ایک نتیجہ نکالا تھا کہ زیان پہلے سے حویلی میں نہیں تھی۔ اس سے پہلے وہ کہاں تھی۔ اس بارے میں وہ لاعلم تھی۔ نہناں کو یقین تھا' وہ ان دونوں سوالوں کے جواب حاصل کرلے گی۔

نہناں سوچ رہی تھی کہ زیان کے بارے میں کیسے' کس سے اور کس طرح معلومات حاصل کی جاسکتی ہے۔ فی الحال تو ملک ایک اور زیان کی شادی اس کے لیے شاک کا باعث بنی ہوئی تھی۔ ملک ایک بالکل ویسا ہی تھا جیسا وہ ڈھونڈ رہی تھی۔ واہ ری قسمت تیرے کھیل۔

اس کا مطلوبہ شخص ایک اور حیثیت میں اسے ملا تھا اور وہ اپنی ضد میں گھربار' عیش و آرام' ناز و نعم سب چھوڑ آئی تھی۔ اسے ایسا شخص مل کے نہیں دے رہا تھا۔ لیکن یہ ہی شخص' کسی اور کو بغیر کسی ضد کے بن مانگے مل رہا تھا۔

زیان کو تو کچھ چھوڑنا بھی نہیں پڑا تھا۔ زیان جیسی مغرور بد دماغ لڑکی جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی کیا ملک ایک جیسا شان دار مرد اس کے لائق تھا یا وہ اس قابل تھی کہ ملک ایک کے خواب بھی دیکھ سکے۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" ان تمام سوالوں کے جواب میں کوئی بڑے زور و شور سے نہناں کے اندر چیخا تھا۔

☆ ☆ ☆

ملک جہانگیر نے ایک کے لیے مختص رہائشی حصے کو نئے سرے سے آراستہ کروایا تھا۔ ایک اور زیان کا بیڈ روم نئے اور قیمتی فرنیچر سے سجایا گیا تھا۔ انسپکشن کے لیے معاذ خاص طور پر نہناں کو لے کر آیا۔ نہناں آراستہ و پیراستہ بیڈ روم کو غور سے دیکھ رہی تھی' آنکھوں میں رشک و حسد کے ملے جلے جذبات تھے۔ معاذ حسب معمول بول رہا تھا۔

"زیان بی بی پہلے شہر میں رہتی ہیں کیا؟" نہناں

نے عام سے انداز میں سوال کیا۔

"آف کورس بھابھی، پہلی بار حویلی آئی ہیں۔" معاذ اپنی دھن میں بول رہا تھا۔

"ایکچوئیلی، ارسلان چچا، زیان بھابھی کے سوتیلے ابو ہیں۔" معاذ نے بولتے بولتے اہم انکشاف کیا تو حیرت کی زیادتی سے، جیسے نہناں جہاں کی تہاں رہ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو نارمل کیا، ورنہ معاذ شک میں پڑ سکتا تھا۔ معاذ کی باتوں کی طرف اب اس کا دھیان نہیں تھا۔ وہ فقط میکانکی انداز میں سرہلا رہی تھی۔

افشاں بیگم نے، عنیزہ سے درخواست کی تھی کہ نہناں کو کچھ دن کے لیے ان کے ہاں رہنے کے لیے بھیج دیا جائے۔ وہاں بہت کام بکھرے ہوئے تھے، جبکہ افشاں بیگم سے اب "ملک محل" کی دیکھ بھال کے امور درست طریقے سے سنبھالے نہیں جارہے تھے۔ ایبک کی شادی کا ہنگامہ سر پہ تھا۔ کوئی بیٹی نہیں تھی جو بے شمار چھوٹے چھوٹے کاموں میں ان کی مدد کرتی۔

"میں نہناں سے کہتی ہوں بلکہ اسے ساتھ لے جائیں۔" عنیزہ نے فوراً" ہی رضامندی دے دی تو افشاں بیگم مطمئن ہوگئیں۔ نہناں کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ عنیزہ بیگم نے اسے کچھ دنوں کے لیے ملک ایبک کی طرف شفٹ ہونے کا کہا تھا۔ اس نے بڑی فرماں برداری سے سرہلایا تھا۔ افشاں بیگم اسے اپنے ساتھ ہی لائی تھیں اور فوراً" ہی کاموں کی ایک لمبی چوڑی فہرست بتائی تھی۔

کارڈز چھپ کے آگئے تھے۔ نہناں افشاں بیگم کی ہدایت پہ سب کارڈز ان کے پاس لائی تھی۔ وہ ملک ایبک کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ نہناں کارڈز کا بنڈل ان کے سامنے رکھ کر وہیں سائیڈ پر کھڑی ہوئی۔ ملک ایبک کارڈ کھول کر ان پہ لکھے نام پڑھ رہا تھا۔ چوہدری طارق، صغیر گیلانی، رانا رب نواز، احمد سیال۔

احمد سیال کے نام پہ نہناں فوراً" اضطراب کا شکار ہوئی۔ بے چینی اس کے پورے جسم میں سرائیت کرچکی تھی۔ وہ کسی معجزے کی توقع تو نہیں کر رہی تھی پر احمد سیال کے نام پہ اسے شدید جھٹکا لگا تھا۔ دماغ جو کچھ سمجھا رہا تھا دل اسے قبول کرنے پہ آمادہ نہیں تھا۔

اس نے آخری بار ہوٹل سے جب اپنے گھر کال کی تھی تو وہاں سے رونے پیٹنے کی آوازیں سنی تھیں۔ اس نے اسے اپنی غلطی سمجھا تھا اور پھر کال کی تھی لیکن اس بار بھی تو غلطی نہیں ہوسکتی تھی ہوٹل اسٹاف کے ایک آدمی نے نمبر ڈائل کیا تھا اور تصدیق کی تھی جس نمبر پہ اس نے کال کی تھی اس گھر کے مالک کا انتقال ہوچکا تھا۔ رونے پیٹنے کی آوازیں ان کے دکھ کا اظہار تھیں۔ وہ ادھڑ سی گئی تھی۔

اس کی تو دنیا ہی ختم ہوگئی تھی۔ جب پاپا ہی نہیں رہے تھے تو وہ واپس کس کے پاس جاتی، اور واپس جاکے کرتی بھی کیا۔ ساری عمر ضمیر کی مجرم بنی رہتی۔ اس نے واپس جانے کے بجائے عنیزہ اور ملک ارسلان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ اس کی خوشی یا چوائس نہیں تھی بلکہ بطور سزا، یہ راستہ اس نے چنا تھا۔ وہ اپنے پاپا کی قاتل تھی اس گھر کے چھوڑنے کے صدمے نے ان کی جان لی تھی۔ ضمیر کی چبھن اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

پر کارڈ پہ لکھا پاپا کا نام جو ملک ایبک نے ابھی ابھی پڑھ کر اس کی سوچوں کو جھنجوڑا تھا وہ تو کوئی اور ہی حقیقت بیان کر رہا تھا۔ وہ مرچکے ہوتے تو کارڈ پہ ان کا نام کیوں لکھا جاتا۔ کارڈ پہ لکھا نام ظاہر کر رہا تھا کہ وہ زندہ تھے اور انہیں شادی میں بلایا جارہا تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے سارے واقعات پہ غور کر رہا تھا۔ یقیناً" پریشانی میں اسے نمبر ڈائل کرنے میں غلطی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس نے پاپا کو مردہ تصور کرلیا تھا۔ اس وقت اس کی عقل کام کر رہی ہوتی تو وہ نام ضرور پوچھتی۔

کارڈ پہ لکھا احمد سیال کا نام اس کے لیے مژدہ جاں فزا ثابت ہوا تھا۔

"احمد سیال کے گھر تمہارے پاپا اور میں خود جائیں گے۔ ملک صاحب بتا رہے تھے۔ کہ ان کا یہ دوست تھوڑا بیمار ہے۔ بیٹی بھی پڑھنے کے لیے باہر چلی گئی

ہے۔ اور کوئی بیٹا بھی نہیں ہے۔" افشاں بیگم نہنال کی دلی حالت سے بے خبر ایبک کے ساتھ بات کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے نہنال کو اشارہ کیا کہ سب کارڈز اٹھا کر وہاں رکھ دے جہاں سے لائی ہے۔ نہنال نے اپنی آنکھیں جھکاتے ہوئے ٹیبل سے سب کارڈز اٹھائے۔ وہ دروازے سے باہر آتے ہی تیز تیز قدموں سے سیدھی اس کمرے کی طرف آئی جو عارضی طور پہ اسے دیا گیا تھا۔ اس نے ڈھونڈ کر مطلوبہ کارڈ نکالا اور باقی سب الگ کر کے رکھے۔

کارڈ پہ احمد سیال کا نام گولڈن روشنائی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اس نے بے اختیار پاپا کے نام پہ ہاتھ پھیرا تو آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے خواہ مخواہ وہ اتنے ماہ اپنے پاپا کو مردہ تصور کرتی رہی۔

اس نے آنسو صاف کر کے کارڈ باقی کارڈز کے ساتھ رکھا اور اپنا سیل فون اٹھایا۔ یہ اسے عنیزہ بیگم نے لے کر دیا تھا۔ پاپا کا نمبر اسے ازبر تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پاپا کا نمبر ڈائل کر کے فون کان سے لگایا۔ کال فوراً" ریسیو کی گئی۔ اس کا پورا وجود سماعت بنا ہوا تھا۔

دوسری طرف احمد سیال اپنی مخصوص مہذب آواز میں ہیلو ہیلو کر رہے تھے۔ اس نے فوراً" رابطہ منقطع کر دیا۔ اس بار اس کی آنکھوں میں آنسو خوشی کی وجہ سے آئے تھے۔ پاپا زندہ تھے۔ اس کی امید زندہ تھی۔ یعنی اب وہ کوئی عام سی لڑکی نہیں تھی۔ رنم سیال تھی اپنے پاپا کی لاڈلی بیٹی 'دنیا جس کے جوتے کی نوک پہ تھی۔

☼ ☼ ☼

ملازم وزیر بخش دودھ کا گلاس ان کی ٹیبل پر رکھ گیا تھا۔ احمد سیال نے نیند کی دو گولیاں دودھ کے ساتھ نگلیں۔ انہیں اب اس کے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔ بلڈ پریشر الگ ہائی رہنے لگا تھا۔ رنم کے جانے کے بعد وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ خود کو از خود مصروف کر لیا تھا۔ وہ بیرونی دوروں پہ پاکستان سے لمبے عرصے کے لیے غائب رہنے لگے تھے۔ اس گھر میں ان کی لاڈلی بیٹی کی یادیں بکھری پڑی تھیں۔ وہ انہیں بھلانے کے جتن کرتے تھے۔ نیند کی گولیاں کھانے کے باوجود انہیں نیند بہت کم اور دیر سے آتی تھی۔ وہ اس آس پہ گھر لوٹتے کہ رنم آئی ہو گی۔ فون کی بیل بجتی تو فون کی طرف بھاگتے کہ اس کی کال ہو گی۔ گھر سے نکلتے تو آتے جاتے لوگوں کو غور سے تکتے شاید ان میں رنم نظر آجائے۔ وقتاً" فوقتاً" وہ فراز اور کومل سے بھی پوچھتے کہ شاید رنم نے ان سے کوئی رابطہ کیا ہو اور انہیں وہاں سے کوئی سراغ مل جائے۔ مگر ان کی ساری امیدیں ایک ایک کر کے دم توڑتی جا رہی تھیں۔ رنم کا دکھ انہیں لے ڈوبا تھا۔

انہوں نے آفس سے گھر اور گھر سے آفس کا راستہ پکڑ لیا تھا۔ باقی ہر جگہ آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ ملک جہانگیر کا چھوٹا بیٹا پاکستان آیا تو انہوں نے بہت محبت سے احمد سیال کو بھی مدعو کیا پر انہوں نے بہانہ کر دیا اور نہیں گئے۔ ملک جہانگیر ویسے ہی اصرار کر کے "ملک محل" آنے کا بول رہے تھے اور وہ مسلسل ٹال رہے تھے۔

کل ان کے سیل نمبر پہ اجنبی کال آئی تھی تو انہوں نے نمبر دیکھتے ہی جھٹ ریسیو کر لی پر دوسری طرف سے ان کے ہیلو کہتے ہی کال ختم کر دی گئی۔ انہوں نے کچھ توقف کے بعد اس نمبر پہ تین بار کال بیک کی پر کوئی رسپانس نہیں ملا۔ نہ جانے کیوں ان کا دل کہہ رہا تھا یہ رنم کی کال تھی۔

ملک جہانگیر' معاذ کے ساتھ احمد سیال کے گھر انہیں ایبک کی شادی کا دعوت نامہ دینے آئے تھے۔ معاذ نے پہلی بار ان کا گھر دیکھا تھا اور بے حد متاثر نظر آرہا تھا۔ دونوں دوست باتیں کر رہے تھے۔ معاذ چائے پی کر ڈرائنگ روم سے باہر آیا۔ اسے واش روم جانا تھا۔ وہ واش روم جانے کے لیے کوریڈور سے گزرتے رک گیا۔ اچانک ہی اس کی نظر وہاں دیوار پہ لگے فوٹو گراف پہ پڑی تھی۔ اس کے رکنے کی وجہ وہ فوٹو تھی۔ وہ سو فی صد نہنال تھی۔ معاذ نے قریب جا کر دیکھا۔

حیرت انگیز طور پہ اس کی شکل نمناک سے مل رہی تھی جسے ابھی ابھی کچھ گھنٹے پہلے وہ خود ملک محل میں دیکھ کے آیا تھا۔ اس سے اپنی حیرت چھپائی ہی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے گھر میں جگہ جگہ نمناک سے مشابہت رکھنے والے بے شمار فوٹو دیواروں پر لگے دیکھے۔

وہ واپس آیا تو ملک جہانگیر وہاں موجود نہیں تھے احمد سیال اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ ملک جہانگیر عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ اور احمد سیال ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ پچھلی دیوار پر بھی اس لڑکی کی تصویر آویزاں تھی۔ معاذ نے جرات سے کام لیتے ہوئے اس بارے میں پوچھ ہی ڈالا۔

"یہ میری بیٹی رنم ہے ہائر اسٹڈی کے لیے ابراڈ گئی ہوئی ہے۔" انہوں نے برا منائے بغیر بتایا۔

"آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے۔" معاذ نے موضوع بدلا اور ان کے گھر کی تعریف کی تو وہ خوش ہو گئے۔ وہ واپسی میں بھی نمناک اور رنم کی خطرناک حد تک مشابہت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"بابا جان آپ نے مجھے اپنے کسی دوست کی بیٹی کے بارے میں بتایا تھا کچھ ماہ پہلے۔" گاڑی کے شیشے سے باہر تکتے ملک جہانگیر سے اس نے سوال کیا۔

"ہاں میں نے تم سے بات کی تھی پر تم مانے ہی نہیں۔ پھر میں نے سوچا تم نہ سہی ایبک سہی پر تمہاری ماں دل سے راضی نہیں تھی اور ایبک کی بھی خاص مرضی نہیں تھی۔" ملک جہانگیر نے جواب دیا۔

"وہ احمد سیال کی بیٹی ہی تھی جس کے گھر سے ہم ابھی واپس آرہے ہیں۔" انہوں نے انکشاف کیا۔

"بابا جان احمد انکل کی بیٹی کہاں ہے اب کیا کر رہی ہے؟" معاذ نے سوال کیا حالانکہ احمد سیال اسے بتا چکے تھے۔

"احمد کی بیٹی پاکستان سے باہر پڑھنے کے لیے گئی ہوئی ہے۔ میری دلی خواہش تھی کہ احمد کی بیٹی بہو بن جائے۔"

"بابا جان آپ اس سلسلے میں احمد انکل کے گھر گئے تھے؟"

"ہاں میں گیا تھا سرسری بات ہوئی تھی۔ میں اکیلا ہی احمد سے ملا تھا بات کی تھی۔"

"پھر کیا جواب دیا انہوں نے؟"

"کچھ نہیں احمد کی بیٹی پاکستان سے باہر چلی گئی۔ بات چلنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔ پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" ملک جہانگیر نے گہری نگاہ سے اسے تکتے ہوئے سوال کیا۔

"بابا جان ایسے ہی۔ وہ امی جان بھی ذکر کر رہی تھیں نا اس لیے۔" معاذ نے بروقت امی کا نام لے کر ملک جہانگیر کو مطمئن کیا۔

"ویسے میں نے احمد کی بیٹی کو پہلی بار دیکھا تو تمہارے لیے پسند کیا تھا۔ اس کا جوڑ تمہارے ساتھ ہی تھا۔" انہوں نے اسے آگاہ کیا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

ملک ارسلان نے عنیزہ کے مشورے سے مدعو کیے جانے مہمانوں کی فہرست حتمی طور پہ تیار کر لی تھی۔ عنیزہ نے بہت سے کارڈز زبان کو دیے تھے۔ وہ جس کو چاہے انوائٹ کرے۔ جب عنیزہ نے کارڈز اسے دیے تھے تب کوئی خاص نام اس کے ذہن میں نہیں تھا لیکن وہ ذرا اکیلی بیٹھی کر سوچنے کے قابل ہوئی تو اسے بوا رحمت، زرینہ بیگم، آفاق، رابیل اور منال سب بے طرح یاد آئے۔ جب سے وہ ملک محل میں آئی تھی اس کے بعد سے لے کر اب تک اس کا ان میں سے کسی کے ساتھ بھی کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ امیر علی کا گھر چھوڑتے ٹائم زرینہ بیگم نے سختی سے منع کیا تھا کہ ہم میں سے کسی کے نمبر پہ بھی کال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ضرورت ہو گی ہم خود فون کریں گے۔ ایسی ہی نصیحت اسے بوا نے بھی کی تھی کہ یہاں اب آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن آج اسے ان سب سے بات کرنے کی ملنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

آفاق، رابیل اور منال تینوں اس کے بہن بھائی آخری ملاقات میں سہمے اور گھبرائے ہوئے تھے۔ یاد

آنے پہ زیان کی آنکھوں میں نمی سی چمکی۔ آفاق بے شک چھوٹا تھا پر بھائی تو تھا۔ بے شک ان کی مائیں الگ الگ تھیں پر باپ تو ایک تھا ناں۔ زیان "ملک محل" میں تھی اور وہ یہاں سے سینکڑوں میل دور شہر میں تھے پر اس دوری نے دلوں میں بھڑکنے والے محبت کے الاؤ اور خون کی کشش کو بڑھا دیا تھا۔

بے اختیار اس نے کارڈ پہ زرینہ آنٹی کا نام لکھا دوسرے کارڈ پہ خوش خط انداز میں اس نے بوا رحمت کا نام لکھا۔ کارڈ لفافے میں ڈال کر وہ عنیزہ کے پاس لے گئی۔ وہ اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر چونکیں۔ زیان بہت کم ان کے بیڈ روم میں آتی تھی اس لیے وہ حیران ہو رہی تھیں۔

"ماما ان کو بلوا بھیجیے گا میں نے کارڈز پہ نام لکھ دیے ہیں۔" اس نے کارڈ ان کی طرف بڑھائے۔ انہوں نے کارڈ پہ لکھے نام بغور پڑھے۔

"تم یہ نہ بھی کرتیں تو میں نے تب بھی ان کو بلوانا تھا۔ بوا کے بہت سے احسانات ہیں مجھ پہ۔ زرینہ بیگم اور بوا نے زندگی کی سب سے بڑی خوشی مجھے بخشی ہے۔ میں خود جاؤں گی شہران کے گھر۔ اور انہیں ساتھ لے کر آؤں گی۔" عنیزہ نے دونوں ہاتھ اس کے شانے پہ رکھے اور محبت سے اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ وہ بہت کم انہیں اس طرح مخاطب کرتی تھی اور ماما تو کبھی کبھار ہی بولتی تھی زیادہ تر آپ کہہ کر کام چلاتی۔ اس لیے وہ بہت خوش تھیں۔

"ہاں آپ بوا کو لازمی ساتھ لے کر آنا۔" زیان کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تو عنیزہ سو جان سے جیسے اس مسکراہٹ پہ فدا ہونے لگیں۔ وہ اس سے کچھ اور بھی کہتی تو انہوں نے لازمی ماننا تھا۔

☼ ☼ ☼

بوا، زرینہ بیگم اور تینوں بچے اداس اور خاموش بیٹھے تھے۔ گھر کا سودا ہو چکا تھا۔ آج ان کی اس گھر میں آخری رات تھی۔ وہاب کی دھمکیوں سے زرینہ بیگم بے حد خوفزدہ تھیں۔ انہوں نے اپنے وکیل سے مشورہ کیا تھا۔ انہوں نے تو مکان نہ بیچنے پہ زور دیا تھا پر زرینہ نے حالات کے رخ کو دیکھتے ہوئے دل پہ پتھر رکھ کر مکان فروخت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہاں رہنے سے وہاب کی تلوار سر پہ لٹکتی رہتی وہ آئے روز دھمکاتا اور زندگی اجیرن کرتا۔ اس لیے انہوں نے یہاں سے بہت دور ایک اور علاقے میں اپنے وکیل کے توسط سے ہی نیا گھر خرید لیا تھا۔

یہ گھر امیر علی نے بڑی چاہتوں سے تعمیر کروایا تھا اور زرینہ بیگم نے سجایا سنوارا تھا۔ وہ اس گھر میں دلہن بن کر آئی تھیں یہاں پہ ہی آفاق، رابیل اور مناہل پیدا ہوئے، پروان چڑھے۔ زندگی کی بہت سی خوشگوار بہاریں انہوں نے اس گھر میں دیکھی تھیں۔ پھر امیر علی سے جدائی کا ابدی غم بھی انہوں نے اس گھر میں برداشت کیا تھا۔ یہ گھر ان کے لیے اینٹ پتھر اور سیمنٹ سے تعمیر کردہ محض ایک عمارت نہ تھا بلکہ ان کے خوابوں کی جنت اس گھر میں تھی۔ اس جنت میں اب ایک شیطان گھس آیا تھا جس نے انہیں دربدر کرنے کی ٹھان لی تھی۔ بوا نے بھی اپنی عمر کا بڑا حصہ اس گھر میں گزارا تھا۔ انہیں بھی بے حد دکھ نے گھیرا ہوا تھا۔ دل گرفتہ زرینہ کو انہوں نے تسلی دی تو وہ پھیکے انداز میں مسکرائیں جس میں اداسی کا رنگ رچا ہوا تھا۔

"بوا صبح جلدی نکلنا ہے۔ اس لیے اب سو جانا چاہیے۔" انہوں نے اپنے آنسو پیتے ہوئے بوا سے نظر چرائی تو بوا نے فوراً" اثبات میں سر ہلایا۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ اور ملک ایبک دونوں دعوت نامہ لے کر امیر علی کے گھر پہنچے تھے۔ بیل بجانے پہ اندر سے جو صاحب برآمد ہوئے وہ ان دونوں کے لیے تو اجنبی تھے ہی، لیکن اس گھر کے مکینوں سے بھی ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے حال ہی میں یہ گھر خریدا تھا اور پرانے مالک مکان کے بارے میں وہ لاعلم تھے۔

ملک ایبک اور عنیزہ واپسی کا ارادہ باندھ ہی رہے

تھے جب وہاں گیٹ پہ وہاب کی گاڑی رکی۔ وہ گیٹ پہ ایک اجنبی صورت کو بے تکلف انداز میں کھڑے دیکھ کر سٹ پٹا سا گیا۔ واپسی کے لیے مڑتی قیمتی گاڑی کو بھی اس نے بغور دیکھا تھا۔

"السلام علیکم" وہ گیٹ کے بیچوں بیچ کھڑے عباس احمد سے مخاطب ہوا۔

"جی میں وہاب ہوں آپ کون اور یہ اس طرح یہاں کیوں کھڑے ہیں؟" اپنا تعارف کرواتے اور آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کا لہجہ خود بہ خود ہی سخت سا ہو گیا۔

"میں اس گھر کا نیا مالک عباس احمد ہوں۔" اجنبی صورت نے اپنا تعارف کروایا تو وہ پریشانی سے انہیں تکنے لگا جیسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہو۔

"یہ گھر میری خالہ زرینہ امیر علی کا ہے تین دن پہلے تک تو وہ یہاں ہی تھیں۔"

"میں کل ہی اپنی فیملی کے ساتھ شفٹ ہوا ہوں۔ میں کسی زرینہ امیر علی سے واقف نہیں ہوں میں نے یہ گھر بروکر کے توسط سے خریدا ہے۔" عباس احمد کے بتانے پہ حیرتوں کے جال وہاب کے چہرے پہ پھیلتے جا رہے تھے۔

"آپ نے یہ گھر کب خریدا ہے؟" حیرت کی جگہ اب شدید غیض و غضب اور اشتعال نے لے لی تھی۔

"میں نے یہ گھر پچھلے ہفتے ہی خریدا ہے اور تمام ادائیگی بھی کر دی ہے۔" عباس احمد تفصیل بتانے کے ساتھ ساتھ وہاب کے تاثرات کا بھی بغور جائزہ لے رہے تھے۔

وہ اپنی گاڑی اسٹارٹ کر کے وکیل کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں سب سے پہلا نام وکیل کا آیا تھا۔ امیر علی کا وکیل مکان کی فروخت اور زرینہ خالہ کی موجودہ رہائش سے یقیناً واقف ہوتا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ وکیل صاحب کے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پے در پے سوالات پہ انہوں نے مکمل حیرت اور لاعلمی کا اظہار کیا۔

"مجھے قطعی طور پہ علم نہیں ہے کہ زرینہ بیگم نے مکان فروخت کر دیا ہے کم سے کم انہیں مجھے تو بتانا چاہیے تھا۔" وکیل صاحب خود الجھے ہوئے تھے۔

"یہ آپ میرا نمبر رکھ لیں جب بھی خالہ آپ سے رابطہ کریں مجھے اس نمبر پہ اطلاع کر دیجیے گا۔" وہاب نے کارڈ پہ لکھا اپنا نمبر انہیں دیا۔

"جی ضرور۔" وکیل صاحب خوش دلی سے بولے۔ وہاب ان کے آفس سے نکلا تو انہوں نے زرینہ بیگم کو فون کر کے وہاب کی آمد سے مطلع کیا۔ وہاب کو دیکھتے ہی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے پتا چل چکا ہے تب ہی وہ ان کے پاس آیا ہے۔ انہوں نے خوب صورتی سے ٹال دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بدن کی قید سے نکلیں تو اس نگر جائیں
جہاں خدا سے کسی شب مکالمہ ہو گا
جہاں یہ روح کا بھی کوئی حق ادا ہو گا
نہ دل کو تنگ کرے گی حصول کی خواہش
نہ کوئی خدشہ لاحاصل ستائے گا
ہمیں قبول نہ ہو گی صدائے نوحہ گری
کہ پھر وصول نہ ہو گی شکست سادہ دلی
نہ مرحلے وہ شفقت کے پیش جاں ہوں گے
کہ جن کے خوف سے لب تمنا بھول جاتے ہیں
نہ ایسی شب کی مسافت کا سامنا ہو گا
جہاں یہ چراغ وفا نہیں جلتا
لبوں کی شاخ پہ حرف دعا نہیں کھلتا
کہیں پہ کوئی مزاج آشنا نہیں ملتا
عذاب ترک مطلب سے بھی اب مکر جائیں
زمین کی قید سے نکلیں تو اس نگر جائیں
جہاں خدا سے کسی دن مکالمہ ہو گا
جہاں یہ روح کا بھی کوئی حق ادا ہو گا

زیان نے نماز پڑھ کر بہت دل سے دعا مانگی۔ وہ عنیزہ بیگم کا انتظار کر رہی تھی وہ شہر گئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنے وعدے کے مطابق بوا کو ساتھ لے کر

آنا تھا۔ زیان کا ٹائم ہی نہیں گزر رہا تھا۔ وہ نماز کی ادائیگی کے بعد اسی جگہ بیٹھی ہوئی تھی' جب باہر سے چہل پہل اور مخصوص آوازیں آنا شروع ہوئی۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ عنیزہ واپس آگئی ہیں اور سب الرٹ ہوگئے ہیں۔ اس نے اشتیاق سے باہر جھانکا کہ بوا بھی ہوں گی۔ پر عنیزہ اکیلی تھیں اور اسی کی طرف آرہی تھیں۔ مایوسی اور ناکامی ان کے چہرے پہ لکھی تھی۔

"کیا بوا اور زرینہ آنٹی نے آنے سے انکار کردیا ہے۔" سب سے پہلے یہی سوچ اس کے دماغ میں آئی۔ وہ عنیزہ کے بولنے کا انتظار کررہی تھی۔

"وہ لوگ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں اور ان کے نئے گھر کا کسی کو بھی علم نہیں ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوں' اپنا وعدہ پورا نہ کرسکی۔" عنیزہ کی آواز میں ندامت اور شرمندگی تھی جیسے ان کا قصور ہو۔

"بھلا وہ لوگ گھر چھوڑ کر کہاں جاسکتے ہیں۔ میرے آنے تک تو ایسا کچھ نہیں تھا۔ کیوں گئے ہیں وہ ایسے۔" زیان خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ کوئی لفظ عنیزہ کی سماعتوں تک رسائی حاصل نہ کرسکا۔

"آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے آپ کی شرمندگی سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ کوئی نقصان ہے۔ گزر جانے والے لمحوں کی تلافی آپ کر نہیں پائیں گی۔ زرینہ آنٹی نے گزرتے اٹھارہ برس میں اٹھارہ ارب مرتبہ مجھے بتایا ہے کہ تم ایک سال چند ماہ کی تھیں جب تمہاری ماں تمہیں چھوڑ گئی تھی۔ ایک سال ڈیڑھ سال کیا عمر ہوتی ہے۔ بچے کو اپنا تک پتا نہیں ہوتا' ماں ہی ماں اس کے لیے سب کچھ ہوتی ہے۔ بچے کی زبان ضرورتیں وہی سمجھ سکتی ہے۔ زرینہ آنٹی میرے سامنے آفاق' رابیل' مناہل کو چومتیں' گلے لگاتیں' لاڈ کرتیں' اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتیں۔"

بولتے بولتے زیان لمحہ بھر کے لیے رکی اور دھواں دھواں چہرے والی عنیزہ کی سمت دیکھا جن کی آنکھوں میں حیرانی' دکھ' افسوس' بے چارگی' لاچاری' درماندگی سمیت جانے کون کون سا جذبہ رقم تھا۔

"لیکن میری ماں میری ساتھ نہیں تھی۔ انیس سال تک بوا نے میری پرورش کی' ماں بن کر' باپ بن کر' دوست بن کر' ان کے روپ میں میرے سب رشتے تھے۔ وہ میری ماں بھی تھیں' میری بہن بھی' میرا بھائی بھی' میرا باپ بھی اور میرا دوست بھی۔ وہی میری ہمدرد تھیں۔ مجھے ایک ایک پل' ایک ایک لمحہ یاد ہے۔ جب مجھے ماں کی ضرورت پڑی بوا نے میری انگلی تھام لی۔ زرینہ بیگم اور امیر علی میری ماں کے خلاف زہر اگلتے رہے۔ ماں کا نام تک لینے پہ پابندی تھی گھر میں۔ پر بوا رات کی تنہائیوں میں چھپ چھپ کر مجھے ماں کی ماں' جیسی پری کی کہانیاں سناتی رہیں۔ وہ کوئی بری بات کر ہی نہیں سکتی تھیں' انہوں نے میری ماں کو بھی چاند کی پری بنا کر پیش کیا۔ کبھی وہ ماں کو پھولوں کی تتلی کی روپ میں ڈھالتیں تو کبھی بادلوں کی رانی کا خطاب دیتیں' لیکن وہ سب جھوٹ تھا۔ میں پانچ سال کی تھی جب زرینہ آنٹی نے مجھے بتایا کہ تمہاری ماں اپنے عاشق کی خاطر تمہیں اور تمہارے باپ کو چھوڑ گئی تھیں۔ میری وہ عمر ایسی نہیں تھی جو ایسے بوجھ سہار سکتی۔ میں پانچ سال کی عمر سے ہی بالغ ہونا شروع ہوگئی تھی۔

بوا مجھے بتاتیں تمہاری ماں مجبور تھی' لیکن زرینہ آنٹی کہتیں تمہاری ماں عشق کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ بوا پردے ڈالتیں' زرینہ آنٹی پردے چاک کر دیتیں۔ کوئی ماں ایسا نہیں کرتی اپنی سگی اولاد کو ایسے چھوڑ جائے' بھول جائے۔ میری ماں میری ڈیڑھ سال کی عمر میں ہی مرگئی تھی۔ وہ صرف محبوبہ تھی جو مجھے' اپنے شوہر کو لات مار کر محبوب کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اس ماں کے حوالے سے میں نے بہت دکھ اور رسوائی سہی ہے۔ میری ماں تو صرف بوا تھیں۔ میں اپنی ماں کی آمد کا انتظار کررہی تھی۔ اکیلی ہوں نا اس لیے اس موقع پہ ان کی ضرورت محسوس کررہی ہوں۔ آپ میری ماں نہیں ہیں اس لیے آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ آپ کو پتا ہے میں نے اللہ

سے اٹھارہ برسوں میں ایک ہی دعا مانگی ہے۔" عنیزہ یک ٹک اسے دیکھے جارہی تھیں انہیں ایسا لگ رہا تھا ان کی تمام طاقت توانائی اور قوت برداشت ابھی تھوڑی ہی دیر میں ختم ہو جائے گی۔

"آپ جانتی ہیں وہ کیا دعا تھی؟" اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پہ سوال تھا۔ عنیزہ کا سر بے اختیار نفی میں ہلا۔

"وہ یہ دعا تھی کہ اے اللہ مجھے اس عورت سے ملا دے ایک بار اس کی شکل دکھا دے۔ جس نے مجھے پیدا کیا جو مجھے اس دنیا میں لائی۔ پتا ہے میں یہ دعا کیوں مانگا کرتی تھی؟"

ایک بار پھر عنیزہ کا سر پھر نفی میں ہلا۔

"میں یہ دعا اس لیے مانگا کرتی تھی کہ میں اپنی نام نہاد ماں کو بتا سکوں کہ میں اس سے کتنی شدید نفرت کرتی ہوں۔ کل وہ بااختیار، طاقت ور تھی سب حق رکھتی تھی۔ آج میں بھی طاقت ور ہوں اس پوزیشن میں ہوں اپنی نام نہاد ماں کو اپنی زندگی سے ایسے ہی کک آؤٹ کردوں جیسے اٹھارہ سال پہلے اس نے مجھے ٹھوکر ماری تھی۔" زیان کا ہر ہر جملہ ایک ایک لفظ پنا تلا تھا۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ بول رہی تھی۔ عنیزہ جیسے اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی چلی جارہی تھیں۔ کوئی ایسی نفرت بھی کسی سے کرسکتا ہے جیسی زیان نے ان سے کی ہے۔

"آپ یہاں سے تشریف لے جاسکتی ہیں۔" وہ لمحوں میں ہی اجنبی بن گئی تھی۔

"دیکھو پلیز! ایسے مت کہو۔" عنیزہ کا انداز گڑگڑانے والا تھا۔ زیان نے دروازہ پوری قوت سے باہر کی طرف کھولا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی جیسے عنیزہ کی کوئی بات بھی نہ سننا چاہ رہی ہو۔

دروازے کے پیچھے چھپی نہناں کو ادھر ادھر ہونے کی مہلت بھی نہ مل سکی تھی کیوں کہ زیان نے اچانک ہی تو دروازہ کھولا تھا۔ اسی دروازے نے اسے چھپا کر اس کا بھرم رکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اندر سے عنیزہ نکلتیں نہناں دروازے کے پیچھے سے نکل کر ایک طرف چل دی۔ آج اس پہ بڑے بڑے رازوں کا انکشاف ہوا تھا۔ دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ اپنی کچھ چیزیں لینے آئی تھی جب دروازے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے زیان کی آواز سنی۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ دروازے سے کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگی۔ خاموش خاموش زیان کی آواز آج تو سماعتوں کو حیران کررہی تھی وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کررہی تھی کہ اس نے ابھی جو کچھ سنا ہے وہ زیان نے ہی کہا ہے۔

☼ ☼ ☼

آئینے کچھ تو بتا ان کا ہمراز ہے تو
تو نے وہ زلف وہ مکھڑا وہ دہن دیکھا ہے
ان کے ہر حال کا بے ساختہ پن دیکھا ہے
وہ نہ خود دیکھ سکیں جس کو نظر بھر کے کبھی
تو نے جی بھر کے وہ ہر خط بدن دیکھا ہے
ان کی تنہائی کا دل دار ہے تو دم ساز ہے تو
آئینے کچھ تو بتا ان کا ہمراز ہے تو
شوخ معصوم جواں مست تخیل بے پروا
کیا وہ خود اپنے یہ انداز دیکھتے ہیں
ان کے جذبات کی سہمی ہوئی آواز ہے تو
آئینے کچھ بتا ان کا ہمراز ہے تو

ملک ایک محویت کے عالم میں زیان کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ معاذ کچھ دیر پہلے ہی کیمرا اسے دے کر گیا تھا۔ ایک نے ایک ایک کرکے سب تصویریں دیکھ ڈالیں۔ پیلے کپڑوں، پیلے دوپٹے کے ہالے میں موتیوں کے گجروں سمیت وہ پہلے سے بڑھ کر دلفریب اور حسین لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے ابھی پلکوں کو چھوا تو رو پڑے گی۔ اس کے پورے چہرے اور آنکھوں میں اداسی رچی ہوئی تھی۔ ایک تکیہ بازوؤں میں دبائے لیٹا ہوا زیان کے کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سب لائٹیں آن تھیں پر وہ خود نیچے تھی۔ مایوں بیٹھنے کے بعد اس کا داخلہ اوپر ممنوع ہو گیا تھا۔ اس لیے ایک ہفتے سے ایک نے اس کی کوئی

جھلک نہیں دیکھی تھی۔ آخری بار جب وہ اس کے کمرے میں گیا تھا تب اسے ملا تھا اور دیکھا تھا۔ اسے شادی پہ اعتراض نہیں تھا تب ہی دونوں طرف سے جھٹ پٹ تیاری ہوئی۔ پرسوں زیان نے مسز ایبک بن کر اس کے پاس آجانا تھا۔ ایبک کے پاس اس موقعے پر بہت سے سوالات تھے' جن کے جوابات اسے زیان سے حاصل کرنے تھے۔ فی الحال تو اسے معاذ کا شکریہ ادا کرنا تھا جس نے زیان کی فوٹو بنا کر اسے دکھائی تھیں۔

افشاں بیگم کو وہ بھا گئی تھی اور ملک ایبک کو حیرت ہو رہی تھی کہ امی جان نے جب زیان کے بارے میں اس کی رائے لی تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا' بخوشی رضامندی دی۔ کیا اس میں زیان کے بے تحاشا حسن کا عمل دخل تھا یا اس کی بے رخی ایبک کو بھا گئی تھی یا پھر اسے واقعی زیان اچھی لگی تھی۔ اسے پہلے بابا جان نے احمد سیال کی بیٹی کے لیے اپنی پسندیدگی ظاہر کی تھی تب ایبک دل سے آمادہ نہیں تھا۔ پر زیان کے معاملے پہ ایسا نہیں ہو۔ افشاں بیگم کو آگاہ کرتے ہوئے وہ پوری طرح خوش اور مطمئن تھا۔ ملک ایبک نے اپنے سب جذبے' سب محبتیں' وچاہتیں اپنی شریک حیات کے لیے سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔ زیان یقیناً "بہت خوش قسمت تھی جو ایبک اس کا ہم سفر بن رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

آج زیان کی طرف سے ملک ایبک کی مہندی جانی تھی۔ سب تیار ہو رہے تھے۔ گھر میں زیان کے ساتھ عمر رسیدہ نوکرانیاں تھی اور ساتھ ملک ایبک کی ایک رشتے کی خالہ تھیں۔ سب ملک ایبک کی طرف جا چکے تھے۔ ایبک کی خالہ اس کے پاس سے اٹھ کر کسی کام سے باہر نکلی تھیں۔ ملک محل کے دوسرے رہائشی حصے سے ڈھول باجوں شور شرابے' ہنسی مذاق کی آوازیں' ہوا کے دوش پہ سفر کرتی بخوبی اس کے کانوں تک رسائی حاصل کر رہی تھیں۔ بلند آواز میں بجتے شادی بیاہ کے گانوں کی آواز اس کے علاوہ تھی جو اس کی سماعتوں کو گویا چیر رہی تھیں۔

وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اس کا ویران اداس سراپا بڑا واضح تھا۔ پیلے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس اسے اپنا چہرہ کچھ اور بھی پیلا لگ رہا تھا۔ خود کو آئینے میں تکتے تکتے اسے ملک ایبک اور اس کی باتیں یاد آنے لگیں جب وہ شادی کے بارے میں رضامندی معلوم کرنے آیا تھا۔ وہ پچھتا رہی تھی' کیوں ہاں کی ہے؟ اس کے پاس انکار کرنے کا سنہرا موقعہ تھا جو ملک ایبک کی معرفت اسے آسانی سے حاصل ہوا تھا۔ لیکن اس نے اپنی بیوقوفی سے گنوا دیا۔

وہ ایک بار انکار کر کے ملک ایبک کے تاثرات تو دیکھتی۔ بہت ناز ہوگا ملک ایبک کو خود پہ' اپنی شخصیت پہ' اپنے خاندان پہ۔ جب وہ انکار کرتی تو بے چارے ایبک کا سارا غرور' ناز مٹی میں مل جاتا۔ عنیزہ بیگم اس کی نام نہاد ماں' اسے اذیت دینے کا اچھا بہانہ تھا اس انکار سے ان کی کتنی توہین ہوتی وہ ملک جہانگیر' افشاں بیگم اور تو اور ملک ارسلان جیسے محبوب شوہر کی نگاہوں سے بھی گر جاتیں۔ عین وقت پہ۔ جب بارات لانے کی تیاری ہو رہی ہے پورے گاؤں کو رشتہ داروں کو ملک ایبک اور زیان کی شادی کی خبر ہے' وہ خوشی منانے ملک محل میں جمع ہوئے ہیں' وہ اس موقعے پہ شادی سے انکار کرتی ہے تو کیسی رسوائی ہوتی ملک خاندان کی۔ بے چاروں کے اٹھے سر جھک جاتے۔ مگر اپنی بے وقوفی یا جلد بازی سے اس نے سب ضائع کر دیا۔ زیان کے پاس پچھتانے کے لیے بہت کچھ تھا۔

اپنے اور ایبک کے ملن کے بارے میں سوچنے کے بجائے وہ بدلے' انتقام اور اذیت دینے کے طریقوں پہ غور کر رہی تھی۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ گھٹن سے بھر گیا۔ اس نے بے اختیار میکانکی انداز میں سب کھڑکیاں وا کر دیں اور خود ایک کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر لمبے لمبے گہرے سانس لینے لگی۔ اتنے میں آہٹ ہوئی۔ ملک ایبک کی رشتے کی خالہ واپس لوٹ آئی تھیں۔ اسے یوں کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ان کی فکر و حیرانی بڑھی۔

"پتر کھڑکی کھول کے کیوں کھڑی ہو۔ ہٹو۔ ادھر سے اور اپنا چہرا چھپاؤ۔" انہوں نے بڑے آرام سے کھڑکیاں بند کردیں۔ زیان کو دل میں بے پناہ غصہ آیا۔

"تمہاری شادی میں کل کا دن باقی ہے ابھی سے اپنا چہرہ کھول کر کمرے سے باہر مت جھانکو تم مایوں کی دلہن ہو۔ سو چیزیں چمٹ جاتی ہیں۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو سب میری جان کو آجائیں گے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بول رہی تھیں۔

زیان خاموشی سے کچھ کہے بغیر بیڈ پہ جاکر بیٹھ گئی۔ اسے ایک کی رشتے کی خالہ سے اختلاف تھا' پر وہ کچھ بولنا نہیں چاہ رہی تھی۔ ادھر وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اس کی معصومیت اور بے خبری پہ ترس کھارہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

مہندی کا ہنگامہ تھمے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی۔ عنیزہ واپس آچکی تھیں۔ ذہنی اور جسمانی تھکن نے انہیں جیسے نچوڑ کے رکھ دیا تھا۔ ان کی اذیت بھی حد سے سوا تھا۔ زیان نے زندگی میں پہلی بار ان سے اتنی طویل اور مکمل بھرپور گفتگو کی تھی۔ ہر ہر جملہ' ہر ہر لفظ' برچھی بن کر ان کے دل میں اترا تھا۔ وہ تو اس کی ماں ہی نہیں تھیں' بلکہ اپنے آشنا کے ساتھ جانے والی ہوس پرست عام سی عورت تھی۔ وہ عورت جو اپنی ڈیڑھ سال کی بیٹی کا خیال کیے بغیر ترحم کھائے بغیر اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ عنیزہ خالی الذہنی کے عالم میں کسی غیر مرئی چیز کو دیکھ رہی تھیں آنسو سلسلہ وار ان کی آنکھوں سے رواں تھے۔

انہیں خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب ملک ارسلان کمرے میں آئے۔ وہ اس وقت چونکیں جب انہوں نے عنیزہ کے کندھے پر تسلی دینے والے انداز میں ہاتھ رکھا۔ وہ بری طرح رو رہی تھیں۔ ارسلان ان کے پاس بیٹھ گئے۔

"تم زیان کی خاطر رو رہی ہو۔ ماں ہو ناں۔" عنیزہ نے دہل کر جیسے ان کی طرف دیکھا کیا اس دن کی باتیں انہوں نے سن تو نہیں لی تھیں۔ زیان نے ماں کے حوالے سے کیسی کیسی باتیں کی تھیں یقیناً" ارسلان کو غصہ آیا ہو گا کیونکہ وہ عنیزہ سے بے پناہ پیار کرتے تھے اور زیان کی باتوں میں کوئی صداقت بھی نہیں تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ چکے تھے عنیزہ کے بہتے آنسو انہوں نے اپنے ہاتھ سے صاف کیے۔

"ہر ماں بیٹی کی رخصتی پہ روتی ہے اور تم خوش قسمت ہو کہ ہماری بیٹی رخصت ہو کر کہیں دور نہیں جارہی ہے۔ وہ اس گھر میں ہماری آنکھوں کے سامنے رہے گی۔ اس لیے تم دل چھوٹا مت کرو۔" وہ قدرے پر سکون ہوئیں صد شکر انہوں نے اس دن والی باتیں نہیں سنی تھیں۔ عنیزہ نہیں چاہتی تھیں ارسلان کے دل میں زیان کی طرف سے کوئی میل آئے۔

"تم سو جاؤ۔ کل کا دن بہت مصروف ہو گا۔" انہوں نے تکیے درست کرتے ہوئے عنیزہ کو کندھوں سے پکڑ کر بستر پر لٹایا۔ ارسلان تھکے ہوئے تھے پندرہ منٹ بعد ان کے ہلکے ہلکے خراٹے گونجنا شروع ہو گئے جو اس بات کا ثبوت تھے کہ وہ گہری نیند سو چکے ہیں۔ عنیزہ نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر آہٹ پیدا کیے بغیر بستر سے اتر کر کھڑکی کے پاس بڑی ایزی چیئر پہ بیٹھ گئیں۔ آج کی رات نیند آنے والی نہیں تھی۔ یہ کرب و اذیت کی رات تھی' تکلیف دہ ماضی کی طرف اذیت ناک سفر کی رات تھی۔ انہوں نے اپنے تئیں ماضی کی طرف کھلنے والے ہر دروازہ پر' کھڑکی پر روزن بند کردیا تھا' پر ماضی زیان کی صورت زندہ تھا۔

☆ ☆ ☆

قاسم صاحب بہت خوش تھے۔ وہ کھانے پینے کی انواع و اقسام کی اشیاء لے کر آئے تھے۔ عنیزہ نے اس سے پہلے انہیں بہت کم خوش دیکھا تھا۔

قاسم صاحب بیٹی کے رشتے کی طرف سے بے حد پریشان تھے۔ ان کے دیرینہ دوست نے ان سے امیر علی کے خاندان کا ذکر کیا تھا اور وہ لوگ عنیزہ کو دیکھنے

آرہے تھے۔ قاسم صاحب بہت خوش تھے۔ ان کی دلی خوشی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

امیر علی کے گھر سے ان کی والدہ' دور پرے کے رشتے کے چچا اور دو رشتہ دار خواتین آئی تھیں۔ امیر علی کے گھر والوں کو عنیزہ بے پناہ پسند آئی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی ان کی کوشش تھی کہ قاسم صاحب سے جواب لے کر جائیں۔ مگر انہوں نے رسمی طور پر سوچنے کی مہلت طلب کی تھی۔ مہمان بہت خوش خوش رخصت ہوئے مگر عنیزہ کے دل میں سناٹے پھیلنا شروع ہو چکے تھے۔

ارسلان پاکستان سے باہر تھا۔ اس سے بہت کم رابطہ ہو پاتا تھا۔ خط لکھنے سے اسے عنیزہ نے خود ہی منع کیا ہوا تھا۔ فون ان کے گھر نہیں تھا۔ عنیزہ کو جب بھی ارسلان سے بات کرنی ہوتی تو اپنی ایک کلاس فیلو کے گھر چلی جاتی جسے ارسلان اور عنیزہ کے دلی معاملات کا علم تھا۔ ارسلان اس مشترکہ کلاس فیلو کو فون کر کے دن اور ٹائم بتا دیتا بمقررہ ٹائم پہ عنیزہ کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاتی۔ ابھی دو دن پہلے ہی تو ارسلان سے اس کی بات ہوئی تھی وہ اپنے امتحانات کی تیاری میں مصروف تھا۔ زیادہ دیر بات نہیں ہو پائی تھی۔ وہ بے حد پریشان تھی۔ قاسم صاحب اپنی خوشی میں اس کی اداسی کو محسوس ہی نہیں کر پائے۔ وہ اس کے پاس بیٹھے امیر علی کی فیملی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

"امیر علی بہت اچھے خوش حال خاندان سے ہے۔ میری خواہش تھی کہ میری بیٹی خاندانی لوگوں میں بیاہ کر جائے۔ اللہ نے جیتے جی میری خواہش پوری کر دی ہے۔ تمہاری ماں کے بعد میں دعائیں مانگتا تھا کہ میری بیٹی عزت سے اپنے گھر کی ہو جائے۔ میں زندگی کا بوجھ اکیلے ڈھوتے ڈھوتے تھک گیا ہوں۔" بولتے بولتے قاسم تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوئے تو عنیزہ نے ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ ایک پریشان حال باپ کا چہرہ تھا جس پہ وقت اور مسائل نے بے پناہ جھریاں قبل از وقت ہی ڈالی تھیں۔

"تمہاری ماں زندہ ہوتی تو خود تم سے یہ سب باتیں کرتی' سمجھاتی۔" وہ پھر گویا ہوئے۔ عنیزہ کا چہرہ اور تاثرات جیسے جامد ہو رہے تھے۔ وہ سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے بیٹھی تھی۔ قاسم صاحب سمجھ رہے تھے وہ شرما رہی ہے۔

"میں جلدی تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں تاکہ عزت سے مر سکوں۔" وہ آخری جملہ بول کر اس کے پاس سے اٹھ گئے تھے۔

آج سے پہلے وہ سوچا کرتی تھی کہ اگر ارسلان سے دور ہو گئی تو مر جائے گی ان کے درمیان کوئی تیسرا آیا تو وہ سہ نہیں پائے گی اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا' پھٹ جائے گا۔ مگر اب امیر علی اس کا امیدوار بن کر درمیان میں آگیا تھا اور اس کا دل ریزہ ریزہ بھی نہیں ہوا تھا۔

ابو خوش تھے' اس کی باعزت رخصتی کے خواب آنکھوں میں سجائے بیٹھے تھے۔ وہ بے بس و مجبور بت ہی تو تھی۔ صرف کڑھ سکتی تھی اپنے خوابوں کا ماتم کر سکتی تھی اور وہ کر رہی تھی۔

قاسم صاحب کو بہت جلدی تھی وہ امیر علی کے گھر گئے ہوئے تھے۔

عنیزہ' قاسم صاحب کے جانے کے بعد اپنی کلاس فیلو راحت سے ملنے چلی گئی۔ وہ عنیزہ کا ویران اجڑا سراپا دیکھ کر ہی جان گئی کہ وہ وقت آن پہنچا ہے' جو عنیزہ جیسی متوسط طبقے کی لڑکیوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔ عنیزہ کے آنسو اس کے دل کو موم کر رہے تھے۔ ملک ارسلان کے دیئے گئے نمبر پہ عنیزہ نے راحت کے گھر بیٹھ کر کئی بار کال کی لیکن نمبر نہیں مل رہا تھا۔ امریکہ کے جس شہر میں ملک ارسلان بغرض تعلیم مقیم تھا وہاں شدید سردی اور کئی کئی انچ پڑنے والی برف نے نظام زندگی مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔

عنیزہ کو پورا یقین تھا ارسلان سے اس کی بات ہو جائے تو وہ فوراً "سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لوٹ آئے گا۔ پلک جھپکتے سب بدل جائے گا' وہ اپنے گھر والوں کو راضی کر کے لے آئے گا اور وہ دونوں اس دنیا میں رہیں گے جو انہوں نے اپنے خوابوں میں سجا رکھی

ہے۔

ارسلان سے بات کرنے کی کوشش مکمل طور پر ناکام ہوگئی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر لوٹی۔ قاسم صاحب ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ عنیزہ تکیے میں منہ چھپا کر روتی رہی۔ قاسم صاحب امیر علی کے گھر سے کھانا کھا کر وہیں سے ہی اپنے دوست کے ساتھ اس کے گھر چلے گئے تھے۔ انہیں بیٹی کی شادی' دیگر معاملات میں ان سے مشورہ کرنا تھا۔

اگلے دن قاسم صاحب نے امیر علی کے رشتے کے لیے ہاں کہلوادی تھی۔ عنیزہ کا رونا دھونا' آنسو' آہیں سب بے کار گئے۔ سب فریادیں دل میں ہی دبی رہ گئیں۔ اس کی اور ارسلان کی محبت کا پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا چکا تھا۔ امیر علی کے گھر والوں کو بہت جلدی تھی۔ وہ جھٹ منگنی پٹ بیاہ کے چکر میں تھے۔

ارسلان ایگزامز سے فارغ ہوا تو عنیزہ کی یاد دل پہ بری طرح حملہ آور ہوئی۔ اسے پتا تھا' وہ اس کے فون نہ کرنے پہ سخت ناراض ہوگی۔ ایک تو ایگزامز کی مصروفیت تھی اوپر سے قدرتی آفت کی وجہ سے موسم خراب تھا وہ چاہنے کے باوجود بھی عنیزہ سے رابطہ نہیں کرپایا تھا۔

اس نے راحت کو کال کی۔ عنیزہ کی بابت پوچھنے پہ جو جواب ملا اس نے ارسلان کے ہوش ہی اڑادیے دل کی دنیا جو اس نے بڑے ارمانوں سے ننھے منے حسین خوابوں سے سجائی تھی وہ اجڑ گئی تھی۔ راحت بتارہی تھی کہ آج عنیزہ کا ولیمہ ہے وہ اس میں شرکت کے لیے تیار ہورہی تھی۔ ارسلان سائیں سائیں کرتے کانوں سے سن رہا تھا' الفاظ تھے کہ پگھلا ہوا سیسہ۔

اس پہ شدید نوعیت کا ڈپریشن حملہ آور ہوا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے رونے لگتا۔ ملک جہانگیر چند دن میں ہی اس کے پاس امریکہ پہنچ گئے تھے۔ ان کے گلے لگ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رویا۔

''بھائی جان میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا عنیزہ کے بغیر۔ وہ چلی گئی ہے میں نے بہت دیر کردی ہے ناں۔''

وہ اونچا لمبا مرد بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ ملک جہانگیر نے پہلی بار اسے ایسے دیکھا تھا۔ وہ ڈر گئے تھے کہ ارسلان خود کو نقصان نہ پہنچالے۔ وہ اسے اپنے ساتھ پاکستان لے آئے۔ یہاں بھی اس کی وہی حالت تھی بلکہ اب تو وہ پہلے سے زیادہ قابل رحم ہوگیا تھا۔ یہاں اسے عنیزہ اور بھی زیادہ یاد آنے لگی تھی۔ وہ بری طرح روتا اپنے بال نوچتا۔ وہ پاگل پنے کی حدود کو چھو رہا تھا۔ ملک افتخار بیٹے کے اس دکھ کو لے کر قبر میں ابدی نیند جاسوئے۔

ملک ارسلان پہلے سے بھی زیادہ ڈپریشن کا شکار ہوگیا تھا۔ وہ پہروں خاموش رہتا خلاؤں میں گھورتا۔ افشاں بیگم اور ملک جہانگیر نے اسے شادی کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی پر وہ تو کف اڑانے لگا' اسے صرف عنیزہ چاہیے تھی۔

ملک جہانگیر نے بہترین ڈاکٹرز اور سائیکاٹرسٹ سے رجوع کیا انہوں نے اینٹی ڈپریشن میڈیسن کے نام پہ سلیپنگ پلز دے دیں۔ ملک ارسلان سویا رہتا۔ اس کے اعلا تعلیم حاصل کرنے کا خواب آنکھوں اور دل تک ہی محدود رہ گیا تھا۔ ملک جہانگیر اس کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتے۔ وہ دنیا سے بے خبر ہوش و حواس سے بے گانہ ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شادی کے بعد امیر علی کے ساتھ عنیزہ کی زندگی نارمل ڈگر پہ رواں دواں تھی۔ باقی سب ٹھیک تھا بس عنیزہ کے دل کا ایک حصہ ویرانیوں کی زد میں تھا۔ اپنے گھر سے روتی دھوتی سسرال میں آئی تھی۔ امیر علی کے سر پہ اس کے حسن کا جادو چڑھ چکا تھا۔ شادی کے شروع میں وہ سمجھ ہی نہیں پایا کہ عنیزہ اس قدر اداس اور چپ چپ کیوں رہتی ہے۔ حالانکہ وہ گھر کے سب کاموں میں حصہ لیتی' سب کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہنستی بولتی مگر اکثر اوقات ایسا لگتا جیسے یہ مسکراہٹ مانگے کی ہے اس کے قہقہے مستعار لیے ہوئے ہیں۔

امیر علی کا اپنا کاروبار تھا وہ دس بجے ناشتا کر کے آرام سے آفس جاتا۔ اس کے جانے کے بعد عنیزہ بوا رحمت کے ساتھ ان کے نہ نہ کرنے کے باوجود کاموں میں لگ جاتی۔ کپڑے دھونے پہ آتی تو گھر بھر کے کپڑے جمع کر لیتی کھڑکیوں دروازوں کے پردے تک اتار لیتی۔ حالانکہ اسے کپڑے دھونے کی ضرورت نہیں تھی اس مقصد کے لیے امیر علی نے تین تین ملازمائیں رکھ چھوڑی تھیں۔

عنیزہ خود کو کاموں میں غرق کر کے ارسلان کی یادوں سے پیچھا چھڑانا چاہ رہی تھی۔ اس نے پوری ایمانداری کے ساتھ امیر علی کے ہمراہ زندگی کا یہ نیا سفر شروع کیا تھا۔ گھر میں سب ہی اس سے خوش تھے۔ بوا رحمت تو اسے بہت پیار کرتی تھیں۔ جب بھیگی بھیگی آنکھوں والی عنیزہ انہیں بہت اچھی لگتی تھی۔

اس نے کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ امیر علی کے ساتھ شادی کے چند ماہ بعد ہی عنیزہ کی ساس کا انتقال ہو گیا۔ اسی دوران اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے خوش خبری سنائی تو امیر علی کے تن من میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مگر عنیزہ کی کھوئی کھوئی حالت مستقل طور پہ انہیں ڈسٹرب کرنے لگی۔ پتا نہیں جتے وقت آنکھیں عنیزہ کا ساتھ کیوں نہیں دیتی تھیں۔ وہ روبوٹ کی طرح ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتی جس میں صرف جسم اس کا ساتھ دیتا اور روح دور کہیں پیچھے بہت پیچھے ارسلان کے پاس رہ جاتی۔

ویسے بھی وہ امیر علی کے پاس ان کے گھر میں صرف اپنا جسم ہی لے کر تو داخل ہوئی تھی، روح ارسلان کے پاس رہ گئی تھی۔ اس کے خواب ارسلان کے پاس رہ گئے تھے۔ وہ محض گوشت پوست کا ڈھیر تھی جس میں کوئی جذبہ اور احساس نہیں تھا۔

قاسم صاحب اسے ملنے آئے تو اسے اتنے بڑے گھر کی مالکن کے روپ میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ عنیزہ کی اندرونی حالت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اب تو امیر علی اس کی خاموشی سے چڑنے لگے تھے۔ ان ہی خاموشیوں کے درمیان عنیزہ نے بیٹی کو جنم دیا۔

☼ ☼ ☼

ملک جہانگیر اس لڑکی کا پتا چلانے کی کوشش کر رہے تھے جس کی وجہ سے ملک ارسلان ان کا لاڈلا چھوٹا بھائی ان حالوں کو پہنچا تھا۔ اس تلاش کے دوران ان کے ہاتھ ارسلان کی ڈائری لگی جس میں بہت سے نمبر لکھے ہوئے تھے۔ اس میں راحت کا نمبر بھی تھا۔ وہ ایک دن سراغ لگانے کے بعد خاموشی سے راحت کے گھر پہنچ گئے۔ وہ بے حد خوف زدہ ہوئی۔ ملک جہانگیر کا کروفر اور شاہانہ جاہ و جلال بتا رہا تھا کہ وہ عام سی شخصیت نہیں ہیں۔ جہانگیر سمجھ رہے تھے کہ راحت ہی وہ لڑکی ہے جس کی وجہ سے ارسلان کی یہ حالت ہوئی ہے، پر راحت سے ملنے کے بعد ان کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔

راحت سے ملنے کے بعد ان کی مایوسی بڑھ گئی تھی امید کے سب جلتے دیے ایک ایک کر کے بجھ گئے تھے۔ جس لڑکی کی محبت میں ارسلان سودائی ہو گیا تھا وہ تو اپنا گھر بسا کر ایک بیٹی کی ماں بھی بن چکی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے واپس لوٹے تھے۔

ملک جہانگیر کی آمد اور ارسلان کی موجودہ حالت راحت کے لیے بہت بڑی خبر تھی۔ وہ عنیزہ کو بتانے کے لیے بے چین تھی۔

امیر علی حسب معمول آفس میں تھے۔ شام کو راحت عنیزہ کے پاس پہنچی۔ ملک جہانگیر کی آمد سے لے کر ملک ارسلان کی حالت تک اس نے الف تا یے سب عنیزہ کے گوش گزار کر دیا۔

اسے جوش جذبات میں امیر علی کے آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ راحت کی زبان سے نکلا ایک ایک لفظ سن چکا تھا۔ پر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کچھ دن تک اس نے بہت مشکل سے خود پہ قابو پائے رکھا اور اپنا رویہ نارمل رکھا۔ مگر کب تک اس کے اندر جوالا مکھی ابل رہا تھا۔ اس نے بہت دھیمے سے نرمی سے عنیزہ سے باز پرس کی۔ وہ ابھی اتنی پختہ اور چالاک

نہیں ہوئی تھی کہ کچھ چھپا پاتی۔ اس نے بہت سادگی سے ارسلان کے یونیورسٹی میں ملنے اور پھر باہم پسندیدگی کا بتایا۔ اس کے دل میں چور نہیں تھا کیونکہ اس نے اپنی زندگی ایمان داری کے ساتھ امیر علی کے گھر سے شروع کی تھی۔ ٹھیک تھا اس کے دل اور یادوں میں ارسلان کا قبضہ تھا پر اس نے امیر علی کی امانت میں خیانت نہیں کی تھی نہ ایسا کرنے کا سوچا تھا۔

امیر علی جیسے تنگ دل' تنگ نظر شوہر کے نزدیک اس کا جرم ناقابل معافی تھا۔ حالانکہ وہ عنبزہ کا ماضی تھا' خود امیر علی کا ماضی ایسی پسندیدگی سے خالی نہیں تھا پر عنبزہ عورت تھی اس لیے سزا کے لائق تھی۔ اس نے اسی ٹائم سزا سنادی۔ کھڑے کھڑے عنبزہ کو گھر سے نکال دیا۔ ایک سال تین ماہ کی زیان کو امیر علی نے عنبزہ کی گود سے چھین لیا تھا۔ عنبزہ روئی' تڑپی' فریادیں کیں' واسطے دیے پر امیر علی کا دل ہمیشہ کے لیے پتھر ہو چکا تھا۔ اسے باپ کے گھر زبردستی بھیجنے کے ایک ہفتہ بعد اس نے عنبزہ پہ وہ ستم بھی توڑ ڈالا جس سے ہر شریف عورت ڈرتی ہے۔ امیر علی نے اسے طلاق دے دی تھی۔ عنبزہ نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اسے زیان مل جائے پر وہ کمزور عورت تھی' ساتھ قاسم صاحب کی اپروچ نہ ہونے کے برابر تھی۔ امیر علی بزور طاقت جیت گیا۔ طلاق کے ساتھ بدنامی و رسوائی اور بدکرداری کا طعنہ بھی امیر علی نے عنبزہ کی جھولی میں ڈالا تھا۔ ایک مرد ہونے کے ناطے اس نے وہ سب کیا تھا جو وہ کر سکتا تھا۔ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصوروار تھی۔ اس پہ دنیا بھر کے جھوٹے الزامات تھوپ کر امیر علی سچا اور مظلوم بن گیا تھا۔ خاندان میں ہر کوئی اسے اپنی بیٹی دینے کے لیے تیار تھا۔

حالانکہ عنبزہ نے اپنا گھر بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی وہ امیر علی کے پاؤں پہ اپنا سر تک رکھ کر دیکھ چکی تھی۔ پر وہ ماضی بھولنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ شادی کے بعد عنبزہ کا ملک ارسلان کے ساتھ کوئی رابطہ بھی نہیں تھا۔ اسے امیر علی نے معاف نہیں کیا تھا۔ کیونکہ خدا معاف کرتا ہے اور وہ انسان تھا عام سا انسان۔

☼ ☼ ☼

زیان نے احساس سے عاری' خالی دل خالی جذبوں کے ساتھ نکاح نامے پہ سائن کیے۔ نینال اس کی پشت پہ کھڑی اس کے حنائی ہاتھوں میں تھامے سنہری پین کو دیکھ رہی تھی' جس سے زیان نے نکاح نامے پہ سائن کیے تھے۔ زیان کی پشت اس کی سمت تھی۔ نکاح کے لیے مولوی صاحب دیگر مردوں کے ہمراہ جن میں ملک جہانگیر' ملک ارسلان اور دونوں کے خاندان کے اور مرد تھے' زیان کے پاس آئے تھے۔ ایجاب و قبول اور نکاح کے بعد وہ جاچکے تھے۔ سب عورتیں' عنبزہ کو مبارک باد دے رہی تھیں۔ نینال وہاں کھڑی زیان کی پشت کو گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے لپک رہے تھے۔ زیان کی طرف نفرت سے اٹھی جھلستی نگاہیں' معاذ کے دماغ پہ نقش ہو گئی تھیں۔ وہ اس کا دیکھنا' دیکھ چکا تھا۔ معاذ کے دماغ میں ایک لفظ گونجا تھا خطرہ۔ اس وقت بہت رش تھا' سب عورتیں زیان کو دیکھنے کے لیے ٹوٹی پڑی تھیں۔ معاذ کے پاس سوچنے کے لیے غور کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

ملک ایبک کا بیڈ روم بہت شان دار تھا۔ پردے' فرنیچر' کارپٹ سے لے کر ڈیکوریشن پیسز اور جہازی سائز بیڈ تک ایک ایک چیز کمرے کے مکین کے ذوق کو سراہ رہی تھی' خواب آگیں فضا میں مدھر گیت کا ارتعاش تھرتھرا رہا تھا۔

یہ پربتوں کے دائرے' یہ شام کا دھواں
ایسے میں کیوں نہ چھیڑ دیں دلوں کی داستان

یہ روپ' یہ رنگ' یہ چھبن چمکتا چاند سا بدن
برا نہ مانو تم اگر تو چوم لوں کرن کرن

کہ آج حوصلوں میں ہیں بلا کی گرمیاں
یہ پربتوں کے دائرے' یہ شام کا دھواں

معاذ کچھ دیر پہلے زیان کے پاس آیا تھا' اسی نے میوزک سسٹم آن کیا تھا' یہ اسی کی شرارت تھی کہ وہی گیت بار بار ریوائنڈ ہو رہا تھا۔

ملک ایبک نے اندر قدم رکھا تو ہر شے بولتی محسوس ہوئی' یہاں تک کہ خاموشی بھی سرگوشیاں کر رہی تھی۔ زیان کا وجود قابل توجہ اور پرکشش تھا۔ زیان کی آنکھوں میں سرخی چھلک رہی تھی۔ جب وہ زیان کے قریب جاکر بیٹھا تو تب اس نے زیان کی آنکھوں کی لالی واضح طور پہ دیکھی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے سوجے نظر آرہے تھے۔ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی زیان کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پہ دھرے تھے۔ ایبک نے ایک پل میں دل ہاتھوں سے نکلتا محسوس کیا۔ وہ اتنی حسین اور دل کش نظر آرہی تھی کہ ایبک کے حواس کی نبضیں سست پڑگئی تھیں۔

آج سے پہلے جب بھی زیان سے ملاقات یا آمنا سامنا ہوا اور وہ "میں ہی میں ہوں۔" کی عملی تفسیر بنی ملی تھی' رسائی سے کوسوں دور' جس کو چھونے کا سوچنا بھی محال تھا۔ آج وہ اپنی تھی ہمیشہ کے لیے اس کی ملکیت بن چکی تھی اور وہ احساس ملکیت کے نشے میں سرشار تھا۔ ملکیت کو عملی طور پہ ثابت کرنے کے لیے اس نے زیان کے گھٹنوں پہ دھرا اس کا ایک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھاما' شاید وہ یقین کرنا چاہ رہا تھا کہ زیان اس کے پاس ہی ہے۔ خاموشی اور بھی کھل کر کلام کر رہی تھی۔ رنگ' خوشبو اور روشنی کا ایک مجسم وجود ایبک کے سامنے اس کی دسترس میں تھا۔

ایبک نے زیان کے پاس سے ایک تکیہ اٹھا کر اپنے کندھے کی طرف رکھا اور قدرے جھک کر نیم دراز ہوگیا۔ اب زیان کا چہرا اس کے بالکل سامنے اور قریب تھا۔ اس کے حنائی پاؤں ایبک کے دائیں بازو کو چھو رہے تھے۔ اس کے پاؤں میں بجی پائل تک کو وہ بڑی وضاحت سے دیکھ اور چھو سکتا تھا۔ آج ایبک کی نگاہوں کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ زیان نے ابھی تک اس سے نظر نہیں ملائی تھی پر وہ اس کے بہت قریب تھا۔ زیان کے دل کی دھک دھک اسے اپنی سماعتوں کے قریب تر محسوس ہو رہی تھی۔ زیان کے نچلے ہونٹ کے کنارے کالا تل اس کے لبوں کی خفیف تھرتھراہٹ سے لرز رہا تھا۔ ایبک نے اچانک اپنی انگشت شہادت وہاں رکھی۔ انگلی کی پور تلے اس نے بھی وہ لرزاہٹ محسوس کی۔

"میں کہاں سے آغاز کروں کہ مجھے کب کہاں' کس وقت تم سے محبت ہوئی؟" ایبک کی نگاہ اس کے ایک ایک نقش کو چھو رہی تھی۔ وہاں شوق کا گرمئی جذبات کا ایک جہاں آباد تھا۔ زیان کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ تب اس نے پہلی بار نگاہیں اٹھا کر ایبک کی طرف دیکھا۔

ایبک کی نگاہوں میں بڑی خوب صورت التجا میں اور گستاخ جذبے مچل رہے تھے۔ اس نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر زیان کی پلکوں کو چھوا تو اس کا ہاتھ پلکیں اور پورا وجود گویا بھونچال کی لپیٹ میں آگیا۔ ایبک نے کندھا اوپر کرتے ہوئے زیان کا بھاری آنچل اس کے سر سے کھسکایا وہ قدرے پیچھے ہٹی' لیکن آج وہ ہار ماننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ زیان کے لبوں سے پہلی چیخ نکلی اس کے بعد اس کے حلق سے نہ رکنے والی چیخوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ رات کے گہرے ہوتے سناٹے میں یہ آواز ایسی دلخراش تھی جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو۔ ملک محل کے مکین ایک ایک کرکے اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔

ملک ایبک مضبوط اعصاب کا مالک اور بے مثال قوت برداشت رکھتا تھا' اس وقت اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہوگیا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیے۔ زیان کے بالوں کے خوب صورت اسٹائل کا حشر ہوچکا تھا' بالوں میں سجے پھول' پتی پتی بکھر گئے تھے۔ لپ اسٹک پھیل کر لبوں کے کنارے سے باہر نکل رہی تھی۔ مسکارے اور آئی شیڈ اور دیگر میک اپ کا بھی یہ ہی حال تھا جو بڑی مہارت اور نفاست سے کیا گیا تھا۔

دوپٹا سر سے اتر کر بیڈ کے نیچے جا پڑا تھا۔ اس کی وحشت زدہ لال لال آنکھیں بے قراری سے گردش کر رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے تک وہ دلہن کے خوب صورت ترین روپ میں تھی۔ مگر اب اس ہیبت کذائی میں وہ خون آشام چڑیل لگ رہی تھی۔

دوڑتے قدموں اور شور کی آوازیں ایبک کے کمرے کے دروازے تک آ کر قدرے تھم گئی تھیں۔ دروازہ زوردار طریقے سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ اس اچانک لگنے والے شاک سے ایبک کے حواس ماؤف سے ہو رہے تھے۔ اس نے اسی کیفیت میں دروازہ کھولا۔ اس کے کھلنے کی دیر تھی' عورتوں کا ریلا اندر گھس آیا۔ عورتوں کے پیچھے ملک جہانگیر اور معاذ بھی تھے' پر وہ مصلحت کے تحت دروازے سے باہر ہی رک گئے تھے۔ پر جب اندر کا منظر ملاحظہ کیا تو وہ بھی داخل ہو گئے۔ زیان بے ہوش ہو کر بیڈ پہ عجیب سے انداز میں لڑھک گئی تھی۔ ہر کوئی ایبک سے پوچھ رہا تھا' کیا ہوا' کیا ہوا۔ وہ بولنے میں سخت دقت محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت لفظ اس کی گرفت سے بھاگ گئے تھے۔ زیان کی حالت ہی بتانے کے لیے کافی تھی۔ نوکرانی جا کر عنیزہ کو بھی بلا لائی تھی۔

"چھوٹی بی بی پہ جن کا اثر ہو گیا ہے' کل مغرب کے ٹائم' باغ میں پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھی تھیں اور ایسی ہی حالت تھی جیسی ابھی ہے۔ چھوٹی بی بی پہ جن عاشق ہو گیا ہے۔"

اس نے انکشاف کیا تو سب سر اس کی طرف گھوم گئے۔ واقعی زیبو کی بات قابل غور تھی۔ گاؤں دیہات میں حسین لڑکیوں پہ آسیب کا آ جانا' جن کا عاشق ہو جانا کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔

ایبک ایک کونے میں بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ افشاں بیگم انتہائی پریشانی کے عالم میں بے سدھ پڑی زیان کو دیکھ رہی تھیں' جس کے ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے۔ عنیزہ رو رہی تھیں۔ انہیں تسلی دیتے ہوئے۔ زیان کو ہوش میں لانے کی تدابیر ناکام ہو رہی تھیں۔ عنیزہ کی پریشانی اب تشویش میں ڈھلنے لگی تھی۔ کسی رشتہ دار عورت نے زیان کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا مشورہ دیا۔

"تمہاری بہو کو ڈاکٹر کی نہیں کسی اللہ والے کی ضرورت ہے۔" ایبک کی رشتے کی خالہ نے جھٹ مشورہ رد کر دیا۔

"ہاں بھئی میری بیٹی کو دم درود کی ضرورت ہے۔" افشاں بیگم نے بھی تائید کی اور آنسو پونچھے۔ مشورہ دینے والی عورت اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

ایبک بھانت بھانت کی بولیاں سن رہا تھا اور گاہے بگاہے بے سدھ پڑی زیان کو بھی دیکھ رہا تھا۔ وہاں عورتوں کا میلہ سا لگا ہوا تھا اور ان سب کا مشترکہ متفقہ خیال تھا کہ زیان پہ باغ میں جن عاشق ہو گیا ہے یا کسی ہوائی مخلوق کا اثر ہو گیا ہے۔

رنگ رنگ کی بولیاں سن کر عنیزہ پریشان ہو رہی تھیں۔ انہوں نے افشاں بیگم کو کمرے میں ہی الگ لے کر جا کر درخواست کی کہ سب عورتوں کو کمرے سے نکالا جائے۔ ویسے بھی کافی دیر گزر چکی تھی۔ افشاں بیگم کی نرمی سے کہی گئی بات کا اچھا اثر ہوا۔ عورتیں ایک ایک کر کے چلی گئیں۔ صرف اب نہناں' افشاں بیگم' عنیزہ اور ملک ایبک ہی وہاں تھے' ان سب افراد میں اگر کوئی خوش اور پرسکون تھا تو وہ صرف اور صرف نہناں تھی۔ زیان کی اس حالت کا جواز اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا' نہ ہی وہ کوئی تاویل خود کو دے پا رہی تھی' پر مڑی تڑی پڑی زیان اس کے دل کو مسرور کر رہی تھی۔

افشاں بیگم سب کی باتیں سن سن کر دہل گئی تھیں۔ زیان کی اس حالت کے بعد وہ ایبک کو کوئی نقصان پہنچتا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اس کا فی الحال زیان سے دور رہنا ہی بہتر تھا۔

"ایبک پتر تم نیچے والے کمرے میں سو جاؤ۔" انہوں نے بیٹے سے نگاہیں ملائے بغیر کہا۔ کتنے ارمانوں سے وہ زیان کو دلہن بنا کر لائی تھیں۔ ایبک کی سب خوشیاں خاک میں مل گئی تھیں۔ وہ جیسے خود کو ذمہ دار سمجھ رہی تھیں۔ ایبک ان کی دلی کیفیت خوب اچھی

طرح سمجھ رہا تھا۔ اس لیے اس نے بنا کسی پس و پیش کے ان کی بات پہ سر تسلیم خم کردیا۔ عنیزہ اور افشاں بیگم دونوں ذیان کے پاس تھیں۔

ایبک کو کمرے سے باہر جاتا دیکھ کر نہناں نے آسودہ سانس لی۔ جلتے بلتے دل کو سکون مل گیا تھا۔ وہ دریا کے پاس رہ کر پیاسا لوٹ گیا تھا۔ اس تشنگی میں نہناں کی خوشی اور سکون مضمر تھا۔

☼ ☼ ☼

ولیمہ کی پوری تقریب کے دوران ذیان بالکل نارمل رہی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا اس پہ جن آنے والا سنگین واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ وہ شرمیلی مسکراہٹ، جھکی نگاہوں سمیت شادی سے پہلے والی ذیان لگ رہی تھی۔ گزرے دو دن کا عکس تک اس کے چہرے پہ نہیں تھا۔ ولیمہ کی تقریب سے فارغ ہو کر شام سے پہلے پہلے سب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔

افشاں بیگم نے نہناں کو مزید ایک دن اپنے پاس روک لیا تھا ذیان کو وہی کندھوں سے تھام کر کمرے تک لائی۔ ذیان آج پہلے سے بڑھ کر حسین لگ رہی تھی۔ ولیمہ کی دلہن کے روپ میں وہ معصوم و دلکش نظر آرہی تھی۔ اس کی کمر کے پیچھے تکیے سیٹ کرتے ہوئے نہناں نے اس کے من موہنے روپ کو غور سے دیکھا۔ کل تو ایبک کے خوابوں کی تکمیل نہیں ہو پائی تھی۔ پر آج ایسا ہونا ممکن تھا۔ ذیان بالکل ٹھیک نظر آرہی تھی۔ ایبک اور ذیان دونوں امنگوں بھرا دل رکھتے تھے، پھر قدرت نے انہیں ایک مضبوط شرعی رشتے میں باندھ دیا تھا۔ وہ خوابوں کی حسین رہگزر پہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے خوشی خوشی تمام عمر ساتھ چل سکتے تھے۔ نہناں کے دل میں دھڑ دھڑ بھانبھڑ جلنے لگے۔ اندر بیٹھا کوئی دہائیاں دے رہا تھا کہ ایبک تو میری تلاش کا حاصل تھا۔ امیدوں کا ثمر تھا۔ پھر ذیان کیسے مالک بن بیٹھی۔

دن بھر کی بھاگ دوڑ اور ولیمہ کی مصروفیت نے ملک ایبک کو تھکا دیا تھا۔

وہ دور صوفے پہ بیٹھا تھا۔ سوفٹ ڈرنک سے بھرا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پی رہا تھا۔ ذیان بیڈ کراؤن سے کمر ٹکائے ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھی تھی۔ شاہانہ جوڑے میں ملبوس وہ پہلے سے بڑھ کر حسین لگ رہی تھی، مگر ایبک نے جذبات کی لگام کو ڈھیلا نہیں پڑنے دیا۔ وہ صوفے سے اٹھا اور ہاتھ میں تھاما خالی گلاس سائیڈ ٹیبل پہ رکھا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے ٹائٹ شرٹ کے اوپری دو بٹن کھولے اور آستین کہنیوں تک فولڈ کیں۔ رسٹ واچ اتار کر سائیڈ پہ رکھی۔ اب وہ سامنے کھڑا تھا۔ ذیان چاہتی تو نظر اٹھا کر دیکھ سکتی تھی ان دونوں میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ ایبک نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ ذیان کو اپنی طرف سے پیش قدمی کا تاثر دینا چاہ رہا تھا۔ اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہا تھا۔

چند لمحے بعد وہاں سے اس کی ہذیانی چیخیں گونج رہی تھیں۔ چیخیں تھیں کہ صور اسرافیل تھا۔ اس بار افشاں بیگم کے ساتھ ملک جہانگیر بھی افتاں و خیزاں ایبک کے کمرے میں موجود تھے۔ ذیان کی حالت بہت بری تھی۔ لمبے بال چہرے کے اطراف جھول رہے تھے اور وہ خود آنکھیں بند کیے جھوم رہی تھی جیسے اپنے حواس میں نہ ہو۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ اس کے حلق سے دبی دبی مردانہ آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔

"نہیں چھوڑوں گا، نہیں چھوڑوں گا اس کے پاس آیا تو بھسم کردوں گا۔" اشارہ یقیناً ایبک کی طرف تھا۔ ملک جہانگیر اور افشاں بیگم نہایت پریشانی اور حواس باختگی سے ذیان کو دیکھ رہے تھے۔ خاص طور پہ افشاں بیگم کی حالت بہت پتلی ہو رہی تھی۔

"میری بہو پہ سچ مچ کا جن عاشق ہو گیا ہے ملک صاحب۔" ان کا لہجہ مارے خوف کے کانپ رہا تھا۔

انہوں نے ذیان پہ عاشق ہونے والے جن کی دھمکی سن کر ایبک کو کمرے سے باہر جانے کو کہا۔ کیونکہ ذیان لال لال آنکھیں نکالے ایبک کو گھور رہی تھی۔ ایبک اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا تو وہ اسے بہلا کر باہر لے گئیں۔ بہو پہ تو جن عاشق ہو گیا تھا اب

بیٹے کی سلامتی بھی خطرے میں تھی۔ ایک بار پھر وہی صورت حال تھی۔ زیان بے ہوش ہو چکی تھی۔ عنیزہ اور ملک ارسلان بھی افشاں بیگم کے بے وقت بلاوے پہ آچکے تھے۔ زیان کی حالت دیکھ دیکھ کر عنیزہ رو رہی تھیں۔

"زیان کی حالت تمہارے سامنے ہے، جن نے براہ راست دھمکی دی ہے تمہیں، میرے بچے۔ اس لیے تمہیں اس کے سامنے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" افشاں بیگم الگ لے جا کر ایبک کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"امی آخر ایسا کب تک ہوگا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ میرا اس کے ساتھ آمنا سامنا نہ ہو۔" اس بات پہ افشاں بیگم اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئیں۔ حالات نے انہیں حواس باختہ کر دیا تھا۔ نئی نویلی دلہن گھر میں لاتے ہی پریشانی نے منہ دیکھ لیا تھا۔ ایبک کو دیکھتیں تو دل مسوس کر رہ جاتیں، اس نے ازدواجی زندگی کی خوشی ہی نہیں پائی تھی، جن نے صاف بولا تھا" زیان کے قریب آئے تو بھسم کر دوں گا۔"

"زیان کو ایسے تو نہیں چھوڑیں گے نا۔ طاہرہ کہہ رہی تھی آپ کو سائیں بابا کے پاس لے جاؤں گی جن نکالنے کے ماہر ہیں۔" افشاں بیگم نے اپنی بہن کا نام لیا تو وہ دل میں محض افسوس ہی کر سکا۔

نہناں، عنیزہ بیگم کی طرف واپس آگئی تھی۔

نوکرانیاں دبی دبی آواز میں زیان کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ نہناں دلچسپی سے سن رہی تھی، خود وہ ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔

"بے چاری چھوٹی بی بی پہ جن آگیا ہے، اب ملک صاحب کی خیر نہیں ہے۔" فریدہ نے جھرجھری لی۔

"جن نے ملک صاحب کو تو کمرے کے اندر قدم بھی نہیں رکھنے دیا ہے۔" یہ زیبو تھی۔

"ہاں بے چارے چھوٹے ملک صاحب نیچے آگئے تھے۔" فریدہ کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

"ہاں تو کیا کرتے بھروہ۔ چھوٹی بی بی کی حالت ہی اتنی خراب ہو رہی تھی۔" زیبو کو بھی ملک ایبک سے ہمدردی ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

عنیزہ، زیان کے پاس تھیں، جب کہ افشاں بیگم، اپنی بہن طاہرہ کے ساتھ جلالی بابا کے پاس گئی ہوئی تھیں۔ دونوں گاڑی سے اتر کر آستانے کے چھوٹے گیٹ سے اندر داخل ہوئیں۔ انتشار اور ہجوم دیکھ کر دونوں مایوس ہو رہی تھیں۔ بالآخر ان کی پریشانی پہ جلالی بابا کے ایک مرید کو ترس آگیا۔ اس نے ایک پرچی پہ ان کے نام لکھ کر اندر بھجوائی۔

انہوں نے اپنا مسئلہ بتایا ہی نہیں تھا اور جلالی بابا جان گئے تھے، وہ روشن ضمیر تھے۔

"ہم کیا کریں اب؟" ڈرتے ڈرتے افشاں بیگم گویا ہوئیں۔

"دیکھو بی بی تمہارا مسئلہ بہت بڑا اور خطرناک ہے، آسانی سے حل ہونے والا نہیں ہے۔ تمہاری بہو خطرناک جن کے زیر اثر آگئی ہے۔ ہمیں پوری حقیقت سمجھنے کے لیے تمہارے گھر آنا پڑے گا۔" جلالی بابا اپنی مخصوص رعب دار آواز میں بول رہے تھے۔ افشاں بیگم کے چہرے پہ اب پریشانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جلالی بابا بہت جلد "ملک محل" میں رونق افروز ہونے والے تھے۔ یعنی ان کی پریشانی کے خاتمے کے دن قریب آگئے تھے۔ دونوں خوشی خوشی واپس آئیں۔

عامل جلالی بابا اپنے سازو سامان سمیت "ملک محل" تشریف لا چکے تھے۔

"کیا لینے آیا ہے تو اس لڑکی سے، بدبخت تیرا نام کیا ہے؟" اپنی گونج دار آواز میں جلالی بابا زیان پہ عاشق ہونے والے جن سے مخاطب تھے۔ زیان نے سرخ سرخ لال آنکھوں سے عامل جلالی بابا کو گھورا۔

"آتم توش نام ہے میرا۔ میں اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔" زیان کے لبوں سے مردانہ آواز برآمد ہوئی۔ یہ سو فیصد مردانہ آواز تھی، وہاں پہ موجود سب

افراد کو گویا سانپ سونگھ چکا تھا۔ صرف عامل جلالی بابا جن سے سوال جواب کر رہے تھے۔

"کیا لیتا ہے تجھے اس لڑکی سے؟"

"میں زیان سے محبت کرنے لگا ہوں۔ جب یہ باغ میں اکیلی بیٹھی رو رہی تھی میں تب اس پہ عاشق ہوا۔ اب میں اس کے قریب کسی کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا۔ خاص طور پہ اس کے شوہر کی۔ یہ صرف میری ہے۔" زیان کے لبوں سے غصے بھری آواز برآمد ہوئی۔ اس نے گردن موڑ کر ون سیٹر صوفے پہ بیٹھے ملک ایبک کو گھور کر دیکھا جیسے کچا چبا جائے گی۔ ایبک اپنے اعصاب پہ قابو پائے برداشت کر رہا تھا۔ عامل جلالی بابا زیان کے کمرے سے اٹھ کر نیچے آگئے تھے۔ ان کے چہرے پہ فکر و تردد کی گہری لکیریں نمایاں تھیں۔ ملک جہانگیر، افشاں بیگم اور ملک ایبک ان کے پاس تھے۔

"جن بہت طاقت ور اور شری ہے۔ آپ کی بہو کے علاج کے لیے بہت وقت اور صبر کی ضرورت ہے۔" جلالی بابا نے اپنے سامنے بیٹھے تینوں افراد کو باری باری دیکھا۔ اس جن سے نمٹنے کے لیے خاص عمل اور حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ میں ہفتے بعد پھر آؤں گا اور بتاؤں گا کہ علاج کیسے شروع کیا جائے۔ علاج کے دوران اور ابھی بھی لڑکی کے شوہر کو اس سے دور رہنا ہوگا، ورنہ آتم توش غصے میں آکر شدید قسم کا نقصان بھی پہنچا سکتا ہے، جیسا کہ اس نے دھمکی بھی دی ہے۔" عامل جلالی بابا گونج دار آواز میں بول رہے تھے۔

ملک ایبک کے علاوہ سب ہی متاثر اور پریشان ہوگئے تھے۔ ایبک اندرونی اور بیرونی دونوں طرح پرسکون تھا۔ وہ زیان کے اس علاج کے حق میں نہیں تھا۔ مخالفت کرتا تو افشاں بیگم کے ناراض ہونے کا سو فیصد امکان تھا۔ لہٰذا اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

☆ ☆ ☆

ایبک اور زیان کی شادی کے بعد نمناں نے سلائی کڑھائی کے مرکز میں پھر سے جانا شروع کر دیا تھا۔ گھر میں زیان کے حوالے سے جو پریشانی چل رہی تھی، وہ اپنی جگہ تھی۔ ایبک نے اس طرف سے دھیان ہٹا کر اسکول والے پروجیکٹ پہ توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ اس نے شادی کے بعد پہلی مرتبہ اسکول کی تیزی سے تعمیر کے مراحل طے کرتی عمارت کا جائزہ لیا۔ ٹھیکیدار اسے کام کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ ایبک اس کی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ آدھ گھنٹہ گھوم پھر کر اطمینان کر لینے کے بعد وہ انڈسٹریل ہوم کی طرف آگیا۔ بہت دن بعد اس طرف آنا ہوا تھا۔ نمناں اسے دیکھتے ہی الرٹ ہوگئی۔ دل کی دھڑکنوں نے خوش گوار آلاپ الاپنا شروع کر دیا تھا۔ بہت دن کے بعد نمناں اسے اپنے سامنے، ایسے اکیلے دیکھ رہی تھی۔ ایبک کو سامنے پا کر وہ بے اختیار اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"السلام علیکم!" ایبک نے دھیمے سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ آپ کیسے ہیں؟ بیٹھیے پلیز!" نمناں نے آداب میزبانی نبھائے۔ وہ دھیرے سے سر کو جنبش دیتا بیٹھ گیا۔

"کام کیسا چل رہا ہے، کوئی پریشانی تو نہیں ہے اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو لسٹ بنا کر بھجوا دیجیے گا۔" وہ اپنے مخصوص مہذب انداز میں گویا ہوا۔

"پریشانی تو نہیں ہے، البتہ کچھ مشینیں خراب ہوگئی ہیں، ساتھ کڑھائی کی ایک نئی مشین کی ضرورت ہے۔"

"آپ گھر جا کر مجھے ایک بار یاد کروا دیجیے گا۔ منشی شہر سے لے آئے گا۔"

"ایک بات پوچھوں، آپ برا تو نہیں مانیں گے۔" نمناں نے پہلی بار بولنے کی ہمت کی تھی۔ ایبک کرسی پہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ نمناں کے لہجے میں محسوس کی جانے والی جرات تھی۔

"جی مس نمناں پوچھیں۔"

"آپ بہت پریشان اور تھکے تھکے نظر آرہے ہیں، کیا وجہ ہے اس کی؟" نمناں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

"لگتا ہے میری بات آپ کو بری لگی ہے' معذرت چاہتی ہوں۔" ایبک کی طرف سے خاموشی طاری رہی تو اس نے دبے دبے انداز میں شرمندگی ظاہر کی۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"تو پھر۔" وہ تیزی سے گویا ہوئی۔

"میں حیران ہوا ہوں' کیونکہ آج سے پہلے آپ نے کبھی ایسی بات نہیں کی نا۔" نیناں دھیمے سروں میں ہنسی۔ ایبک ٹھٹک کر اسے تکنے لگا۔ آج تو وہ حیران کردینے پہ تلی ہوئی تھی۔

"آپ کو میری بات بری نہیں لگی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اچھی لگی ہے۔" وہ بالکل عام سے انداز میں بولی۔ ایبک بے ساختہ ہنس پڑا۔ یہ سادہ اور بے ریا ہنسی تھی۔ نیناں سب کچھ بھلائے اس کی ہنسی کے سحر میں گم ہونے لگی تھی۔ یہ پہلا اتفاق تھا جو ایبک نے اس سے اتنی باتیں کی تھیں۔

"ہاں میں ڈسٹرب ہوں تھوڑا۔" وہ ہنستے ہنستے اچانک خاموش ہوا تو سارا سحر اچانک ٹوٹ گیا۔

"آپ زیان بی بی کی وجہ سے پریشان ہیں نا؟" وہ ہمدردی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہولے سے سر ہلا کر رہ گیا۔

"آپ انہیں کسی ڈاکٹر کو دکھائیں نا۔" نیناں نے خلوص سے مشورہ دیا۔ پر یہ خلوص ایبک کے لیے تھا' زیان کے لیے ہرگز نہیں تھا۔

"آپ کی اس ہمدردی اور خلوص کا بے حد شکریہ۔" ایبک اس کی بات کے جواب میں گویا ہوا۔ اس نے ڈاکٹر کو دکھانے کے حوالے سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

"اچھا مس نیناں میں جا رہا ہوں' یہاں کسی قسم کی کوئی پرابلم ہو تو مجھے بتا دیا کریں۔" وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دروازے کی طرف مڑا اور نپے تلے باوقار قدموں سے چلتا اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ نیناں کھڑکی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا۔ وہ وہاں سے روانہ ہوا تو وہ کھڑکی سے ہٹی۔

☆ ☆ ☆

معاذ کی واپسی میں صرف کل کا دن تھا۔ وہ بجھے بجھے دل کے ساتھ تیاری میں مصروف تھا۔ ایبک بھائی کی شادی کا سارا مزا کرکرا ہو گیا تھا۔ اس نے بھائی اور بھابھی کی شادی کے بعد سیر و تفریح' گھومنے پھرنے کے بہت سے پروگرام بنائے تھے۔ جو زیان بھابھی کے جن کی وجہ سے غارت ہو کر رہ گئے تھے۔ پورے ملک محل میں عجیب سا سناٹا تھا' لگتا ہی نہیں تھا کہ یہاں کسی کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ ملک جہانگیر اور افشاں بیگم زیان کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ گھر میں کام کرنے والی نوکرانیاں تک خوف زدہ تھیں۔ بات بھی سرگوشیوں میں کرتیں۔ معاذ الگ جھنجلایا ہوا تھا۔ اس نے کتنی بار مشورہ دیا کہ بھابھی کو کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھائیں' مگر اس کے مشورے پہ کسی نے بھی کان نہیں دھرا۔ اس کا دل کرتا زیان سے فرمائشیں کرے۔ لاڈ اٹھوائے' چھوٹے چھوٹے کام کروائے' اسے لے کر گھومنے پھرنے جائے۔

معاذ کو بہن کا بہت شوق تھا' وہ اکثر و بیشتر بڑے حسرت ناک انداز میں' اللہ سے بہن نہ ہونے کا شکوہ کرتا تھا۔ زیان کو دیکھتے ہی اس کے دل نے کہا کہ اس کی بہن کی کمی پوری ہو گئی ہے۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسا اس کے ذہن میں بہن کا تصور تھا۔ بہت جلد دونوں آپس میں بے تکلف ہو گئے تھے۔ زیان اس کی باتوں پہ ہنستی' دلچسپی لیتی تو اسے بہت اچھا لگتا۔ ان دونوں یعنی زیان اور ایبک بھائی کی شادی پہ اس نے کیسی رونق لگائی' خوشی منائی۔ زیان رخصت ہو کر آئی تو معاذ نے اس کے بیڈ روم میں جا کر سب سے پہلے اس کا چہرہ دیکھا اور منہ دکھائی دی۔

اس کے شرارتی جملوں کی بارے وہ نروس ہو رہی تھی' اپنی مسکراہٹ چھپا رہی تھی۔ معاذ نے کتنی ڈھیر ساری اس کی فوٹو بنائیں۔ سب ٹھیک تھا' وہ میوزک سسٹم آن کر کے وہاں سے باہر آیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑی دیر میں ہی خوشیوں بھرا ماحول پریشانی میں بدل

گیا تھا۔ معاذ نے بھی دیکھا۔ زیان بھابھی پہلے والی تو لگ ہی نہیں رہی تھی۔ نہ ہنستی' نہ بولتی' نہ اس کی شرارتوں پہ مسکراتی۔ اب تو اس کے جانے میں ایک دن باقی تھا۔ وہ بے حد اداس ہو رہا تھا۔ لگ رہا تھا ان کے گھر کو کسی کی نظر کھا گئی ہے۔

معاذ' زیان کے بیڈ روم کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ افشاں بیگم بھی تھیں۔ وہ اس کے ساتھ آئی تھیں' انہیں انجانا سا خوف تھا کہ شاید زیان' معاذ کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچادے۔ حالانکہ شادی کے بعد سے لے کر اب تک ایسا ہوا نہیں تھا' آتم توش نامی جن کا سب غصہ' غیض و غضب صرف اور صرف ایبک کے لیے ہی تھا۔ زیان بیڈ پہ بیٹھی تھی' چہرے پہ فکر کے سائے تھے' پر مجموعی طور پہ وہ بالکل ٹھیک نظر آرہی تھی۔

"آؤ معاذ' کہاں غائب ہو اتنے دن سے؟" اسے دیکھتے ہی وہ بیڈ سے اتر آئی۔ چہرے پہ گزشتہ دنوں والی طاری وحشت کا نام و نشان تک نہ تھا۔

"بھابھی آپ کی طبیعت ہی ٹھیک نہیں تھی' میں دو تین بار آیا تو تھا' لیکن کمرے کے دروازے سے ہی واپس ہو گیا۔" وہ معاذ سے تین ساڑھے تین سال چھوٹی تھی' پر وہ انتہائی احترام سے مخاطب کرتا تھا۔ زیان جواب میں دھیرے سے مسکرا دی' ایسی مسکراہٹ جس میں بے بسی کی آمیزش تھی۔ افشاں بیگم نے معاذ کو فہمائشی انداز میں دیکھا' جیسے کہہ رہی ہوں زیان کی طبیعت کے حوالے سے کوئی بات مت کرنا۔ وہ ان کی آنکھ کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔

زیان اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ افشاں بیگم دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہی تھیں۔ زیان بالکل نارمل اور ٹھیک ٹھاک نظر آرہی تھی' لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی پرانی والی زیان ہے۔ ایبک کو سامنے دیکھتے ہی جن بے قابو ہو جاتا' ویسے وہ ٹھیک ہی رہتی تھی۔

☼ ☼ ☼ ☼

معاذ ساری رونقیں اپنے ساتھ سمیٹ کر لے گیا تھا۔ اس کی موجودگی سے اک تازگی اور زندگی کا احساس تھا۔ سارا دن وہ اودھم مچائے رکھتا' نت نئی شرارتیں کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ وہ جب تک ملک محل میں رہا' نہنال اس کی موجودگی سے پریشان ہی رہی۔ بظاہر لاپروا اور شرارتی معاذ در حقیقت بہت حساس تھا۔ قدرت نے اس کو اپنی حساسیت کی بدولت خاص خوبی عطا کی تھی۔ وہ معمولی سے معمولی بات کو بھی فوراً "محسوس" کرتا۔ چھوٹی چھوٹی تفصیلات اس کے علم میں آجاتیں۔ دوسرے جن کو نظرانداز کرتے' وہ ان کا جائزہ لیتا۔ اکثر ایسی باتیں وقوع پذیر ہوتیں جن کو وہ گہرائی میں جا کر محسوس کرتا۔ وہ اس بار ملک محل میں زیادہ عرصہ نہیں رہا تھا۔ پر نہنال کے بارے میں اس کی رائے اوروں سے مختلف تھی۔ ایبک بھائی کی شادی کے دوران اس نے دو بار نہنال کی نگاہوں کی چوری پکڑی تھی۔ ایک بار اپنے تئیں وہ سب سے چھپ کر زیان کو نفرت سے گھور رہی تھی' جبکہ ایبک بھائی کے لیے اس کے انداز کچھ اور تھے۔

جانے سے پہلے معاذ کا دل چاہا کہ وہ ایبک بھائی کو اپنے خیالات سے آگاہ کرے۔ پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ احمد سیال کے گھر میں پائی جانے والی ان کی بیٹی کی تصویریں اور نہنال کی ان کی بیٹی سے مشابہت بھی حیران کن تھی۔ وہ اس کا ذکر بھی ایبک سے کرنا بھول گیا تھا۔ نہنال کی شخصیت خاصی پراسرار اور شک و شبے کے دائرے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد نہنال کم از کم خوش تھی۔ کیونکہ معاذ کی موجودگی اسے خائف ہی رکھتی تھی۔ ہر پل' ہر لحظ اسے دھڑکا لگا رہتا جیسے معاذ اس کے بارے میں جانتا ہو۔ جبکہ ملک محل میں آنے اور ملک ایبک کو دیکھنے کے بعد اس کی پوری کوشش تھی کہ اس کی شخصیت کا راز کسی پہ بھی عیاں نہ ہو۔

اس کا احساس زیاں ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ اس کے لیے ملک ایبک کا رشتہ آیا تھا۔ وہ ہمیشہ پہلے نمبر پہ رہی تھی۔ وہ خود کو بہلاتی۔ اسے ملک ایبک کو ہر صورت' ہر قیمت پہ حاصل کرنا تھا۔ وہ زیان سے شادی

کرکے بھی نامراد رہا تھا۔ پر اس کی نامرادی کی عمارت پہ ہی اپنا خوابوں کا محل تعمیر کرنا تھا۔ اس کی دعا تھی کہ وہ کبھی بھی زیان کے قریب نہ جاسکے۔ رنم کی حسیات ملک ایبک کے معاملے میں بہت شارپ تھیں۔ اسے پتا تھا وہ زیان کی وجہ سے بہت اداس اور اپ سیٹ ہے۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگتا۔ کاش ایک دن ایسا آئے جب ملک ایبک اس کے لیے پریشان ہو۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی۔ کاش کوئی معجزہ رونما ہو اور ملک ایبک اس کا ہو جائے۔ دل میں شور مچاتے جذبوں پہ بند باندھنا اب اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ ساری عمر اس نے من پسند چیزیں حاصل کی تھیں۔ اسے امید تھی ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ اپنی من پسند مراد آسانی سے پالے گی۔ کسی طرح بھی اسے ملک ایبک کا مزاج آشنا ہونا تھا، اس کا قرب اور اعتبار حاصل کرنا تھا۔

وہ آج کل جن خطوط پہ سوچ رہی تھی، اس کی وجہ سے اس کا نہنال والا راز بہت جلدی افشا ہونے کا خطرہ تھا، کیونکہ اب اسے اپنے جذبات پہ قابو نہیں تھا۔ اس کا دل چاہتا ایبک سے روز ملاقات ہو، وہ اسے ڈھیروں باتیں کرے، پہروں تکتی رہے۔

ملک محل میں اور نہنال کے روپ میں اس کی خواہش پوری ہونا ناممکن تھا۔ اسے اپنی اصل شخصیت میں رنم کے روپ میں واپس آنا تھا۔ وہ رنم جو احمد سیال کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی۔ احمد سیال بزنس ٹائیکون دولت جن کے گھر کی لونڈی تھی۔ وہ اسی احمد سیال جیسے بااختیار شخص کی بیٹی تھی۔ احمد سیال، ملک جہانگیر کے گہرے دوست۔ زیان، ملک ایبک کی زندگی سے باہر ہو جاتی تو اسے ملک ایبک کی زندگی میں آنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ آسیب زدہ لڑکی کسی طرح بھی تو ملک ایبک کے قابل نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے وارڈ روب کھول کر اپنا نائٹ ڈریس نکالنا چاہا۔ مگر خالی الماری اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اسے شدید قسم کا غصہ آیا۔ حالانکہ افشاں بیگم نے اس کا ایک اور شب خوابی کا لباس دھو کر استری کروا کے رکھوا دیا تھا۔ وہ اسے آج کا واقعہ بتا چکی تھیں کہ زیان کے جن نے اس کے تمام کپڑے خراب کر دیے ہیں۔ وارڈ روب کھولتے ہوئے وہ تھوڑی دیر کے لیے یہ بات بھول ہی گیا تھا کہ عزت مآب آتم توش نے اس کے پہنے جانے والے کپڑوں اور دیگر استعمال کی چیزوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ حیرت انگیز طور پر محترم جن نے زیان کی کسی بھی چیز کو کوئی ہلکا سا بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ زیان کا بھاری عروسی سوٹ سلیقے سے تہ کیا ہوا سب سے اوپری خانے میں پڑا تھا۔ دیگر کپڑوں کا بھی یہ ہی حال تھا۔

زیان اپنے بیڈ روم میں آکر بالکل پرسکون تھی۔

آزادی اور سرشاری کا انوکھا احساس ہوا تھا۔ وہ شادی کے بعد پہلی مرتبہ یہاں قدم رکھ رہی تھی۔ اس لیے سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا یہ ویسی ہی خوشی تھی جیسی بیاہتا بیٹی کو شادی کے بعد پہلی بار میکے آکر ہوتی ہے۔ وہ لاکھ سب کی محبتوں سے منہ موڑتی 'مگر دل میں پنپنے والے جذبوں سے دامن نہیں چھڑا سکتی تھی۔ تب ہی تو ملک ارسلان نے گھر آنے پہ میرا بچہ کہہ کر سر پہ ہاتھ پھیرا' ماتھا چوما اور فرط محبت سے اپنے ساتھ لگایا تو دل ہی دل میں کنڈلی مارے بیٹھی شرمندگی نے سر اٹھایا۔

پہلی بار بے ریا ہو کر اس نے ان سے باتیں کیں۔ اس کے دل میں کوئی کڑواہٹ نہیں تھی۔ ملک ارسلان سے تو اسے ویسے بھی کوئی شکایت نہیں تھی کوئی تھی بھی تو اس نے اندر ہی دل میں دفن کر دی تھی۔ کیونکہ ان کا سلوک اتنا اچھا اور محبت بھرا تھا کہ شکوے' شکایتیں خود بخود ختم ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اسے ایک بیٹی کی سی ہی اہمیت دیتے تھے۔ زیان خود ہی ان سے دور دور رہتی' لاکھ کوشش کے باوجود بھی زیان نے انہیں بحیثیت باپ خود سے بے تکلف ہونے کا موقع نہ دیا تھا۔

آج جب انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تو اسے رونا آنے لگا۔ اسے پھر امیر علی یاد آگئے تھے اور یہ کیسے ممکن تھا' اسے امیر علی کے ساتھ جڑے غم یاد نہ آتے۔ ان غموں کے ساتھ اس کا تکلیف دہ ماضی وابستہ تھا۔ وہ ماضی جسے وہ بھول کر بھی بھول نہ پائی تھی۔ سر جھٹک کر زیان نے تکلیف دہ یادوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ موسم بہت شدت پہ مائل تھا' سخت گرمی اور حبس تھا۔ اس نے شب خوابی کا ہلکا پھلکا سا کاٹن کا لباس نکالا اور شاور لینے لگی۔

بال سلجھاتے ہوئے اس نے میوزک سسٹم آن کر دیا۔ گانے کے ساتھ ساتھ اس کے لب بھی ہل رہے تھے۔ وہ باہر آکر ٹیرس پہ پڑی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ رات کے اس پہر ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ گرمی اور گھٹن کا احساس کچھ کم ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

ملک ایبک نہا کر بیڈ پہ لیٹا ہوا تھا۔ کمرے کے کھڑکیاں دروازے کھلے تھے اور لائٹیں آف تھیں۔ اچانک ہوا کے دوش پہ کچھ آوازیں اس کی سماعتوں پہ دستک دینے لگی۔ ایبک نے کروٹ بدلی تو نظر کھلے دروازے سے باہر سامنے والے ٹیرس کی طرف اٹھ گئی۔ زیان کرسی پہ بیٹھی میوزک سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ رات کے اس سناٹے میں آواز بخوبی ایبک کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا یہ وہی زیان ہے جس پہ آتم توش نامی جن عاشق ہے۔ وہ مکمل ہوش و حواس میں تھی' شب خوابی کے ہلکے سے لبادے میں رات کے اس پہر وہ ترشی ہوئی مورت لگ رہی تھی۔ کتنی قریب اور کتنی دور تھی وہ۔ بیوی ہوتے ہوئے بھی میلوں' صدیوں کے فاصلے تھے۔ ایبک کو اپنی انگلیوں کے پوروں تلے زیان کا لمس ابھی بھی تازہ اور آنچ دیتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے اٹھ کر پوری قوت سے کمرے کا دروازہ اور سب کھڑکیاں بند کیں۔ یقیناً" زیان نے یہ آوازیں سنی تھیں' تب ہی تو اس نے مڑ کر اس طرف دیکھا تھا۔ کھلا دروازہ اور کھڑکیاں سب بند ہو چکے تھے۔ ایبک نے اے سی فل آن کر کے پہنی گئی ہلکی سی شرٹ اتار کر دور پھینک دی تھی۔ زیان اس ٹائم اس کے سامنے ہوتی تو جانے وہ کیا کر بیٹھتا۔ شاید اس کا گلا ہی دبا دیتا۔

وہ زیان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ کچھ تو تھا جو اسے محسوس ہوا تھا۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے گویا اس خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔

فاصلے کے معنی کا کیوں فریب کھاتے ہو؟
جتنے دور جاتے ہو' اتنے پاس آتے ہو

(آئندہ ماہ آخری قسط ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

صدف ریحان گیلانی

بس اک حرف

سال خوردہ دروازہ اتنی طاقت سے دھکیلا گیا تھا کہ گویا اس بے چارے کو جڑ سے ہی اکھاڑنے کا ارادہ ہو۔ سارے میں پھیلی سرما کی نرم سی دھوپ میں صحن کے وسط میں بچھی چارپائی پر حمیدہ اونگھ رہی تھی' جو اس اچانک چرچراہٹ پر ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔ منہ پر تانا دوپٹا ہٹایا تو اک پل کو آنکھیں چندھیا گئیں۔

آنے والی لبنیٰ تھی۔ سر پر بندھا اسکارف کھینچ کر اتارتے ہوئے اس نے بے وقت کھاٹ سنبھالے پڑی ساس پر چنداں توجہ نہ دی۔ حمیدہ کا بخار سے تپتا سرخا سرخ منہ اسے کیا متوجہ کرتا' اس کے تو اپنے چہرے پر ایسی تھکن رقم تھی۔ گویا میلوں پیدل چل کر آئی ہو۔ حالانکہ وہ زیادہ دور نہیں یہ دو گلیاں چھوڑ کر ہی تو گئی تھی۔

"مما آگئی۔" اسے آتے دیکھ کے نیم کے نیچے مٹی سے گھروندے بناتا تین سالہ واثق اٹھ کر لپکا پیچھے ہی ڈیڑھ سالہ حفصہ بھی بھاگی آئی۔ جنہیں دیکھتے ہی اس کا پھیکا پڑا رنگ یک لخت بدل گیا۔ دو گھنٹے قبل جاتے ہوئے وہ انہیں منہ ہاتھ دھلا صاف ستھرا کر کے گئی تھی اور اب ان کا حلیہ پہچانے میں نہیں آ رہا تھا۔ مٹی سے لتھڑے ہاتھ پاؤں اور کپڑے تو دس دن پہلے کے پہنے لگ رہے تھے۔

"ہائے ہائے۔ اوہ مر جاؤ تم دونوں۔ در فٹے منہ ہے تم دونوں کا۔ ماں گھر سے باہر گئی تھی۔ مر نہیں گئی تھی جو کوئی نظر رکھنے والا نہیں رہا تم لوگوں پر ستیاناس جائے۔ الو کے پٹھو۔ ادھر مرو ذرا۔" اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گل افشانی کرتے بچوں کو پکڑ کر دو' دو لگائیں۔ حمیدہ تو اس کے لہجہ و الفاظ پر تڑپ ہی گئی۔ اگر جو وہ ٹھیک ہوتی تو ضرور اٹھ کر سوگی خبر لیتی۔ مگر اس وقت وہ خود سے بے زار چپ چاپ اس کے تیور دیکھتی رہی۔ بچے گلا پھاڑ رہے تھے۔ لبنیٰ کی زبان نان اسٹاپ چل رہی تھی۔

آج گاؤں میں میڈیکل کیمپ لگا تھا۔ لبنیٰ وہیں گئی تھی۔ ماہانہ چیک اپ کے لیے۔ ان کے علاقے میں کوئی باقاعدہ ہسپتال تو تھا نہیں۔ آجا کے آباؤ اجداد کی گدی سنبھالے اک حکیم صاحب تھے۔ جن کا اپنا ہی طرز حکمت تھا۔ ہر طرح کی بیماری میں وہ ایک ہی طرح کی نیلی پیلی' ہری لال گولیاں کا پورا بنڈل پکڑا دیتے۔ زیادہ حالت خراب ہوتی تو موٹا سا انجکشن ٹھونک دیتے اور اگر اس سے بڑھ کر مریض لب دم ہوتا تو بوتل (ڈرپ) چڑھا کر فرض پورا کر دیتے۔ اب اگر پھر بھی وقت آخر آ جائے تو اس میں ان کا کیا قصور۔ انہوں نے تو اپنی سی پوری سعی کی نا۔ گزشتہ کئی دہائیوں میں ان کی کی گئی ان ہی کارروائیوں کی بنا پر بہت سے لوگ محتاط ہو گئے تھے۔ کئی تو اس گلی کی جانب آنا ہی چھوڑ چکے تھے۔

لبنیٰ تو جب سے بیاہ کر اس گاؤں آئی تھی' کبھی بھول کر بھی ادھر نہ گئی تھی۔ بچوں کی بیماری شماری میں وہ شہر بھاگی جاتی۔ البتہ جب سے دیہی علاقوں میں مختلف این جی اوز کی جانب سے فری میڈیکل کیمپ لگنا شروع ہوئے تھے۔ تب سے ان جیسوں کے دن بدل گئے تھے۔

خصوصاً خواتین اور پھر حاملہ خواتین جو بے چاریاں حکیم صاحب ہی کی جیسی نسل در نسل چلی آتی سینہ بہ سینہ علم رکھنے والی دائیوں کے ہاتھوں برے حالوں کو جا پہنچتی تھیں۔ دیہات میں زچہ و بچہ کی شرح اموات ایسی دائیوں کی وجہ سے تو ہی زیادہ ہے۔ لبنیٰ خوب جانتی تھی۔ آخر وہ اپنے خاندان کی واحد بارہ جماعت پاس لڑکی تھی (اور اپنی ان بارہ جماعتوں کا اسے زعم بھی بہت تھا۔) اس لیے تو آج تک وہ کسی دائی کے پاس جانے کے بجائے مہینہ دو مہینہ میں لگنے والے میڈیکل کیمپس میں جانے کو ترجیح دیتی۔ گو کہ وہاں بھی کوئی باقاعدہ ایم بی بی ایس ڈاکٹرز تو نہیں تھیں۔ ہاں ٹرینڈ ایل ایچ وی ضرور آ کر ان جیسوں کے لیے آب حیات بن جاتی۔ حتیٰ کہ اب تو الٹرا ساؤنڈ کی سہولت بھی آسان ہو گئی تھی۔ لبنیٰ پھر پورے دن سے تھی اور یقیناً "ڈاکٹرنی (ایل ایچ وی) نے الٹرا ساؤنڈ تو ضرور ہی کیا ہو گا کہ اب یہ بھی مسئلہ ہے آج کل کی ڈاکٹر صاحبان اس کے علاوہ تو کچھ بتاتی نہیں پاتیں۔

حمیدہ ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے یک ٹک اسے دیکھے جارہی تھی۔ صبح مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے کیمپ لگنے کا اعلان ہوا تھا اور اس کے بعد بہو صاحبہ اسے بتا کر گھر سے نکل گئی تھیں۔ نہ ساس سے پوچھا تھا نہ ساتھ چلنے کا کہا۔ ورنہ وہ اپنے بخار کی بھی پروا نہ کرتی اور خود جا کر ڈاکٹرنی سے ساری تفصیل پوچھ آتی اور اب مجال ہے جو وہ منہ سے کچھ پھوٹ دے۔ حمیدہ کو بے چینی ہو رہی تھی۔

لبنیٰ اپنے بھاری بھرکم بے ڈول ہوئے جسم کو سنبھالتے پھولی سانسوں کے ساتھ تیز تیز نلکا چلا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ بچوں کی گوشمالی بھی جاری تھی۔ گالیاں، کوسنے، دو ہتڑ، کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی اس نے۔

حمیدہ نے لیٹ کر پھر منہ پر دوپٹا تان لیا۔ لبنیٰ کا مزاج اتنا خراب کیوں ہے۔ اندازہ ہو گیا تھا اسے۔ پھر جب وہ خود کچھ نہیں بتا رہی تو پوچھنے کا فائدہ۔ چلو اللہ جو بھی دے ساتھ خیریت سے ہو۔ سب سے اہم تو ماں اور بچے کی صحت ہوتی ہے نا۔

☼ ☼ ☼

شارق نے خالی کپ ٹیبل پر رکھتے دونوں پاؤں اوپر کر کے لیٹنا چاہا تو کمر کے نیچے ننھا سا بازو آ گیا' وہ جلدی سے سیدھا ہوا اور نرمی سے ہاتھ پکڑ کر پرے کیا۔

لو یہ سو بھی گیا' ابھی تو ماں کی جھڑکیاں کھا کر کتاب لے کر بیٹھا تھا کہ اب ایک منٹ میں غافل۔ یہ بچے بھی نا ان کی نیند بھی کیا غضب کی نعمت ہوتی ہے۔ بستر پر لیٹتے ہی کیسے بے خبر ہو جاتے ہیں' نہ کوئی سوچ نہ کوئی فکر' کمال ہے' کچھ لمحے قبل اس کے ساتھ کھیلتا' باتیں کرتا واثق اب مزے سے سو رہا تھا۔ شارق کو بے اختیار اس پہ پیار آیا۔ بکھرے بال سمیٹ کر ماتھا چوما اور اس کے گرد بازو پھیلا کر ساتھ لگا لیا۔

حفصہ ابھی تک لبنیٰ کے لیے امتحان بنی ہوئی تھی۔ سارا دن چاہے وہ ادھر ادھر کھیلتے ہوئے سوتے گزار دیتی' مگر رات کو اسے ماں کی بھرپور توجہ چاہیے ہوتی تھی۔ وہ صرف ماں کے ساتھ کھیلنا' بولنا اور خصوصاً" اس کی گود میں گھس کر سونا پسند کرتی تھی۔ لبنیٰ آج کل خود اپنے آپ سے بے زار' اسے حفصہ کے یہ چونچلے سخت گراں گزرتے۔ اب بھی وہ شدید بحالت اذیت بیڈ کے اگلے کنارے پر بیٹھی حفصہ کو گود میں لیے مسلسل ایک گھنٹا ہلا کے اسے سلانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

ڈیڑھ سال کا بچہ ہوتا ہی کیا ہے۔ آٹھ ماہ کی عمر میں تو اس بے چاری سے ماں کا دودھ چھڑوا دیا گیا۔ اسی وجہ سے وہ بے حد چڑچڑی ہو گئی تھی۔ پھر آئے دن کوئی نہ کوئی بیماری بھی چمٹی ہوتی' پھر اس سب کے علاوہ ستم کہ وہ اب ماں کے ساتھ بھی نہ سوئے کہ سوتے میں اسے خوب ہاتھ پاؤں چلانے کی عادت تھی۔ اس پانچ فٹ کے بیڈ پر تو وہ ساری فیملی سوتی تھی۔ اس پر اب لبنیٰ کی جو حالت تھی' بے چارا شارق ساری رات بے آرام ہوتا' بچے کھینچ کھینچ کر اس سے پرے کرتا رہتا۔ نتیجتاً" وہ خود بچوں کے نرغے میں گھرا ہوتا۔ کبھی ایک کا ہاتھ پاؤں اس کے نیچے آجاتا تو کبھی کوئی اس کے اوپر سویا ملتا۔

چھوٹا سا تو کمرہ تھا' ایک بیڈ' ایک الماری' دو ٹرنک' چار کرسیاں' دو تپائیاں اور کئی بے شمار چیزوں سے کمرہ ہر وقت کھچا کھچ بھرا رہتا۔ اس پر اب جو پوزیشن ہو چکی تھی۔ شارق سنجیدگی سے غور کر رہا تھا کہ کمرے کی ایک آدھ چیز نکال کر چھوٹی سی ایک چارپائی لے آئی جائے' تاکہ کم از کم واثق تو الگ سے سو سکے اور ایسا اب انہیں بہت جلد کرنا پڑے گا' تو کیا چیز نکالی جائے اور کدھر سے۔ واثق کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا وہ اپنے ہی خیال میں گم پلاننگ کرنے میں مگن تھا کہ حفصہ کی نازک سی کمر میں پڑنے والے دھمو کے نے اس کا خیال تتر بتر کر دیا۔

"کم بخت' عذاب سارا دن جان کھاتی ہو میری۔ اب تو سو مر جاؤ۔ ریں ریں ہی ختم نہیں ہوتی تمہاری' بس ہر وقت گود میں چڑھنے کا شوق۔ پرے دفع ہو جاؤ' مصیبت ہی بن جاتی ہو میرے لیے۔"

"اوں ہوں۔۔۔ یہ کیا ہو گیا ہے' یہ کس لہجے میں بول رہی ہو بچی ہے۔" شارق کو تیر کی طرح جا کر لگے اس کے الفاظ فوراً "ٹوکا۔

"تو پھر کیسے بولوں' جتنی میری جان جنگل میں پھنسی ہوئی ہے نا میں ایسے ہی بول سکتی ہوں' ان مصیبتوں کے ساتھ۔" ایک اور دھمو کا پڑا۔ حفصہ سے زیادہ شارق تڑپ کر اٹھا۔

"پاگل ہو گئی ہو' دماغ چل گیا ہے تمہارا۔ خبردار جو اب اسے ہاتھ بھی لگایا تو۔۔۔"

"ہاتھ تو کیا' میں اسے جان سے مار دوں گی۔ اتنا ہی درد اٹھ رہا ہے نا تو پکڑو اسے۔ نری مصیبت۔۔۔ سارے جنجال میرے لیے ہی رہ گئے تھے۔" وہ حد درجے چڑی ہوئی تھی' نہ صرف حفصہ کو جھنجوڑ کر پرے پھینک دیا' بلکہ خود بھی بھاں بھاں کر کے رو پڑی۔ شارق کو جہاں اس کے بھالے نما الفاظ نے کچوکے لگائے' وہیں اس پر غصہ بھی خوب آیا۔

"نہایت ہی فضول بکواس کرنے لگی ہو تم۔ کیا ہوتا جا رہا ہے تمہیں۔ ساری عورتیں' بچے پیدا کرتی ہیں۔ تم کوئی دنیا سے نرالا کام کرنے جا رہی ہو۔ ذرا بھی زبان قابو میں نہیں رہی تمہاری۔ اتنا واویلا تو کوئی جاہل عورت بھی نہیں کرتی ہوگی۔ پڑھ لکھ کر گنوایا ہے تم نے تو۔۔۔ آگ لگا دو ایسی ڈگری کو جو تمہیں بولنے کا سلیقہ بھی نہیں سکھا سکی اور یہ تمہارے سوتیلے بچے نہیں' تمہاری اپنی اولاد ہیں' کیسی ماں ہو تم ذرا دل نہیں کانپتا تمہارا ان کے لیے اتنے برے کلمات منہ سے نکالتے ہوئے' حد ہوتی ہے جہالت کی۔ بدتمیز کم عقل عورت۔" وہ بکتا جھکتا روتی بلکتی حفصہ کو کندھے سے لگائے کمرے سے نکل گیا۔ لبنیٰ اور زور و شور سے رونے لگی۔ کتنا غبار بھرا تھا اس کے اندر' سب نکالنے کے درپے ہو گئی۔

صحن میں ٹہل ٹہل لوریاں گا گا کر جیسے تیسے حفصہ کو سلایا۔ واپس کمرے میں آیا تو وہ رضائی میں منہ دیے ابھی بھی سسک رہی تھی۔ شارق کے دل کو کچھ ہوا۔ حفصہ کو لٹا کر وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ ایسی کیوں ہو گئی ہے۔ اسے اچھی طرح احساس تھا' ابھی تو واثق اور حفصہ ہی بہت چھوٹے تھے کہ ایک اور ذمہ داری کچی بات ہے وہ خود بھی ابھی اس حق میں نہیں تھا۔ مگر کیا کیجیے۔ اکثر زندگی میں وہ نہیں ہوتا' جو آپ چاہتے ہیں۔ ہوتا تو وہی ہے نا جو اوپر والے کی چاہت ہوتی ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں اپنی زندگیوں کے فیصلے کرنے والے۔ سب فیصلوں کا اختیار تو صرف اس کو ہے جو زندگی دیتا ہے۔ پھر جب انہیں ایک اور زندگی کی نگہبانی سونپنے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا تو پھر اس پر جزبز ہونا کیسا۔ وہ تو یہ سوچ کر ہی رب کا شکر گزار ہوا تھا۔ مگر وہ لبنیٰ کا کیا کرتا' وہ تو حفصہ کی بار ہی خوب تنگ ہوئی تھی کہ تب فقط دس ماہ بعد پھر سے اپنے اندر ہوتی تبدیلی پر سیخ پا ہو گئی تھی۔ ننھا واثق ہی اسے بہت بڑی ذمہ داری لگتا تھا کہ پھر ایک اور۔۔۔ جبکہ شارق نے کئی بار سمجھایا اور اب بھی سمجھا رہا تھا۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو ان میں بحث ہوئی تھی اسی بات پر' بلکہ اس سے بھی پہلے کئی بار۔

"کیوں اللہ کی ناشکری بنتی ہو۔ وہ اپنی نعمتوں سے نواز رہا ہے' تو کیوں ایسے کرتی ہو۔ بے وقوف' بلکہ خوش ہو کر قبول کرو' وہ بھی تو لوگ ہیں جو ایک بچے کو ترس رہے ہیں۔"

"تو اللہ انہیں ہی دے دیتا۔ مجھے ہی کیوں۔۔۔" وہ پٹاخ سے بولی تھی۔ بنا سوچے سمجھے اور شارق کا دل چاہا تھا چٹاخ سے ایک تھپڑ تو اس کے گال پر مار ہی دے۔

"کیونکہ تم پر اللہ کی خاص رحمت ہے۔ ناقص العقل عورت۔" وہ خوب بھنایا۔

"میرے لیے یہ نعمتیں ہی بڑی تھیں۔ ان کی ضرورتیں تو پوری کر لیں۔ ایک اور کی کہاں سے کریں گے۔" اس کا وہی انداز شارق نے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"نہ تم ان کی ضرورتیں پوری کر سکتی ہو اور نہ آنے والے کی کرو گی۔ ان کی ضرورتیں صرف وہی پوری کرے گا جو انہیں بھیج رہا ہے۔ آئی سمجھ میں تمہارے۔"

"واہ۔۔۔ بڑے پڑھے لکھوں والی باتیں آگئی ہیں۔ اپنا قصور نہ ماننا مجھ پر سب تکلیفیں تمہاری وجہ سے تو ہیں۔ خود تو تم صبح سے نکلے رات گئے واپس آتے ہو۔ تمہیں کیا پتا بچے کیسے پلتے ہیں۔ خون پلانا پڑتا ہے انہیں خون۔ تمہارا کیا جاتا ہے شکنجے میں تو میری ہی جان آتی ہے نا۔ شادی کیا ہوئی۔ سزا ہو گئی میرے لیے۔ یہ دو سنبھالے نہیں جاتے کہ اب تیسرا پھندا بھی گلے میں ڈال دیا ہے میرے۔ بس مجھے کچھ نہیں پتا میں نے نہیں رکھنا یہ بچہ۔" حتیٰ کہ وہ تو یہاں تک تلی ہوئی تھی۔ پھر شارق نے کیسے اسے قائل کیا کیسے کیسے جتن کر کے سمجھایا یہ وہی جانتا تھا اور اب جوں جوں دن نزدیک آرہے تھے۔ توں توں وہ اور تیر و تلوار بنتی جارہی تھی۔ مانا کہ ہر عورت پہ وقت بہت کٹھن ہوتا ہے۔ گویا پل صراط پر کھڑی ہوتی ہے وہ۔ خدا نے یوں ہی تو نہیں جنت اٹھا کر اس کے ہاتھوں پر بھی نہیں' بلکہ قدموں تلے رکھ دی۔ وہ غفور ہے۔ خبیر ہے۔ وہ جانتا ہے اس کی بندی کیسے کڑے وقت سے گزر کر ایک نئی زندگی کو جنم دیتی ہے۔ مولا کا کتنا خاص کرم ہے۔ عورت پر اور پھر وہ لوگ۔ جو ہر طرح کی گھڑی میں صبر کا دامن تھامے رہیں۔ ان کے لیے تو وہ بے اندازہ نعمتوں کی نوید دیتا ہے وہ اور اگر جو لوگ بے صبرے' ناشکرے ہوتے ہوں تو ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہو گا۔ بے صبری اور ناشکری تو ہیں بھی ایسے برے وصف کہ یہ سب اجریوں ضائع کر دیتے ہیں۔ گویا گھن لگی لکڑی۔۔۔ استغفر اللہ۔۔۔ معاذ اللہ۔۔۔ شارق بے اختیار خوف کے مارے تھرا اٹھا۔

اپنے معصوم صورت بچوں سے تو اسے جی بھر کر پیار تھا اور جو ابھی آیا بھی نہیں تھا اس کے لیے بھی وہ اپنے دل میں محبتوں کا اک دریا موجزن پاتا تھا۔ لبنیٰ تو اس دن کے انتظار میں تھی کہ کب اس بوجھ سے چھٹکارا ملے اور اسے یہ انتظار تھا کب وہ اپنے بچے کو بازوؤں میں لے کر پیار کر سکے اور پیاری تو اسے وہ بھی بہت تھی جو ان بچوں کی ماں تھی' مگر کیا کرتا کہ وہ تھوڑی سی نہیں' بلکہ زیادہ ہی نازک جان اور کم عقل ثابت ہوئی تھی۔

لبنیٰ۔۔۔ بڑی چاہ سے پکارتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا جو اک جھٹکے سے چھڑا لیا گیا۔ اک گہری سانس بھرتے لحاف پرے سرکایا۔

"کیا بات ہے' کیوں اتنی بدتمیز ہو رہی ہو۔ اماں بتا رہی تھیں تم آج چیک اپ کے لیے بھی گئی تھیں۔ سب ٹھیک ہے نا' کیا کہا ڈاکٹر نے' کتنے دن ہیں اب؟ کیا ڈیٹ دی ہے اس نے؟" پے در پے سوال کرتے بڑی محبت کے ساتھ آنسو پوروں پر چننے چاہے تھے' مگر ہاتھ پھر پرے کر دیا گیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ضرور برا مانتا۔ مگر اس وقت تو صرف پریشانی دل کی دیواروں سے لپٹی پڑ رہی تھی۔

وہ ایک کاغذ فیکٹری میں چند ہزار ماہوار پر ملازم تھا۔ صبح سویرے دوسرے نمبر کی بس پر گاؤں سے نکلتا تو شام ڈھلے گھر واپس آپاتا۔ آج بھی آتے ہی کھانا کھا کر کمر ٹکانے لگا تھا کہ یہ **فضیحتہ** ہو گیا۔ وہ جانتا تھا۔ لبنیٰ مزاج کی تیز ہے۔ مگر آج کا اس کا رویہ۔۔۔ اتنی چڑچڑی اور بے زار کہ مرنے مارنے پر تل جائے۔ ضرور کوئی بات ہے اس کے پیچھے۔

"لبنیٰ۔۔۔ میری جان! تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو' کیا کہا ہے ڈاکٹر نے' دیکھو میرا دل گھبرا رہا ہے' تم مجھے اور پریشان مت کرو۔ ایک تو تمہاری یہ کنڈیشن اس پر تمہارا یوں ہانپو ہونا بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے تمہارے لیے۔ کیوں ایسے کرتی ہو پھول جیسے بچے ہیں تمہارے۔ انہیں دیکھ کر خوش ہونے' شکر ادا کرنے کے بجائے تم سارا وقت جلتی کڑھتی رہتی ہو۔ حفصہ بہت چھوٹی ہے ابھی۔ بہت پیار کرتی ہے تم سے۔ یقین کرو اگر وہ اس طرح مجھ سے لاڈ کرے تو میں نثار ہو جاؤں اپنی بیٹی پر۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ تم ماں ہو اس کی۔ مگر افسوس ہے کہ عجیب ماں۔۔۔ ارے میں تو ننھے مہمان کے لیے اس قدر ایکسائیٹڈ ہوں کہ یہ ہی پلان کر رہا تھا کہ اس کے لیے مرے میں کیسے جگہ بنائی جائے۔ پتا ہے کیا کرتے ہیں۔ یہ کرسیاں نکال کر۔۔۔" وہ اسے اپنا خیال بتانے لگا' جبکہ لبنیٰ کینہ توز نظروں سے

اسے گھور رہی تھی۔ یوں گویا کھا ہی جائے گی۔ پچھلی عزت افزائی بھلا کر شارق نے پھر اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ جسے نرمی سے سہلاتے لہجے میں مٹھاس بھر کر بولا۔

"یوں ہی سڑتی رہیں ناتو ایک دن کوجی (بدصورت) ہوجاؤ گی' تم اپنی حالت دیکھو' خوش رہا کرو' اس طرح رونے اور پریشان ہونے سے کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ تم مجھے کچھ بتاؤ تو سہی نا۔ اگر خدانا خواستہ تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہے تو میں تمہیں صبح ہی شہر لے چلتا ہوں۔ اگر ابھی کہتی ہو تو ابھی چلتے ہیں۔ ایک سے ایک بہترین ڈاکٹر ہے وہاں۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔ تمہیں اپنی اتنی فکر نہیں ہوگی' جتنی مجھے ہے تم تو میرا دل ہو۔ میری زندگی جانتی ہو نا کتنی محبت کرتا ہوں میں تم سے۔"

"بھر پائی میں ایسی محبت سے بخشو مجھے۔" لبنیٰ نے ٹھک سے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے۔ شارق اس کے انداز پر ہق دق رہ گیا۔

"کیا فائدہ مجھے تمہاری اس محبت کا جو میری جان کی دشمن ہی بن جائے' پیچھے ہی پڑ جائے۔ خون ہی چوس لے۔ کچھ نہیں بچا میرے اندر۔ خون کا ایک قطرہ نہیں ہے۔ بلڈ کی شدید کمی ہے مجھے۔ یہ پیلا رنگ دیکھ رہے ہو میرا۔ بی پی لیول اتنا ہائی رہتا ہے کہ جیسے کسی وقت بھی دماغ کی رگ پھٹ جائے' یہ جسم دیکھ رہے ہو میرا۔ یہ صحت نہیں ہے' سوجن ہے۔ ابھی پچھلے مہینے پانچواں سال لگا ہے ہماری شادی کو اور تمہاری یہ تین سوغاتیں (بچے) جانتے ہو آج کتنی باتیں سنائی ہیں مجھے ڈاکٹر نے' کتنی عورتوں کے سامنے اتنا کچھ سننا پڑا مجھے۔ شرم سے کہیں ڈوب مرنے کو دل کررہا تھا میرا۔ اتنی ذلت اٹھائی ہے آج میں نے۔"

"کیسی ذلت' کس بات کی شرم' کون سا غلط کام ہے کیا تم نے۔ تم نے اس جاہل ڈاکٹر کا منہ نہیں توڑا گیا۔" شارق کا سکتہ ٹوٹا' غصہ ہی آگیا ہے۔

"کیسے منہ توڑتی میں اس کا۔ ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا اس نے' پھر میرے بھلے کو ہی کہہ رہی تھی وہ۔ اگر اسی رفتار سے میں بچے پیدا کرتی رہی نا تو بہت جلد جنازہ اٹھاؤ گے میرا۔" وہ بھی لبنیٰ تھی جو بولتے ہوئے کبھی بھی آگا پیچھا نہیں دیکھتی تھی۔ شارق نے بڑی مشکل سے اپنے دائیں ہاتھ کو قابو کیا۔

"بس بہت ہوگیا' مجھے نہیں چاہئیں یہ تمہارے خالی خولی کے دعوے۔ تمہاری محبت میں تب مانوں نا' جب تمہیں میری زندگی سے بھی پیار ہو۔ تمہیں تو صرف اپنی غرض سے پیار ہے۔ بیوی چاہے جئے یا مرے' تمہاری بلا سے۔ میں تنگ آگئی ہوں۔ اس مسلسل اذیت سے مجھ سے نہیں برداشت ہوتیں اتنی باتیں اور جانتے ہو اس بار بھی ہماری بیٹی ہے اور پھر اس سے اگلی بار بھی ہوسکتی ہے۔ تم چند ہزار کمانے والے کہاں سے پورا کرو گے اتنے بچوں کا۔ زمانہ کہاں سے کہاں بھاگا جارہا ہے۔ کل کو اتنی بیٹیوں کا بوجھ اتارنا کس قدر مشکل ہوگا۔ تمہیں تو ذرا کسی بات کی فکر نہیں ہے۔ مگر میرا تو سکھ چین حرام ہوگیا ہے۔ کیا ساری زندگی پریشانیوں کے انبار تلے ہی دبی رہوں گی۔ کبھی کہیں سکون بھی ہے میرے لیے۔" وہ بولتے بولتے ہانپ گئی تھی۔ شارق ساکت سا بہ لب سن رہا تھا۔ لبنیٰ اس نے تو حد ہی کردی تھی۔

اس کی محبت کی ناقدری' نعمتوں کی ناشکری' اس آنے والی کل کی فکر جس پر انسان کا رتی بھر اختیار نہیں۔ وہ اپنا آنے والا اگلا پل نہیں جان سکتا۔ آئندہ سالوں کا تو ذکر ہی کیا اور پھر بیٹا ہو یا بیٹی یہ تو وہی دیتا ہے جو قادر مطلق ہے اور وہ جسے چاہے جو مرضی دے۔ کسی کو صرف بیٹے' کسی کو بیٹیاں اور کسی کو دونوں یہ سب تو اس کے فیصلے ہیں نا۔ ہم خاک کے بنے پتلے کون؟ مگر اکثر اس بات کو نہیں سمجھتے لوگ اور اپنے ہی ہاتھوں اپنی ناعاقبت اندیشی سے اپنی دنیا اور آخرت خراب کرلیتے ہیں۔ اللہ پاک نے تو فرمایا ہے کہ وہ کسی پر کوئی بوجھ نہیں ڈالتا یہ تو ہم خود ہیں کہ اپنی کمر پر اپنے ہی میرے اعمال کا بوجھ لیے پھرتے ہیں اور افسوس کہ پھر واویلا کرتے ہیں کہ یہ کیا ہوگیا۔ شارق بہت دیر بعد بولنے جوگا ہوا تو لہجے میں انتہائی دکھ کی آمیزش تھی۔

"مجھے تمہاری سوچ پر شرم آرہی ہے لبنیٰ۔ ارے

بنی تو رحمت قرار دی ہے ہمارے آقا نے اور تم تو خوش نصیب ہو جسے اللہ دوسری بار اپنی رحمت کے قابل سمجھ رہا ہے اور دو بیٹیوں کی پرورش کرنا' ان کی اچھی تربیت کرنا' پھر ان کی شادی' سمجھو تم نے تو جنت لوٹ لی۔ تمہیں تو شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس رب کا جو تم پر جنت کے راستے آسان کر رہا ہے۔ تم صرف دنیا ہی کیوں سوچ رہی ہو۔ تم اس جہان کا بھی تو سوچو اور پھر ہر آنے والا بچہ اپنا رزق اپنا مقدر ساتھ لے کر آتا ہے۔ کیسی مسلمان ہو تم' ہر بات جانتے ہوئے پھر بھی پریشان ہو رہی ہو اور کیا تمہاری ماں ایک بیٹی نہیں تھیں اور کیا تم خود ایک بیٹی نہیں تھیں۔ کیا تمہیں پالا پوسا نہیں' تمہارے ماں' باپ نے۔ تمہارے لیے کسی چیز کی کمی رہی ہے کبھی۔ جو تمہارا نصیب تھا۔ وہ سب ملا ہے نا تمہیں۔"

"ہونہہ میرا نصیب۔" لبنی نے استہزا بھری نظریں کمرے کے در و دیوار پر ڈالیں اور اس کا یہ انداز شارق کو اور اشتعال دلا گیا۔

"تم جیسی جاہل عورت کو سمجھانا بھی نری جہالت ہے۔ ٹھیک ہے تم چاہتی ہو' مزید بچے نہیں ہوں تو نہیں ہوں گے مگر تم میرے ان بچوں کو بخش دو۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں' تم آئندہ ان کے لیے کوئی برے کلمات اپنے منہ سے مت نکالنا۔ میرا کلیجہ پھٹتا ہے۔ جب تم انہیں کچھ بھی برا کہتی ہو' ماں کی صرف دعا ہی نہیں بددعا بھی عرش تک جاتی ہے۔ پتا نہیں اتنی کم علم کیوں ہو تم۔ اکثر تمہاری حرکتوں پر میرا دل چاہ رہا ہوتا ہے۔ تم جیسی بدتمیز عورت کو اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دوں۔ مگر کیا کروں۔ سخت مجبور ہوں کہ تم سے صرف مجھے ہی نہیں میرے بچوں کو بھی بہت پیار ہے۔" بولتے بولتے شارق کا لہجہ یکسر بدل گیا شاید اس کے ستے چہرے پر ترس آ گیا۔ وہ سر نیہواڑے چپ چاپ سنے جا رہی تھی۔ حالانکہ اتنی باتوں پر اس کا چپ رہنا خلاف معمول ہی تھا۔

"چلو اب سب سوچیں دور پھینک دو اور سو جاؤ آرام سے۔" شارق خود بھی لحاف میں گھس گیا۔ اسے بھی کھینچ کر ساتھ لٹایا اور ابھی وہ بستر کی گرمی اور اس کی قربت کی سکون آمیز نرمی سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہیں ہو پایا تھا کہ لبنی کی آواز نے سب آرام تہس نہس کر دیا' وہ کہہ رہی تھی۔

"مجھے تمہاری کسی بات پر اعتبار نہیں ہے' تم مرد لوگ ہوتے ہی جھوٹے ہو۔ حفصہ کی بار بھی تم نے کہا تھا کہ اب اور بچے نہیں۔ مگر ہوا کیا۔ میں ایک بار پھر تمہاری وجہ سے اس اذیت سے گزر رہی ہوں۔ مگر اس کے بعد نہیں۔ میں اب یہ سلسلہ ہی ختم کر دوں گی۔ بچی کی پیدائش کے فوراً" بعد میں آپریشن کروالوں گی۔ قصہ ہی ختم۔" اور شارق نے لحاف یوں پرے پھینکا۔ گویا سو والٹ کا کرنٹ لگا ہو۔ "کیا! کیا بکواس کی تم نے؟" اور لبنی کوئی اس سے ڈرتی تھوڑا ہی تھی جو اپنے الفاظ سے مکر جاتی۔ وہ اب واضح الفاظ میں اسے اپنا موقف بتا رہی تھی اور شارق اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے سوچ رہا ہو۔ اب تو اسے اٹھا کر گھر سے باہر پھینک ہی دوں۔

☼ ☼ ☼

"خیر تو ہے' رات کیوں لڑ رہے تھے تم دونوں۔" چائے میں پاپا ڈبو کر کھاتی حمیدہ نے بیٹے سے پوچھا۔ جس کے آگے رکھا ناشتا جوں کا توں پڑا تھا۔

"آپ نے اسے اکیلے جانے ہی کیوں دیا۔ خود کیوں نہیں گئیں اس کے ساتھ' دماغ خراب کروا آئی ہے وہاں سے پاگل عورت!" اماں کے پوچھنے کی دیر تھی' وہ تو پھٹ پڑا۔ بیوی کے نادر خیالات انہیں بھی بتاتا چلا گیا۔

"ہائے ہائے مجھے تو پتا ہی نہ چلا۔ مجھے کہتی تو کیا میں ساتھ نہ جاتی اس کے' وہ تو خود بڑی سیانی ہے' اکیلی ہی نکل پڑی۔ میں ساتھ ہوتی تو مجال تھی اس ٹٹ پنی (ایل ایچ وی) کی کہ اسے کوئی الٹا سیدھا بول جاتی اسے۔ کلی دیکھ کر گھیر لیا اس نے۔ چار پیسوں کے پیچھے خدائی فوجدار بنی پھرتی ہے۔ تنخواہ حلال نہیں کرنی اس کم بختی ماری نے۔ اپنے پنج بچے ہیں اور لوگوں کی

نوئوں کے دل پھرتی ہے کہ ایک بھی نہ پیدا کرو۔ یہ جو حکومت والے بچے بند کراتے پھرتے ہیں پہلے یہ اپنے مکائیں نا' حد ہو گئی' لو دسو' سیدھا ہی اللہ کے کاموں میں۔ دخل اندازی انسانیت ہی نہیں رہ گئی کہیں اور پھر جس روح کو اس نے بھیجنا ہے وہ بھیج دے گا سارے مل کے چاہے جتنے مرضی جتن کرلو۔

اب یہ اپنے چاچے فضل دین کی نوں کا ہی قصہ سن لو۔ پانچ بچوں کے بعد آپریشن کروا آئی تھی۔ خصم کے ساتھ آڑا لگا کے۔ اب چھ سال بعد خیر سے پھر بیٹھی ہے' نتیجہ (تیسرا) مہینہ لے کے۔ اب بتاؤ کدھر گئی' ان ڈاکٹرنیوں کی ڈاکٹری' اویں خوامخواہ کا پکھنڈ ڈالا ہوا ہے۔ گرو کری (گھر گھر) فساد مچاتی ہیں اللہ ماریاں اور تو فکر نہ کر لبنی چاہے جتنے پر مارلے۔ اویں کیسے کرلے گی اپنی مرضی' تیری رضامندی ہوگی تو پرچے پر سین (سائن) کرے گا۔ تب ہی تو کریں گی وہ آپریشن۔"

حمیدہ چاہے ان پڑھ عورت تھی۔ مگر اتنا علم تو تھا ہی اسے۔ بیٹے کو بھرپور تسلی دی۔

"منیر ابھی کیڑے دس بارہ بچے ہو گئے ہیں کہ تیری بڈی (بیوی) کو وخت پڑ گیا ہے۔ اس کی ماں کی تو چار کڑیاں ہیں' اسے ابھی اللہ دوسری دینے لگا ہے تو یہ منڈیرے چڑھ گئی ہے۔ اپنی ماں سے سبق سیکھے' اس نے بچی تو پالی ہیں۔ آئے میری اپنی دو بہیں آئے ہائے اللہ نصیب چنگے کرے' دھیاں دچاریاں کیا کہتی ہیں۔ کوئی زیادہ نہیں کھاتی وہ۔ تیری رن نے تے پڑھ کے ای گنوایا ہے' تو ہم جیسے گنواروں کو بھی چھڈ گئی۔ نکے نکے بالوں (بچوں) کو یوں گالیاں' بددعائیں دیتی ہے جیسے وہ اس کے برابر کے ہوں۔ اللہ معافی دے' کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے' پر ذرا جو وہ بولتے سوچتی ہو۔ کل وی مار مار کے میرے بچوں کے منہ لال کردیے' میں صدقے' کتنی دیر ہتھکلیاں (ہچکیاں) لے لے کہ روتے رہے وہ۔ میرا تو کلیجہ منہ کو آ نا رہا۔ اسے میں کہتی ہوں نہیں چنگے لگتے تھے بچے تو نہیں کرانا تھا ویاہ' رہتی رہیں ماں کے گھر۔"

حمیدہ بھی آخر لبنی کی ساس تھی جو بولنے پر آئی تو کچے چٹھے سارے کھول دیے۔ بیٹے کو تو پھر اس نے ناشتا کروا کر بھیج دیا' مگر پھر جو اس کے ہاتھوں لبنی کی شامت آئی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ حتیٰ کہ اس نے یہاں تک دھمکی لگا دی کہ اگر اس سے نہیں پلتے بچے تو بے شک وہ انہیں چھوڑ کر اپنے میکے جا بیٹھے۔ اس کی بوڑھی ہڈیوں میں ابھی اتنا دم ہے کہ وہ خود پال لے گی اپنے پوتے پوتریاں۔ اور لبنی جو پہلے ہی الٹی مت کی عورت تھی اس نے بھی ٹھان لیا کہ اب چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے وہ اپنے ارادے پر عمل کرکے رہے گی۔

☼ ☼ ☼

اور پھر تو جیسے سارے زمانے نے اسے سمجھانے کا ٹھیکہ ہی لے لیا۔ جو بھی سنتی اتنے عظیم ارادے پر پہلے تو دانتوں میں انگلیاں داب لیتی۔ کوئی تو اس کی ہمت پر اور کوئی تو اس کی عقل پر' ہر کسی کی اپنی رائے ہوتی ہے اور دنیا اپنے خیال کا اظہار کرنے سے بھی نہیں چوکتی' اس روز نزہت آپا آگئیں' ابھی پوری طرح بیٹھنے بھی نہ پائی تھیں کہ حمیدہ نے بیٹی کو ساری رام کہانی کہہ سنائی۔ وہ تو کتنی دیر ہکا بکا ماں کا منہ دیکھتی رہی' پھر اسے جالیا۔

"کیا ہو گیا ہے لبنی' عقل تو ٹھکانے ہے تمہاری' دیکھو ایسی غلطی کبھی مت کرنا۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے' جو اچھی اور سمجھ دار ڈاکٹرز ہوتی ہیں وہ تمہاری عمر کی ماؤں کو کبھی بھی آپریشن کا مشورہ نہیں دیتیں۔ تم پہلے کسی اچھی سی ڈاکٹر سے ملو۔ کوئی متبادل طریقہ اپنالو۔ مگر ایسی کوئی حماقت کرکے بیماریاں نہ لگوالینا خود کو۔"

"تو کیا ایسے بیماریاں نہیں لگے گی مجھے۔" وہ جو پہلے ہی ہر ایک سے عاجز آئی ہوئی تھی تڑخ کر بولی۔

"نہ پوری خوراک' نہ پھل' نہ دودھ' نہ دوائیاں' اوپر تلے کے ان بچوں نے خون تک تو رہنے نہیں دیا میرے اندر' آپ کو کیا پتا' کیا حالت ہے میری۔ یہ تو میں یا میرا اللہ ہی جانتا ہے۔ شارق چند روپے میرے

ہاتھ پر رکھ کر سمجھتا ہے کہ فرض ادا ہو گیا۔ میری جان کی تو فکر ہی نہیں ہے اسے۔ بس بچے... بچے... ان حالوں میں بیماریاں ہی لگیں گی مجھے اور کیا ہو گا بھلا؟"

"خدا نہ کرے' کیسی باتیں کرتی ہو' اللہ تمہیں صحت' زندگی دے۔ شارق جتنے جوگا ہے اس سے بڑھ کر تو خیال رکھتا ہے تمہارا۔ اماں بھی کوئی ایسی سختی نہیں کرتیں' گھر کی زیادہ تر ذمہ داری تو ابھی تک انہوں نے خود سنبھال رکھی ہے۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے' جو چاہے مرضی کھایا پیا کرو۔ اللہ کا شکر ہے ضرورت کی ہر چیز تو ہوتی ہے' گھر میں پھر بھی جو کمی ہو کہہ دیا کرو شارق سے۔"

"ہونہہ... میں نے کہا اور شارق نے سنا۔ رہنے دیں ان باتوں کو' اسے پروا ہو نا میری' تو اور مجھے کیا چاہیے پھر' اسے تو بس بچوں کی محبت کا ہڑکا ہے۔" وہ سخت چڑی ہوئی تھی۔ نزہت آپا ہنس دیں۔

"تو بچوں کی محبت کا ہڑکا تو تم سے محبت کے بعد لگا ہے اسے اور یہ کتنی خوب صورت محبت ہے اور کیسی پیاری نعمت۔ تم تو خوش نصیب ہو جسے اللہ پاک بن مانگے یہ نعمتیں عطا کر رہا ہے' شکر کیا کرو اس کا۔ یوں بے زار مت ہوا کرو۔" انہوں نے گود میں بیٹھی حفصہ کو سینے میں بھینچ لیا اور چٹاچٹ منہ چومنے لگیں۔ واثق اپنے کھلونے بکھرائے بیٹھا تھا۔ پھوپھو کو بہن سے پیار کرتے دیکھ کر خود بھی لپکا۔ یاں کو تو کئی مہینوں بعد جا کر پیار آتا تھا۔ پھوپھو اچھی تھیں' جب بھی آتیں خوب خوب لاڈ کرتیں۔ نزہت نے اسے بھی بازوؤں میں لے لیا۔

"ماشاء اللہ۔ دیکھو تو کیسے ننھے فرشتے ہیں یہ بھلا یہ ہم سے کیا لیتے ہیں۔ الٹا ہماری زندگیوں کو خوشیوں سے بھر دیتے ہیں۔ اولاد بھی کیسا پیارا انعام ہے میرے رب کا۔ بیٹا اگر نعمت ہے تو بیٹی رحمت اور یہ سوچو لبنیٰ' جب تمہاری یہ بیٹیاں بڑی ہوں گی تم زندگی کے جھمیلوں سے تھکنے لگوں گی تو یہی پریاں تمہاری تھکن سمیٹ لیا کریں گی۔ بازو بن جایا کریں گی تمہارے۔ دیکھنا کتنا آرام دیا کریں گی تمہیں۔"

"ہاہاہا... یہ کس دن کے خواب دکھا رہی ہیں آپا۔ اس سے پہلے میری جان بھی تو کھا جائیں گی یہ۔ پھر اگر یہ ایک دو سال میری خدمت کر بھی لیں گی تو مجھے کیا فائدہ پال پوس کر پڑھا لکھا کے ان کو بھیجنا تو کسی اور گھر ہی ہے نا۔ اگلوں کی جوتیاں سیدھی کرنے کو۔ ہنہہ..."

"نہیں... ہیں... یہ کیسی بات کر رہی ہو۔ اللہ ان معصوم پریوں کے نصیب بھلے کرے۔ ماں کو ہمیشہ اپنی اولاد کے متعلق اچھی بات منہ سے نکالنا چاہیے اور پھر یہ تو اللہ کے بتائے اصول ہیں' جن پر ہمیں عمل کرنا ہی ہوتا ہے۔ یہ ہی تو زندگی ہے۔ بیٹی کا عورت بننا' اپنا گھر' اپنے بچے' اب تمہیں اپنے گھر میں کیا کمی ہے۔ نصیبوں والی ہوتی ہیں۔ وہ عورتیں جنہیں اللہ شوہر کی محبت' گھر کا سکھ اور اولاد کی خوشیاں عطا کرتا ہے۔ اب مجھے دیکھ لو۔ میرا اپنا دل کرتا ہے۔ میرے گھر میں خوب ساری رونق ہو۔ مریم بڑی ہو گئی ہے۔ بڑی خواہش ہے کہ ایک اور بچہ ہو..." نزہت یک دم چپ کر گئیں' لہجہ بھیگ سا گیا۔ آنکھوں میں حسرت سی اتر آئی تھی۔

"ہاں تو اللہ نے دیا تو تھا۔ آپ کو دوسرا بچہ' آپ نے خود ہی نہیں رکھا۔" لبنیٰ نے بڑی رعونت سے ناک چڑھا کر انہیں جتایا۔ نزہت کے لبوں پر مجروح سی مسکان پھیل گئی۔

"ہاں وہ میری خطا تھی۔ میں مانتی ہوں' میں نے کب انکار کیا۔ وہ تو مہربان ہوا تھا مجھ پر' مجھ گناہ گار کو ہی شکر ادا کرنا نہیں آیا۔ ان دنوں ایاز کی نوکری چھوٹ گئی تھی۔ پھر سال بھر کی مریم... مجھے لگا میں ذمہ داری اٹھا نہیں پاؤں گی۔ میں یہ بھول گئی تھی کہ جو اس ذمہ داری کا اہل سمجھ رہا ہے۔ وہ سب آسانیاں بھی دے گا۔ جس نے ایک در بند کر دیا ہے وہ چاہے تو اور سو دروازے کھول سکتا ہے۔ میں نے اس پر توکل کرنے کی بجائے اپنی عقل محدود پر بھروسا کیا اور جب انسان اللہ کے فیصلے کو اپنے لیے بوجھ سمجھتا ہے اور ان فیصلوں پر اپنے ارادوں کی مہر لگانا چاہتا ہے تو یقیناً اسے منہ کی کھانا پڑتی ہے۔ ہم ناقص العقل جلد باز'

ہم کیا جانے ہمارے لیے کہاں فائدہ ہے' کہاں خسارہ۔ اگلا آنے والا پل اپنے دامن میں ہمارے لیے کیا لے کر آرہا ہے۔ ہم اتنا نہیں جانتے۔ مگر تدبیر ہم سالوں کی سوچتے ہیں۔ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تدبیر سے نہیں اور تقدیر ہے ہم اس پر بھروسا کیوں نہیں کرتے۔ میں نے بھی صرف ایک ناسمجھی کرکے سارے عمر کا پچھتاوا مول لے لیا۔ ایک غلطی جو میری ساری زندگی پر محیط ہوگئی کہ جس کے بعد کوئی دوا کام آرہی ہے نہ دعا اور میں نہیں چاہتی کہ تم بھی کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤ جو تمہارے لیے مستقل روگ بن جائے۔"

"آئے ہائے۔ آپ تو بددعائیں دینے پر ہی اتر آئیں' میں نے ایسا کیا کرلیا ہے۔" نزہت کی باتوں کا اس نے الٹا ہی اثر لیا۔ وہ ان پر چڑھ دوڑی۔

"تین بچے بہت ہیں آج کل کے دور میں۔ شارق کی معمولی تنخواہ میں کیسے گزارہ ہوتا ہے' یہ میں ہی جانتی ہوں۔ اگر میں اپنی جان بچانے اور ان بچوں کی زندگی بہتر بنانے کے لیے اگر کچھ اچھا سوچ رہی ہوں تو سب کو برا کیوں لگ رہا ہے' حد ہوگئی۔" وہ تن فن کرتی دروازے کی طرف بڑھی۔

"چلو ٹھیک ہے' اگر تم ان بچوں سے اتنی ہی تنگ ہو تو یہ جو گڑیا آرہی ہے۔ اسے مجھے دے دینا۔ ساس اور پھوپھی میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ تم سے زیادہ پیار دے کر پال لوں گی۔"

"اے ہے۔ ایویں تمہیں دے دیں۔ میں اپنی پوتری کیوں بھیجوں کسی اور کے گھر۔ میں زندہ ہوں' میں آپے سانبھ (سنبھال) لوں گی۔ کوئی فکر نہ کرے۔ میں نے تو کہہ دیا ہے اس سے پہلے والے بھی پالے جاتے ہیں تو ٹھیک۔ نہیں تو نکلے یہاں سے میں آپے خیال کرلوں گی اپنے جگر گوشوں کا۔" لبنیٰ سے پہلے حمیدہ تڑپ کر بول اٹھیں۔ نزہت کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ پاؤں پٹخ کر کمرے سے نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

امی کا فون آیا تھا' بس حال پوچھنے کی دیر تھی اور وہ کسی پارے بھرے غبارے کی طرح پھٹ پڑی تھی۔ رو رو کر آپ بیتیاں سنائیں۔ مجھے اتنی باتیں سنائی ہیں۔ سارے پنڈ میں مشہور کردیا ہے۔ گھر سے نکال دینے کی دھمکی دی ہے ماسی نے۔ آپ کی چار بیٹیوں کے طعنے مارے ہیں۔ (حالانکہ حمیدہ نے قطعاً" اسے طعنہ نہیں دیا تھا۔) اس کے دکھڑے بے شمار تھے۔ فون پار امی کا رنگ بھی لال ہوگیا۔

"بھرجائی ہے ہی بڑی چالاک' شروع سے ہی پھاپھا کٹنی ہے وہ تو مجھ سے تو آڑے لگنے کا کوئی موقع نہیں جانے دیتی کبھی۔ لو دسو بھلا میری کڑیاں نظر آگئیں تے آپ کون سا صرف منڈے جنے تھے۔ اپنی دی تو ہیں۔ اس کی اپنی باتوں کی وجہ سے اللہ اسے دوسری پوتی کا منہ دکھا رہا ہے۔ اللہ کرے جو بچے بھی ہوجائے تو ان کے گھر وی کڑیاں ہی ہوں۔" امی نے تو پکڑ کے بوری کا منہ ہی کھول دیا۔ ایک تو آتے سے کوسنے۔ لبنیٰ بڑی مشکل سے انہیں واپس اپنے مسئلے کی طرف لے کر آئی۔

وہی مستقبل کے اندیشے' انجانے' ان دیکھے' جن سے ہم یوں ڈرتے ہیں جیسے ہمارا تخیل واقعی اک دن ظہور پذیر ہوجائے گا۔ اگر ہم اتنی ہی اچھی امید کے ساتھ تقدیر پر بھروسا کرلیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یقین آخر کار ہوجائے۔ ایک بہتر آس' کوشش پھر بہترین عمل کو جنم دیتی ہے اور ایک دھڑکا صرف اور صرف بدشگونی ہی بھر دیتا ہے ہماری زندگی میں اور یہ دھڑکا ہوتا ہی کیوں ہے؟ جب ہی جب ایمان مکمل نہیں ہوتا۔

اور آج کا انسان اسی بیماری کا تو شکار ہے اور یہ بیماری لگتی کیوں ہے؟ جب ہم صبر کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور شکر کرنا بھول جاتے ہیں۔ یہ ہی دو اوصاف ہیں جو ہمیں آنے والی کی مشکلات سے بچا سکتے ہیں۔ مگر ہم سمجھیں تو تب نا' ہماری عقلوں پر تو کم فہمی سے بھاری قفل لگے ہیں۔

"سچ کہتی ہو بیٹیاں تو آخری سانس تک کا بوجھ ہیں۔ اب میں نے جیسے تیسے وختوں میں پڑ کے تین دیاہ دی ہیں' تو دنیا کہتی ہے فارغ ہوگئی۔ سر سے بوجھ

اتر گیا۔ پر سچ پوچھو تو اصل تو میں اب پھنسی ہوں۔ اتنے خرچے 'استاد بنا دلانا' ساہ ہی نہیں آتا ایمان سے۔ اب بشریٰ کے دیور کی شادی تھی۔ پچھلے دنوں وہاں جانا لازمی تھا' پھر خرچا و کھرا۔

اور ابھی دو دن پہلے رجی کی ساس بیمار ہو گئی' آج وہاں جانا ہے عیادت کو اور وہاں بھی کون سا خالی ہاتھ جائیں گے۔ ہزار دو ہزار کا تو پھل ہی لے جانا پڑے گا۔ نری مصیبت' اپنے گھر میں چاہے ہانڈی نہ پکی ہو' پر دھیوں کے گھر خالی ہاتھ نہ جاؤ۔ ہائے یہ زمانے کے رواج۔ فیر اوپر سے تمہاری فکر الگ لگی ہے مجھے۔ دو چار چیزیں تو بنانی ہی پڑیں گی' نہ کروں گی تو تیری چنڈال ساس ہی نہیں چھوڑے گی تجھے۔ اب بتاؤ کہاں کہاں سر دے ایک وچاری ماں' اب کیا' کیا کروں میں' اگر کسی کا خیال نہ کرو تو وہ جینے نہیں دیتی۔

چلو سیانی ہو گئی ہو تم۔ اتنے ہی بچے برے نہیں۔ ارے ہمارے زمانے میں تو نہ کسی نے دیں ہمیں ایسی صلاحیں۔ ورنہ ہم بھی سکون سے ہوتے۔ تم فکر نہ کرو ابھی تو کچھ دن باقی ہیں نا۔ میں ادھر کسی ڈاکٹرنی سے مشورہ کر لیتی ہوں۔ وہاں تو تیری ساس اور خصم نے تیری چلنے نہیں دینی۔ میں ادھر ہی دو چار روز پہلے بہانے سے بلالوں گی تمہیں' خیر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" لو جی امی نے تو سارا حل ہی بتا دیا تھا۔ اب ماں کا منہ تو سامنے نہیں تھا۔ لبنیٰ نے مارے خوشی کے موبائل ہی چوم لیا۔

"سچ کہتے ہیں' ماں ٹھنڈی چھاں' مصیبت کے وقت ماں ہی کام آتی ہے۔ اوہ جیوندی رہ میری ماں۔ "ٹھیک ہے امی' پھر میں تیاری کر کے رکھوں گی۔" یوں ماں بیٹی نے مل کر ساری منصوبہ بندی کر لی اور ایک دن ایاز آگیا۔ اسے لینے کے لیے۔ اس پیغام کے ساتھ کہ اماں کی طبیعت خراب ہے۔ انہوں نے لبنیٰ کو بلوایا ہے۔ شارق تو گھر تھا نہیں' لبنیٰ اتنی خبر سن کر بے چین ہو گئی۔

"ہائے میری اماں!" اس نے تو رونا ہی ڈال دیا۔ (نرا ڈراما) حمیدہ بے چاری بھی بوکھلا گئی۔ فٹافٹ شارق کو

فون کر کے بتایا۔ اب وہ بھی کیا کہتا کہ بات ہی ایسی تھی۔ لبنی نے لپک جھپک اپنا تیار بیگ نکالا، جسے دیکھ کر حمیدہ حیران تو ہوئی، مگر چپ رہی۔

ایاز کے پاس کون سی گاڑی تھی، وہی ابا کے دور کی پرانی موٹر سائیکل، جس پر اتنے سامان کے ساتھ اتنے سارے جی۔ پھر لبنی کی حالت، حمیدہ نے پکڑ کر واثق کو اتار لیا۔ روتے پھڑکتے کو اندر لے گئی۔ بیگ ٹنکی پہ رکھا تھا، پھر حفصہ۔ بھائی کے پیچھے وہ بیٹھ گئی، بہت سنبھل کے۔

سب پلاننگ تو مکمل تھی، لبنی کی تیاری، امی کا بہانہ، ڈاکٹر سے اپائنمنٹ، پھر کمی کہاں رہ گئی تھی اور کسی بھی پلاننگ پر بھاری تو اس کی پلاننگ ہے ناں جو مختار کل ہے۔ اور وہ جو چاہے کرے۔ کسی کے لیے خیر تو کسی کے لیے شر اور اس میں اس کی کیا مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے، یہ تو وہی جانے۔ انسان کس قدر عاجز اور بے بس ہے۔ اسے یہ اندازہ تب ہی ہوتا ہے جب اس کا کوئی ارادہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ ننھی سی حفصہ بائیک پر سو گئی تھی اور اچانک ہی گرنے لگی۔ جسے بچانے کی کوشش میں ایاز بائیک پر کنٹرول کھو بیٹھا اور پھر وہ ہو گیا جو گمان کے کسی حصے میں نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

سورج کب کا مغرب کی گود میں اتر گیا تھا۔ نارنجی شام کے سر پر دھیرے دھیرے رات کی سیاہ چادر سایہ کرنے لگی تھی۔ اس پر آسمان سے اترتی دھند نے اور اندھیرا کر ڈالا۔ خنکی ایک دم بڑھ گئی۔ لبنی نے آخری روٹی بھی ہاٹ پاٹ میں رکھی اور توا اتار کر چولہے پر دودھ کی دیگچی چڑھا دی۔ تب ہی واثق اسے پکارتا ہوا کمرے سے نکلا۔

"مما۔۔۔ مما۔۔۔ بہت بھوک لگی ہے، آپ کھانا دے دیں۔ آخر کب ختم ہوں گے آپ کے کام۔"

"او میری جان! ہائے میں صدقے، میرے بچے کو بھوک لگی ہے۔ بس یہ لو ختم ہو گئے میرے کام۔ آپ اندر چلو، میں ابھی لے کر آئی کھانا۔" کچلو سے واثق کے خفا سے چہرے پر لبنی کو ایک دم سے پیار آیا، اس کا منہ چوم کر کہا۔

"جلدی سے آجائیں پھر۔ وہ حفصہ کی بچی بھی تنگ کر رہی ہے مجھے۔ ہوم ورک نہیں کرنے دے رہی۔" وہ واپس دوڑ گیا۔

شارق بھی بس آنے ہی والا تھا۔ روز تو وہ اس کے آنے سے پہلے ہی سر شام بچوں کو کھانا کھلا دیا کرتی تھی، مگر آج کچھ دیر ہو گئی۔ سلنڈر اچانک ہی ختم ہو گیا تھا اور شدید سردی کے باعث سیلی ہوئی لکڑیوں پر کام کرنا بڑا ہی کٹھن ہو جاتا تھا۔ ان دنوں سلگتے سلگتے کتنا ہی وقت لے لیتی تھیں وہ، اس نے جلدی جلدی بچوں کے لیے کھانا نکالا اور ابھی کمرے کے دروازے تک ہی آئی تھی کہ حفصہ کی چیخ نے دل دہلا دیا، لپک کر اندر آئی۔ واثق نے اس کے بال دونوں مٹھیوں میں جکڑ رکھے تھے۔

"ارے۔۔۔ ارے یہ کیا کر رہی ہو، چھوڑو بہن کو۔" اس نے واثق کو ڈپٹا، جھٹ سے ٹرے بیڈ پر رکھی۔

"مما۔۔۔ مما۔۔۔ اس نے میری ہوم ورک کی کاپی پھاڑ دی، یہ دیکھیں۔" واثق روتا ہوا اسے اپنی کاپی دکھانے لگا۔ "اب میں کیا کروں گا۔ صبح مجھے ٹیچر سے مار پڑے گی۔ وہ تو مجھے کلاس سے باہر نکال دیں گی۔ اس کی وجہ سے میرا ہر کام خراب ہوتا ہے۔ یہ ہے ہی چڑیل ہمیشہ مجھے تنگ کرتی ہے۔ میری چیزیں خراب کر دیتی ہے، پتا نہیں کیا ہے اسے۔۔۔ اُفوہ۔ یہ مر کیوں نہیں جاتی۔"

وہ صدمے کی انتہا پر تھا اور یہ اس کے منہ سے لفظ نکلے تھے کہ کوئی تیز دھار بھالا جو لبنی کے دل میں اتر گیا۔ اذیت کی اک لہر تھی جو رگوں کو کاٹتی چلی گئی۔ بے اختیار اس نے واثق کے پھول سے چہرے پر طمانچہ جڑ دیا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ کہاں سے سنتے ہو ایسی باتیں، چھوٹی بہن ہے تمہاری۔ ایسے کہتے ہیں اسے۔ بولو آئندہ کہو گے اس طرح۔" وہ اسے بری طرح جھنجھوڑ رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔۔۔ کیوں مار رہی ہو اسے۔" شارق

بے چارا تھکا ہارا شہر سے آیا تھا کہ گھر میں آتے ہی یہ سب اس کی برداشت سے باہر تھا۔ واثق کو اپنی طرف کھینچا۔

"بابا... بابا... بھائی نے مجھے مارا ہے۔" تین سالہ حفصہ روتی ہوئی فریاد لے کر اس کی ٹانگوں سے آ لپٹی۔

"کیوں واثق! یہ کیا سن رہا ہوں میں۔ ایک ہی تو چھوٹی سی بہن ہے اس کے ساتھ بھی یہ سلوک۔ کیوں مارا آپ نے اسے۔ بہت ہی بری بات۔" بیٹے کو تادیب کرتے اس نے حفصہ کو گود میں لے لیا۔ واثق اپنا دکھڑا سنانے لگا۔

لبنیٰ مرے مرے قدموں سے چلتی کمرے سے نکل گئی۔ ابھی چولہے پر دودھ رکھا تھا۔ پھر شارق کے لیے کھانا بھی نکالنا تھا اور پھر جب بچوں نے باپ کے ساتھ گپیں لگاتے ہوئے کھانا بھی کھالیا اور وہیں اس کی رضائی میں گھس کر شہر سے آئی مونگ پھلیاں ٹونگتے ہوئے اس کے بازوؤں میں منہ چھپا کر سو گئے تو شارق کا دھیان اس پر گیا۔ وہ بیڈ کراؤن سے کمر ٹکائے گم صم بیٹھی تھی۔

"اُفوہ... اتنی سردی ہو رہی ہے۔ ایسے کیوں بیٹھی ہو ابھی تک۔ بستر میں آجاؤ۔ سونے کا ارادہ نہیں ہے کیا آج۔"

"لبنیٰ! کیا بات ہے تم نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔" شارق کو لگا جیسے وہ رو رہی ہے اور اس نے دوپٹے سے چہرہ پونچھتے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کچھ نہیں۔ بس ویسے ہی دل نہیں کیا۔ سو جاؤ میں صبح کے لیے کپڑے استری کردوں تمہارے۔" وہ اٹھ گئی۔

"اوہ یار... یہ کیا بات ہے' یہ وقت آرام کا ہوتا ہے' یہ کام تم دوپہر میں بھی کرسکتی تھیں۔ ہزار بار کہا ہے میرے آنے سے پہلے سارے کام ختم کرکے رکھا کرو۔ پتا نہیں کب سدھرو گی۔" شارق سخت بدمزا ہوا۔ وہ یوں ہی چپ چاپ الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔

"بچے شرارتیں کرتے ہیں آپس میں لڑتے ہیں اور جس طرح بیماری کی حالت میں انہیں کڑوی دوا پلانا ضروری ہوتا ہے۔ ایسے ہی کبھی کبھار کسی بدتمیزی پر ڈانٹنا بھی ان کے لیے اچھا ہے۔ میں تمہیں اس بات سے منع نہیں کرتا۔ مگر کم از کم مارنے سے گریز کیا کرو۔" واثق نے بعد میں چپکے سے اسے بتایا تھا کہ مما نے تھپڑ بھی مارا ہے اور اس کے گال پر چھپی انگلیاں بھی اس بات کی گواہ تھیں۔ شارق کی تو یوں بھی دونوں بچوں میں جان تھی۔ واثق کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے وہ اسے تنبیہی انداز سے کہہ رہا تھا۔

لبنیٰ کے ہاتھ تھم گئے۔ اس کا بھی کب دل چاہتا تھا انہیں مارنے کو۔ اس کی تو اپنی جان اٹکی رہتی دونوں میں۔ مگر واثق نے بات ہی ایسی کی تھی کہ وہ مجبوراً اسے مار بیٹھی اور تب سے وہ اک مسلسل اذیت میں گھری تھی۔ کیا کیا کچھ نہ یاد آگیا تھا اسے۔ کیسے کیسے لمحے' کتنے ہی گزرے پل... کتنی ہی ہزاروں کوتاہیاں۔ اور کیسے مستقل خسارے... کبھی اس نے کہیں سنا تھا کہ انسان اپنی زبان کا کمایا ہی کھاتا ہے اور تب اپنی کم فہمی کے باعث وہ اس جملے کا مفہوم نہیں جان سکی تھی۔ مگر اب جب سے اپنے دل پر

چوٹ پڑی تھی۔ تب سے اچھی طرح سمجھ آگیا تھا۔

یہ ہی زبان ہے' جس سے ہم دعا کرتے ہیں اور اس کی قبولیت کا یقین چاہتے ہیں اور یہ ہی زبان ہے' جس سے ہم اکثر غصے کی حالت میں اپنے بہت پیاروں کے لیے برے کلمات بھی نکال بیٹھتے ہیں۔ تو جب دعا عرش تک جاتی ہے تو کیا وہ برے کلمات نہ جاتے ہوں گے۔

ضرور جاتے ہوں گے اور جیسے ہماری دعائیں درج ہوتی ہیں ویسے ہی وہ بھی تو کہیں نقش ہو جاتے ہوں گے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہماری دعا اثر کرتی ہے تو وہ الفاظ بھی تو کبھی نہ کبھی کسی گھڑی میں ہماری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہوں گے اور پیارے آقائے دوجہاں نے بھی تو فرمایا کہ تمہارے اعمال کا دارومدار تمہاری نیتوں پر ہے اور یہ سچ ہے بے شک اور جب آپ اس کی نعمتوں کو اپنے لیے بار سمجھیں گے شاکر نہیں ہوں گے تو اسے کوئی پروا نہیں وہ بے نیاز ہے۔ وہ دینے والا بھی ہے اور لینے والا بھی۔

اور جب وہ دیتا ہے ہم احسان نہیں مانتے اور جب وہ لے لیتا ہے تو بھی ہمیں کوئی حق نہیں کہ واویلا کریں۔

جب اس روز وہ گھر سے نکلی تو اس کی نیت کیا تھی۔ اچانک حادثہ... ایاز کی ٹانگ بری طرح فریکچر ہو گئی اس بے چارے کو مفت میں تین ماہ بستر پر پڑا رہنا پڑا۔ ننھی سی حفصہ کو خوب چوٹیں آئیں اس کا ایک کندھا اتر گیا۔ اس نے اتنی اذیت کاٹی اور وہ اس کے ساتھ کیا بیتی؟ اور اسے ایک زندگی کا امین بنایا گیا تھا۔ جس سے وہ بے زاریت ظاہر کر رہی تھی۔ اس کے اندر سانس لیتی وہ ننھی سی جان وہیں دم توڑ گئی۔ ڈاکٹرز نے بڑے مشکل سیزر سے اس کی جان بچائی' مگر اس روح فرسا خبر کے ساتھ کہ اب وہ دوبارہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی اور تب...

امی اور حمیدہ... جن میں پہلے ہی ٹھنی رہتی تھی۔ پھر تو ایک دوسرے کی شکل دیکھنے سے بھی گئیں۔ حمیدہ کا موقف تھا کہ نہ وہ اس روز جھوٹ بول کر اسے بلواتی' نہ ان کے خاندان کو اتنی مصیبتیں دیکھنی پڑتیں۔ اس ساری آفت کی وجہ وہ ہیں اور امی کا موقف تھا کہ وہ لوگ پہلے ہی لبنیٰ کی بات کو سمجھ لیتے تو یوں نوبت یہاں تک آتی۔ یہ سب ان لوگوں کی جہالت کا شاخسانہ ہے۔ جو بے کار میں ان کے بیٹے کو بھی بھگتنا پڑ گیا۔

جبکہ نزہت آپا نے سارا کیا دھرا اس ایل ایچ وی کا نکالا' نہ وہ کم بخت ماری وقت سے پہلے اسے بیٹی کا بتاتی نہ یہ دن دیکھنے پڑتے۔ ایسی کم علم' بدعقل صرف نام کی مسیحا میں روز جانے کتنے گھروں میں فساد ڈلواتی ہوں گی اور شارق کو تو آجا کر سارا گناہ اس کی زبان کا لگ رہا تھا۔ وہی تو تھی جو اپنے ہی بچوں سے تنگ تھی۔ نہ وہ بچوں کو کوستی رہتی' نہ یہ سب کچھ ہوتا۔ وہ تو کئی ماہ تک اس کی صورت دیکھنے کا روادار بھی نہ رہا تھا۔ اپنی جس اولاد کے لیے وہ اتنا خوش تھا اور جسے وہ اپنے بازوؤں میں لے کر پیار کرنے کا آرزو مند تھا۔ اپنے اسی بچے کو وہ اپنے ہی ہاتھوں ایک گہرے گڑھے میں رکھ آیا۔ اس کی نظر میں تو اس کی بچی کی قاتل ہی وہ تھی۔

جبکہ دنیا والوں نے لبنیٰ کو بہتیرے دلاسے دیے۔ یہ سب تمہاری تقدیر میں لکھا تھا۔ ایسے ہی ہونا تھا یہ سب... بھول جاؤ۔ غم نہ کرو اور کیا واقعی؟

اور بے شک یہ اس کے مقدر کا لکھا تھا۔ مگر اس سارے میں کہیں نہ کہیں قصوروار وہ خود بھی تھی۔ وہ کیسے بھول جائے۔ کیسے غم نہ کرے۔ اس کی ایک نہیں بلکہ کئی لغزشوں نے اسے کیسے بڑے نقصان سے دوچار کیا تھا اور وہ اب شکر بھی کرتی تھی اور صبر بھی۔

مگر کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ یہ بات کچھ عرصہ پہلے جان لیتی۔ ان حرفوں کی اہمیت کو جان لیتی۔ اچھا جو بھی ہوتا ہے۔ سب اس کی طرف سے ہوتا ہے۔ وہ سب کے ساتھ بہتر کرے اور ہماری غلطیوں کو معاف بھی۔ (آمین)

لبنیٰ نے اپنے بہتے اشک پونچھ لیے اور دل ہی دل میں استغفار پڑھتے ہوئے معمول کے کام نپٹانے لگی۔

☆ ☆

فرحین اظفر

دل لگی وفا

سوہا اور ماہا دونوں بہنیں اپنی ماں کے ساتھ گھر کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔

گھر کی نچلی منزل میں ان کے تایا اور تائی اپنی دو بیٹیوں عفت اور نائلہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ تایا اکثر بیمار رہتے ہیں۔

حدید 'انس' عفت اور نائلہ کے خالہ زاد ہیں۔ نائلہ 'انس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر انس 'سوہا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنی خالہ اور سوہا کی تائی کے سامنے کردیتا ہے۔ خالہ کو بے پناہ دکھ کا احساس ہوتا ہے 'مگر بظاہر راضی خوشی اس کا رشتہ لے کر اپنی دیورانی کے پاس جاتی ہیں۔ سوہا کی والدہ یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کر لیتی ہیں۔

نائلہ باقاعدگی سے اپنے والد کو اسپتال لے کر جاتی ہے۔ وہاں اسپتال کے کلرک شبیر حسین عرف شبو سے روابط بڑھ جاتے ہیں کہ اچھے برے کی تمیز کو بھول جاتی ہے۔

سوہا اور انس کی شادی کی تقریبات بہت اچھے طریقے سے انجام پاتی ہیں اور سوہا رخصت ہو کر انس کے گھر آجاتی ہے۔

حدید کسی کو ڈراپ کرنے جاتا ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

سوہا کے اکیلے پن کی وجہ سے عفت اس کے پاس رک جاتی ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ حدید کا بھی خیال رکھتی ہے۔

حدید 'عفت کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کو جان لیتا ہے اور سوچ لیتا ہے کہ اس بار خالہ کو مایوس نہیں کرے گا۔

نائلہ 'شبیر حسین سے ملنا نہیں چھوڑتی اور آخر کار اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہے 'جس کا اندازہ اس کی ماں کو بھی ہو جاتا ہے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے حدید کے ساتھ نائلہ کی شادی کا فیصلہ کر لیتی ہیں اور اس بات کا اظہار انس اور ماہا سے بھی کردیتی ہیں۔

حدید 'انس کی خاطر نائلہ سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہو جاتا ہے اور شادی کے بعد پوری سچائی سے نائلہ کو بیوی کا درجہ دینا چاہتا ہے 'مگر نائلہ نے حدید کو مجبوری کے تحت اپنی زندگی میں قبول کیا اور اس کو وہ مقام نہ دیا جو اس کا حق تھا حدید

خاموش ہو گیا کہ وقت کے ساتھ ساتھ نائلہ اس کو قبول کر لے گی مگر حدید کی شرافت اور خاموشی کو دیکھتے ہوئے نائلہ کے ذہن میں کچھ اور ہی منصوبے بالا ہی بالا تشکیل پانے لگے جس پر نائلہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑی کامیابی سے عمل پیرا تھی کہ وہ انس کی نہ ہو سکی تو سوہا اور انس کو بھی جدا کر دے گی۔

ماہا کی شادی حبیب سے بخیر و خوبی ہو جاتی ہے۔ ماہا حبیب کے ساتھ دبئی چلی جاتی ہے' ماہا حبیب سے شادی کے بعد اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت لڑکی سمجھنے لگتی ہے' مگر اس کو پتا چلتا ہے کہ حبیب ایک بیٹے کا باپ ہے اور وہ فوراً" پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔

سوہا امید سے ہوتی ہے' مگر نائلہ بڑی عمدگی اور کامیابی سے سوہا کو اس خوشی سے محروم کر دیتی ہے اور اس حادثے کے بعد انس کو اپنی زیادتی کا احساس ہوتا ہے اور وہ سوچ لیتا ہے کہ اب سوہا کو کوئی غم نہیں دے گا۔ نائلہ اسپتال میں شبیر حسین کو دیکھ کر چکرا جاتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ شبیر حسین نے اس کو نہیں دیکھا' مگر شبیر حسین نائلہ کا پیچھا کرتے کرتے اس کے گھر پہنچ جاتا ہے اور نائلہ نہ چاہتے ہوئے بھی شبیر حسین کے جال میں گھر جاتی ہے۔

حبیب ماہا کو منا لیتا ہے اور پاکستان آجاتا ہے' مگر ماہا پھر غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہے اور حبیب کے ساتھ جانے سے منع کر دیتی ہے۔ حبیب اکیلا ہی دبئی جانے کے لیے روانہ ہو جاتا ہے کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

عفت کا نکاح معراج کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ جس کا حدید کو پتا چلتا ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

دسویں قسط

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مزنہ آپی!"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں میں' دبئی سے فون آیا تھا اس کا منیجر تھا۔ پورا ہفتہ گزر چکا ہے۔ اس کا فون بند ہے۔ اگر تم لوگوں کے درمیان کوئی بات ہوئی بھی تھی یا اگر تم سے کوئی ناراضی بھی تھی۔ تب بھی تمہیں اس کا کچھ تو خیال ہونا چاہیے تھا۔"

وہ اسے بے لاگ باتیں سنا رہی تھیں۔

"میں نے خود کئی بار فون کرنے کی کوشش کی تھی لیکن......"

"جھوٹ مت بولو۔" انہوں نے سختی سے اسے جھڑک دیا۔

"اگر تم نے اسے فون کرنے کی کوشش کی ہوتی۔ تو تم اس بات سے مجھ سے پہلے آگاہ ہو جاتیں۔ لیکن تمہیں تو ہوش ہی نہیں ہے کہ وہ ہے کہاں۔" وہ جیسے ماہا پر پھٹ سی پڑیں۔

"آئی... آئی ایم سوری مزنہ باجی! دراصل یہاں عفت کے نکاح کا سلسلہ اتنا اچانک شروع ہوا کہ۔"

"ہاں! شاباش ہے تم کو۔ اپنے میکے میں رنگ رلیاں منا رہی ہو تم۔ اور شوہر پچھلے ہفتے سے بھی زیادہ دن سے لاپتا ہے۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں میری بات کا۔" آخر میں وہ بری طرح چلا پڑیں۔

ماہا کو کب امید تھی کہ وہ اتنی بری خبر سنا کر اسے اتنی باتیں سنائیں گی اور وہ بھی اس قدر ذلت بھرے انداز میں۔

"پتا نہیں کہاں چلا گیا بھائی میرا۔ انکوائری بھی کروالی۔ جس دن اسے دبئی جانا تھا۔ وہ فلائٹ پر تھا ہی نہیں۔ او میرے خدایا! کہاں ڈھونڈوں میں اپنے بھائی کو۔"

ان کے انداز میں کچھ ایسی بین کرتی ہوئی کیفیت تھی کہ ماہا کو اپنے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ دوسری طرف مزنہ باجی سے فون شاید ان کے شوہر نے لے لیا تھا۔ وہ اسے بہت دھیمے اور ٹھنڈے لہجے میں کچھ بتا رہے تھے۔ لیکن ماہا کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ اسے ان کی آواز آرہی تھی۔ لیکن ایک بات بھی سمجھ نہیں آرہی تھی۔

سوہا اور انس اس کی اونچی گھبرائی ہوئی آواز سن کر اندر آئے تھے۔ اور اب اس کا ہوائیاں اڑاتا چہرہ دیکھ کر تفکر میں پڑ گئے تھے۔

"کیا ہوا ماہا۔" سوہا تشویش سے نزدیک آکر پوچھنے لگی۔ ماہا نے بالکل خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ انس نے صورت حال سمجھتے ہوئے فوراً" بڑھ کر اس سے فون لیا اور اپنے کان سے لگایا۔

"ماہا تم ٹھیک ہو ناں! کیا بات ہے حسیب بھائی خیریت سے ہیں۔"

سوہا نے اسے بازوؤں سے تھاما۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی۔ انس نے گہری سانس لے کر فون بند کیا اور سوہا سے بولا۔

"خیریت نہیں ہے۔ حسیب پچھلے کئی دنوں سے لاپتا ہے۔ فون بند ہے۔ اور ٹریس نہیں ہو رہا۔ خود اس کا بھی کچھ اتا پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ جس دن دبئی جانا تھا اس دن وہ ایئرپورٹ تک ہی نہیں پہنچا۔ اور۔۔۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ تینوں آپس میں ہی اس قدر محو ہو گئے تھے کہ امی کی آنکھ کب کھلی اور کب انہوں نے تمام باتیں سنیں انہیں پتا ہی نہیں چلا۔

طبیعت پہلے ہی خراب تھی۔ یہ خبر سن کر اور بگڑی اور الٹے ہاتھ میں اس شدت کا درد اٹھا کہ وہ بری طرح تڑپ گئیں۔ ان کے منہ سے بے حد کرب آمیز آواز نکلی۔

"سو۔و۔ہا۔"

ماہا ہڑبڑا کر حواسوں میں واپس آئی۔ اس نے پلٹ کر امی کو دیکھا اور تینوں لمحے بھر میں لپک کر ان کے پاس آ گئے۔

"امی۔! امی کیا ہو گیا آپ کو سنبھالیں خود کو امی۔" ماہا بولتے بولتے بری طرح رو پڑی۔

"انس ایمبولینس کو فون کریں۔ امی کو شاید انجائنا۔" سوہا سے بات مکمل نہیں کی گئی تھی۔ درد سے بے حال ہوتی امی اس کے بازوؤں میں جھول گئیں۔ ماہا اور اس کی چیخیں نکل گئیں۔ انس نے بری طرح بدحواس ہو کر جیب میں ہاتھ ڈالا موبائل نکالا اور نمبر ملایا تھا۔

☼ ☼ ☼

جانے کتنا سمے بیت گیا تھا۔

ایمرجنسی میں گم ہو جانے والے ڈاکٹرز اور امی کی شکل دیکھے ہوئے لگتا تھا زمانے گزر چکے ہیں۔ ان دونوں کے لبوں سے دعاؤں کے اور آنکھوں سے نمکین سیال کے جو چشمے پھوٹے تھے تو اب تک بنا کسی روک ٹوک کے برابر سے ابل رہے تھے۔ انس نے اسپتال پہنچ کر فون کر کے حدید کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔ حدید نے پوری بات سن کر اسپتال پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس مشکل صورت حال میں بھی حدید کو دیکھ کر جہاں انس کے دل میں اطمینان جاگا تھا۔ وہیں چہرے پر خفگی بھی جھلک آئی تھی۔

وہ دل ہی دل میں حدید سے کچھ ناراض سا تھا۔ ماضی میں جو کچھ بھی ہوا۔ اور حدید کی شادی جس سے بھی ہوئی۔ اسے اب بیتی ہوئی باتوں کو بھلا کر آگے کی طرف بڑھنا چاہیے تھا۔ وہ بہرحال اب خالہ جان کا داماد تھا۔ اور آج عفت کے نکاح کے موقع پر گھر میں تقریب کی مصروفیت میں انہیں بیٹے کی کمی کا جس قدر بھی احساس ہوا ہو گا۔ حدید کے خلاف دل اتنا ہی برا ہوا ہو گا۔ اوپر سے اس اہم موقع پر وہ خود تو موقع سے غائب ہے ہی، لیکن اسے نائلہ کا بھی خیال نہیں آیا۔ وہ خود ہی اکیلی رکشے میں آئی۔ حدید نے ایک فون تک نہیں کیا۔ بلکہ جب سے عفت کے

رشتے کی بات چلی وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہے۔ اس کا اندازہ نہ چاہتے ہوئے بھی حدید کے لیے روکھا اور سرد ہو گیا۔ ذرا نزدیک آنے پر اس نے جس انداز میں اسے دیکھا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ حدید خود بھی اندر کہیں اس سے اور سب سے شرمندہ ہے۔ یقیناً" اپنی ہی بے خبری اور غیر موجودگی پر۔ لیکن تب بھی وہ حدید کو جتانے سے باز نہیں آیا۔

"خیال آگیا تمہیں اپنے جاننے والوں کا۔ اب بھی مت آتے۔" جواباً" حدید نے جس بے چارگی اور بے بسی سے اس کی شکل دیکھی تھی۔ وہ آگے کچھ بھی کہنے سے باز رہا۔ سوہا اور ماہا۔ کوریڈور کی بخ بستہ دیوار سے ٹکی دھیرے دھیرے سسک رہی تھیں۔ حدید نے ایک نظر ان دونوں پر ڈالی۔ اور جب اسے لگا کہ کچھ کہنا یا نہ کہنا حالات کے میزان میں مساوی وزن قرار پائیں گے تو انس کے پاس سے ہٹ کر سوہا کے نزدیک گیا۔ اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

سوہا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور سنبھل کر آنسو صاف کرنے لگی۔ لیکن ماہا۔۔۔ وہ بجائے خاموش ہونے کے' حدید کو دیکھ کر' کچھ اس بری طرح تڑپ کر روئی کہ وہ تو وہ' انس اور سوہا بھی بے اختیار ہی اسے خاموش کروانے لگے۔

"سب بہتر ہو جائے گا۔ ٹھیک ہو جائیں گی امی۔ بس تم پڑھتی رہو۔ جتنا بھی تم کو آتا ہے پڑھ پڑھ کر دم کرو ماہا۔ اللہ کے کلام میں بہت طاقت ہے۔ اللہ بہت رحم کرنے والا ہے اور۔۔۔۔" وہ رندھی ہوئی آواز اور بیٹھے ہوئے گلے سے ماہا کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماہا کی حالت اس بلبل کی سی تھی جس کے گلے پر چھری پھیر کر دم نکلنے تک کے لیے بڑے سارے ڈرم میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس ڈرم میں کس قدر تاریکی ہوتی ہے۔ موت و زندگی کی جنگ لڑ لڑ کے زندگی ہار جاتی ہے۔ اسے بھی اپنی جان نکلتی اور روح فنا ہوتی لگ رہی تھی۔

"حسیب بھائی کا بھی پتا چل جائے گا۔ تم اکیلی نہیں ہو۔ ہم سب ہیں تو تمہارے ساتھ۔ ماہا پلیز۔" انس ایک گہری سانس بھر کے اس کے برابر میں آبیٹھا۔ اور کچھ کہے بغیر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر تھپکنے لگا۔ قریب کھڑا حدید آنکھوں میں الجھن اور استفہام کے رنگ لے کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"حسیب۔۔۔۔؟ کیا ہوا اسے؟" کسی سے جواب نہیں دیا گیا۔ ماہا بدستور روتی رہی۔ ایک ڈاکٹر سنجیدہ شکل بنائے باہر آیا۔ حدید اور سوہا اس کی طرف بے تابی سے لپکے۔

"مریضہ کی حالت خطرے سے باہر ہے۔" اس کے لبوں سے جانے الفاظ نکلے تھے یا کوئی جاں فزا مژدہ۔ دم توڑتے سوالوں کو دھکیل کر شکرانے کے کلمات ان کی جگہ آن بیٹھے۔ کافی دیر بعد امی سے بات کرنے کی اجازت ملی۔ ماہا کا دل اتنا دکھا ہوا تھا کہ انس نے چاہا اسے امی کے سامنے جانے سے ہی منع کر دے۔ لیکن بھلا ایسا ممکن کب تھا۔ وہ فوراً" ہی امی کو دیکھنے کے لیے مچل گئی۔ اور حسب توقع ان کا ہاتھ تھام کر پھر سے رو پڑی۔ انس کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

البتہ سوہا نے اس مرحلے پر امید سے زیادہ سمجھداری کا مظاہرہ کیا۔ خود بھی فضول میں رونے دھونے سے پرہیز کیا۔ کیونکہ امی کی حالت کافی بہتر تھی۔ اور ساتھ ہی ماہا کو بھی سنبھالا دیا۔

رضوانہ حسن کو اس معمولی ہی سہی۔ لیکن ہارٹ اٹیک نے بری طرح نچوڑ ڈالا تھا۔ ان کا رنگ غیر معمولی حد تک زرد ہو گیا تھا۔ ہاتھوں کی نسیں' سوکھی جھاڑیوں کی مانند ہاتھ کی جلد پر ابھر آئی تھیں۔ پھر بھی ان کی ہمت تھی کہ وہ دھیرے سے مسکرائی بھی تھیں۔ اور بات کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن ان چاروں نے ہی انہیں بات کرنے سے منع کر دیا تھا۔

انس کو کل حیدر آباد جانا تھا اس لیے سوہا نے انس کے ساتھ گھر جانے کا فیصلہ کیا' بوجھل ہوتے پپوٹوں سے بھاری قدم گھسیٹتی جس وقت وہ ماہا کو بتانے پلٹی' اس کے سوکھے لبوں پر گلابی نمی چمکنے لگی تھی۔ امی نیند میں جاچکی تھیں۔ اور ان کے سرہانے بت بنی بیٹھی ماہا نے صرف گردن موڑ کر اس کی بات سنی اور سرہلایا تھا۔ وہ بات سمجھی تھی یا نہیں۔ سوہا نے رک کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

☼ ☼ ☼

چچی جان کی خیریت کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اماں شکرانے کے نوافل ادا کرنے کھڑی ہوئیں تو اس نے عفت کو آرام کرنے کا مشورہ دے کر خود بھی آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں کے پار حواس پوری طرح کام کررہے تھے۔ لامتناہی سوچیں اس کی نیند کو ایک دوجے کے اوپر دھکیلتی دھڑلے سے بند کواڑ کھول کر سامنے آجاتیں۔ اور ستم یہ کہ سارا دھیان اسی ایک شخص سے جڑا تھا۔ جسے اس نے کبھی اپنا نہیں سمجھا تھا اور وہ اب سب سے زیادہ اپنا تھا۔

''حدید!'' اس نے بمشکل اپنے لبوں کی لرزشوں کو قابو کیا۔ اور بے خبری کی دھنک رنگ پھدکتی چڑیا کو دبوچ کر پھسلانے لگی تھی۔ تب ہی موبائل فون کی معمولی سی تھرتھراہٹ نے اس کی گرفت ڈھیلی کی۔ اور چڑیا پھر سے اڑ گئی۔

''حدید کا میسج اس وقت۔'' اس نے حیرت و بے یقینی سے دم بدم صبح کی گود میں سر رکھنے کو' بڑھتی ہوئی رات پر نظر ڈالی۔ پھر پیغام کھولا۔

''میں رات میں آنٹی کے پاس رک رہا ہوں۔ تم بھی گھر پر ہی رک جاؤ۔ انس اور سوہا اپنے گھر چلے گئے ہیں۔''
ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری۔

''اتنے دن کی بے رخی' لاتعلقی اور بے اعتنائی دکھانے کے بعد' آدھی رات گزرنے پر آپ کو میرا خیال آگیا۔ اور یہ پیغام۔ کتنا بے تکا اور بھونڈا ہے۔ رات تو اختتام کے قریب ہے۔ ان کے خیال میں اس وقت میں بیٹھ کر ان کی واپسی کا انتظار کررہی ہوں گی۔ وہ بھی گھر جانے کے لیے۔ اچھا ہے۔ واہ واہ۔ بہت اچھا۔'' اس کی دھیمی مسکراہٹ ایک زخمی ہنسی میں بدل گئی۔ لیکن اس نے اپنی آواز کو حتی الامکان دبا کر رکھا۔ ورنہ غنودگی میں جاتی ہوئی عفت چونک جاتی۔ حدید کا اس وقت آنے والا میسج اور انس اور سوہا کا گھر چلے جانا' اس کے اندر حسد کے بھانبھڑ جلا گیا۔

انسان زندگی میں سب سے زیادہ فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔ وہ لاکھ اچھا بن لے۔ مگر اس کی بری فطرت کہیں نہ کہیں اسے مٹی ضرور چٹاتی ہے۔ اور فطرتاً'' مخلص اور بے ریا انسان کسی کے ساتھ برائی کر بھی لے۔ اس پر خوش بھی ہونا چاہے۔ لیکن ضمیر کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہی رہتا ہے۔ اس کی فطرت میں بھی حسد رچا بسا تھا۔ جیسے بھینسوں والے باڑے میں بھوسے اور گوبر کی باس رچی بسی ہوتی ہے۔ وہاں کے مکینوں کو بھلے پتا نہ چلے۔ لیکن کسی نئے آنے والے کو ضرور محسوس ہوجاتی ہے۔ اسے بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ اس نے مکافات عمل کے خوف سے کتنی بار توبہ کی اور کتنی بار پھر برائی کے رستے پر کشاں کشاں چل پڑی۔

برائی انسان کے دل و دماغ میں سانپ کی طرح پلتی اور موجود رہتی ہے۔ آپ اس سے بچنے کے لیے ''ہش ہش'' کرتے رہیں۔ وہ وقتی طور پر دور ہٹے گی لیکن پلٹ کر ڈسے گی ضرور۔ اس سے چھٹکارا پانے کے لیے اس کا سر کچلنا پڑتا ہے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کی زندگی میں در آنے والی برائی کسی سانپ نہیں۔ اژدھے کی صورت موجود ہوئی تھی۔ جس کا سر کچلنے کے لیے لاٹھی نہیں' زہریلے ہتھیاروں اور خطرناک اسلحے کے ساتھ ساتھ

تربیت یافتہ ہونا بھی ضروری ہے۔
بے چاری نائلہ خالی ہاتھ ہی نہیں' خالی الدماغ بھی تھی۔ نہ اسے اپنی فطری کمزوریوں کا ادراک تھا۔ نہ تقدیرو تدبیر کے پیچ و خم سلجھانے کا شعور۔ موبائل کی وائبریشن عروج پر تھی۔ ایک بار پھر برائی اپنا پھن پھیلائے اسے اپنی طرف بلانے اور ڈسنے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھی۔
اس نے فقط چند لمحے ہی لگائے ہوں گے۔ سوچنے اور فیصلہ کرنے میں۔ پھر سیل فون کو مٹھی میں دابے وہ سیڑھیاں چڑھتی دبے قدموں اوپری حصے میں آگئی۔ رات کے اس پہر یہاں ہلکی روشنی تھی۔ سبک خرام ہوا تھی۔ اور حبس زدہ کمرے کے برعکس بے حد سکون سا تھا۔ اس نے کرسی پر گر کر آرام دہ انداز میں سامنے میز پر ٹانگیں پھیلائیں اور کال ریسیو کرلی۔
"اس وقت فون کیوں کیا ہے۔" الفاظ کے مقابلے میں اس کا لجہ بے حد پرسکون تھا۔
"او بلے بھئی بلے۔ جاگ رہی تھی میری بلبل یا جاگ گئی میری کال دیکھ کے۔" دوسری طرف سے آتی کرخت آواز میں خوشی کا ڈھونگی عنصر شامل تھا۔
"زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا فون اتنا اہم نہیں کہ میں نیند برباد کرکے اسے سننے اٹھ جاؤں۔ میں جاگ ہی رہی تھی۔"
"اس ٹیم جاگ رہی تھی۔ خیر تو ہے۔" اس کے پینڈو لب و لہجے کا ہر رنگ جھوٹا تھا۔
"ہاں خیر ہی ہے۔ میرے شوہر جاگ رہے تھے تو ان کے ساتھ میں بھی۔" اتنا بے ساختہ اور بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا کہ اپنی ہی حیرت میں وہ بات مکمل کرنا بھول گئی۔
"ہاں بھئی۔ تیرا خاص الخاص ٹیم تو اسی کے لیے ہے۔ یہ تو ہم ہی بھیک منگے ہیں۔ جو تیری منتیں کرتے کرتے نہیں تھکتے اور تو ہمیں لفٹ ہی نہیں کرواتی۔" نائلہ نے دل ہی دل میں اسے ایک موٹی سی گالی سے نوازا۔
"وہ اس قابل ہے کہ اسے ٹائم دیا جائے۔" جی تو چاہتا تھا کہ اپنے مخصوص انداز میں اس کمینے شخص کو اس کی اوقات یاد دلا دے۔ دوسری طرف سے ابھرتی ہنسی کی مکروہ آواز سننے کی اس میں تاب نہیں تھی۔ اس لیے فون بند کرکے میز پر پھینک دیا۔
"تجھے بیچ چوراہے پر تختہ دار پر لٹکا کر پھانسی نہیں دینی چاہیے بلکہ معلق کرکے آگ لگا دینی چاہیے تو اس قابل ہے۔ تجھے پتھروں سے نہیں' انگاروں سے سنگسار کیا جانا چاہیے۔ تاکہ مرنے کے بعد بھی تیرا جسم' تجھ جیسے دوسرے کتوں کے لیے نشان عبرت بن جائے۔
میں خود پر ترس نہیں کھاتی۔ کیونکہ میں نادان تھی نہ معصوم۔ پھر بھی جانتے بوجھتے تیری چال میں پھنس گئی۔ لیکن میں اکیلی تو نہیں۔ میرے جیسی اور کتنی ہوں گی۔ جن کے دل شکستہ ہوں گے۔ جن کی روحیں گھائل ہوں گی۔ جو نادان بھی ہوں گی اور معصوم بھی۔ اور پھر۔ پھر تو نے ان کی معصومیت کو داغ دیا ہوگا۔" دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ احتساب کے کڑے عمل سے گزرتی رہی۔
"میرے لیے نہیں میرے مالک۔ میں تجھ سے ان سینکڑوں معصوم جانوں کے لیے رحمت اور انصاف کا تقاضا کرتی ہوں۔ میں تجھ سے تیرا کرم مانگتی ہوں۔" وہ بے انتہا دھیمے لبوں سے بڑبڑائی تھی۔
اس کے پورے وجود میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ان اعصاب شکن دن رات نے اسے توڑ دیا تھا۔ اسے نرجلا شجر بنا دیا تھا۔ اس کا وجود کھوکھلا ہو رہا تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں پر نمی کا احساس ہوا۔ اس نے تعجب سے چہرے سے ہاتھ ہٹائے' وہ بے بسی کی انتہائی کیفیت پر تھی۔ لیکن وہ رو نہیں رہی تھی۔ پھر یہ۔ تب ہی ایک بے حد باریک

ٹھنڈی بوند جیسی چیز احساس پہلی ہتھیلی میں گری۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سرشام چلنے والی ہلکی ہوائیں حبس میں بدل گئی تھیں۔ اور اب یہ حبس ٹوٹنے جا رہا تھا۔
رحمت خداوندی آسمان سے اتر کر اس نرجلے شجر کو سرسبز کرنے والی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ نے چھب دکھلائی۔ پھر وہ کرسی سے اٹھی۔ اور دونوں بازو پھیلا کر کھلے آسمان تلے آ گئی۔ ٹھنڈی بوندیں اس کے جلتے رخساروں سلگتے بند پپوٹوں پر گرنے لگیں۔ اس کا مرجھایا ہوا وجود جلا پانے لگا۔

☼ ☼ ☼

ابھی صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ تھکن سے اس کا روم روم دکھنے لگا تھا۔ انس کی ضد پر اس کا دل تو نہیں چاہتا تھا لیکن پھر بھی وہ محض اس کا دل رکھنے کی خاطر گھر آ گئی تھی۔
اسپتال سے نکلتے وقت اس نے خاص طور پر حدید سے ماہا کو کھانا کھلا دینے کی تاکید کی تھی۔ کیونکہ معراج کے گھر والوں کے جاتے ہی امی کی طبیعت بگڑ گئی تھی اور اس کے بعد کسی کو بھی کھانا کھانے کی فرصت ملی نہ خیال آیا۔ اس کے اپنے پیٹ میں بھی اعصاب شکن صورت حال سے نکلتے ہی چوہے دوڑنے لگے تھے۔ صورت حال کو بھانپ کر انس نے راستے میں سے کھانے کا کچھ سامان لے لیا تھا اور اس وقت بھی اس نے دل میں سوچا تھا کہ انسان دل ہی دل میں کیا کیا ارادے نہیں باندھتا۔ پھر وہ سب بھربھری مٹی کا ڈھیر ثابت ہوتے ہیں۔
"جانے عفت اور نائلہ نے بھی کھایا کہ نہیں۔ وہ دونوں بھی تو...." اس کے دھیان میں در اڑ پڑ گئی۔ بمشکل پیروں کو راضی کر کے چلنے والا بوجھل وجود ہوا سے بھی ہلکا ہو گیا۔ وہ پہلے گھبرائی پھر بری طرح بوکھلائی۔
"ارے ارے۔ ارے۔" بے ساختہ اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے بچی۔
"بہت تھکن ہو گئی تھی نا تمہیں۔ اس لیے۔" انس نے بے حد محبت سے اس کے کانوں میں دھیمی سی سرگوشی کی۔ اور اس کا نازک وجود لاؤنج کے صوفے پر دھر دیا۔ وہ چند لمحے بنا کسی حرکت پر دم بخود رہی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ انس یہ حرکت بھی کر سکتا ہے۔ پھر اس کے بازوؤں کا حصار ٹوٹتے ہی جیسے کسی خواب سے جاگی۔ اور بے ساختہ زور سے کھلکھلائی۔
ہنستے ہنستے اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور سانس چڑھ گئی۔ انس خود بھی دھیرے سے ہنستا ہوا صوفے پر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔
"اف اللہ!" اس نے آنکھیں صاف کر کے چند لمحوں کے بعد اس کو دیکھا۔
"کتنی مدت کے بعد ایسی ہنسی آئی ہے مجھے۔ اپنی آواز اور اپنی ہنسی خود ہی اجنبی سی لگ رہی تھی۔" انس نے نثار ہوتی نظروں سے اسے دیکھا۔ اور بازو پھیلا دیا۔ وہ بنا کچھ کہے اس کے کندھے سے آن لگی۔ کتنے ہی پل خاموشی سے الفت کے پھول ان پر وار کر اٹھ گئے۔
"میں سوچ رہی تھی کہ حسیب بھائی کہاں چلے گئے۔" تھوڑی دیر بعد اس کی سنجیدہ آواز ابھری۔ انس جواب میں خاموش ہی رہا۔ اس کے پاس جواب تھا ہی نہیں۔
"ماہا کی نند کہہ رہی تھیں کہ ان دونوں کا آپس میں کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ کہیں حسیب بھائی ماہا کو سزا دینے کے لیے تو نہیں غائب ہو گئے۔"
"کیا کہہ سکتا ہوں میں۔" انس نے گہری سانس لی۔ حسیب کا یوں ایک دم سے روپوش ہو جانا۔ اس کے لیے بھی کسی معمے سے کم نہیں تھا۔ اور معمہ بھی وہ جو ہزار وہموں کے حصار میں کھڑا تھا۔

"اللہ کرے ایسی ہی بات ہو۔ خدانہ کرے اگر کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو ماہا تو۔" سوہانے سر جھکالیا۔ اس سے بات مکمل نہیں کی گئی۔ انس نے یہاں وہاں بھٹکتی نظر اس پر ڈالی۔ پھر اس کی ٹھوڑی پکڑ کر سر او نچا کیا۔ سوہا کی آنکھوں میں سرخ لکیریں گہری ہو رہی تھیں۔

"چائے پیو گی۔ میں بنا کر لاتا ہوں۔ بھوک تو نہیں لگ رہی اب۔" اس کی بات بالکل ہی موضوع سے ہٹ کر تھی۔

"پچ۔ سونا نہیں ہے۔ صبح جانا ہے آپ کو۔" اس کا دل سوچ سوچ کر اداس تھا۔ بس نہیں چلتا تھا۔ کچھ بھی کر کے انس کو روک لے۔

"نہیں سونا نہیں ہے۔"

اس نے معنی خیزی سے کہتے ہوئے اپنا سر دھیرے سے اس کے سر سے ٹکرایا۔ پھر اپنے بازو کے گھیرے سے اسے آزاد کرتا ہوا اٹھا۔

"چائے لا رہا ہوں۔ سونے کی کوشش نہیں کرنا۔ ورنہ۔۔۔" اس نے سوہا کی طرف ایک شرارتی اشارہ دیا۔ سوہا نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارا۔

☼ ☼ ☼

دن نکلے ہوئے کچھ ہی گھنٹے گزرے تھے۔ جب نائلہ عفت اور اماں کے ساتھ ناشتا لے کر اسپتال پہنچی۔ حدید کی آنکھوں میں سرخی اور ہلکی سوجن تھی۔

"آپ گھر جا کر آرام کر لیں۔ میں رک جاؤں گی آج یہاں۔" عفت نے اپنی عادت و فطرت سے مجبور ہو کر حدید اور ماہا سے بیک وقت کہا۔

"اور جاتے ہوئے مجھے بھی ساتھ گھر لے چلیے گا۔"

نائلہ نے جان بوجھ کر عفت کے فوراً" بعد حدید کو مخاطب کر کے اسے گویا یاد دلانے کی کوشش کی کہ نائلہ اور اس کا آپس میں کوئی رشتہ بھی ہے۔

"صبح سے مزنہ آپی کے فون پر فون آ رہے ہیں۔ حسیب کا کچھ پتا نہیں ہے۔ وہ بھائی جان سے پتا کروانے کے بجائے صرف میرے اوپر ہی چلائے جا رہی ہیں۔ بتاؤ ذرا۔ میں اکیلی یہاں کس شخص کو کیسے ان کو ڈھونڈ سکتی ہوں۔ انس اور حدید بھائی سے کہہ تو رکھا ہے۔ اگر امی کی طبیعت اتنی خراب نہیں ہو جاتی اور وہ بھی اتنی اچانک۔ تو وہ ہی دونوں کچھ پتا کر سکتے تھے۔ اب یہاں اسپتال میں انہیں دیکھیں یا ان کی باتیں سنیں۔"

سوہا کا فون آیا۔ تو ماہا کاریڈور میں کھڑی ہو کر بولنا شروع ہوئی تو بس بولتی ہی چلی گئی۔ اس کی بے ربط باتیں۔ گھبرایا ہوا لہجہ اور بات کی تیز رفتاری اس کی ذہنی پراگندگی اور اعصابی شکست و ریخت کا مظہر تھی۔

"تم بالکل فکر مت کرو ماہا! کچھ بھی غلط نہیں ہوا۔ وہ تم سے ناراض تھے نا! تو بس ناراضی ظاہر کرنے کے لیے غائب ہو گئے ہیں کہیں۔ اور اس سے اچھا طریقہ انہیں کیا سوجھے گا کہ اپنا سیل بھی آف کر کے بیٹھ گئے۔ تم دیکھنا ایک دو دن میں خود ہی آ جائیں گے۔" ماہا جواباً" خاموش ہو گئی۔ وہ سوہا کو کیا بتاتی کہ ناراض حسیب نہیں تھا۔ وہ خود حسیب سے ناراض تھی۔

"سوہا پلیز تم جلدی آؤ۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔" اس کی آواز نیچی ہو گئی۔ تب ہی کسی نے نرمی سے اس کا کندھا تھاما۔ سوہا نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں عفت کھڑی تھی۔

"اندر چلی جاؤ۔ چچی جان تمہارا پوچھ رہی ہیں۔" اس کی نظروں اور چہرے پر ایک عجیب سی ٹھنڈک اور ملاحت تھی۔ اس کے اپنے ہاتھ میں بھی سیل فون دبا تھا۔ ماہا نے سہلاتے ہوئے سوہا کو الوداعی کلمات کہے۔ اور جب فون بند کر کے واپس امی کے پاس جانے لگی تو وہاں سے گزرتے ایک شخص پر اس کی نظر پڑی۔ وہ چہرہ اسے بہت جانا پہچانا سا لگا۔ اس نے ذہن پر زور ڈالا تو اسے یاد آگیا کہ اس نے انہیں کب اور کہاں دیکھا تھا۔ تقریب اسناد کی سالانہ تقریب میں اسٹیج پر کھڑے کچھ بولتے ہوئے وہ اسکول چین کے مالک تھے۔ ان کا نام مغیث حسن تھا۔ عفت نے اسے کمرے میں غائب ہوتے دیکھا اور پھر فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف معراج تھا۔

"جی السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ صبح بخیر۔ کیسے مزاج ہیں۔ جناب کے۔" چند دن پہلے کی بہ نسبت اس کے انداز میں آج قدرے بے تکلفی پائی جاتی تھی۔

"میرے حال تو ٹھیک ہیں۔ لیکن...." وہ رک سی گئی۔ پتا نہیں اپنے گھر کے مسئلے کے لیے اسے پریشان کرنا مناسب بھی ہوتا یا نہیں۔ جبکہ دوسری طرف وہ مستقل اصرار ہی کیے گیا۔ تب عفت نے اسے پوری بات بتادی۔ معراج خاموشی سے سنتا رہا۔

"بس بتا ہی نہیں چلا کب اتنی زیادہ خراب ہوگئی طبیعت ان کی۔"

"چلیں خیر! میں نے تو آپ سے بات چیت کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ کہ آپس میں تھوڑی بے تکلفی ہو جائے۔" عفت ایک دم خفت زدہ سی ہوگئی۔

"لیکن موقع ایسا ہے کہ اب اس طرح مناسب نہیں لگتا۔ آپ بھی یقیناً" آرام دہ محسوس نہیں کریں گی۔"

"جی۔" اسے اچانک ہی اپنے اور معراج کے درمیان رشتے کی نزاکت کا احساس ہوا تھا۔ فون بند کرنے کے بعد، چچی جان کے پاس جانے تک وہ اپنے آپ کو کسی اجنبی لیکن مسحور کن لہجے کی خوشبو کے حصار میں محسوس کرتی رہی۔

☆ ☆ ☆

حدید نائلہ کو لے کر گھر آیا تو سوہا اور انس اسپتال کے لیے نکل چکے تھے۔ نائلہ گھر آکر چپ چاپ کچن میں چلی گئی اور ناشتا بنانے لگی۔ گو کہ حدید نے وہاں ناشتا کیا تھا۔ لیکن وہ اتنا کم تھا۔ اور حدید نے بھی کھل کر کھانے سے گریز کیا تھا۔ نائلہ کی نگاہوں کا مرکز اس کے سوا اور تھا ہی کون؟

اس نے حدید کی آدھی سوئی آدھی جاگی آنکھوں سے اس کی تھکاوٹ کا اندازہ کرلیا تھا۔ تھکی ہوئی وہ خود بھی تھی۔ اور اگر کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ اپنی تھکن کے سوا اور کسی شے کے بارے میں سوچنا بھی گناہ تصور کرتی۔ اور ان اشیاء میں یقیناً" حدید بھی شامل ہوتا۔ لیکن اب بہت کچھ بدل گیا تھا۔ وقت، حالات، زندگی اور۔ شاید وہ خود بھی۔

"کیا میں دھیرے دھیرے سمجھوتے کے لیے تیار ہو رہی ہوں؟" اس نے انڈا تلتے ہوئے خود سے خود ہی حیرت میں بھیگا سوال کیا۔

"نہیں۔ یہ صرف اور صرف مکافات عمل کا خوف ہے۔ جو تمہیں اس بدتمیز بچے کی طرح تمیز کے دائرے میں رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ جسے استاد کا مولا جٹ حد میں رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔" کوئی اس کے اندر سے بولا۔ اور نائلہ نے بڑے دل سے قسم کھائی کہ اندر بولنے والا ضمیر اگر مجسم شکل میں سامنے ہوتا تو شاید وہ اس کا سر پھاڑ

تھی۔ حدید نہا کر نکلا آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ جب وہ ناشتے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔
"ناشتا کرلیں۔" بنا اس کی طرف دیکھے اس نے مخاطب کیا۔ حدید کی طرف خاموشی تھی۔ نائلہ چند لمحے ویسے ہی کھڑی رہی۔ پھر نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اس کی طرف ایک نگاہ غلط انداز تک ڈالنے کا روادار نہ تھا۔
"میں نے آپ سے کہا ہے ناشتا کرلیں۔ میں نے دیکھا تھا آپ نے وہاں ٹھیک سے کچھ نہیں کھایا تھا۔
"اچھا۔" اس نے طنزیہ انداز میں ہنس کر اسے دیکھا۔
"میری طرف دیکھا تم نے۔ تمہارا ایمان تو نہیں خراب ہوگیا۔ دو رکعت توبہ کے نفل پڑھ لو جاکر۔ کیوں اپنی آنکھوں کو تکلیف دی تم نے۔" اس کے لفظوں کی کاٹ کو نائلہ نے بڑے ضبط سے برداشت کیا۔ یہ وہ پہاڑ تھا جسے دو دھاری تلوار پر چل کر اسے سر کرنا تھا۔ اور ہر صورت میں کرنا تھا۔
"اب... آپ کو دیکھنے سے میری آنکھوں کو تکلیف نہیں ہوتی۔" ناشتے کی سجی ہوئی ٹرے بیڈ پر رکھی تھی۔ اور وہ دور صوفے پر بیٹھا تھا۔
"کیوں۔ اب کیا میرے اندر پڑے کیڑے مر گئے ہیں۔" وہ جتنا ہو سکتا تھا۔ اپنی سطح سے گری ہوئی تکلیف دہ گفتگو کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا نائلہ ہمیشہ کی طرح بنا بحث کیے بلکہ الٹا دھونس جما کر وہاں سے چلی جائے۔ وہ اپنے اندر کے اس مرد سے ڈرتا تھا۔ جس کی نرمی اور خدا خوفی اسے کسی کے ساتھ زیادتی کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اور یہ وہ خوف تھا۔ جسے کرنے کے باوجود وہ کبھی کھوج نہیں پایا تھا۔ اور جب شناخت کرلیا تو اسے لگا کہ نائلہ نے جو زیادتیاں اس کے ساتھ کی ہیں۔ اور جائز حقوق رکھتے ہوئے بھی جس طرح اسے بے حیثیت کیا ہے۔ اور اس رویے پر جو تکلیف اس نے برداشت کی تھی۔ اس کے بدلے میں نائلہ کو اتنی جلدی معاف کر دینا خود اس کے ساتھ ہی زیادتی ہوتی۔
اور رہا عفت کو پانے اور نائلہ کو زندگی سے نکال دینے کا سوال۔ تو یہ تو اب ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ نائلہ کو اجاڑ کر بھی وہ اپنا دل نہیں بسا سکتا تھا۔ اپنی دنیا اپنی من پسند ہستی کے وجود سے آباد نہیں کر سکتا ہے۔ نائلہ بھلے چلی جاتی، عفت پھر بھی نہ آتی۔ جبکہ اس کی سوچوں اور خیالات سے بے خبر نائلہ اس طرح کٹہرے کے مجرم کی مانند سر اور نظر جھکائے بول رہی تھی۔
"نہیں۔ میری آنکھوں میں پڑے کیڑے مر گئے ہیں۔ میری عقل پر پڑے پتھر ریت بن کر جھڑ گئے ہیں۔ مجھے ہر شے بہت صاف دکھائی دینے لگی ہے۔" اس کی آواز ذرا کی ذرا کانپی۔ لیکن حدید کے پاس توجہ دینے کا وقت ہی کہاں تھا۔
"میں تمہارے ہاتھ کا بنا ناشتا نہیں کرنا چاہتا۔" اس کی ہموار اور بے لچک آواز گونجی۔ اور خاموشی چھا گئی۔
"تو پھر۔ جس کے ہاتھ کا کرنا چاہتے ہیں۔ اسی کا سمجھ کر کر لیجیے۔" نائلہ رکی نہیں تھی۔ لیکن وہ ضرور اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

باہر کی نسبت اس تپتی دوپہر میں اسپتال کے پرائیویٹ روم میں کافی ٹھنڈک تھی۔ سوہا اور انس نے اندر قدم رکھتے ہی اس سکون کو محسوس کیا جو ارد گرد فضا میں سانس لے رہا تھا۔
"شاید اس کی ایک وجہ یہ پرسکون چہرہ بھی ہے۔" سوہا نے دل ہی دل میں سوچا۔ عفت بے حد سنجیدگی اور ملائم تاثرات کے ساتھ چچی کو اپنے ساتھ لائی ہوئی یخنی پلا رہی تھی۔
"یہ کتنی ذمہ دار قسم کی لڑکی ہے۔ اسے ہر بات کا کتنا علم ہوتا ہے۔" اس نے دوسری بار عفت کو دیکھتے ہوئے

دل ہی دل میں توصیف کی۔

"آپ کو تو آج حیدر آباد واپس چلے جانا تھا نا! انس بھائی۔" عفت اب چچی کے ہاتھ اور منہ صاف کر کے سوپ کا پیالہ اور دیگر برتن وہاں سے ہٹانے لگی۔

"لاؤ میں دھو کر لاتی ہوں۔" سوہا نے اس کی مصروفیت دیکھتے ہوئے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کرنی چاہیں۔

"نہیں تم ابھی تو آئی ہو۔ بیٹھو تم۔ میں یہ دھو کر ذرا نماز بھی ادا کر آؤں۔" وہ برتن لے کر باہر نکل گئی۔ اور جب برتن دھو کر نماز ادا کر کے واپس کمرے میں آئی تو بے ساختہ ٹھٹک سی گئی۔ کمرے میں معراج کی والدہ اور بڑی بہن تشریف فرما تھیں اسے ایک نامعلوم جھجک نے آن گھیرا۔

"آؤ آؤ بیٹا رک کیوں گئیں۔" اس پر سب سے پہلی نگاہ چچی جان کی ہی پڑی تھی۔ ان کی نقاہت زدہ آواز پر دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ اور دونوں ہی خواتین کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"ارے ماشاء اللہ۔ ہماری بیٹی بھی یہیں ہے۔" معراج کی والدہ نے جس طرح ایک دم سے اٹھ کر اس کا ماتھا چوما اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ عفت کے دل میں سر اٹھاتی جھجک اور بہت سے خدشوں کا خاتمہ ہونے لگا۔ وہ دل میں معراج کی والدہ اور بہن کو بہت تیز مزاج کی حامل خواتین سمجھتی تھی۔ کچھ اس کی وجہ بھی تھی کہ ان کی والدہ کی آواز بے حد سخت، سپاٹ اور بلند ہوتی تھی۔ لیکن رشتہ طے ہو جانے کے بعد سے لے کر آج تک انہوں نے ایک ذرا سی بھی کسی بات سے اپنے مزاج کے ٹیڑھ پن کی جھلک نہیں دکھائی تھی۔ کم از کم ابھی تک تو نہیں۔ شاید بلکہ رخصتی کے بعد ان کا جو بھی رویہ ہوتا۔

ہر لڑکی کی طرح عفت کے دل میں بھی اپنی ازدواجی زندگی اور سسرالیوں کے معاملے میں کچھ تحفظات تھے۔ وہ ان کا اظہار تو نہیں کرتی تھی۔ لیکن ان کے زیر اثر ضرور تھی۔ انس کمرے میں موجود نہیں تھا۔ عفت کا دھیان واپس لوٹا تو معراج کی والدہ کہہ رہی تھیں۔

"بس بہن! انسان کو کچھ پتا نہیں ہوتا کب کیا ہو جائے۔ اب کل کا ہی لے لیجیے' ماشاء اللہ کتنے بہتر طریقے سے سب معاملات نمٹ گئے۔ تو آخر میں یہ سب۔" ان کی ہمدردانہ آواز پر امی کے چہرے پر ایک زرد پھیکی مسکراہٹ آگئی۔ پپڑی زدہ ہونٹ ذرا کی ذرا دائیں بائیں کھینچ سے گئے۔

"میں تو کہتی ہوں' خدا کے ہر کام میں مصلحت ہی ہوتی ہے۔ اگر جو یہ اٹیک ذرا دیر پہلے آجاتا تو۔ کیا کرتے سب۔ کہاں بھاگے دوڑتے پھرتے۔ ماں کو سنبھالتے یا لڑکے والوں کو۔" اب کی بار بہن نے ہمدردی میں حصہ لیا۔ لیکن بے حد عجیب انداز میں۔ دھیرے دھیرے مسکراتی امی کے سرہانے بیٹھی سوہا کے لب سکڑ گئے۔ لمحہ بھر کے لیے دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر دونوں نے ہی اپنی پلکیں جھکالیں۔

بات اگر ٹھیک بھی تھی۔ تو بہت بھونڈے انداز میں کی گئی تھی۔ سوہا کو انس کی کمی ایک دم ہی چبھنے لگی۔ اور عفت کے دل میں دم توڑتے خدشے پھر سے نمو پاتے' زندگی چرانے لگے۔

"جان بچی سو لاکھوں پائے۔ اللہ آپ کا سایہ بچیوں پر سدا سلامت رکھے۔" والدہ پھر بھی ذرا بہتر کلمات ادا کر گئیں۔

"اب اپنا اور اپنی طبیعت کا بہت خیال رکھیے گا۔ عفت کی شادی بھی جلد ہی آجائے گی۔ خدانا خواستہ دوبارہ کوئی۔"

"آنٹی آپ کچھ لیں گی۔ چائے یا جوس وغیرہ۔" اب ان کی بات کاٹنا ضروری ہو گیا تھا۔

"ہیں؟" وہ ذرا کی ذرا رکیں۔ پھر فوراً "ہی خوش ہو گئیں۔

"ارے نہیں نہیں بیٹا۔ ہم تو بس اب چلیں گے۔ یوں بھی عیادت کو آئے ہیں۔ کوئی مہمان تھوڑا ہی ہیں۔"

تھوڑی دیر بیٹھ کر دونوں خواتین رخصت ہو گئیں۔ سوہا نے ان کے جانے کے بعد عفت کو دیکھا۔ جو اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں جانے کیا کھوج رہی تھی۔ سوہا نے بنا کچھ کہے جا کر دھیرے سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبائے۔ عفت نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔" تپتی دوپہر میں جب حدید تھوڑی دیر آرام کے بعد آفس کے لیے نکل چکا تھا۔ دروازے پر ہوئی دستک پر اس نے بالکل بے دھیانی میں دروازہ کھولا تھا۔ اسے کیا پتا تھا۔ وہاں ایک بھوت اس کا منتظر ہے۔

"چل زیادہ ڈرامے نہ کر۔ مجھے پتا ہے تیرا خصم چلا گیا ہے گھر خالی ہے۔" گلی ویران تھی۔ اک ہو کا عالم طاری تھا۔ انسان تو انسان، پرندے بھی اپنے چونچیں کھولے ہانپ رہے تھے۔ اور وہ دروازے پر جما کھڑا تھا۔ اس سناٹے کا فائدہ اٹھاتا ہوا۔ دروازہ بند کرنے کی کوشش ناکام ہی رہتی۔ وہ پورے ہوم ورک کے ساتھ ہی آیا تھا۔

"جلدی راستہ دے دے بھئی۔" اس نے دھڑلے سے دروازے کی چوکھٹ پر جما نائلہ کا ہاتھ ہٹایا اور اندر داخل ہو کر سیدھا برآمدے میں چلا گیا۔ نائلہ کو کمر پر پسینے کی دھاریں بہتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی آیت الکرسی پڑھتی رہی۔ خود پر اور گھر پر دم کرتی رہی۔

"جو اپنے معاملات اللہ کے سپرد نہیں کرتا۔ اللہ اسے ذلیل و خوار کرنے کے لیے دنیا کے سپرد کر دیتا ہے۔ دنیا جو کوہ نور کی طرح دمکتی ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ ایک بے رنگا اژدہا ہے۔ جو اپنے شکار کو ثابت نگل جاتا ہے۔ اور جو خدا کو یاد نہیں کرتا۔ خدا اسے اپنا آپ خوب یاد دلاتا ہے۔ کہ پھر وہ اسے بھول نہیں پاتا۔ وہ بھی بہت بے چارگی سے اللہ کو یاد کرتی اندر آئی۔

"میرے جیٹھ اور جیٹھانی آنے والے ہیں۔ تم جلدی سے کام کی بات کرو اور جاؤ یہاں سے۔"

اس کا انداز پہلے کی نسبت کم ڈرا ہوا لیکن بے حد کوفت بھرا تھا۔

"او ہو۔ ہو۔ ہو۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بھونڈے پن سے ہنسا۔ اس کی موٹی توند تھل تھل کرنے لگی۔

"بڑی جلدی پڑ گئی کام کی تجھ کو۔" نائلہ نے جان بوجھ کر اس کی بات نظر انداز کی۔ وہ صوفے پر آگے ہو کر بیٹھی تھی۔ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ وہ بے حد سنجیدگی سے میز کی چکنی شفاف سطح کو گھور رہی تھی۔

در حقیقت یہ زندگی کا وہ مقام تھا جہاں انسان ہاتھ پیر چھوڑ کر صرف وقت کے کروٹ بدلنے کا انتظار کرتا ہے۔ مجبورا" بے بسی سے، بے کسی سے۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں بچتا۔ گو کہ اس کروٹ بدلنے کے انتظار میں اس کے ہاتھ سے بہت سی ایسی قیمتی اشیاء نکل جاتی ہیں۔ جنہیں وہ زندگی بھر تگ و دو کرنے کے بعد بھی واپس حاصل نہیں کر سکتا۔ سو وہ بھی صبر سے انتظار میں تھی۔ لیکن یہ صبر کتنا صبر آزما ہو سکتا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔ تب ہی شبیر حسین عرف شبو نے پٹاخا چھوڑا۔ اور وہ ایسے اچھل پڑی جیسے آس پاس کوئی بم دھماکا ہوا ہے۔

"تم...."

اس نے ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھا۔ پھر اتنی بات کو ناکافی جان کر مزید بولی۔

"مم۔ میں کیا کروں۔" مجھے بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں بھلا کر ہی کیا سکتی ہوں۔" اس نے دو جملوں میں بے ربطگی کے ڈھیر لگا کر پوری کوشش کی کہ شبیر حسین ایک ہی بار میں اس کے کچھ نہ کر سکنے پر یقین کر لے۔

"اوہ بھئی۔ اتنا کیوں ہول رہی ہے۔ شادی پر زیور نہیں ملا تجھے۔" اس کا اطمینان دیدنی تھا۔
"نہیں۔" اس کا سر بے اختیار نفی میں ہلا۔ "نہیں ملا زیور۔" وہ بے خیالی میں بڑبڑائی۔ پھر اس کا چہرہ دیکھ کر بڑبڑاتی اور تیزی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
"میری شادی بہت ایمرجنسی میں ہوئی تھی۔ زیور تو دور کی بات 'دو جوڑے کپڑے' تک نہیں ملے تھے۔"
"تو پھر۔ یوں کر۔ تیری جیٹھانی کے پاس بھی تو ہو گا زیور۔ چچ اوئے اس کی شادی تو طریقے سے ہوئی تھی نا! یا وہ بھی۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر کمینگی سے ہنسا۔ نائلہ کی ٹانگوں سے جان نکلنے لگی۔ وہ ایک لمحے کے غور و خوض کے بغیر بتا سکتی تھی کہ اس نے زندگی میں شبیر حسین سے زیادہ منحوس شخص کوئی نہیں دیکھا تھا۔ کمینگی کی اگر کوئی مجسم شکل ہوتی تو یقیناً" وہ شبیر حسین ہی ہوتا۔
اپنے بے جان پڑتے وجود کی اینٹھن محسوس کرتے سے اس نے دل سے اپنی موت کی دعا مانگی۔
"مرنا تو ایک دن ہے ہی ویسے بھی۔ یا اللہ! کسی بھی ذریعے سے تذلیل کی سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے مجھے ایک عزت دار موت نصیب فرما دے۔" صوفے پر آگے کو سرک کر بیٹھے بیٹھے اس نے کتنی صدیوں کا سفر طے کیا تھا یہ صرف وہ خود ہی جانتی تھی۔ شبیر حسین گاہے بگاہے ایک اچٹتی نظر اس کے اترتے چڑھتے چہرے کے تاثرات پر ڈالتا۔ اور پان چبانے لگتا۔ تھوڑی دیر سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کن انداز میں سر اٹھایا۔
"جو تم چاہ رہے ہو۔ وہ نہیں ہو سکتا شبیر۔"
"میرا پیچھا چھوڑ دے اب۔ شادی ہو گئی میری۔ کیوں میری زندگی برباد کرنے کے پیچھے پڑا ہے۔ اور بھتیری مل جائیں گی تجھے۔ چلا جا نا! یہاں سے نکل جا میری زندگی ہے۔ تجھے اللہ کا واسطہ۔" وہ بلبلا کر رونے لگی۔
کتنی دیر گزر گئی تھی اسے اسی طرح ہتھیلیوں میں چہرہ چھپا کر بلکتے ہوئے۔ گھر میں ایک اکیلی اسی کی آواز گونج رہی تھی۔ شبیر حسین کی طرف مکمل خاموشی تھی۔ اور وہ بے وقوف سمجھ رہی تھی کہ شاید اسے یوں روتا بلکتا دیکھ کر آج تو اس کا پتھر دل ضرور ہی پگھل جائے گا۔ اس نادان نے اپنے آنسو ہمیشہ غلط جگہ بہائے تھے۔ ہمیشہ انسانوں کو راضی کرنے کے لیے اگر اس کے آدھے بھی اپنے خالق کے آگے بہائے ہوتے تو شاید آج یہ منظر بہت مختلف ہوتا۔ یہ منظر ہی کیا۔ اس کی زندگی ہی مختلف ہوتی۔
اس حقیقت سے پرے وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اگر آج شبیر حسین پر اس کی آہ و زاری اثر کر جائے تو حدید کو اپنا بنانے کے لیے زمین آسمان ایک کر دے گی۔
کافی دیر آنسو بہانے کے بعد جب اس کے ہولتے بلکتے دل کو ذرا کی ذرا قرار آیا تو بے حد مدھم سی آہٹ محسوس ہوئی شاید شبو اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ شاید وہ مایوس ہو کر جانے والا تھا۔ اس نے تیزی سے سر اٹھایا۔ اور جتنی تیزی سے سر اٹھایا اتنی ہی تیزی سے ایک بے حد خوف زدہ سہمی ہوئی اور بھیانک سی آواز اس کے حلق سے نکلی۔
شبیر حسین کسی ڈراؤنی بلا کی طرح اس کے سر پر جھکا کھڑا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک نوکدار چاقو تھا۔ جس کے چکنے پھل کی دہری دھار کسی جھری سے داخل ہونے والی دھوپ کی لکیر میں چمک رہی تھی۔ اس نے نائلہ کے سر اٹھاتے ہی بے رحمی سے اس کے بال دبوچے اور چاقو کی نوک کو ٹھوڑی کے نچلے حصے میں چبھایا۔
"بند کر یہ ناٹک۔" گالی دیتے ہوئے کہا۔
"یہ ٹسوے میری سامنے بہانے سے تیرا کچھ نہیں ہونے والا۔ نہ میرا کچھ بگڑنے والا سمجھی۔" اس نے نائلہ کے سر کو زور دار جھٹکا دیا۔ تکلیف سے نائلہ کی سسکاری نکلی اور آنکھیں باہر ابل آئیں۔
"تجھ سے جتنا کہا ہے۔ اتنا کر۔ چل مجھے اس کے کمرے میں لے کر چل۔" اس نے نائلہ کے بال پکڑ کر کھینچے۔
وہ تکلیف سے دوہری ہوتی بمشکل اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

"اچھا میرے بال تو چھوڑ دو۔ میں۔۔۔ میں چلتی ہوں لے کر۔ اف خدایا!" عافیت اسی میں تھی کہ اس کی ہدایت پر بلاچوں و چرا عمل کیا جائے۔ اس نے ایک ایک سیڑھی جیسے پل صراط پر چلتے ہوئے چڑھی۔ ہر ہر قدم پر پیروں کی جگہ اس کا دل کٹ کٹ کر گر رہا تھا۔

سوہا اور انس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ مگر اس میں تالے کے بجائے یوں ہی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ یہ پرانے زمانے کا بنا ہوا مکان تھا۔ دروازے میں لاک نہیں تھا۔ نائلہ نے مرے ہوئے ہاتھوں سے کنڈی کھولی۔ اسے اپنے وجود پر ایک لاش کا سا گمان ہو رہا تھا۔ چلتے پھرتے وجود اور آتی جاتی سانسوں کے باوجود جسم بے جان کیوں لگتا ہے۔ اگر زندگی میں کسی گھڑی اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوتا تھا تو وہ گھڑی آچکی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی شبیر حسین اسے ایک طرف ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ الماری اور اس میں لگی چابی نظروں کے سامنے تھی۔

"میں۔۔۔ میں سیڑھیوں کے پاس کھڑی ہو جاتی ہوں۔" اندر کی طرف لپکتا ہوا شبو ذرا کا ذرا رکا اور اس کی طرف پلٹا۔

"جا۔ لیکن دیکھ اگر کوئی ہوشیاری دکھائی نا!" اس نے لمحے سے بھی کم وقت میں پلٹ کر نائلہ کا جبڑا اپنے سخت ہاتھ میں دبوچ لیا۔ نائلہ کی جان نکلنے لگی۔

"تو پھر۔ تو مجھے جانتی ہے اچھی طرح۔" اس نے پھر ایک زوردار جھٹکا دے کر اس کا چہرہ چھوڑا اور نائلہ کو لگا اس کا منہ کسی لوہے کی ہتھکڑی سے آزاد ہوا ہے۔ اور جبڑا تو شاید اس ہتھکڑی کے ساتھ ہی نکل کر باہر گر چکا ہے۔ شبیر حسین نے چند منٹ کمرے کا جائزہ لینے میں لگائے۔ الماری کے علاوہ اور کوئی ایسی جگہ بظاہر دکھائی نہیں دیتی تھی کہ جس میں قیمتی اشیاء کے رکھے جانے کا گمان ہوتا۔ اس نے آگے بڑھ کر چابی گھمائی۔ الماری کا دروازہ بنا کسی مزاحمت کے کھل چکا تھا۔

ابھی اس کی ایک طائرانہ نگاہ ایک سمت سے دوسری سمت کا سفر مکمل نہیں کرپائی تھی کہ نائلہ سفید چہرہ لیے واپس اندر داخل ہوئی۔

"غضب ہو گیا شبو! میرا بیٹا گھر آگیا۔" اس کی آواز خطرناک حد تک بیٹھی ہوئی تھی۔ اور حالت سے ایسا لگتا تھا جیسے قریب المرگ کوئی مریض 'بستر علالت سے اٹھ کر چل کر اس تک آیا ہو۔ شبو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جیب میں ہاتھ مار کر ایک رومال برآمد کیا۔ اسے منہ پر لپیٹتا ہوا باہر نکلا اور 'لوہراد ھرد یکھا' کمرے کی پچھلی جانب چلا گیا۔

جتنی دیر میں انس نے صحن میں بائیک کھڑی کر کے اس کی چابی نکالی۔ وہ دیوار سے لگی ایک موٹی پائپ لائن کے ذریعے گھر کی پچھلی طرف موجود 'پانی کی سیوریج کے لیے بنائی گئی گندی گلی میں' اتر چکا تھا۔

گندی نالی کا کیڑا۔ کیڑی غلاظت۔۔۔ نائلہ کا ذہن اتنا کام نہیں کر رہا تھا کہ کوئی بھی بات پوری طرح سوچ سکے۔ وہ سوئے ہوئے دماغ اور جاگتی آنکھوں سے سیڑھیاں اترتی نیچے آئی تھی۔ اسے اپنے ہاتھوں اور پیروں کی لرزش پر اختیار رہا تھا اور نہ ہی یہ یاد رہا تھا کہ انس کے کمرے کا نہ سہی الماری کا دروازہ تو بند کر دیتی۔

☼ ☼ ☼

گھر کیسا بھی ہو۔ عالیشان محل ہو یا کچا پکا جھونپڑا۔ اگر حق ملکیت کے ساتھ اس میں داخل ہو تو طمانیت کا ایک گہرا احساس رگ و پے میں جاگتا ہے۔ اس احساس میں کتنا سکون پنہا ہوتا ہے۔ کہ ایک دنیا کی دولت لٹا کر بھی اس سکون کا بدلہ نہیں پایا جا سکتا۔

تپش بھرے اس گرم دن کے وسط میں جب سورج کی شعاعیں نوکیلی انی کی طرح جسم میں کھبتی تھیں۔

دھوپ سے تڑختے فرش پر بائیک کھڑی کر کے سامنے برآمدے کی طرف جاتے ہوئے وہ اس سکون اور احساس کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے اپنے اعصاب میں سر اٹھاتی تھکن کو بخوبی جانچ رہا تھا۔

اندر کمروں کے آگے بنا برآمدہ جسے دیوار کھڑی کر کے ٹی وی لاؤنج کی شکل دی گئی تھی اس وقت ویران پڑا تھا۔ مگر فل اسپیڈ میں چلتا پنکھا اس بات کا گواہ تھا کہ کوئی ابھی بھی یہاں سے اٹھ کر گیا ہے۔

"حدید!" اس نے حدید کے کمرے کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔ دروازہ نیم وا تھا۔ کوئی جواب نہ آنے پر اس نے پھر آواز دی اور دروازہ کو ہلکا سا دھکیلا۔

"جی!"

بالکل اچانک اسے اپنے پیچھے سے نائلہ کی آواز آئی۔ وہ اچھلتے اچھلتے رہ گیا۔ پھر پلٹ کر اسے دیکھا۔ "کہاں تھیں تم نائلہ اور کس قدر خاموشی سے آئی ہو۔" اس نے آخری جملہ دل میں ادا کیا۔ (مجھے تو ڈرا ہی دیا)

"جی۔" اس کی نظریں اور سر کسی مجرم کی مانند جھکے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا۔"

"جی۔" وہ سر اٹھا کے ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگی۔

"کوئی مسئلہ ہے۔" انس کو اس کے انداز غیر معمولی سے لگے۔ اور یہ تو بس نائلہ ہی جانتی تھی کہ اس طرح ہر بات کے جواب میں ایک لفظی جملہ "جی" کہنا بھی کس قدر پہاڑ تھا۔

انس دو قدم چل کر اس کے نزدیک آیا۔ وہ یوں اس کے چہرے کو دیکھنے لگی تھی۔ جیسے اس پر جن کا سایہ ہو گیا ہے۔ انس کو آن کی آن میں سویا کی نائلہ کے بارے میں کی گئی باتیں یاد آگئیں۔ وہ ان دنوں نائلہ کے عجیب و غریب رویے کی وجہ سے کتنی پریشان تھی۔

"تم منہ دھو کر آئی ہو۔ یا پسینہ آرہا ہے۔" انس نے بے حد دھیرے اور احتیاط سے اس کی کنپٹی پر بہتی پانی کی لکیر کو انگلی سے سمیٹا۔ اور نائلہ جیسے کسی کوے سے باہر نکلی۔

اس نے دل ہی دل میں خود کو باور کر دیا کہ بلا سر سے ٹل چکی ہے۔ "خود کو حوصلہ دینے کی خاطر بے ربط سے انداز میں ہنسی۔ یہ ہنسی بالکل ایسے ہی تھی کہ اس کی باچھیں بس دائیں بائیں ذرا سی چر گئیں۔

"وہ میں۔۔۔ گرمی میں بیٹھی تھی۔ ابھی ابھی لائٹ آئی ہے۔ تو اس لیے اتنا پسینہ آگیا۔ پھر میں کچن میں گئی پانی پینے تو لائٹ آگئی اور میں نے اپنا منہ بھی وہیں دھو لیا۔" انس ابھی بھی فکر مندانہ نظروں سے اسے دیکھتا اپنا چوڑا وجود لیے اس کے راستے میں کھڑا تھا۔

"میں تمہارے لیے لسی بنا کر لاتی ہوں۔ بیٹھو۔"

"او کے تم بناؤ لسی۔ میں تب تک چینج کروں۔ کھانا مت دینا۔ مجھے نکلنا ہے۔ حیدر آباد کے لیے۔" جتنی تیزی سے کہتا وہ سیڑھیاں چڑھ کر گیا تھا۔ اتنی ہی پتھروں والی جامد کیفیت نائلہ پر اتری۔ وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھی۔ وہیں کھڑے ہو کر انس کے واپس لوٹنے کا انتظار کرنے لگی۔

اسے یقین تھا۔ انس ابھی واپس آئے گا اور آکے اس سے بازپرس کرے گا۔ لیکن جس بات کا یقین تو کیا گمان تک نہ تھا وہ ہو گئی۔

بیرونی دروازے کا لاک کھول کر حدید نے صحن میں قدم رکھا۔ ابھی وہ خود کو انس کی جرح کے لیے تیار نہیں کر پائی تھی کہ حدید لاؤنج میں داخل ہوا۔ شاید وہ بائیک اندر لانے کے بجائے باہر ہی کھڑی کر آیا تھا۔ نائلہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے حدید کو اندر آتے اور انس کو اوپر سے نیچے پلٹتے دیکھا۔

"یہ کیسی عجیب سی اسمیل پھیلی ہوئی ہے گھر میں۔ تمباکو کی سی۔" ہمیشہ کی طرح اس نے نائلہ کے وجود کو

بھرپور طریقے سے نظر انداز کیا تھا۔ پر اوپر سے اترتے انس کا چہرہ دیکھ کر رک گیا۔ اور سلام دعا کرنے کے بجائے اسے یوں ہی دیکھنے لگا۔ یقیناً" انس کے چہرے پر کچھ غیر معمولی تھا۔ جس نے اسے کچھ کہنے سے روکا تھا۔
"کمرے کا دروازہ اور الماری کھلی پڑی ہے۔"
"نہیں۔ کیا کہہ رہے ہو۔"
"ہاں جیسے کسی نے تلاشی لینے کی کوشش کی ہو۔ لیکن میں نے چیک کرلیا ہے۔ کوئی چیز ہلی نہیں ہے اپنی جگہ سے۔"
"اچھی طرح دیکھا۔" انس سہلاتا بت بنی نائلہ کے قریب آیا۔ نائلہ نے دائیں بائیں دونوں جانب سے دو مردوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ یہ دونوں مرد اس گھر کے رکھوالے اور محرم تھے۔ وہ کیسے ایک نامحرم کو گھر کے اندر بلاتے وقت بھول گئی اتنی بڑی بات۔ ذمہ دار مرد کو اپنے گھر کی حفاظت کرنی آتی ہے۔ جیسے ایک باکردار عورت کو اپنی عزت کی حفاظت کرنی آتی ہے۔
"اور یہ بدبو سی کیسی آرہی ہے۔ تمباکو جیسی۔ جیسے سگریٹ کی عجیب سی۔" وہ دونوں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ نائلہ کی ہتھیلیاں بھیگیں۔ اور پیروں کی جان حقیقتاً" نکل گئی۔ اس کے اعصاب مکمل طور پر جواب دے چکے تھے۔ اسے زور کا چکر آیا۔ اور اگلے ہی پل وہ انس کے بازوؤں میں ڈھیر ہو چکی تھی۔
حدید نے منتشر حواسوں سے انس کو نائلہ کا چہرہ تھپتھپاتے دیکھا۔ اس کے بال اور دوپٹا بے ترتیب ہو چکے تھے۔ پورا جسم پسینے کی نمی سے گیلا تھا۔ اور بکھری لٹیں گردن اور اطراف میں چپکی ہوئی تھیں۔ حدید کے پورے وجود میں ناپسندیدگی کی لہریں اٹھیں۔ اور آنکھوں سے لپکنے لگیں۔
اس نے حواس باختہ سے انس کو دیکھا۔ جو پہلے بازوؤں کا سہارا دے کر اس کے وجود کو زمین پر پوری طرح گرنے سے بچا چکا تھا۔ اور اب اس کا سر اپنی گود میں رکھے فکر مندی سے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ حدید کے لیے یہ منظر ناقابل برداشت سا لگا۔ جانے کیوں۔ وہ فوراً" آگے بڑھا۔
"میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔ ابھی۔"
"رہنے دو۔ میں خود کال کرلوں گا۔ تمہیں حیدر آباد نہیں جانا۔" اس کا لہجہ ناگواری کو چھپانے کی کوشش میں سپاٹ سا ہو گیا۔ اور بات مکمل کر کے وہ جواب سنے بغیر کچن کی طرف بڑھ گیا۔
"یار پتا نہیں۔ میرے کمرے میں کون گیا تھا۔ کس نے تلاشی لینے کی کوشش کی ہے۔"
"کم از کم نائلہ نے نہیں کی ہوگی۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے پانی کے گلاس سے چند چھینٹے نائلہ کے چہرے پر مارے۔ بظاہر وہ نائلہ کی حالت سے پریشان اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کر رہا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ انس کو نہ وہ پریشان لگا' نہ نائلہ کو ہوش دلانے کا خواہش مند۔
"میں نے ایسا کب کہا۔" انس کو بھی اس کا انداز برا لگا۔ جلدی میں ہونے کے باوجود وہ حدید سے اس بات کو کلیئر کرنا چاہتا تھا۔ حدید نے جس انداز میں اس وقت بات کی تھی۔ وہ اس کے لیے زندگی کا سب سے عجیب ترین اور ناقابل فہم رویہ تھا جو' حدید نے اس کے ساتھ اختیار کیا۔ وہ جواب دینے کے بجائے ہنکارا بھر کے سر اثبات میں ہلانے لگا۔ انس چند لمحے فیصلہ کن موڑ تک نہ پہنچ سکنے کی کیفیت میں مبتلا رہا۔
"میں بلادوں ڈاکٹر کو۔ اسے ہوش نہیں آرہا ہے۔" اس کی تشویش بے حد فطری تھی۔
"نہیں۔۔۔ ضرورت نہیں ہے۔۔۔ تم جاؤ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔"
"بھاڑ میں جاؤ۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ان' دونوں میاں بیوی پر جیسے لعنت بھیج کر واپس پلٹا تھا۔ اپنے کمرے

میں آ کر کھلے دروازے کو دیکھ کر اس کی ذہنی رو بھٹک کر پھر سے اسی سوال پر آکر اٹکی تھی کہ کمرے میں کون آیا تھا۔ پیکنگ تقریباً مکمل ہی تھی۔ اسے نہا کر کپڑے ہی چینج کرنے تھے۔ پھر بھی جب تک وہ گھر میں رہا۔ اسی بات میں اس کا دھیان الجھا رہا کہ آخر کون... کس نے...

☼ ☼ ☼

شام ڈھل رہی تھی۔ عفت اپنے دل اور اپنی نیک فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر مامار بیتنے والی مشکل کا سوچتے ہوئے چچی جان کے ساتھ رک گئی تھی نرس خود ہی آکر رضوانہ حسن کو دوائیں اور انجکشن وغیرہ دے جاتی تھی اسے کھانے کے نام پر چند نوالے ہی کھلانے ہوتے تھے۔

پندرہ بیس منٹوں میں وہ یہ کام کر کے جیسے دنیا جہان سے فارغ ہو جاتی تھی۔ اور اس کے پاس سوچنے کے لیے بے شمار باتیں ہوتیں۔

اس نے گہری سانس لے کر زمین پر رکھے اپنے پیر چپلوں کی قید سے آزاد کر کے بیڈ کے کنارے نکائے۔ مہندی کے گل بوٹوں سے سجے میرون پیر اور ہاتھ۔

خوب صورتی اور باریکی سے لگائے گئے ڈیزائن کم از کم کسی دل کی مریضہ کی تیمار دار کے حلیے پر بالکل موزوں نہیں لگتے تھے۔

"رخصتی... معراج۔" اس کے لبوں نے بالکل چپکے سے دھیمی سے سرگوشی کی اور ایک معصوم مسکراہٹ لبوں کو چھو کر پلٹ گئی وہ معراج کی شخصیت کو اپنے خیالی دھاگوں میں پرو کر مکمل کرنے میں اتنی محو تھی اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو خیالی پیکر مجسم شکل میں زیر لب مسکراہٹ دبائے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ عفت کو باقاعدہ ہوش میں آنے میں ایک لمحہ لگا۔

"آپ!" گھبراہٹ اس کے چہرے سے ہویدا ہونے لگی۔

"السلام علیکم۔" اس کا چہرہ سنجیدہ لیکن لہجہ متبسم تھا۔

رضوانہ حسن معراج کو دیکھ کر مسکرائیں اور معراج سے باتیں کرنے لگیں۔ عفت معراج کی موجودگی میں قدرے بے آرام سی تھی۔ ایک تو اس سے قائم ہونے والا رشتہ بالکل نیا تھا۔ دوسرے جتنا نیا تھا۔ اتنا ہی قریبی بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عفت سلام دعا کے بعد سے جو سر جھکا کر بیٹھی تھی تو اب تک سر اٹھا نہیں پائی تھی۔

معراج کے پاس بھی کونسے باتوں کے خزانے تھے کہ وہ باتیں کرتا ہی چلا جاتا۔ رضوانہ بھی زیادہ بولتیں تو کمزوری محسوس کرنے لگیں۔ نتیجتاً" ہر تھوڑی دیر کے بعد خاموشی چھا جاتی۔ اسپتال کے کمرے کی فضا میں اس خاموشی سے نت نئے رنگ بھرنے لگتے۔ کبھی معنی خیزی کے... تو کبھی شوخی کے... ایک دوبار معراج کی باتوں کے درمیان اس نے چاہا کہ ذرا اک ذرا اک اچٹتی نگاہ ڈال کر اس کا چہرہ دیکھ لے۔

وہ چہرہ جو بے حد اپنا ہو چکا تھا اور جو بے حد پرایا سا تھا ابھی۔ پھر بھی اس کے ملبوس سے' اس کی شرٹ کی سلوٹوں سے' اس کے شوز میں دھیرے دھیرے ہلتے پاؤں سے' ہلکے روئیں سے بھری گندمی کلائیوں سے اور اس کی دھیمی اور بھاری' لیکن آواز سے اک ایسی اپنائیت چھلک رہی تھی' ایک ایسا جذبہ امڈ رہا تھا جو اس اجنبی کو اجنبی نہیں رہنے دے رہا تھا۔ عفت نے اسے بولتا ہوا پا کر اک بے حد چور نظر اس پر ڈالی' لیکن وہ بات تو رضوانہ سے کر رہا تھا' لیکن دیکھ اسی کو رہا تھا۔ چوری پکڑے جانے پر وہ خود تو دھیرے سے مسکرا دیا' عفت بے چاری گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"مجھے اک فون کرنا ہے۔ میں آتی ہوں۔" اس کمرے میں رہ کر مزید حماقتیں کرنے سے 'بھاگ جانا ہی بہتر تھا۔ اس نے سر پر سے سرکتا گلابی آنچل دوبارہ درست کیا اور فون اٹھا کر باہر نکل آئی۔
کمرے سے نکل کر اس نے ایک گہری سانس بھر کر خود کو نارمل کیا اور قریب سے گزرتے کسی کی عیادت کے لیے آئے ہوئے چند لوگوں کی نظریں اپنے مہندی رچے ہاتھوں پر دیکھ کر جھینپ سی گئی۔ فوراً" سر جھکا کر ذرا کونے میں گئی اور سوہا کا نمبر ملانے لگی۔

☼ ☼ ☼

سوہا نے فون بند کر کے مایوسی سے کرسی پر بیٹھی ماہا کو دیکھا۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ اس نے خود بھی عشا کی نماز پڑھی اور زبردستی ماہا کو بھی اٹھا کر پڑھوائی۔ اس کے بعد مزنہ آپی کو فون ملایا۔ حسیب کی بہن ہونے کے ناطے ان سے رابطے میں رہنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔ ان کی تمام تر کڑواہٹ بھری باتوں کے باوجود۔
"انہوں نے تو سب جگہ پتا کر لیا ہے۔ کسی دوست کو علم نہیں ہے۔ وہاں اس کا منیجر الگ پریشان ہے اور اس کے فلیٹ میں پتا نہیں اس کی کون سی دوست رہ رہی ہے۔ وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لے رہی۔"
"اس بارے میں تو آپی مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں ماہا سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔"
"اوہ نو۔۔۔ انہیں بھی علم نہیں ہو گا ورنہ کیا وہ تمہیں اب تک بتا نہیں چکی ہوتی' ان محترمہ کو تو شوہر سے جھگڑنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔" سوہا کے تن بدن میں ان کے انداز سے آگ ہی تو لگ گئی۔ ابھی وہ غصہ میں کچھ بولنے ہی والی تھی کہ پیچھے سے ماہا نے فون اچک کر لائن کاٹ دی۔
"تو بند کیوں کر دیا بھئی۔ کرنے دیتی نا بات۔ دماغ درست کرتی آج میں محترمہ کے۔"
"ان کے دماغ درست ہی ہیں سوہا! وہ ایسی نہیں ہیں۔ بس حسیب کے اس طرح گم ہو جانے پر' میرے حواس سلامت ہیں اور وہ بالکل پاگل ہو گئی ہیں بس۔" سر جھکا وہ واپس کرسی پر جا بیٹھی۔
"تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تمہیں بھی پاگل کریں۔"
"پاگل کو کیا پتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔" ماہا جان بوجھ کر پھیکا سا مسکرائی۔
"ماشاء اللہ! مجھے تو اب تم بھی پاگل لگ رہی ہو۔"
وہ جل ہی گئی۔
"کاش کہ تمہارا لگنا سچ ہی ہوتا۔" ماہا کی حسرت زدہ آواز پر وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"اللہ کی ہر شے اک نعمت ہے۔ میں نے بہت دیر سے جانا۔ کسی کے آنسو' کسی کا غم' کسی کی غیر موجودگی' کسی کی جدائی۔ انسان کو کب کون سی چیز' کون سا واقعہ' کون سا سبق دے کر جائے گا یہ' نادان انسان کبھی جان نہیں سکتا۔ کسی شخص کی دوری اسے اپنے خالق سے قریب کر دے گی۔
وہ کبھی جاننے کی کوشش نہیں کرتا بس۔ روتا ہے تو شکایت کرتا ہے۔ آنسو بہاتا ہے تو شکوہ۔ کوئی روٹھ جائے تو اللہ سے ناراضی۔ کوئی چلا جائے تو 'سوال۔ حالانکہ اگر وہ دیکھے' سوچے اور سمجھے تو اس کے دل کا سارا سکون اور زندگی کا تمام اطمینان اس ایک جملے میں چھپا ہے کہ۔
"جو ہوا اللہ کی مرضی سے ہوا اور اسی لیے اچھا ہوا۔" وہ تاریک پڑتے آسمان میں کہیں کہیں منقش کی طرح دمکتے ستاروں میں اپنا مقدر ڈھونڈتی بول رہی تھی۔ سوہا سے آگے سے کچھ کہا نہیں گیا۔ بات تو ٹھیک ہی تھی' لیکن۔۔۔ فون پھر سے بجنے لگا۔

"ارے عفت کال کر رہی ہے۔ تم نے حدید بھائی سے کہا تھا رات میں رکنے کے لیے۔" ماہا جیسے کسی دھیان سے جاگی۔ سوہا کے ہونٹ سیٹی کی طرح سکڑ گئے۔

"میں بالکل بھول ہی گئی۔ اف۔۔۔!" ماہا نے اس کی عقل پر بلکہ یادداشت پر ماتم کرنے جیسا منہ بنایا۔

"تم بھی نا! لو اب دو اسے تسلی اور فوراً" فون کرو حدید بھائی کو۔"

"ہیلو۔" سوہا نے فون کان سے لگایا اور چند لمحے دوسری طرف کی بات سن کر بولی۔

"آئم سو سوری عفت! یہاں ماہا کا رو رو کر برا حال تھا۔ ریئلی میں بالکل بھول گئی۔ بس میں ابھی انہیں کال کر دیتی ہوں۔" وہ دوسری طرف عفت کی بات سننے لگی۔ عفت یقیناً" اتنی دیر ہو جانے پر گھبرا گئی تھی۔ سوہا نے فون بند کر کے جلدی سے حدید کو فون ملایا۔

☆ ☆ ☆

دن ڈھل چکا تھا۔ مغرب سے ذرا بعد کا وقت تھا۔ آسمان نے مکمل طور پر سیاہ نقاب لے لیا تھا۔ جب اس کی پلکیں ذرا کی ذرا تھرتھرائیں۔ اس نے بھاری پپوٹے بمشکل ذرا کی ذرا کھولے تو آنکھوں میں پڑنے والی سفید روشنی جھماکے کی صورت پتلیوں میں گڑ گئی۔

اس سے لمحے بھر سے زیادہ دیکھا نہیں گیا۔ اس نے فوراً" آنکھیں دوبارہ بند کیں۔ ذہن ایک دم خالی اور جسم تھکاوٹ سے ایسے چور چور تھا۔ جیسے پتا نہیں کتنے میلوں کا سفر طے کر کے تھکن سے نڈھال ہو چکا ہے۔ ابھی اس کے آدھے سوتے آدھے جاگتے ذہن نے کیا، کیوں۔۔۔ اور کیسے کی طرح کے سوالات نہیں اٹھائے تھے۔ فی الحال وہ صرف اپنی آنکھیں کھولنے اور اپنے ٹوٹتے جسم میں اٹھتی درد کی ٹیسیں برداشت کرتی اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"دلیٹی رہو۔ اگر اٹھنے کی ہمت نہیں ہے تو۔" اس کے کانوں میں ایک جانی پہچانی آواز گونجی اور اس بار اس کی آنکھیں بنا کسی دقت کے کھل گئیں۔

حدید کی آواز نے صرف آنکھیں نہیں اس کی یادداشت کا وہ خانہ بھی کھول دیا تھا جس میں چند گھنٹے قبل پیش آنے والا واقعہ حرف بہ حرف لکھا رکھا تھا۔ اس نے اپنے جسم کی پوری توانائی صرف کی اور کروٹ لینے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ صوفے پر لیٹی تھی۔ سر میں اٹھنے والی ٹیسیں شدت پکڑ گئیں۔

حدید بظاہر بے نیاز بنا ٹی وی میں گم تھا۔ ٹی وی کا والیوم معمول سے دھیما تھا جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بے نیاز دکھنے کے باوجود وہ نائلہ سے مکمل طور پر غافل نہیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے دوپہر کے مناظر کسی فلم کی طرح چلنے لگے۔ اس نے آنکھوں پر سے ہاتھ نہیں ہٹائے تھے۔ حدید نے ذرا نگاہیں ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ وہ دھیرے دھیرے سسکنے لگی تھی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بنا متاثر ہوئے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کتنی دیر اسے یوں چپکے چپکے روتے ہوئے گزر گئی۔

"اگر تم اس ناٹک پر وقت ضائع کرنے کے بجائے شرافت سے بتا دو کہ تم انس کے کمرے میں کیا کرنے گئی تھیں۔ تو ہم دونوں کا وقت بچ جائے گا۔" حدید کی تلخ آواز گونجی تو نائلہ کو لگا اس سے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس نے بے یقینی سے حدید کو دیکھا۔

"کیا۔۔۔ کیا کہا آپ نے۔۔۔"

"وہی جو تم نے سنا۔ کیا چرانے گئی تھیں انس اور سوہا کی الماری میں سے۔" اس نے انس اور سوہا کے نام پر خاص زور دیا۔

"آپ۔۔۔ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں۔۔۔ میں نے۔۔۔" دکھ کے مارے اس سے الفاظ مکمل نہیں کیے گئے۔

حالانکہ یہ دکھ اس کا اپنا تھا۔ اگر وہ غیر جانبداری سے اپنا محاسبہ کرتی اور اپنے ماضی کے کردار کو سامنے رکھتی تو حدید بالکل حق پر نظر آتا۔

کردار پر لگے داغ' داغ نہیں پتھروں پر کھدی ہوئی لکیریں ہوتی ہیں۔ زمانے لگتے ہیں۔ ان درازوں کو بھرنے میں اور پھر بھی کبھی نہ کبھی' کسی نہ کسی کی یادداشت کا گرم تھپیڑا ان درازوں کو دوبارہ گہرا کر دیتا ہے۔ وقت کے ساتھ ذرہ ذرہ کرکے بھری ہوئی ریت کو اڑا لے جاتا ہے۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" نائلہ گونگی بن کر بیٹھی اس کی شکل دیکھتی رہی۔

زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا مقام آتا ہے۔ جب انسان کو اپنے تمام الفاظ فالتو لگنے لگتے تھے۔ خواہ وہ کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوں۔ اپنی آواز ایک فضول شے لگتی ہے۔ جس کا کوئی مصرف نہیں۔ خواہ وہ آواز کتنی ہی بلند' کتنی ہی مدھم اور کتنی ہی خواب صورت کیوں نہ ہو اور وہ الفاظ جو اپنی سچائی پر خود مشکوک ہوں' وہ الفاظ جو اٹھے یا دبے کسی کو کوئی فرق نہ پڑنے والا ہو۔ تو پھر وہ آواز اور الفاظ دونوں انسان کے کام کے نہیں رہتے۔

نائلہ پر بھی وہ وقت' وہ مقام اور وہ گھڑیاں آچکی تھیں۔ اسے معلوم تھا۔ اس وقت وہ روئے' دھاڑے' چیخیں مارے تب بھی اپنی بات کی سچائی ثابت نہیں کرسکے گی۔ کیوں کہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا کہ انس کے کمرے میں وہ نہیں کوئی اور گیا تھا۔ ثبوت ہوتا بھی تو وہ پیش نہیں کرسکتی تھی۔

پتا نہیں کون سی صدیوں کی تھکن اس کی رگ وپے میں سرایت کرگئی تھی کہ لگتا تھا پورا جسم پتھر روڑے ڈال کر اس پر گھسیٹا گیا ہے۔ حدید کو اس کی حالت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اگر اس سے مخاطب تھا تو فقط اپنی بات کا جواب لینے کے لیے۔ نائلہ کی نظریں یہاں وہاں پھرنے لگیں۔ جیسے صوفے کی ہتھیوں کی جڑوں میں' ٹی وی ٹرالی کے لاک ہول میں یا پھر سینٹر ٹیبل کے نیچے سے اسے جواب مل جائے گا۔ اور اسے جواب مل ہی گیا' لیکن کہیں اور سے نہیں اپنی خالی ہاتھوں سے۔

"میں۔ میرے پاس ایک انگوٹھی تھی۔ ایسے ہی نقلی۔ میں کبھی کبھی پہنتی تھی۔ نکاح والے دن سوہا نے مانگ کر پہنی تھی تو واپس نہیں کی۔ میں وہی لینے کے لیے۔" اس سے بات مکمل نہیں کی گئی۔ وہ اب دوبارہ سر ہاتھوں میں ڈال کر رو رہی تھی۔ فرق یہ تھا کہ پہلے اس کے پاس بہانہ نہیں تھا۔ اب کھل کر رونے کا بہانہ مل گیا تھا۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو نا!" حدید کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

"نہیں نہیں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ میں کیسے یقین دلاؤں آپ کو۔" اس نے بدقت تمام "خدا کی قسم" کو لبوں میں روکا تھا۔

"تو تم نے سوہا سے مانگی نہ انس سے ذکر کیا۔ سیدھی اڑانے کے لیے اس کے کمرے میں پہنچ گئیں۔"

"سوہا' چچی کے ساتھ تھی۔ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی میں۔" ایک جھوٹ۔ پھر جھوٹ پر جھوٹ۔ اور پھر۔ جھوٹ در جھوٹ۔

"تو تمہیں ایسی کون سی آگ لگ گئی تھی اسے لینے کی' جو اکیلی پہنچ گئیں۔"

"میں۔ مجھے۔" اس نے بے حد لاچاری سے جرح کرتے حدید کو دیکھا۔ کاش یہ شخص اس سے محبت کرتا ہوتا۔ اس نے اس کا اعتماد اس کا مان' بھروسہ جیت لیا ہوتا تو اس کی ہربات پر آنکھیں بند کرکے یقین کرلیتا۔

"مجھے شک تھا کہ سوہا نے وہ انگوٹھی کھودی ہے۔ کیوں کہ اس نے نکاح والے دن مانگنے کے باوجود وہ انگوٹھی

نہیں پہنی تھی۔"

"ایک آرٹی فیشل رنگ کے لیے تم نے۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ سوہا کی کال آرہی تھی۔ کوفت اور بے زاری نے نئے سرے سے اسے لپیٹ میں لیا۔

"بولو۔" اس کا انداز پھاڑ کھانے سے ذرا سا ہی کم تھا۔ سوہا بھی اٹک سی گئی۔

"وہ حدید بھائی۔ آپ آج رات رک جاتے امی کے پاس تو۔" اس نے سوہا کی محتاط آواز سن کر گہری سانس بھری خود پر قابو پایا اور جب دوبارہ بولا تو کافی بہتر ہو چکا تھا۔

"میں نہیں رک سکتا۔ نائلہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیوں کیا ہوا اسے۔" سوہا کی آواز میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی ابھری۔

"گرمی کی شدت سے اس کا بی پی لو ہو گیا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔" سوہا کو صورت حال کی سنگینی کا ادراک ہوا۔

"اوہو۔ تو پھر۔ اب ٹھیک ہے وہ۔"

"اب ٹھیک تو ہے' لیکن میں اسے اکیلا چھوڑ کر نہیں آسکتا۔" وہ بولتے ہوئے اٹھا اور کمرے میں چلا گیا۔ نائلہ سسکتے ہوئے تعجب سے اس کی پشت دیکھتی رہی اور اس نے بات مکمل کر کے موبائل بیڈ پر پھینک دیا۔

دل تو چاہتا تھا اڑ کر عفت کے پاس چلا جائے جو اس وقت اکیلی اسپتال میں یقیناً" گھبرا رہی ہو گی' لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ نائلہ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ اسے نائلہ کی کوئی پروا تھی۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اسے اپنے بھائی اور اس کے سامان کی پروا تھی اور نائلہ کی بات پر رتی برابر یقین نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

عفت معراج کے سامنے سے تیسری بار فون سننے کے بہانے اٹھ کر باہر آئی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ رات میں اکیلی اسپتال میں رکنے کے خیال سے دل ہی دل میں پریشان ہو گئی تھی۔

گو کہ رضوانہ کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ ایمرجنسی جیسی کوئی صورت حال نہیں تھی' لیکن پھر بھی یوں تن تنہا ایک بستر پر پڑی دل کی مریضہ کے ساتھ' اتنے بڑے اسپتال میں اکیلے رات گزارنے کا خیال اسے ہولا رہا تھا۔

سوہا نے بہت معذرت کر لی تھی۔ ساتھ ہی نائلہ کی طبیعت کا بھی بتا دیا تھا اور اس نے اس کی بے ہوشی کا سن کر بے حد خلوص اور چاہ سے دعا کی تھی۔

"یا اللہ! نائلہ کی طبیعت کی خرابی کسی خوش خبری سے جوڑ دے۔" اس نے ماہا اور سوہا کو ہمیشہ سگی بہنوں کی طرح ہی چاہا تھا اور نائلہ کو ملا کر تینوں بہنوں میں سے ایک کا بھی آنگن بچوں کی قلقاریوں سے اب تک آباد نہ ہو سکا تھا۔

یہ وہ کمی تھی جسے وہ صرف محسوس کرتی تھی کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ سوہا سے نائلہ کے بارے میں سن کر فی الحال تو اس نے دعا مانگی اور پھر فوراً" اپنے بارے میں سوچا۔ معراج کو آکے بیٹھے بھی دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس کا یوں اکیلے مزاج پرسی کو چلے آنا اتنا عجیب نہیں تھا' لیکن دو گھنٹے تک بیٹھے رہنا یقیناً" رضوانہ کو بے چین کر رہا تھا اور خود معراج کیا سوچ رہا تھا جو واپسی کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ عفت کو اب اس کی بھی فکر ہو رہی تھی۔

"ایک بار معراج چلے جائیں تو کمرے میں بند ہو کر لمبی تان لوں گی۔ پھر کیا خبر ہو گی۔ کب رات کٹ گئی کب دن نکل آیا۔" دل ہی دل میں ارادہ کر کے وہ پلٹی اور تیز قدموں سے کمرے تک آگئی۔ رضوانہ کو رات کی دوائیں دی جا چکی تھیں انہیں بھی نیند ستا رہی تھی۔ عفت کو ان کا بھی خیال آ رہا تھا۔ وہ دروازے پر پہنچی تب ہی معراج باہر

نکلا۔ عفت نے ایک دم ٹھہر کر سر جھکا لیا۔ جانے کیا بات تھی۔ لاکھ کوشش کر کے بھی وہ نظر بھر کے اس شخص کی طرف نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ جو اب اس پر دنیا میں سب سے زیادہ حق رکھتا تھا۔

"میں چلتا ہوں۔ میرے خیال میں کافی دیر رک گیا میں۔"

"جی۔" اس نے نہ تائید کی نہ تردید۔

"آپ آج اکیلی رکیں گی۔"

"شاید رکنا پڑے۔ ایکچوئیلی حدید بھائی آ رہے تھے، لیکن نائلہ کی طبیعت بالکل اچانک خراب ہو گئی تو انہیں گھر پر رکنا پڑا۔" وہ خوامخواہ کنفیوز ہوئے چلی جا رہی تھی۔ زندگی میں ایسی صورت حال سے اس سے پہلے کبھی واسطہ بھی تو نہیں پڑا تھا۔ الوداعی کلمات کہتا وہ پلٹ کر کوریڈور میں سیدھا چلتا چلا گیا۔ عفت وہیں کھڑی اس کی پشت دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ موڑ مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ عفت پلکیں نہیں جھپکا سکی۔

وہ وہیں کھڑی قدم قدم اسے خود سے دور ہوتا دیکھتی رہی۔ ہر اٹھتے اور گرتے قدم کے ساتھ دل کو کچھ نئی کیفیات میں ڈوبتے ابھرتے محسوس کرتی رہی۔ جانے کتنی دیر گزر گئی اور کتنی دیر گزرنی تھی۔

یہ عمارت، یہ ماحول اب تک تو نہیں، لیکن اب سے انجان لگنے لگا تھا۔ یوں لگتا تھا کوئی رنگوں بھرا منظر تھا جس پر کسی نے بلیچ ڈال دی۔ وہ رنگوں بھرا منظر جگہ جگہ سے سفید پڑ گیا۔ یا پھر سرمئی....

"اگر... اگر...." ایک سوچ نے تلے قدموں سے جھجکتی آئی اور اس کے دل کے کواڑ کھول کر باہر جھانکا۔

"اگر آج حدید، معراج کی جگہ ہوتے تو کیا میں اکیلی ہوتی۔"

"ہش!" دماغ کے کسی روزن نے سچائی کی البیلی ٹیار کو باہر دھکیلا۔

"ان ہی کی وجہ سے اکیلی ہوں۔ کیا انہیں پتا نہیں تھا کہ میں اسپتال میں رکوں گی اور وہ نہیں آئیں گے تو میں کتنی اکیلی پڑ جاؤں گی۔"

"اری او پگلی... ارے نادان سن!" وہ شرمیلی جھجکی سوچ جو دل کے کواڑ کھول کر دہلیز پر سر جھکائے بیٹی تھی ایک دم تنک گئی۔

"اس تنہائی کی بات کون کرتا ہے! یہ تو وہ اکیلا پن ہے جو تو نے راتوں جاگا اور پہروں بھوگا ہے۔ یہ تو وہ پیاس ہے جس نے تجھے ساون میں بے کل رکھا۔ یہ وہ آگ ہے جس نے چھاجوں مینہ برستے میں تجھے سلگایا۔ یہ ایک رات... ہونہہ۔" اس نے طنز سے ہنکارا بھرا۔

"یہ رات کسی گنتی شمار میں ہے۔"

نادان میں نہیں، نادان تو ہے تو...." دماغ کے روزن میں کھڑی الہڑ مٹیار نے بڑا چڑ کر اس کی طرف اشارہ کیا۔

"جو پرائی چیزوں پر نگاہ ڈالے وہ نادان نہیں تو اور کیا ہے۔" اس کے اندر دلیلوں اور اعتراضات کا ہجوم لگ گیا۔ الفاظ کی عجیب چھینا جھپٹی جاگ اٹھی۔ یہاں تک کہ اس کی پتھرائی آنکھوں میں نمی اترنے لگی اور اسی نمی کے اس پار "ک دھند کی اوٹ سے اس نے کسی کے وجود کو اپنی سمت بڑھتے دیکھا۔

دل و دماغ میں چھڑی جنگ میں اچانک سیز فائر ہوا۔ اس کا دھیان پلٹا اس نے تیز تیز پلکیں جھپکا کر اپنی آنکھوں کو مسلا اور سامنے دیکھا۔ وہاں حدید نہیں تھا۔ وہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے تو معذرت کر لی تھی یہ کوئی اور تھا۔ کوئی مہمان وجود... جو دور جاتے جاتے پلٹ آیا تھا۔

"میں نے سوچا اگر تم آج رات اکیلی یہاں رک رہی ہو۔ تو میں بھی رک جاتا ہوں۔ میرا نہیں خیال کہ تمہیں کوئی اعتراض ہو گا۔" آپ سے تم تک کے سفر میں جتنے بھی موڑ آئے تھے۔ وہ سب کاٹ آیا تھا۔

باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔)

مکمل ناول

سلمیٰ فقیر حسین

پھر نہ کہنا

"نامرن جوگی کو پندرہ سال سے بچیوں کا خیال تک نہیں آیا۔ اب اچانک پندرہ سال بعد فون کھڑکا رہی ہے کہ بی جی مجھے میری بچیاں دے دو۔ ورنہ چھین کر لے جاؤں گی۔ میں نے کہا بدبخت دو' چار سال امریکا کیا رہ آئی۔ اسی کی زبان بولنے لگی تو آگے سے بڑی بے شرمی سے کہنے لگی۔ میں نے بچیوں کو جنم دیا ہے' آپ نے نہیں اور یقیناً" بچیاں میرے یعنی اپنی ماں کے پاس آنے کو ترس رہی ہوں گی۔ اس لیے شرافت سے بچیاں اسے دے دوں۔" کل نسرین بیگم کا فون آیا تھا۔ جس کی تفصیل بی جی فون پر اپنی صاحب زادی پروین کو سنا رہی تھیں۔

"بات تو فکر مندی کی ہے بی جی۔ آپ تو جانتی ہیں۔ کیسی شاطر ہے وہ اپنی غرض کے لیے کچھ بھی کر گزرتی ہے۔ اسے کب عزت بے عزتی کی پروا ہے۔" پروین پریشانی سے بولی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ مجھے تو آج تک وہ دن نہیں بھولتا۔ جب بڑی بے شرمی سے دونوں بچیاں میرے حوالے کرتے ہوئے بولی تھی۔ "بی جی میں اس چار دیواری میں گھٹ گھٹ کر نہیں جی سکتی۔ زندگی ایک بار ہی ملتی ہے اور میں اسے اپنی مرضی اور پسند کے ہم سفر کے ساتھ جی بھر کر ان جوئے۔ (انجوائے) کرتے ہوئے گزارنا چاہتی ہوں۔ یہ بات آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ نوازش سے میری شادی سراسر میری مرضی کے خلاف ابا جی کی جائیداد سے عاق کردینے والی دھمکی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ مگر اب جب ابا جی اس دنیا میں نہیں رہے تو میں کیوں اپنی زندگی اپنی مرضی کے بغیر نہ گزاروں۔ میں ماضی کی کوئی یاد اپنے ساتھ نہیں لے کر جانا چاہتی' یہ بچیاں بھی نہیں۔ یہ آپ کا خون ہیں۔ انہیں آپ ہی رکھیے' بس اتنی سی درخواست ہے۔ نوازش سے کہیے کہ وہ شرافت سے مجھے طلاق دے دے۔" بی جی ماضی میں کھوئی سی دلگرفتی سے بول رہی تھیں۔ پروین کے دل سے بھی ہوک سی نکلی تھی۔

"دفع کریں بی جی۔ کچھ عورتیں عزت اور محبت پر آسائشوں کو ترجیح دیتی ہیں۔ ہماری بھابھی بھی ایسی ہی عورت تھی۔ ورنہ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ ویر جی اسے کتنا چاہتے تھے۔ اس کے جانے کے بعد ویر جی نے ہمارے سمجھانے کے باوجود دوسری شادی نہیں کی۔" پروین تاسف سے کہہ رہی تھی۔

"اپنی جدائی کا روگ جو لگا گئی میرے پتر کو' اب اس کی اولاد چھین کر دوسرا روگ لگانا چاہتی ہے۔ پر تو مجھ سے لکھوا کر رکھ لے یہ بات۔ چاہے مجھے اس کی کھوپڑی میں ہی کیوں نہ سوراخ کرنا پڑے' گزاروں گی' لیکن اپنے پتر کے سینے پر دوجہ زخم نہیں لگنے دوں گی' ہاں!" بی جی کے پنجابی خون نے بھی جوش مارا تھا۔

"آپ نے سوچا کیا ہے بی جی۔" پروین بی جی کی دھمکی سن کر پریشانی سے پوچھنے لگی۔

"ارے تو پریشان نہ ہو۔ سر تو اس کا تب پھاڑوں گی۔ جب کوئی اور راستہ نظر نہ آیا۔ ابھی تو میں سوچ رہی ہوں کہ جتنی جلدی ممکن ہو' اپنی جاسمین کی شادی کردوں۔"

"لیکن بی جی ایسا کیسے ہوسکتا۔"

"کیوں ایسا کیوں نہیں ہوسکتا۔ مت بھول میری بچی کہ تو پاکستان میں رہتی ہے اور جہاں سب ممکن نا ممکن ہوسکتا ہے۔" بی جی اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولیں۔

"میرا یہ مطلب نہیں ہے بی جی۔ میں تو آپ کو یہ یاد دلا رہی ہوں کہ جاسمین کی ایک ہی شرط ہے کہ وہ ڈاکٹر بنے بغیر شادی کسی صورت نہیں کرے گی۔" پروین نے بھتیجی کی شرط یاد دلائی تھی۔

"ارے اگر اس کی شرط پوری کرنے کا انتظار کرتی رہی تو میرے ہاتھوں سے نکل کر سیدھی ماں کے ہاتھوں میں پہنچے گی اور میں نہیں چاہتی اس بے وقوف پر اس بدبخت عورت کا سایہ بھی پڑے۔"

"جاسمین نے کچھ کہا ہے۔" پروین نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"کہنا کیا ہے اس نے۔ مگر مجھے لگتا ہے۔ اگر اس کی ماں نے دو مگرمچھ کے آنسو اس کے سامنے بہائے تو

بوڑھی بی جی سے جان چھڑانے میں لمحہ نہیں لگائے گی۔ ویسے ہی اس کی ہر بات ماں کے ذکر پر ختم ہوتی ہے۔ ابھی کل مجھ سے کہہ رہی تھی بی جی! آپ بھی ہمیں سیر کروانے نہیں لے کر گئیں۔ اگر ہماری ماں ہوتی تو کبھی وہ ہم پر اتنی سختی نہ کرتی اور نہ ہمیں اس پنجرے میں قید کرتی۔ دل تو چاہا اس کی ماں کے کرتوت اسے بتادوں۔ پھر سوچا اس کرموں جلی کے کرتوتوں کو بتا کر اپنی پوتری کا دل دکھی کیوں کروں۔ آخر کو ہے تو ان کی ماں ہی نا اور انہیں یاد نہ آئے' یہ تو ہو نہیں سکتا۔ ماں کو بھولنا آسان کب ہوتا ہے۔ سچ پوچھیں تو اس ڈر سے جاسمین کی شادی جلد کررہی ہوں کہ کہیں ماں کی محبت کا پلڑا بی جی کی محبت اور سختی کے برابر میں جھک نہ جائے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ وہ میری پوتریوں کو خوش نہیں رکھ پائے گی۔" بی جی کی بھوری آنکھوں میں آنسو اتر آئے تھے۔ جب سے نسرین کا فون آیا تھا۔ بی جی کے آنسو تو یوں ہی ہر دو منٹ بعد چھلک رہے تھے۔

"آپ پریشان مت ہوں بی جی۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" پروین نے ماں کے لہجے کی نمی محسوس کرکے تسلی دینے والے انداز میں کہا تھا۔ پھر اچانک کچھ یاد آنے پر بولی "اور ہاں بی جی' آپ کو بتایا تھا نہ کہ ہاشم اپنی میڈیکل کی پڑھائی امریکا سے مکمل کرکے آرہا ہے۔"

"ہاں تو کیا اب نہیں آرہا۔ میں نے تو تجھے پہلے ہی کہا تھا۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں اسے پڑھنے بھیج دو مگر موئے امریکا مت بھیجنا۔ موا دہشت گردی خود کرتا ہے اور پھر نام لگاتا ہے ہم مسلمانوں پر۔" پھر ذرا رازداری سے پوچھنے والے انداز میں بولیں۔ "میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ یہ پاکستانیوں کے ساتھ گوری میمیں اس لیے بھیجتا ہے کہ وہ پاکستان کے نقشے بنا کر امریکا بھیجیں۔ تاکہ جہاں چار لوگ بیٹھ کر چائے پی رہے ہوں۔ وہ وہاں بم مار سکے۔ میں نے تو نوازش اور جلا مت سے کہہ دیا ہے کہ وہ ڈیرے' پر چار' آٹھ [illegible] جمع مت ہونے دیا کریں۔ کیا پتا موا (امریکا) ڈیرے پر بم مار کر ہماری فصلیں اور نسلیں سب تباہ کردے۔" بی جی اپنے بھولے پن سے فکر مندی سے بولیں۔

ویسے بھی جب سے ڈراؤن حملے شروع ہوئے تھے۔ بی جی کو ہر لڑائی' ہر فساد کی جڑ امریکا ہی لگتا تھا۔ حالانکہ ایک دن دادا جان کو گھر واپس آنے میں دیر ہوگئی تھی تو دادی نے روتے ہوئے امریکا پر الزام لگانے شروع کردیے تھے کہ وہ ڈاکٹر عافیہ کی طرح دادا جان کو جہاز میں ڈال کر لے گئے ہیں۔ وہ تو جب دادا جان نے یقین دلایا آکر کہ وہ سمندر کی سیر کو چلے گئے تھے تو دادی نے امریکا پر الزام لگانے بند کیے تھے۔

"اف فوہ بی جی! آپ نا' بات پوری نہیں سنتیں اور مطلب نکال لیتی ہیں۔ میں کہہ رہی ہوں کہ اسے یہاں کے مشہور اسپتال میں جاب مل گئی ہے اور وہ کل ہمیشہ کے لیے پاکستان آجائے گا۔ پھر میں اسے لے کر آؤں گی۔ وقاص کا بھی آپ سب سے ملنے کا بڑا دل کررہا تھا۔" پروین نے مسکراتے ہوئے خوشی سے بتایا۔

"بھئی یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ میں تو خود نواسے سے ملنا چاہتی ہوں اور وقاص (پروین کا شوہر) میاں سے کہنا کہ جم جم آئیں۔ بی جی کا دل اور دروازے اپنے بچوں کے لیے ہمیشہ کھلے ہیں۔" بی جی تو جیسے پروین کی باتوں پر نہال ہوگئی تھیں۔ پھر ایک دو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد پروین نے فون رکھ دیا تھا۔ بی جی نے آواز دے کر لڑکیوں کو ہاشم کے جاب لگنے اور آنے کے متعلق بتایا تھا اور پھر رشتہ کروانے والی کو فون کرنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

جاسمین کو جب اپنے لیے رشتہ ڈھونڈنے والی بات کا پتا چلا تو اس نے خوب رونا دھونا مچایا اور یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اس کے آنسوؤں نے بی جی پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ بڑے زور و شور سے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی تھیں اور جب ابو جی اور دادا ابا نے بھی بی جی کے عمل کو درست ٹھہرایا تو جاسمین نے اپنے زور بازو

پر رشتے کی نہ طے پانے کی کوششیں شروع کریں۔ تب ہی جب ایک دو رشتے بالکل اوکے ہونے کے قریب تر تھے۔ اس نے بی جی کی غیر موجودگی میں کچھ ایسی عجیب و غریب حرکتیں کی کہ رشتے والے سر پر پیر رکھ کر بھاگے اور بی جی ان کے پھر کبھی واپس نہ آنے پر حیران ہوتی رہیں۔ ڈیڑھ مہینے میں چھ رشتے تھے جو دیکھے جاچکے تھے اور ساتواں رشتہ لے کر ماسی مہمانوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں موجود تھی اور دونوں پارٹیوں کو بات کرنے کا موقع دے کر خود کھانے سے بھرپور انصاف کررہی تھی۔

مہمانوں کے لڑکی بلانے کا کہنے پر بی جی اسے بھی کھینچ تان کر لے آئی تھیں اور اب اپنے ساتھ بٹھائے بلکہ باندھے ہوئے بیٹھی تھیں۔ کیونکہ بی جی نے بڑی مہارت سے اس کا بازو دبوچ رکھا تھا۔ جیسے وہ بھاگی جارہی ہو۔

"ایک تو لڑکی ڈاکٹر بننے والی ہے اور اوپر سے سوہنی دی رج کے۔ یہ تو سونے پہ سہاگے والی بات ہوئی۔ واہ جی واہ۔" گہرے جامنی رنگ کی شلوار قمیص پر گہری لال لپ اسٹک لگائے۔ شیر بلند خان کی ماں نے واری صدقے ہونے والی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی نظر اتاری۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اپنی تعریف پر گوبھی کے پھول کی طرح پھیل جاتی۔ مگر اس وقت تو اس کی تعریف بے وقت کے دھرنوں سے بھی زیادہ بری لگی تھی۔ تب ہی اس نے باقاعدہ آنکھیں نکال کر کہنے والی کو گھورا۔

"ہائے... ہائے... بلند خان کے ابا۔ دیکھو آنکھیں بھی کتنی بڑی' بالکل اس ٹی وی والی لڑکی جیسی' جسے اپنا شیر بلند خان بڑا پسند کرتا ہے۔" بڑی بی تو اس پر بری طرح فریفتہ ہوگئی تھیں۔

"ہے کیا... آپ کا لڑکا کسی ٹی وی والی کو پسند کرتا ہے۔" خاموش اور پرسکون بیٹھی بی جی ایک دم فکرمندی سے پوچھنے لگی تھیں۔

"ارے نہیں بہن جی... فلمیں دیکھنا پسند کرتا ہے' لڑکی کو نہیں۔" دھوتی اور سفید کرتے پر بوسکی چادر کی بکل مارے' شیر بلند خان کے ابا نے بیوی کو ایک گھوری سے نوازتے ہوئے جلدی جلدی وضاحت کی۔

"ہاں بھئی... فلمیں دیکھنا کوئی اتنی بری بات نہیں ہے۔ میں اور تمہاری بی جی تو خود جوانی میں وحید مراد اور رانی کی فلمیں گھر والوں سے چھپ کر سینما میں دیکھنے جاتے تھے۔ آپ کو پتا ہے بیگم ایک بار کیا ہوا تھا جب ہم..."

"چوہدری جی! اس وقت آپ اپنے پوتروں' پوتریوں کے ساتھ نہیں بیٹھے' بلکہ پوتری کے ہونے والے سسرالیوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔" بی جی جو پہلے ہی ان کے مہمانوں کے سامنے اپنی اور بے جی کی جوانی کا ذکر کرنے پر پانی پانی ہو رہی تھیں۔ ان کو مزید کسی گل فشانی کی طرف بڑھتے دیکھ کر' دانت پیس کر بظاہر مسکراتے ہوئے بولی تھیں اور چوہدری جی بھی باقی کا قصہ منہ میں دبا کر بدمزا ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

"کہنے دیجیے بی جی... کتنی میٹھی باتیں کرتے ہیں چوہدری جی!" بڑی بی کو یقیناً" پوری کہانی سننے کا شوق ہوا تھا۔ تب ہی مسکرا کر بولیں۔

"نہ جی کیا میں نے کبھی کوئی میٹھی بات نہیں کی؟" شیر بلند خان کے ابا جی کو بیوی کی کسی دوسرے کی تعریف سخت ناگوار گزری تھی۔ جبکہ چوہدری جی نے ایک ترنگ سے بالوں میں اسٹائل سے ہاتھ چلایا تھا۔

"آپ تو برا مان گئے میاں جی..." بڑی بی نے جلدی سے کہا۔ "جو بات کرنے آئے ہیں' وہ کریں آپ۔" بڑے میاں ابھی تک منہ بنائے ہوئے تھے۔

"جی جی... ضرور بتائیے اور کیا بات ہے۔" بی جی نے اس کی کلائی پر کمزور پڑتی گرفت کو ایک مرتبہ پھر سختی سے پکڑا یوں کہ جاسمین کے منہ سے بے ساختہ ہائے نکلا۔

"ارے کیا ہوا میری بیٹی کو۔" بڑی بی کا انداز ایسا فکرمندی لیے ہوئے تھا۔ جیسے الیکشن کے دنوں میں عوام کے ساتھ سیاست دانوں کا ہوتا ہے۔

"کچھ نہیں' وہ میرے ہاتھ کے نیچے اس کا ہاتھ آگیا

تھا۔" بی جی نے فوراً" گھبرا کر وضاحت کی کہ کہیں وہ نہ کچھ بک دے۔

"بیٹا اتنی چھوٹی چھوٹی تکلیف پر نہیں چلاتے' ابھی تو آپ کو بہت کچھ کرنا ہے۔" شیر بلند خان کے والد نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"مثلاً" کیا۔" جاسمین نے گھبرا کر پوچھا۔ کیونکہ انہوں نے کچھ اس انداز میں کہا تھا کہ اسے خطرے کی گھنٹی دور تک سنائی دی تھی۔

"بھئی جب میری اپنی بہو ڈاکٹر بن جائے گی تو پھر اپنے شیدو' اللہ رکھا اور مادھوری وغیرہ کو حفاظتی ٹیکے تم سے ہی لگواؤں گا۔"

"یہ سب آپ کے بچے ہیں۔" جاسمین اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اطمینان سے بولی۔ حیرت اس لیے تھی کہ بی جی اور دادا جی کی عمر کے کپل کے بچے اتنے چھوٹے ہیں کہ انہیں حفاظتی ٹیکوں کی ضرورت ہے۔

"ارے نہیں بیٹا جی! مادھوری تو میری بکری کا نام ہے' اللہ رکھا مینڈھے کا اور شیدو میرے شکاری کتے کا نام ہے۔" فوراً" خوش دلی سے وضاحت کی گئی' جبکہ جاسمین کی آنکھیں بے یقینی سے ابل پڑیں۔

"میں جانوروں کی نہیں انسانوں کی ڈاکٹر بننے والی ہوں۔" اس نے مسکین سی صورت بنا کر روٹھے لہجے میں کہا۔ اب میں اتنی بری ڈاکٹر بھی نہیں ہوں کہ انسانوں کی بجائے جانوروں کا علاج کرنے لگوں۔ اس نے کوفت سے سوچا۔

"ہم جانتے ہیں بیٹا' لیکن جب گھر میں ڈاکٹر ہو گا تو باہر سے جانوروں کے ٹیکے لگواتا میں اچھا لگوں گا کیا؟"

"مگر میں نے تو سنا ہے شیر بلند خان شادی کے بعد شہر میں رہے گا۔" اس نے شکوہ کرتی نظر بی جی پر ڈال کر بھرائے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں پتر' رہو گی تو شہر میں ہی' مگر میں شیر بلند خان سے کہہ دوں گا کہ وہ ہر مہینے کی دس تاریخ کو تمہیں گاؤں لے آیا کرے۔ تاکہ اپنے جانوروں کو اپنی ہی بہو کے ہاتھوں سے حفاظتی ٹیکے لگائیں۔" ہونے والے سسر صاحب تو ابھی سے ڈاکٹر' بہو سے کام لینے کے تمام منصوبے ترتیب دے چکے تھے۔

"واقعی شیر بلند خان کے ابو جی۔ جب ہماری ڈاکٹرنی بہو آئے گی تو قسم سے شریکوں کے' سینے پر تو سانپ لوٹ گے اور مجھے تو ابھی سے ڈر لگ رہا ہے کہ آپ کی بہن میری بہو' بیٹے پر کوئی تعویذ گنڈا نہ کروا دے۔ وہ تو ویسے ہی ایسے کاموں میں ماہر ہے۔ ہم بھی کسی خاص بابے کو پکڑتے ہیں' جو آپ کی بہن کے تعویذوں کا توڑ کر سکے۔ کہیں ایسا نہ ہو ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور وہ کام کر جائے اور ادھر ہماری بہو' بیٹا گھر کے اندر قدم رکھیں اور ادھر ہمارے شیر بلند خان کا پیر پھسلے اور ساتھ ہی بہو بیگم گر کر ٹانگ تڑوا لے۔" بڑی بی نے تو تصور میں ہی تعویذوں کے اثر سے بہو بیگم کی ٹانگ ٹوٹتے ہوئے بھی دیکھ لی تھی۔

"اللہ نہ کرے میری بچی کو کچھ ہو۔" بی جی نے فوراً" اسے اپنے ساتھ چپکا لیا۔ اس نے بھی خوف سے جھرجھری لی۔

"ہیں نا ساس۔۔۔ تب ہی تو بیٹے کے پیر پھسلنے پر بہو کی ٹانگ ہی ٹوٹی دیکھ رہی ہے۔ ہونہہ۔۔۔" اس نے کوفت سے سوچا۔

"یوں ہی نہ میری بہن کے پیچھے پڑی رہا کرو۔" سسر محترم نے جاسمین اور بی جی کے چہرے پر خوف دیکھ کر بیوی کو گھر کا۔ وہ شوہر کو نند کی حمایت کرتے دیکھ کر منہ بنا کر رہ گئیں۔

"دیکھیں۔۔۔ ہمیں آپ کی بچی بہت پسند آئی ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو جائے' مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ لڑکی' لڑکا ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔ کیونکہ زندگی تو انہیں ہی گزارنی ہے۔" سسر محترم نے نہایت شائستہ انداز میں اپنا مدعا بیان کیا۔ بی جی کو لڑکے' لڑکی کے ایک دوسرے کو دیکھنے والی بات ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہیں چوہدری جی بول پڑے تھے۔

"ہاں بھئی کیوں نہیں۔ آپ جب چاہے شیر بلند خان کو ادھر بھیج دیں۔ اب ہر کوئی ہمارے جیسا تو نہیں

ہے کہ ماں، باپ نے جس کھونٹے سے باندھ دیا، وہیں ساری عمر گزار دی۔ آہ۔" چوہدری جی نے کہتے ہوئے باقاعدہ آہ بھری۔

"تو ٹھیک ہے، پھر کل یا پرسوں، ہم شیر بلند خان کو ادھر بھیج دیں گے۔ یقیناً" اسے بھی ہماری طرح جراثیم پسند آئے گی۔" بڑی بی کھڑے ہوتے ہوئے خوش دلی سے بولیں اور آگے بڑھ کر جاسمین کی چہرہ پیچھے کرنے کی تمام کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے اپنی آدھا کلو سرخ سرخی اس کے ماتھے پر بوسہ دینے کے دوران لگادی۔

"یہ جراثیم کون ہے۔" دروازے کی اوٹ سے جھانکتی روبی نے اپنے دائیں بائیں کھڑی زینب اور زیبی کو حیرت سے دیکھا۔ دونوں نے ہونق پن سے کندھے اچکادیے۔

"لو جراثیم بیٹا۔ پورے چار، پانچ سو کے نوٹ ہیں، گن کر اپنی بی جی کو پکڑا دینا۔" سسر محترم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیسے اس کی مٹھی میں دبائے "اور ہاں پتر یاد سے بی جی کو پکڑا دینا۔ کہیں گم ہی نہ کردینا۔ پوری زندگی میں پہلی بار کسی کو اتنا شگن دیا ہے۔" جاتے جاتے بھی تاکید ہوئی، جبکہ جاسمین پہلے اپنی ڈاکٹر اور اب اپنا نام بگڑاتے دیکھ کر بے ہوش ہونے کے قریب ہوگئی تھی۔ باہر کھڑی تینوں مہمانوں کو باہر آتا دیکھ کر اور جاسمین کو جراثیم کہتے دیکھ کر اپنی ہنسی دبانے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھے اپنے کمرے کی طرف کھسک گئی تھیں، کیونکہ بی جی نے انہیں ادھر آنے سے سختی سے منع کیا ہوا تھا۔

"ارے جن لوگوں کو میرا نام لینا تک نہیں آتا، میں ان کے ساتھ کیسے رہوں گی۔ جاسمین کچھ کرو، ورنہ ساری عمر کتوں کو ہی حفاظتی ٹیکے لگاتی رہے گی۔" اس نے سوچا تھا۔

"آنٹی جی! ہم نے آپ کو بتایا نہیں کہ مجھے ملیریا ہے۔" اس نے دادا، دادی، بی جی کو شیر بلند خان کے والد محترم سے کوئی بات کرتے دیکھ کر چپکے سے "بڑی بی" کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"ارے بیٹا۔ مجھے ان پڑھ کو کیا پتا کہ یہ ملیریا کیا بلا ہے۔ یقیناً" کوئی ڈاکٹری کی بڑی ڈگری ہوگی، ہے نا۔" بڑی بی معصومیت سے بولیں۔

"لو بھئی انہیں تو بیماریوں کے نام کا بھی نہیں پتا۔" اس نے جھنجلاتے ہوئے سوچا۔ اس سے پہلے کہ وہ ملیریا کی وضاحت کرتی، بی جی اس طرف متوجہ ہوگئی تھیں اور پھر جب تک وہ دروازے سے باہر نہیں نکل گئے، بی جی ان کے ساتھ ہی چمٹی رہی تھیں۔ یوں کہ وہ اپنے کسی بھی منصوبے پر عمل نہیں کرپائی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ارے یار۔ کوئی ایسا مشورہ دو کہ شیر بلند خان مجھے دیکھنے کے ساتھ ہی انکار کردے، کیونکہ یہ تو طے ہے کہ میں ڈاکٹر بنے بغیر خودکشی تو کرسکتی ہوں۔ مگر کسی شیر بلند خان یا نذیر ولد قدیر خان سے شادی نہیں کرسکتی۔" وہ غصے سے کھولتے ہوئے ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی۔

"تمہاری یہ دھمکیاں زیادہ سنگین نہیں ہیں اور یہ بات اچھی طرح ذہن میں بٹھالو کہ بی جی جو سوچ رہی ہیں وہ کرکے رہیں گی۔ رابعہ عرف رابی نے اس کی مسلسل دھمکیوں سے عاجز آکر کہا تھا۔

"تو تمہارا کیا مطلب ہے۔ چپ چاپ شادی کرلوں اور وہ جو بچپن سے آج تک "ڈاکٹرنی باجی" بننے کا سپنا سجایا ہے، وہ کسی شیر بلند خان کے بچے پالنے پر لٹادوں۔" وہ دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے، خونخوار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے غصہ ہوئی۔

"یہ تو بہت غلط کررہی ہیں بی جی۔ وہ ہرگز میری اکلوتی ایک سال بڑی بہن کے ساتھ ایسا نہیں کرسکتیں۔" زینب عرف زینی افسردہ سی شکل بناتے ہوئے روہانسی ہوئی۔ "مان لیا کہ بی جی جاسوں کی عمر میں دو بچوں کی ماں بن گئی تھیں، مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ جاسوں کی شادی کسی بچوں کے باپ سے کردیں۔ پھر رابی تو جاسوں سے بھی چھ ماہ بڑی ہیں، ان کی شادی تین بچوں کے باپ سے کردیں گی۔" زینی

بست دکھی ہو رہی تھی۔

"نہیں۔ یہ تمہیں کس نے بتایا کہ شیر بلند خان کے بچے بھی ہیں۔" وہ سب ہونق پن سے زینی کو دیکھنے لگیں۔

"دیکھا بی جی، کتنا ظلم کر رہی ہیں میرے ساتھ۔" جاسوں باقاعدہ رونے لگی تھی۔ بچوں والی بات تو خود اسے ابھی معلوم ہوئی تھی۔

"تمہیں رونے کی ضرورت نہیں ہے جاسوں۔ ہم سب ہے نا۔ تمہارے ساتھ کچھ غلط نہیں ہونے دیں گے۔ خواہ ہمیں جان دینی پڑے یا شیر بلند خان کی جان لینی پڑے۔ بھئی اگر بی جی کو ابھی نہیں روکا تو کل ہماری باری بھی آنی ہے۔" زیب النساء عرف زیبی کو ابھی سے اپنی فکر ستانے لگی تھی۔

"تو اور کیا۔" زینی نے ہمیشہ کی طرح زیبی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "بتاؤ نا تمہیں کیسے پتا چلا۔" روبی جواب جاننے کی جلدی میں تھی۔ "کیا۔" زینی نے ہونق پن سے اسے دیکھا۔

"اوہو بھئی۔ یہی کہ شیر بلند خان کے بچے بھی ہیں۔" روبی نے بے زاری سے وضاحت کرنے لگی۔

"ابھی تو جاسوں نے بتایا کہ وہ کسی شیر بلند خان کے بچوں کو پالنے میں اپنا پسینہ نہیں لوٹا سکتی۔ اس کی معصومیت سیاست کی طرح عروج پر تھی اور باقی سب نے پہلے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر دانت پیس کر رہ گئیں۔

"میری پیاری بہن! جب کوئی سنجیدہ مسئلہ زیر بحث ہو تو تم بس اتنی مدد کیا کرو کہ خاموش رہا کرو۔" جاسوں نے اسے دانت پیس کر بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے منت کی تھی۔

"مجھے تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں نے کیا غلطی کی ہے۔ جو وہ میری چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی بات کر رہی ہیں۔ حالانکہ ڈیڑھ ماہ پہلے تک تو ان کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" جاسوں کی سوئی پھر بی جی اور شادی پر اٹکی تھی۔

"واقعی اگر بات چوہدری ہاؤس کی لڑکیوں کی شادیوں کی ہوتی تو یقیناً" پہلے میری ہوتی۔ کیونکہ چھ ماہ ہی سہی تم سے بڑی ہوں۔ یقیناً" بات کچھ ایسی ہے جو بی جی ہم سے چھپا رہی ہیں۔" روبی نے اپنی انگلیوں کو گال پر تھپتھپاتے ہوئے پرسوچ انداز میں کہا۔

"ارے اندازے لگانا چھوڑ دو اور یہ سوچو کہ شیر بلند خان کو کیسے بھگائیں۔" جاسوں نے فکرمندی سے کہا "ایسا کرتے ہے کہ گھر میں آنے والے ہر نئے لڑکے کو گیٹ سے ہی ٹرخا دیتے ہیں۔" روبی نے کہا۔

"دادا جان اور دانش اور رامش تو گھر آسکتے ہیں نا۔ پلیز! انہیں آنے دینا بے چارے کیا باہر سردی میں رہیں گے۔" زینی کو چوہدری ہاؤس کے مردوں کی فکر ہوئی۔

"کہا بس خاموش رہو۔" جاسوں نے بڑی بہن ہونے کا رعب جھاڑا وہ منہ بنا کر بیٹھ گئی۔ بلکہ باقاعدہ منہ پر انگلی بھی رکھ لی۔

"مگر پتا کیسے چلے گا کہ گیٹ پر کوئی نیا آیا ہے۔" زیبی نے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ تم اور زینی پڑھنے کے بہانے چھت پر آنے جانے والے پر نظر رکھو گی اور جیسے ہی کوئی اجنبی نظر آئے۔ ہمیں بتانا باقی ہم پر چھوڑ دو۔" روبی پرسوچ نظروں سے جاسوں کو دیکھنے لگی۔ جاسوں اس کی نظروں کے مفہوم کو سمجھتی تھی۔ تب ہی مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

"چوہدری جی! جاسمین کی اتری شکل دیکھ کر مجھے بڑا ملال ہوتا ہے اگر اس بندر کے منہ والی کا خوف نہ ہوتا کہ وہ میری جاسوں کو پٹیاں پڑھا کر مجھ سے اور میرے پتر سے دور کردے گی تو کبھی یوں اپنی بچی کی مرضی کے بغیر شادی نہ کروانے کی کوشش کرتی۔ ہائے۔ کیڈا شوق تھا۔ مجھے اسے ڈاکٹر بنے دیکھنے کا۔ پر جو سوہنے کو منظور۔" بی جی نے دلگرفتی سے کہتے ہوئے۔ اوپر کی طرف دیکھا اور قمیص میں بٹن لگانے لگیں۔

"سب قسمت کے کھیل ہیں بیگم۔" چوہدری جی نے شیشے میں سے خود کو بغور دیکھتے ہوئے کہا اور نظر آتے سفید بال رنگنے لگے۔ "اب قسمت کے سامنے

کس کی چلتی ہے۔ مجھے ہی دیکھ لو' کتنا شوق تھا دوسری شادی کا۔ مگر ہائے ری قسمت۔ نہ اوپر والے نے تیرا اوپر کا ویزا بھیجا اور نہ تو نے مجھے گوریوں کے دیس جانے کی اجازت دی۔ کتنا شوق تھا کوئی گوری میری بیوی بنے۔"

"ہاں تو چلے جاتے گوریوں کے دیس کس نے تمہیں روکا تھا۔ میں نے تو تمہیں اجازت دے دی تھی۔ ویسے بھی میں کون ہوتی ہوں' تمہیں روکنے والی۔" بی جی اتنی سنجیدہ بات کے جواب میں دادا کی فضول گوئی سے چڑ سی گئی تھیں۔ "اور یہ بات مجھ سے لکھوا کر رکھ لو تم سے پہلے کبھی اوپر جانے والی نہیں ہوں۔ ہر نماز کے بعد یہی دعا کرتی ہوں کہ اللہ دونوں کو ایک ساتھ ہی اٹھائے۔" بی جی نے ساتھ جتا بھی دیا تھا کہ وہ اکیلی یا پہلے جانے والی نہیں ہیں۔

"لو جی۔ عورتیں اپنے سر کے تاج کی لمبی عمر کی دعائیں مانگتے نہیں تھکتیں۔ ایک ہمارے والی ہے۔ پر کسی کو بھی کیا دوش دوں۔ جو بویا ہے وہی کاٹ رہا ہوں۔ اگر امی ابے کی بات مان لیتا تو دو بیویاں ہوتیں ایک امی کی پسند یعنی خالہ کی بیٹی اور دوسری ابے کی پسند یعنی چچا کی بیٹی۔ مگر میرا دل لٹو بھی ہوا تو اس پر۔" دادا جان ہمیشہ یونہی بی جی کو پریشان دیکھ کر اپنی باتوں میں الجھا لیا کرتے تھے۔ ابھی بھی مقصد یہی تھا۔ جس وہ خوب کامیاب ہو رہے تھے۔

"پتا ہے۔ مجھے۔ اب میرا زیادہ منہ مت کھلوانا چوہدری جی۔ ورنہ کوئی گستاخی کر جاؤں گی۔" بی جی نے غصے سے ان کی قمیص وہیں پھینکی اور اٹھ کر چارپائی کے نیچے سے چپل تلاش کرنے لگیں۔

"کیا پتا ہے تمہیں ذرا مجھے بھی پتا چلے۔" چوہدری جی بھی شیشہ اور کنگھا نیچے رکھ کر متوجہ ہوئے۔ رامش اور دانش نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور مسکرا کر کتابیں کھول لیں۔

"یہی کہ تمہاری خالہ کی بیٹی لنگڑی تھی اور چچا کی کانی۔" بی جی نے جھک چارپائی کے نیچے سے جوتی نکالی اور زور سے پیروں میں پٹخی۔

"تو پھر کیا ہوا۔" دادا جان کھسیانے سے ہو گئے۔

"اور تمہیں بھی جانتا ہوں۔ جو تم نے مجھے امریکہ جانے کی اجازت دی تھی۔ جانتے ہو بچوں کیا ہوا تھا؟" دادا جان نے لڑکوں کو متوجہ کیا۔ دادی بھی جاتے جاتے رک گئیں کہ نہ جانے کیا گل فشانی کر دیں۔ بچوں کے سامنے۔ "مجھے امریکہ جانے کی اجازت دینے کے بعد میری اماں جی اور تم لوگوں کی پردادی کے کان میں کہہ گئی کہ اماں جی۔ اگر آپ کا بیٹا امریکہ گیا تو میں "بش" کو فون کر کے کہہ دوں گی کہ یہ اسامہ کا ساتھی ہے اور اسامہ بن لادن اس کی اماں کے پاس چھپا ہوا ہے۔ اب خود ہی سوچو۔ مرتے دم تک میری اماں نے مجھے امریکہ جانے کا نام تک نہیں لینے دیا۔" دادا جان کو امریکہ نہ جانے کا بڑا قلق تھا۔ لڑکے دونوں ہنسنے لگے۔

"واقعی یہ تو بڑا برا کیا بی جی نے۔" رامش نے کہا۔

"توبہ ہے۔ تمہاری اماں کے پیٹ میں کوئی بات چھپتی نہیں تھی۔" بی جی کھسیانی سی ہو کر بولیں۔ اب انہیں یہ کیا بتاتیں کہ یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر کسی کو بتایا تو کہہ دوں گی کہ اسامہ اسی کا بیٹا ہے۔ تب ہی تو اماں جی نے آخری وقت میں ہی یہ سچ بیٹے کو بتایا تھا۔ پہلے کہاں ہمت ہوئی تھی۔ "اور تم دونوں کیا یہاں دانت نکال رہے ہو۔ جاؤ۔ دیکھو۔ چھوٹی دونوں کیا صبح سے چھت پر کر رہی ہیں۔" بی جی کو اچانک چھوٹی زیبی اور زینی کا خیال آیا تھا۔ جو صبح سے چھت پر کھڑی ہر آنے جانے والے پر نظر رکھے ہوئے تھیں۔

"جی بی جی۔" وہ دونوں بی جی کو غصے میں دیکھ کر کھسک گئے۔

"اب تم کہاں چلیں، میری قمیص میں بٹن تو لگا دو۔" دادا جان انہیں قمیص ایسے ہی چھوڑے جاتے دیکھ کر بولے۔

"آج سے میں تمہارا کوئی کام نہیں کروں گی۔"

"میں پھر اپنے کام کروانے کے لیے دوسری شادی کر لوں گا۔" دادا نے دھمکی دی۔

"میاں چاہو تو تیسری بھی کر لو۔ اجازت دی۔" بی

بی ایسی اجازت ہر دوسرے، تیسرے ماہ دیتی رہتی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ اب تب ہی گھر واپس آؤں گا۔ جب ساتھ دوسری بیوی ہوگی۔" دادا جان غصے سے کھولتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی بحث مذاق میں ہو یا غصے میں اسی مکالموں پر ختم ہوتی تھی۔ پہلے پہل تو بی جی۔ ان کے جاتے ہی چاقو تیز کرنے کے لیے بیٹھ جاتی تھیں۔ اور کبھی پیٹرول اور ماچس ہاتھ میں پکڑے گیٹ کے چکر کاٹتی رہتیں اور اگر ابا جی یا تایا جی گھر ہوتے تو وہ ہنستے ہوئے کہتے "بی جی۔ بیٹھ جائیں۔ ابھی حکومت غریبوں میں زکوۃ وغیرہ مفت بانٹتی ہے عاشق مزاجوں کے لیے عورتیں بانٹنے کا رواج ابھی پاکستان میں نہیں آیا۔ تسلی رکھیں۔ ابا جی کو اگر مفت میں بھی دوسری بیوی ملے گی تو وہ نہیں لیں گے۔ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

مگر بی جی کھولتے ہوئے۔ ایک ہی رٹ لگائے رکھتیں "اگر دوسری شادی تمہارے ابا نے کرلی تو مانو پیٹرول چھڑک کر پہلے اس سوکن کو آگ لگاؤں گی اور پھر خود کو۔ تاکہ بڈھا ساری عمر رنڈوا ہی رہے۔" بی جی کی دھمکیوں سے وہ سب مسکراتے رہتے لیکن جب ہر بار چوہدری جی تنہا کھسیانے سے ہو کر واپس آتے تو بی جی کو سکون کے ساتھ یقین بھی آگیا کہ یہ محض چوہدری جی کی باتیں ہی ہیں۔ جنہیں ہوائیاں چھوڑنے کی عادت تھی اور کچھ نہیں۔"

☼ ☼ ☼

صبح سے ایک بھی بندہ گلی میں سے ایسا نہیں گزرا جسے دیکھ شیر بلند خان کا خیال آتا اور ہمارے گھر میں تو کوئی بندہ بھی نہیں آیا۔ زینی نے رات کو انہیں تفصیل سے جواب دیا۔

"چلو آج نہیں تو کل ضرور آئے گا۔" جاسمین نے پرسوچ چہرے کے ساتھ کہا۔

"اس بات کا بھی ہمیں دھیان رکھنا ہوگا۔ پھوپھو کا لاڈلا بیٹا بھی چوہدری ہاؤس میں آنے والا ہے۔" ربی نے نائٹ کریم لگاتے ہوئے کہا۔

"فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جب بھی آئے گا پھوپھو ساتھ ہی ہوں گی۔" جاسمین نے کہا۔

"کتنا مزا آئے گا نا۔ جب پھوپھو لوگ آئیں گے۔" زینی اپنا چشمہ اتار کر رکھتے ہوئے خوش دلی سے بولی۔ جاسمین نے اس کو یوں خوش ہوتا دیکھ کر ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"ویسے کیا خیال ہے۔ دادا جان کی خدمت نہ لی جائے۔" زینی نے ان سب کی طرف دیکھا۔

"سب سے پہلے ان کی ہی مدد لینے کی کوشش تھی۔ مگر انہوں نے کہا۔ بیٹا جی۔ تمہاری بی جی آپ کے لیے کچھ غلط نہیں کریں گی۔" جاسمین نے افسردہ سی شکل بناتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلو۔ اب سوتے ہیں۔ صبح جلدی اٹھنا ہوگا۔ کیا پتا شیر بلند خان مرغے کی بانگ کے ساتھ ہی چلے آئیں۔ گاؤں والے تو ایسے ہی آتے جاتے ہیں۔"

"ہاں۔ چلو بھئی سوئیں۔" سب ہی اپنے بستر پر لیٹ گئیں اور شاید سو بھی گئی تھیں۔ مگر وہ یونہی کروٹ پر کروٹ بدلتی رہی تھی۔ رات کا نہ جانے کونسا پہر تھا۔ جب بی جی ان کے کمرے میں آئی تھیں۔ اس نے حیرت سے انہیں دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔

"معاف کرنا دھی رانی۔ مجبوری ہے۔ ورنہ کیا مجھے نہیں پتا کہ تجھے بچپن سے ہی ڈاکٹرنی جی کہلانے کا کتنا شوق ہے۔ بس میری بچی میں تجھے کھونا نہیں چاہتی۔" بی جی نے اس کے بالوں میں چند لمحے ہاتھ پھیرا تھا اور ماتھے پر بوسہ دے کر اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ جاسوں نے اپنے گال پر چپ چپ محسوس کر کے ہاتھ پھیرا وہ یقیناً بی جی کے آنسو تھے۔ جو بوسہ دینے کے دوران اس کے گال پر گرے تھے۔ وہ بی جی کی باتوں پر کتنی ہی دیر گم سم سی لیٹی رہی تھی۔

"شاید بی جی آپ کو میری طرف سے کچھ بے اعتباری ہے۔ ایک بار اس شیر بلند خان سے پیچھا چھڑالوں۔ آپ سے اس بے اعتباری کی وجہ پوچھ کر

اسے ضرور دور کروں گی۔" اس نے سوچا تھا۔
"یار مجھے خودکشی کرنے کا کوئی آسان سا طریقہ بتاؤ تاکہ اگر فیصلہ میری مرضی کے مطابق نہ ہوا تو اپنا مستقبل خراب ہونے سے پہلے پہلے اس جہاں سے ہی کوچ کر جاؤں۔" وہ سب اس وقت چھت پر کھڑی شیر بلند خان کے آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ آج ضرور آئے گا۔ جب جاسمین نے افسردہ سی شکل بنا کر کہا تھا۔
"نہیں میں تمہیں ہرگز خودکشی کرنے نہیں دوں گی۔ بے شک مجھے تمہارا اگلہ کیوں نہ دبا کر۔ کیوں نہ روکنا پڑے۔" زینی نے تو تصور میں اسے مرے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ تب ہی بوکھلا کر اس کے ساتھ چمٹ گئی تھی۔ وہ تھی بھی ان سب سے زیادہ حساس اور معصوم۔
"اگر تم میری اکلوتی بہن نہ ہوتی اور مجھے تمہارا سر پھاڑ کر درد نہ ہوتا۔ تو لمحہ بھی نہ لگاتی' تمہارا سر پھاڑنے میں" بے وقوف لڑکی ہے۔ جاسمین کو اس کا یوں "زیبا" بننا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔
"میرا خیال ہے۔ اسی چھت پر سے کود جاؤ۔ زمین پر جاتے ہی تمہارا کام تمام ہو جائے گا اور خودکشی کے لیے کہیں دور بھی نہیں جانا پڑے گا۔" روبی نے فٹ مشورہ دیا تھا۔
"نہیں بھئی' چھت سے زمین پر آتے ہی میری ہڈی پسلی ایک ہو جانی ہے اور یوں فرشتوں کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی حالت میں جاتی میں کیا اچھی لگوں گی کوئی اور طریقہ بتاؤ" جاسمین نے پہلے طریقے کو رد کرتے ہوئے کہا۔
"تو پھر نہر میں کود جاؤ۔" زینی نے جھٹ جواب دیا۔
"اتنی سردی میں تو منہ دھونے سے پہلے دس بار سوچنا پڑتا ہے کہ دھوئیں یا نہ دھوئیں۔ نہ بھئی نہ۔ نہر میں تو ڈوبتے ہی میری قلفی جم جائے گی۔ کوئی ایسا طریقہ بتاؤ۔ جس میں سردی بھی کم لگے اور تکلیف بھی کم ہو۔" جاسمین نے بے ساختہ جھرجھری لے کر کہا۔
سردی تو ویسے ہی اسے بہت محسوس ہوتی تھی۔
"تکلیف تو خودکشی کرنے میں ہوگی ہی۔" روبی نے دانت پیس کر بے زاری سے کہا۔
"اگر ایسی بات ہے تو پھر میں خودکشی ہرگز نہیں کروں گی بلکہ شیر بلند خان کو کرواؤں گی۔" اس نے چھت پر پڑی واحد چارپائی پر بیٹھتے ہوئے ہاتھ جھاڑے۔
"مطلب اب تم خودکشی نہیں کروں گی؟" روبی نے اسے خودکشی کا ارادہ ملتوی کرتے دیکھ کر آنکھیں نکالیں۔
"تمہیں میرے خودکشی نہ کرنے کا اتنا افسوس کیوں ہو رہا ہے؟"
"مجھے افسوس کیوں ہو گا۔ مجھے تو تم سے ادھار لیا پانچ سو کا نوٹ واپس کرنا ہی ہے اور تمہارے سوٹ بھی میرے کھلے ہوں گے۔ اور۔"
"شیر بلند خان آگیا۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی زینی کی گھبرائی سی آواز ابھری۔ جوان کی خودکشی والی باتوں سے گھبرا کر منڈیر کے ساتھ کھڑی گلی میں جھانک رہی تھی۔ "دیکھو کتنی بڑی گاڑی میں آیا ہے۔" وہ تینوں اپنی اپنی جگہ سے اچھل کر اس کی طرف لپکیں۔
"ہائے اللہ یہ ہے۔ شیر بلند خان۔" زینی نے گلی میں جھانکتے ہوئے۔ خوشی سے چیخ ماری۔
"کافی امیر لگ رہا ہے۔" روبی نے اسے گاڑی سے نکل کر گیٹ کی طرف جاتے دیکھ کر قیاس کیا۔
"شیر بھائی تو بہت ہینڈسم ہیں۔" زینی نے لمحے میں متاثر ہوتے ہوئے اسے بھائی بنا لیا۔
"قسم سے یار گولی مار ڈاکٹر بننے کے شوق کو اور آرام سے شادی کر کے مزے لوٹ۔ مجھے بی جی پر غصہ آرہا ہے کہ انہیں شیر بلند خان کے لیے میں کیوں نہیں نظر آئی۔" روبی تو اس کو دیکھ کر زیادہ ہی متاثر نظر آرہی تھی۔
"ڈوب مرو۔ تم سب کی سب۔ ایسے متاثر ہو رہی ہو' جیسے اس سے پہلے کوئی امیر اور ہینڈسم بندہ دیکھا ہی

نہیں ہو۔" وہ ان کی مسلسل تعریفوں پر چڑ کر بولی جبکہ نظریں اسی پر تھیں جو گیٹ کے دائیں' بائیں کچھ دیکھتے ہوئے اب موبائل پر کوئی نمبر ملا کر کان سے لگا رہا تھا۔

"یقیناً" پینڈو پروڈکشن سے تصدیق کر رہا ہوگا کہ آیا میں بکری منڈی درست جگہ پر آیا ہوں یا نہیں۔" وہ بڑبڑائی تھی۔" اسے تو میں مزا چکھاتی ہوں۔ چوہدری ہاؤس آنے کا۔" وہ کھولتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو یقیناً" وہ بھی آنے والے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتی۔ مگر اب تو مسئلہ ہی دوسرا تھا۔

"پیار سے "سمجھانا" سمجھ جائے گا۔ اگر غصہ کروگی تو ہو سکتا ہے۔ اڑ جائے۔ پھر ہمیں نہ دھرنوں کے لیے کہنا۔" روبی منہ پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے ہنسی۔

"اڑنے جوگا چھوڑوں گی تو اڑے گا۔" وہ فوں' فوں کرتی سیڑھیاں اترنے لگی۔

"اور ہاں! نام پوچھے تو نک نیم بتانا۔ ورنہ سوچے گا کہ یہ تو میری تائی کا نام ہے۔" زیبی نے بھی پیچھے سے ہانک لگائی "ایک تو ہمارے نام ہی دادیوں' پردادیوں کے ناموں پر رکھے ہیں۔ اتنے اولڈ کہ میری فرینڈز باقاعدہ مذاق اڑاتی ہیں کہ ارے یہ تو میری نانی کا نام ہے۔ زیب النساء۔ اگر نک نیم کا رواج نہ ہوتا تو' قسم سے میں تو کسی سے اپنا تعارف ہی نہ کروا پاتی۔"

زیبی کو ہمیشہ سے اپنے نام بہت اولڈ لگتے تھے۔ اسی نے سب کے نک نیم رکھے تھے۔ اسی لیے ابھی بھی جاسمین کو ہدایت دینے کے ساتھ ایک نئے سرے سے اپنے ناموں پر تلملا رہی تھی جبکہ دوسری دونوں بغور گلی میں دیکھ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ نیچے آئی۔ بی جی فون پر پریشانی سے کسی کی خیریت پوچھ رہی تھیں جبکہ دادا جان' حلوہ کھاتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ نووارد نے ابھی بیل پر ہاتھ رکھا ہی تھا۔ جب اس نے گیٹ کھول کر باہر جھانکا۔

"جی فرمائیں۔" اس کی آواز بدل کر پاٹ دار آواز میں کہنے پر' آنے والے نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں پہلے الجھن پھر حیرت اور پھر تاسف ابھرا۔ کیونکہ وہ سامنے دونوں آنکھیں ٹیڑھی کیے کھڑی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس کے دیکھنے کا انداز یوں تھا کہ وہ دیکھ نووارد کو رہی تھی۔ مگر سامنے والے کو لگ رہا تھا کہ وہ اسے نہیں اس کے برابر کسی اور کو دیکھ رہی ہے۔

"گونگے ہیں تو اشاروں سے بتا دیجیے ہم آپ کا مدعا سمجھ جائیں گے۔ کیونکہ اشاروں کو سمجھنے پر کافی عبور حاصل ہے ہمیں۔" وہ اسے خود کو بغور دیکھتے پا کر جھٹ بولی۔

"جی نہیں گونگا نہیں ہوں۔ ماشاء اللہ سے زبان ہے میرے پاس۔" ہاشم علی نے جلدی سے کہا۔

"تو پھر اسے استعمال کیوں نہیں کرتے۔" وہ ہونٹ ٹیڑھے کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کر تو رہا ہوں۔" ہاشم علی اس کے ہونٹوں کو ٹیڑھا دیکھ کر تاسف سے بولا۔

"کیا؟ اس نے زور سے آنکھیں بھینچ کر اسے دیکھا۔ اسکول لائف میں جتنے بھی اسٹیج پلے کیے تھے۔ ابنارمل لوگوں والے۔ وہ سب آج بروئے کار لانے کا اس نے ارادہ باندھ لیا تھا۔

"اپنی زبان استعمال۔"

"مگر زبان سے تو بات کی جاتی ہے۔ یہ کوئی صابن تھوڑی ہے۔ جسے استعمال کیا جائے۔ ہاتھ دھونے یا منہ دھونے کے لیے۔" اس کا بھولا پن عروج پر تھا۔

"آپ نے ہی تو کہا تھا کہ میں زبان استعمال کروں۔" ہاشم کو اس کا یہ الزام ہضم نہیں ہوا تھا۔

"کیوں؟ میں تمہاری ٹیچر ہوں یا امی جان ہوں۔ جو میری بات ماننا تمہارے لیے ضروری ہے۔" اس نے تیوری چڑھائی۔

"دیکھیں محترمہ۔ میں یہاں کسی سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے یہ بتا دیں کہ آیا یہ عبداللہ۔۔۔"

"آپ جس سے ملنے آئے ہیں۔ وہ یہاں نہیں رہتے۔" اس نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔

"آپ کو کیسے پتا کہ میں جس سے ملنے آیا ہوں۔ وہ یہاں نہیں رہتے۔" ہاشم نے الجھن اور مشکوک انداز میں اسے دیکھا۔ جاسمین ایک لمحے کے لیے گھبرائی۔

"دیکھیں آپ جائیے یہاں سے اور آئندہ کبھی مت آئیے گا۔ وہ کیا ہے کہ گیٹ کھولنے کی ذمہ داری میری ہے اور میں چلوں تو میرا سانس پھولنے لگتا ہے۔ دراصل میری ایک ٹانگ لکڑی کی ہے۔ اس لیے میں زیادہ دیر کھڑی نہیں ہو سکتی۔" وہ اسے ٹالنے کے لیے مسکین سی شکل بنا کر بولی۔ ہاشم کا دل درد سے بھر گیا۔ اتنی چھوٹی لڑکی اور اتنی بیماریاں۔ اس نے دکھ سے سوچا۔

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ میں ابھی چلا جاتا ہوں۔ بس اتنا بتا دیں کہ یہ چوہدری عبدالشکور ولد غازی خالد کا ہی گھر ہے نا۔"

"جی یہ تو میرا چھوٹا سا گھر ہے۔ اتنے لوگوں کی بستی نہیں ہے۔" اس نے پھر معصومیت سے اسے بیوقوف بنانے کی کوشش کی۔

"ارے۔۔۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ یہ ایک ہی انسان کا نام ہے۔" ہاشم نے جلدی سے وضاحت کی۔

"اچھا۔۔۔ اچھا میں سمجھی الگ الگ لوگوں کے نام ہے۔"

"یہی گھر ہے۔ یہ دیکھیے باہر لکھا ہوا ہے۔ عبدالشکور ولد غازی خالد۔" ہاشم علی اسے خاموش نہ ہوتے دیکھ کر تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"اچھا کہاں ہے۔" وہ تدرے باہر کی طرف ہوتے ہوئے۔ نیم پلیٹ کو دیکھنے لگی۔ جہاں دادا' پردادا کا نام صاف لکھا ہوا تھا۔ اس نے نظریں پر سوچ انداز میں گھماتے ہوئے تھوک نگلا۔

"دراصل میں بات یہ ہے کہ ابھی ہفتہ بھر پہلے ہی ہم نے یہ مکان خریدا ہے۔ اس لیے یہ نیم پلیٹ نہیں اتاری۔" اسے بروقت بہانہ سوجھ ہی گیا۔ "تانا جان کو تو پتا ہے۔ مگر ممی کو کیوں نہیں پتا۔" اس نے پریشانی سے ماتھا مسلتے ہوئے سوچا۔

یہ ایسے جانے والا نہیں۔ اگر بی جی کا فون بند ہو گیا تو ادھر آتے انہیں دیر نہیں لگے گی۔ اسے بھگانے کے لیے کوئی اور طریقہ اپنانا ہوگا۔ اس نے کان کھجاتے ہوئے' کن انکھیوں سے پریشان سے ہاشم علی کو دیکھ کر سوچا اور مسکرا دی۔ اگلے ہی لمحے وہ دھڑام کی آواز کے ساتھ زمین پر گری تھی۔ اس کے گرنے کی آواز پر ہاشم بے ساختہ سٹ پٹا کر دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔ مگر اس پر نظر پڑتے ہی اس کی طرف بڑھا۔

"کیا ہوا محترمہ۔ آپ ٹھیک تو ہے۔ اٹھیں۔" ہاشم فکر مند سا اس کی طرف جھکا۔

"نہیں شکریہ۔ میں اٹھ جاؤں گی۔ آپ کو بتایا تھا نہ کہ میں زیادہ دیر کھڑی نہیں ہو سکتی۔" اس نے گیٹ کا سہارا لے کر کراہ کراہتے ہوئے کہا۔

"او سوری۔۔۔ آپ جائیں۔۔۔ وہ میں۔۔۔ میں بھی بس جا رہا ہوں۔" وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔ اسے واقعی شرمندگی ہوئی تھی۔ اسے یوں کھڑے رکھنے پر اس نے بھی سر ہلاتے ہوئے گیٹ بند کر کے ایک نظر چھت کی طرف دیکھا جہاں تینوں منڈیر پر کہنیاں ٹکائے' ہاتھ کے پیالے میں چہرہ تھامے کھڑی تھیں۔

"یاہو۔" اس نے دھیرے سے کہتے ہوئے زمین سے چند فٹ اوپر اچھل کر واپس آکر فٹ بال کو ٹھوکر سے اڑایا۔ فٹ بال کو ٹھوکر لگنے کی آواز باہر تک گئی تھی۔ "لگتا ہے بے چاری پھر گر گئی۔" ہاشم نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے عجیب سی آواز پر گیٹ کی طرف ٹھٹک کر دیکھا اور تاسف سے سر ہلاتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"تو بھلا ہم کیوں گھر بیچ کر جانے لگے۔ اب ہاشم کو گھر نہیں مل رہا تو۔۔۔ اس میں ہمارا کیا قصور۔ تمہیں خود چاہیے تھا کہ بیٹے کے ساتھ آتیں۔ مگر تمہیں تو سیر سپاٹوں سے ہی فرصت نہیں ہے بی بی۔" پروین پھوپھو نے فون پر بی جی کو بتایا تھا کہ ہاشم کو گھر نہیں مل رہا اور جو

پتا میں نے اسے دیا ہے وہاں بھی وہ گیا تھا مگر کوئی اور رہ رہا ہے۔ کوئی لڑکی بتا رہی تھی کہ انہوں نے وہ گھر ہفتہ بھر پہلے آپ لوگوں سے خریدا ہے۔" تب ہی پھوپھو کی باتوں پر بی جی غصہ ہو رہی تھیں۔

"تو اب اتنا بڑا شہر ہے' میں اسے کہاں ڈھونڈوں۔ پہلے سیاپے میری جان کو کیا کم ہے بی بی۔ جو اب ایک تم نے میرے گلے ڈال دیا ہے۔ بچہ گم ہو گیا تو کہاں سے ملے گا۔" بی جی سخت پریشان ہو رہی تھیں۔

"بی جی اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ آپ ہی کے مین چوک میں کسی مرغی کی دکان کے سامنے کھڑا ہے۔ اگر آپ کو نہیں ملا تو گھر واپس چلا جائے گا اسے راستوں کا پتا ہے اور آپ کو پتا ہے۔ میں اپنی خوشی سے لندن نہیں آئی۔ وقاص کا چیک اپ کروانا تھا اور کچھ بزنس کے کام بھی نپٹانے تھے انہوں نے۔ میں کب آ رہی تھی۔ ہاشم کو یوں اکیلا چھوڑ کر وہ تو ہاشم نے ہی مجھے فورس کیا کہ میں وقاص کے ساتھ جاؤں۔ ورنہ وہ بزنس کے کاموں میں الجھ کر اپنا خیال نہیں رکھیں گے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ یہ بتا کس رنگ کی گاڑی میں ہے۔ تمہارے ابا جی کو بھیجتی ہوں۔" بی جی اب شروع ہوتا دیکھ کر پوچھنے لگیں اور اس کے بتانے پر فون بند کر کے اسی وقت چوہدری جی کو لینے بھیج دیا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ ایک بار پھر اسی گرین گیٹ کے سامنے تھا۔

"نانا جان یہ ہی گھر ہے نا۔" اس نے اندر داخل ہونے سے پہلے ایک بار تصدیق کے طور پر پوچھا اور نانا جان کے اثبات میں سر ہلانے پر حیران سا ہوتا اندر چلا آیا تھا۔

"بی جی اور کوئی نہیں ہے گھر میں' میں نے تو سنا تھا۔ صرف دونوں ماموں اور ممانی ہی گاؤں میں رہتے ہیں۔ ان کے بچے یہاں پڑھائی کی غرض سے آپ کے ساتھ رہتے ہیں۔" ہاشم علی نے بی جی کے ہاتھ کی بنی بے شمار چیزوں سے انصاف کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ اسے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ یہاں آئے ہوئے اس نے بی جی اور نانا جان کے سوا جہاں کوئی اور ذی روح نہ دیکھ کر پوچھا تھا۔

"ٹھیک سنا ہے بیٹا۔ لڑکے دونوں تو اسکول سے آتے ہی میچ کھیلنے چلے گئے تھے۔ چھوٹی دونوں اکیڈمی میں گئی ہیں۔ ماشاء اللہ بی اے کر رہی ہیں اور بڑی دونوں تو پیپر دے کر فارغ ہیں۔ اس لیے نہیں سوئی پڑی ہوں گی۔ نہیں تو ٹی وی سے لگی ہوں گی۔" بی جی نے تفصیل بتائی۔ ہاشم ان کے بی اے کو بی اے کہنے پر مسکرا دیا۔

"تو بیٹا۔ یہ گاجر کا حلوہ کھاؤ۔ تمہیں بچپن میں بہت پسند ہوا کرتا تھا۔" بی جی نے پلیٹ میں حلوہ ڈال کر اس کی طرف کیا۔

"ہاں۔ ہاں بیٹا بہت مزے کا بنا ہے۔" دادا نے ذرا سا آگے ہو کر حلوے کا پیس اٹھانا چاہا۔ تب بی جی نے ان کے حلوے کی طرف بڑھے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"جتنا میٹھا کھانا تھا کھا چکے۔ اب بچے کے لیے ہے۔" بی جی نے پیار سے اسے دیکھا۔ جو مسکرا رہا تھا۔ چوہدری جی بدمزا ہو کر پیچھے ہو بیٹھے۔

"جس دن تم اس دنیا سے اٹھ گئی نا بیگم۔ اس دن میں جی بھر کر میٹھا کھاؤں گا۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے۔ تمہیں عیش کرنے کے لیے یہاں ہی چھوڑ جاؤں گی۔ کبھی نہیں' فرشتوں سے پہلے مذاکرات کروں گی کہ اس بڈھے کو بھی ساتھ لے کر چلو۔ ورنہ میں بھی یہیں بیٹھی ہوں۔" وہ بی جی ہی کیا جو کسی کا حساب بے باق نہ کریں۔

"دادا جان وحید مراد اور رانی کی فلم لگی ہے۔ دادا جان کہاں ہیں آپ۔" تب ہی ایک نسوانی آواز پہلے دور اور پھر قریب سے ابھری تھی۔ ہاشم نے بے ساختہ سر اٹھایا۔

"تمہارے بڑے ماموں کی بڑی بیٹی ہے۔" بی جی نے اس کے دیکھنے پر کہا۔ دادا جان فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب ہی وہ ٹی وی لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور ہاشم کو بی جی کے روبرو بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی۔ اتنا خوف تو اسے کبھی کسی دہشت گرد سے بھی

نہیں آیا تھا جتنا اس وقت اسے ہاشم سے آرہا تھا۔
"تم۔" ہاشم کے منہ سے اسے یوں اپنے سامنے صحت مند بلکہ ہٹی کٹی کھڑی دیکھ کر نکلا تھا۔ اس کی آنکھیں پہلے سے کہیں زیادہ پھیل گئی تھی۔ بی جی نے تعجب سے پہلے اسے اور پھر ہاشم کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ بی جی کوئی سوال کرتیں اس نے شور مچایا۔
"اوہو۔ بی جی کب سے گاؤں سے ابو جی کا فون آرہا ہے دیکھیں کہیں بند ہی نہ ہو گیا ہو۔" تب ہی دادا جان ٹی وی والے کمرے کی طرف چل دیے۔
"اچھا۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ بی جی فوراً" اپنی جگہ سے اٹھ کر کونے میں رکھے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھیں۔
"آپ یقیناً" وہی ہیں نا جنھوں نے گیٹ کھولا تھا اور جس سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔" ہاشم کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔
"میں نے گیٹ کھولا تھا۔ مگر کب۔ میں تو آپ کو فرسٹ ٹائم دیکھ رہی ہوں۔" وہ صاف مکر گئی۔
"لیکن میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہ آپ ہی تھیں۔" ہاشم کو اپنی بینائی پر پورا بھروسا تھا۔ جاسمین نے بے ساختہ ہونٹ کاٹ کر بی جی کو دیکھا۔ جو بڑبڑاتے ہوئے نمبر ملا رہی تھیں۔ اسے تو لگا تھا وہ مکرے گی تو وہ مان جائے گا۔ کوئی نیا بہانہ سوچ جاسمین۔ ورنہ ماری جائے گی۔ اس نے سوچا۔
"یقیناً" آپ نے میری دوسری سسٹر کو دیکھا ہو گا۔ وہ بے چاری ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا نام جاسمین ہے اور بی جی اس کی شادی کر رہی ہیں۔ ان کا خیال ہے وہ شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے افسردہ سی شکل بناتے ہوئے جلدی جلدی کہا کہ کہیں بی جی واپس نہ آجائیں۔
"سوری۔ میں نے آپ کو غلط سمجھا۔ وہ دراصل آپ کی بہن کی شکل بالکل آپ کے جیسی ہے۔ اس لیے میں دھوکا کھا گیا۔" وہ واقعی دل سے شرمندہ ہوا تھا۔
"دھوکا تو آپ اب بھی کھا رہے ہیں۔ مسٹر شیر بلند خان۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔
"ویسے بی جی۔ جاسمین کی شادی کا فیصلہ بڑا غلط لے رہی ہیں۔ ان کی کنڈیشن ایسی نہیں ہے کہ ان کی شادی کر دی جائے۔ میں بی جی سے بات کرتا ہوں۔"
"ارے نہیں ایسا کچھ مت کہیے گا۔ جب بی جی آپ سے جاسمین کی شادی کی بات کریں۔ تب انکار کریے گا۔ ورنہ جاسمین بے چاری کو ڈانٹ پڑے گی۔ دراصل بی جی نے کسی کو جاسمین کی بیماری کے متعلق بتایا نہیں ہے نا۔" تب ہی بی جی فون رکھ کر پلٹیں اور جاسمین کی تیزی سے چلتی زبان بند ہو گئی۔
"لو فون ہی نہیں اٹھا رہے۔" بی جی اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئیں۔ "ابھی آئی دادا جان۔" جاسمین بی جی کو سنانے کے لیے کہ دادا جان نے بلایا ہے۔ وہاں سے کھسک گئی اور پھر تب ہی باہر آئی جب ہاشم چلا گیا۔ بی جی نے آج اسے چوہدری ہاؤس ہی رک جانے کا کہا تھا۔ مگر وہ کچھ کام ہونے کا بہانہ کر کے چلا آیا تھا کیونکہ اس کی ہمدرد طبیعت جاسمین کے لیے بے چین سی ہو رہی تھی۔
"جیسے بی جی کے روکنے کے باوجود بھی نہیں رکا۔ یقیناً" اب کبھی واپس چوہدری ہاؤس کا رخ نہیں کرے گا۔" وہ رات کو اپنے بستر پر مزے سے بیٹھی مونگ پھلی کھاتے ہوئے اپنے آج کے کارنامے کے بارے میں بتانے کے بعد ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"دھ۔ دھ۔ پھر آگیا۔" وہ تینوں بڑے انہماک کے ساتھ شاہ رخ خان کی فلم دیکھ رہی تھی۔ جب زینی پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اندر آئی۔
"ارے آنے دو' اب کسی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" جاسوں نے ڈرائی فروٹ کھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
"ہمیں تو پہلی ہی نظر میں متاثر کر گیا تھا۔ مگر اپنی جاسوں نہ جانے کیوں اس سے خوف کھاتی ہے۔" زینی نے اپنی طرف پر سوچ نظروں سے دیکھتی جاسوں

کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کہیں لال بیگ تو نہیں آگیا۔"
زیبی جانتی تھی۔ جاسوں لال بیگ سے ہی سب سے زیادہ خوف کھاتی تھی۔
"کیا۔۔۔ لال بیگ۔۔۔ کہاں ہے لال بیگ۔" اپنے ہی خیالوں میں گم جاسوں نے صرف لال بیگ ہی سنا تھا۔ تب ہی چیخ کر صوفے پر چڑھ گئی۔
"ہائے اللہ لال بیگ۔۔۔" وہ تینوں بھی اس کی چیخ سے بدحواس ہو کر صوفوں اور ٹیبل پر چڑھ گئیں۔ لاؤنج میں بیٹھے ہاشم علی نے چونک کر ٹی وی والے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔
"یا اللہ خیر۔" بی جی نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا اور اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھیں۔
"چھوکریوں۔۔۔ کیا کوئی جن بھوت دیکھ لیا ہے۔ جو یوں چلا رہی ہو۔" بی جی انہیں یوں صوفوں پر سہمے ہوئے کھڑے دیکھ کر پوچھنے لگیں' جن کی متلاشی نظریں کارپٹ پر کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ "بی جی لال بیگ۔۔۔" زیبی نے منہ بسورا۔
"کہاں ہے' کہاں ہے۔" بی جی ہڑبڑا کر صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئیں۔ کہیں کسی کو کرنٹ تو نہیں لگ گیا۔ ہاشم بی جی کی آواز پر یک دم کھڑا ہو گیا۔ نہیں۔۔۔ یقیناً" جاسمین بے چاری گر گئی ہو گی۔ دیکھتا ہوں۔ وہ دو قدم چلا' پھر رک گیا۔ نہیں یہ مناسب نہیں لگتا۔ یوں منہ اٹھا کر لڑکیوں کے کمرے میں جانا۔ وہ ملول سا وہیں رک گیا۔
"زیبی بتاؤ کہاں دیکھا تھا تم نے لال بیگ۔" جاسوں نے روہانسی آواز میں کہا۔ لال بیگ کی تو وہ تصویر دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگتی تھی۔ یہاں تو اوریجنل لال بیگ دیکھا گیا تھا۔
"میں نے تو نہیں دیکھا۔" وہ معصومیت سے بولی۔
"جاسوں نے دیکھا تھا۔ میں نے تو نہیں دیکھا۔ تم نے خود ہی لال بیگ کے متعلق کوئی بات کی تھی۔" "ہاں تو میں نے صرف بات کی تھی۔ یہ تھوڑی کہا تھا کہ یہاں لال بیگ ہے۔"
"ارے جب کسی نے لال بیگ دیکھا ہی نہیں تو پھر یہ شور شرابہ کیوں؟" بی جی نے چشمے کے پیچھے سے آنکھیں نکالیں۔
"اوہو۔۔۔ بی جی ہم لوگ تو یوں ہی مذاق کر رہے تھے۔ آپ نے سچ سمجھ لیا۔" جاسوں یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ یہاں کوئی لال بیگ نہیں ہے۔ مصنوعی طور پر مسکراتے ہوئے نیچے اتری' جبکہ دل ابھی بھی دھک۔۔۔ دھک کر رہا تھا۔ جیسے کسی شریف بندے کا دل پولیس والوں کو اپنے روبرو دیکھ کر کرتا ہے۔
"بی جی۔۔۔ آپ ڈر رہی ہیں۔ وہ بھی لال بیگ سے۔" روبی نے بھی خود کو بہادر ثابت کرنے کی کوشش کی اور نیچے اتری اور اس کے پیچھے پیچھے وہ دونوں بھی۔۔۔
"بی جی ہم ہے نا۔۔۔ آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" زیبی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"ہاں بی جی۔۔۔ ہم ہے نا۔۔۔" زینی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ تب ہی ان ڈرامے بازوں کو خونخوار نظروں سے گھورتی بی جی نے نیچے سے جوتا اٹھایا۔ "تم سب کو تو میں بتاتی ہوں۔" بی جی اٹھ کر ان کی جانب لپکیں۔
"ہائے بی جی۔۔۔" وہ سب چلا کر آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگیں۔ ہاشم گھبرا کر بے حد پریشانی سے دروازے کی طرف بڑھا' جہاں سے آواز آئی تھی۔ اسے یہ ہی لگا تھا کہ بی جی کو کچھ ہو گیا ہے۔ کیونکہ لڑکیوں کی چیخ ہی ایسی درد بھری تھی۔ ابھی وہ دو قدم ہی آگے بڑھا تھا۔ جب وہ سب کی سب آگے پیچھے اس سے ٹکراتے ہوئے گزری تھیں۔ وہ۔ ارے۔۔۔ ارے کرتا ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا جب لڑکیوں کے تعاقب میں آتا بی جی کا بھاری جوتا اس کے ماتھے پر لگا تھا اور اس اچانک افتاد پر ہڑبڑا کر پیچھے صوفے پر گرا تھا۔ "اف۔" اس کے منہ سے بے ساختہ جھنجلا کر نکلا تھا۔
"ہائے ربا۔۔۔" بی جی کے تو اس کے جوتا لگتا دیکھ کر ہی ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ زیادہ تو نہیں لگ گئی۔ میرے چاند کو۔" بی جی جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے فکر مندی سے بولیں۔ جو یوں صوفے پر

گرا تھا کہ ٹانگیں صوفے کے بازو پر اور سر اور کمر صوفے پر تھے۔

"بہت برا ہو رہا ہے بے چارے کے ساتھ۔"

"ایسا واقعی نہیں ہونا چاہیے 'اتنے ہینڈسم بندے کے ساتھ۔"

"بالکل بھی ایسا نہیں کرنا چاہیے ہمیں شیر بھائی کے ساتھ۔"

"اتنی ہمدردی ہو رہی ہے تم سب کو تو بی جی سے بول کر تم سب کی ہی شادی اس سے کروا دیتی ہوں۔ ویسے بھی مرد کو اسلام میں چار بیویاں کرنے کی اجازت ہے۔" وہ سب کی سب ایک دروازے کے ساتھ چپکی اپنی اپنی رائے دے رہی تھیں۔ جب جاسمین نے غصے سے کہا تھا۔

"شکل سے تو نہیں لگتا کہ یہ بندہ اتنا ڈھیٹ ہے۔ اگر ڈھیٹ نہیں ہے تو دوبارہ یہاں آنے کی کیا تک بنتی ہے۔" باقی سب کی طرح اس کی نظریں بھی ہاشم پر ہی تھیں۔ جو اب کھڑا اپنی شرٹ کندھوں سے پکڑ کر سیدھی کر رہا تھا۔

"معاف کرنا بیٹا۔ تم بھی کیا کہتے ہو گے کہ نانی نے جوتا ہی مار دیا۔ وہ کیا ہے کہ ان لڑکیوں نے بڑا تنگ کیا ہوا ہے۔ کبھی لال بیگ کا نام سن کر ہی چلانے لگتی ہیں اور کبھی ایک دوسرے کے خراٹوں سے ڈر کر شور مچا دیتی ہیں کہ چور آ گیا۔" بی جی نواسے کے سامنے جی بھر کر شرمندہ ہو رہی تھیں۔

"کوئی بات نہیں نانو سمجھ جائیں گی۔" ہاشم نے اپنی کوفت چھپاتے ہوئے دھیرے سے بی جی کے بجائے نانو کہا۔ کیونکہ بی جی کہنے کی اسے اتنی پریکٹس نہیں تھی۔ نانو ان چاروں کو جیسے اس لفظ سے کرنٹ لگا تھا۔ تب ہی وہ حیرت سے منہ کھولے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگی تھیں۔ جاسمین کو تو ابھی سے چکر آنے لگے تھے۔

"ہائے ربا۔ میں نے تو اس سے ایک سو ایک جھوٹ بولے ہیں۔ اگر میرے جھوٹ بی جی کے سامنے کھل گئے تو یقیناً وہ مجھے الٹا لٹکا دیں گی۔" جاسوں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یہ سب کرنے سے پہلے تصدیق کے لیے نام پوچھ لینا چاہیے تھا۔ اب ہم کیا کریں۔" روبی نے کندھے اچکائے تھے۔ "تم لوگ میری مدد نہیں کرو گی۔" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"کریں گے۔ کیوں نہیں کریں گے۔" زیبی نے فوراً کہا۔ "میں بھی اپنی بہن کے ساتھ ہوں۔" زیبی نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر ایک نظر روبی کو دیکھا۔ جو آنکھیں ماتھے پر رکھے۔ لاتعلق نظر آنے کی کوشش میں تھی۔

"روبی تم میرا ساتھ نہیں دو گی۔"

"ایک شرط پر مدد کروں گی۔"

"جلدی بولو۔ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔"

"میں نے جو تمہارے پانچ سو روپے ادھار لیے تھے وہ مجھے معاف کر دو گی۔"

"ٹھیک ہے مت دینا۔ مگر اب یہ سوچو میرے جھوٹوں پر پردہ کیسے ڈالا جائے۔" اس کے کہنے کے ساتھ ہی وہ سب سوچنے بیٹھ گئی تھیں۔

"جاسوں۔ کس رنگ کے پردے کے متعلق سوچنا ہے؟" زیبی نے چند پل سوچنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ان تینوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"تم بس ہمیں سوچتے ہوئے دیکھو مگر خاموشی کے ساتھ۔" روبی کے مشورے پر وہ منہ بسور کر رہ گئی۔

"ایسا کرتے ہیں کہ۔" جاسوں کے کہنے پر وہ سب سر جوڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"بی جی آپ لڑکیوں پر اتنا غصہ مت ہوا کریں۔ خاص کر جاسمین پر۔ وہ بے چاری تو بہت سویٹ ہے۔" ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ہاشم نے جاسمین کے متعلق بی جی سے بات کرنے کی غرض سے کہا تھا۔ جبکہ بی جی نے حیرت سے ناک پر انگلی رکھ کر اسے دیکھا۔ اس دن اس کا اسے دیکھ کر تم کہنا بھی یاد آ گیا تھا۔ ہاشم ان کے یوں دیکھنے پر لمحہ بھر کو گڑبڑا گیا۔ "وہ ایکچوئیلی۔ امی بہت ذکر کرتی ہیں جاسمین کا۔"

اس نے جلدی سے کہا۔ "مجھے پتا چلا تھا کہ آپ جاسمین کی شادی کرنا چاہ رہی ہیں 'کیا ایسا نہیں ہو سکتا بی جی کہ آپ کچھ عرصے کے لیے اس کی شادی کا خیال دل سے نکال دیں۔ جب تک وہ... وہ..." آگے کہتے کہتے رک گیا۔ کیونکہ اسے اس دن والی زینی کی بات یاد آگئی تھی کہ بی جی نے جاسوں کی بیماری کے متعلق کسی کو نہیں بتایا۔

"ہاں... ہاں بول پتر کیا کہنا چاہتا ہے۔" بی جی جو اس کی باتوں کا مطلب سمجھ رہی تھیں۔ اسی بنا پر قدرے خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

"وہ... میں چاہتا ہوں کہ میں اسے اپنے ساتھ اسپتال لے کر جاؤں۔ شادی تو بعد میں بھی ہو جائے گی۔" وہ ان سے صاف طور پر نہیں کہہ سکا تھا کہ چیک اپ کروانے۔ تب ہی گول مول سا بولا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بی جی سے جاسمین کو ڈانٹ پڑے۔ صرف اس وجہ سے کہ اس کی بیماری کے متعلق مجھے کیسے پتا چلا ہے۔ جبکہ بی جی اس کے ہچکچا کر کہنے کو اس کی شرم سمجھی تھیں۔ تب ہی نہال سی ہو کر اس کا ماتھا چومنے لگیں۔ "تو نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے نا پتر۔"

"جی بی جی۔ اس میں سوچنے سمجھنے والی کیا بات ہے۔ اپنوں کی مجبوری اپنے نہیں سمجھیں گے تو اور کون سمجھے گا۔ پھر میں تو آپ کا نواسہ ہوں اور نواسے' بیٹوں سے کم تو نہیں ہوتے۔" وہ بی جی کو خوش دیکھ کر محبت سے بولا۔

"جیتا رہ میرا پتر۔ تو نے تو میرے سارے وہم ہی دور کر دیے۔ واقعی امریکہ کا جادو تجھ پر نہیں چڑھا۔ تب ہی واپس بھی پلٹ آیا ہے اور ایسی سوہنی باتیں بھی کر رہا ہے۔" بی جی تو خوشی سے پاگل ہو رہی تھیں کہ جاسوں کی ڈاکٹر بننے کی ضد بھی پوری ہو جائے گی اور ہاشم جیسا نیک' سلجھا ہوا دولہا بھی مل جائے گا اور رہی نسرین وہ تو اپنا سا منہ لے کر رہ جائے گی۔

"کیا سوچ رہی ہیں بی جی۔" وہ بی جی کو یوں آپ ہی آپ مسکراتے دیکھ کر بولا اور کچھ بی جی کی باتیں بھی اسے تھوڑا حیران کر رہی تھیں۔

"کچھ نہیں تو بیٹھ۔ میں تجھے لڑکیوں سے ملواتی ہوں۔ لڑکے البتہ چوہدری جی کے ساتھ کسی ملنے والے کے ہاں گئے ہیں۔ ابھی آتے ہی ہوں گے۔" بی جی نے مسکراتے ہوئے کہا اور لڑکیوں کو آوازیں دینے لگیں۔

"بی جی آپ نے ہمیں بلایا۔" اگلے ہی منٹ وہ چاروں لائن بنائے سعادت مندی سے پوچھ رہی تھیں۔ ہاشم نے ایک نظر انہیں دیکھا اور جاسمین کو نہ پا کر مایوسی سے نظر جھکالی۔ "یقیناً" اپنے کمرے میں ہوگی۔ ایسے لوگ دوسروں سے ملنے سے گھبراتے ہیں۔ اس نے سوچا۔

"دیکھو یہ ہاشم علی ہے۔ تمہاری پھوپھو کا بیٹا۔ امریکا سے ڈاکٹر بن کر آیا ہے اور اب یہیں رہ کر پاکستان کی خدمت کرے گا۔" بی جی کے لہجے میں اس کے لیے فخر تھا۔ وہ مسکرایا۔

"السلام علیکم! ڈاکٹر ہاشم علی بھائی۔" ان سب نے اسی فرماں برداری کے ساتھ یک زبان ہو کر سلام کیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو بی جی کو یقیناً" ان کی اس فرماں برداری پر شک گزرتا' مگر اس وقت تو وہ جیسے اپنے سر سے بوجھ اتر جانے پر خوشی سے پھولے ہوئے تھیں۔

"اور یہ ہے..." بی جی نے ابھی اتنا ہی کہا تھا۔ جب جاسوں زور و شور سے کھانستے ہوئے پانی پینے کا کہتے ہوئے کچن کی طرف تیزی سے چل دی۔

"ہائے۔ ایسے کیسے کھانسی ہو گئی۔ ساری کھٹی میٹھی چیزیں تو میں ان سے چھپا کر کولر میں رکھتی ہوں۔ دیکھو اگر زیادہ کھانسی ہوئی تو تم کوئی سیرپ لکھ دینا۔" بی جی فکر مندی سے اپنے خفیہ ٹھکانے کا بھی بتا گئیں۔

جس پر ان تینوں نے منہ ہی منہ میں ہوں کرتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہاشم نے بہت اشتیاق سے بی جی کو جاتے دیکھا۔ بی جی سب کی ذرا سی بھی بیماری سے پریشان ہو جاتی تھیں' جبکہ ہاشم پہلے بورڈنگ اور پھر امریکا رہنے کی وجہ سے اس طرح کی محبتوں اور فکر مندیوں سے دور رہا تھا۔ تب ہی جب وہ فارغ ہوتا

تھا تو سیدھا بی جی کے پاس چلا آتا تھا۔ اسے بی جی کا خیال کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔

"پھوپھو آپ کی بہت باتیں کرتی ہیں ڈاکٹر ہاشم بھائی۔" زینی نے بی جی کے جانے کی تسلی کر کے کہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں بہت باتیں کرتی ہیں۔" زینی کیسے پیچھے رہتی۔ ہاشم مسکرا دیا۔

"ویسے آپ لوگ ڈاکٹر والا لاحقہ ہٹا بھی سکتی ہے۔" وہ ان کے مسلسل ڈاکٹر لگانے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"جی ہاشم بھائی۔۔۔ روبی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرتے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے۔ ہاشم سے مسکرا کر کہا۔

"لو پاگل بنانا تو بھول گئے۔" زینی نے اس کے اشارہ کرنے پر بے ساختہ سر پر ہاتھ مارا۔

"کسے پاگل بنانا بھول گئے۔" ہاشم نے دلچسپی سے انہیں دیکھا۔

"آپ کو۔۔۔" زینی نے بے ساختہ کہا۔

"مجھے۔۔۔" ہاشم نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"اس کا مطلب ہے ہاشم بھائی کہ ہم اپنا تعارف کروانا بھول گئے۔" روبی نے ذرا کی ذرا اسے آنکھیں نکالیں۔ وہ آنکھیں چرا گئی۔ کیونکہ اسے بھی اپنی بے وقوفی کا اندازہ ہو گیا تھا۔

"او۔۔۔ اچھا۔۔۔" ہاشم ریلیکس ہو کر بیٹھ گیا۔ "کیا نام ہے آپ کے۔۔۔" اس نے خود ہی پوچھ لیا۔

"میرا زیب النساء ہے۔ سب پیار سے زیبی کہتے ہیں۔" روبی نے سب سے پہلے اپنا پلان کے مطابق جھوٹا تعارف کروایا، جبکہ زینی نے یقیناً "اس کا اصل نام بتانے کے لیے منہ کھولا، مگر زیبی کے بازو میں کاٹی جانے والی چٹکی پر وہ صرف "اوئی" کر کے رہ گئی، ساتھ ہی پلان بھی یاد آ گیا تھا۔

"اور میرا نام پی ایم ہے۔" زیبی کو ہمیشہ سے خوب صورت اور تک نیم پسند تھے۔ یہ نام بھی ابھی ابھی اسے پسند آیا تھا۔ اس لیے سوچنے کی زحمت کیے بغیر فٹ رکھ لیا۔

"پی ایم کیا نام ہوا۔" ہاشم کو نام پر حیرت ہوئی۔ زیبی نام پر اعتراض دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے گھبرائی۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ دراصل پروین ملوترہ۔۔۔" گھبراہٹ میں وہ پریا ملوترہ کو پروین ملوترہ بول گئی تھی۔

"مگر پروین ملوترہ تو۔۔۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ جب کہ روبی نے اس کے یہ نام رکھنے پر دل ہی دل میں اسے گالیاں بکتے ہوئے تیزی سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ تو جانتے ہیں نا کہ ہمارے نام بی جی نے اپنی فوت ہو جانے والی بہنوں کے ناموں پر رکھے ہیں۔ بی جی کی ایک بہن پروین کی شادی انڈیا میں کسی ملوترہ خاندان میں ہوئی تھی۔ اس لیے پروین ملوترہ نام ہے۔" روبی جلدی جلدی جو سمجھ میں آیا، ویسی ہی وضاحت کر دی۔ ساتھ ہی زینی کو تعارف کروانے کا اشارہ کیا۔ ہاشم اس نام پر حیران سا ہوتے ہوئے کندھے اچکا گیا۔

"میرا نام بھلا کیا تھا۔" زینی نے ہونق پن سے انہیں دیکھا۔ اس بحث کے بیچ وہ تو اپنا وہ نام بھی بھول گئی تھی۔ جو انہوں نے اسے یاد کروایا تھا، جبکہ ان دونوں کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لیں۔ "آپ کو اپنا نام یاد نہیں۔" ہاشم حیرانی و پریشانی سے اسے دیکھنے لگا۔

"وہ۔۔۔ ہاشم بھائی اس کی میموری تھوڑی ویک ہے۔ اکثر دادا کو بی جی اور بی جی کو دادا جان کہہ دیتی ہے بے چاری۔" زیبی کے وضاحت دینے کے ساتھ دانت بھی پیسے۔ زینی نے اس کو دانت پیستے دیکھ کر صرف اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ اسے نہار منہ بادام وغیرہ کھلایا کریں۔ کسی بھی بیماری کو معمولی نہیں لینا چاہیے۔ میں خود ہی بی جی سے بات کرتا ہوں۔ جاسمین کے ساتھ اس کو بھی اسپتال لے جا کر چیک اپ کروالاؤں گا۔" ہاشم گہرے تفکر سے افسوس لیے زینی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ایک تو انسان نیا نیا ڈاکٹر بنا ہو اور دوسرا کوئی قریبی رشتے دار بھی بیمار پڑ جائے تو فکر مندی سوا سیر ہو جاتی ہے۔

"بی جی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔ دیکھیں میرا نام جنت بی بی ہے۔ مجھے یاد آگیا۔" معاملہ بی جی تک جاتے دیکھ کر اس نے جان بچانے کے لیے بی جی کا نام ہی لے دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تو سنا تھا۔ دونوں ماموں کی دو' دو بیٹیاں ہیں اور بڑے ماموں کے دو بیٹے بھی۔ مگر یہاں تو پانچ لڑکیاں ہیں۔" بی جی نے ہاشم کو کھانے کے لیے روک لیا تھا۔ اب کھانے کی تیاری کرتے ہوئے جاسمین کو ہاشم کو ڈرائی فروٹ دینے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ جب اسے ڈرائی فروٹ والی پلیٹ دے کر پلٹنے لگی تب ہاشم نے الجھ کر جیسے خود سے پوچھا تھا جبکہ جاسمین ٹھٹک کر رک گئی۔ پھر کچھ دیر کچھ سوچا اور دھیرے سے اس کے پاس آکر بولی۔

"وہ اصل میں... ہاشم بھائی جو چھوٹی ہے' وہ ہماری بہن یا کزن نہیں ہے' بلکہ وہ دادا جان کی دوسری بیوی کی بیٹی ہے۔" اس نے وہ جھوٹ بولا تھا جس پر ہاشم فوراً" یقین کرلیتا کہ خاندان کا ہر شخص جانتا تھا کہ دادا جان کو دوسری شادی کا کتنا شوق ہے۔ چھوٹی اس نے یوں کہہ دیا تھا کہ وہ الجھا رہے کہ چھوٹی کون ہے؟ آپ کا مطلب ہے وہ چشمے والی جنت۔" ہاشم کو سب سے چھوٹی زینی ہی لگی تھی۔ جی۔ اس نے دھیرے سے سرہلایا اور بی جی کی آواز پر فوراً" پلٹ گئی۔ ہاشم پریشان سا ہوگیا اور حیران بھی کہ ممی نے اس سے نانا جان کی دوسری بیٹی کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ اب بھلا ممی مجھے کیا بتاتیں' نانا جان کی دوسری شادی اور بیٹی کے بارے میں ہو سکتا ہے' خاندان سے یہ بات چھپائی ہو۔ اس نے سوچا تھا اور کھانا کھاتے ہی بی جی کے روکنے کے باوجود وہ واپس گھر آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پروین تمہارے پتر نے تو میری روح خوش کردی۔ اتنا نیک اور سمجھ دار بچہ میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا لگتا ہی نہیں ہے کہ امریکا سے آیا ہے۔" (گویا امریکا میں نیک اور سمجھ دار نہیں بستے۔) بی جی فون پر پروین پھوپھو سے ہاشم کی تعریف کے پل باندھ رہی تھیں۔

"بی جی کیا کیا ہے ہاشم نے۔" وہ نا سمجھی سے پوچھنے لگی۔

"لو بھلا تمہیں نہیں پتا۔" بی جی حیران ہوئیں۔ "نہیں کیا ہوا ہے؟"

"شرم کے مارے نہیں بتا تا ہوگا۔ چلو میں ہی بتا دیتی ہوں۔" بی جی کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔ "ہاشم نے آپ سے یہ کہا کہ وہ جاسوں کو پسند کرتا ہے۔" پروین پھوپھو کو یقین نہیں آیا۔

"بی بی اس نے جو کچھ کہا اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ جاسوں کو پسند کرتا ہے۔ اب تم بتاؤ۔ تمہیں یا تمہارے میاں کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے؟"

"جاسوں میری بھتیجی ہے اور اگر وہ میرے بیٹے کو پسند ہے تو اس سے اچھی بات میرے لیے کوئی اور کیا ہوگی۔ میں تو بس اس بات پر حیران ہو رہی ہوں کہ ہاشم کی روز مجھ سے بات ہوتی ہے' مگر اس نے ایسا کوئی ذکر مجھ سے کیوں نہیں کیا۔" پھوپھو خوش ہونے کے ساتھ الجھی ہوئی بھی تھیں۔ ان کی تو ہمیشہ سے یہ خواہش رہی تھی کہ ان کے اکلوتے بیٹے کی بیوی کوئی ان کے میکے کی لڑکی بنے۔ مگر وہ اپنے بیٹے پر زبردست نہیں کر سکتی تھیں۔ تب ہی بی جی کی جاسوں کی شادی کے لیے پریشانی دیکھ کر بھی انہوں نے ہاشم کا نام نہیں لیا تھا کہ کہیں وہ کسی دوسری جگہ نہ راضی ہو۔

"بھئی بچہ ہے۔ اپنے منہ سے اپنی شادی کی بات کرتے ہوئے شرما گیا ہوگا اور پھر فون پر بھلا ایسی باتیں کب ہوتی ہیں۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے بھی شرما کر سوچ سوچ کر بات کررہا تھا۔" بی جی نے پھوپھو کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"تائی سے بات کرسکتا ہے' مگر ماں سے نہیں... ٹھیک ہے۔ اب میں بھی اس سے تب ہی جاسوں کے متعلق بات کروں گی۔ جب اپنے منہ سے جاسوں کے لیے پسندیدگی کا اظہار کرے گا۔" پروین پھوپھو نے

بیٹے کے اس کو اتنی بڑی بات نہ بتانے پر ناراضی سے سوچا تھا اور دھیرے سے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔
بی جی نے دادا جی کے ساتھ ساتھ پنڈ فون کر کے بھی ہاشم کی جاسوں کو پسند کرنے والی بات بتادی تھیں۔
سب ہی بہت خوش ہوئے تھے۔ اسی خوشی میں بی جی لڑکیوں کو لے کر قریبی پارک میں گھومنے گئی تھیں۔ وہ سب بی جی کی اس اچانک کایا پلٹ پر حیران تو ہوئیں مگر کسی نے بھی پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ان کے لیے یہ ہی بہت تھا کہ بی جی نے چوہدری ہاؤس کی مضبوط دیواروں سے باہر جھانکنے کی بلکہ جی بھر کر گھومنے کی اجازت تو دی۔ بی جی خود بھی ان دنوں بے حد خوش تھیں۔

☆ ☆ ☆

"کیا سوچا ہے بی جی آپ نے مجھے آپ میری کون سی بیٹی دے رہی ہے۔ دیکھیں آپ مجھ سے میری اولاد کو دور نہیں رکھ سکتیں۔ میں چاہوں تو اپنی دونوں بیٹیوں کو لے جاسکتی ہوں۔ مگر میں ایسا نہیں کر رہی۔ کیونکہ مجھے نوازش علی کا خیال ہے۔" نسرین نے آج پھر فون کیا تھا۔ بی جی سے وہی مطالبہ دہرایا تھا' جو وہ ہر بار کرتی تھی' جبکہ اس کی آواز سنتے ہی بی جی کے ماتھے پر تیوری چڑھ گئی تھی۔
"اگر تمہیں اتنا ہی میرے پتر کا خیال ہوتا تو کبھی اس گڈی والے کے پیچھے میرے ہیرے جیسے پتر کو نہ چھوڑ کر جاتی۔ غضب خدا کا' جو عورت دو بچیوں کی ماں بن کر بھی اپنے نفس کو کنٹرول نہیں کر سکتی۔ وہ بھلا بچیوں کی تربیت کیا کرے گی۔" بی جی کو شروع ہوتا دیکھ کر نسرین نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"بی جی میں نے آپ سے تقریر سننے کے لیے فون نہیں کیا۔ ایسی بے وجہ کی تقریریں ہر نیوز چینل پر آج کل بہت آرہی ہیں۔ اس لیے وہ بات کریں جو میں آپ سے پوچھ رہی ہوں۔"
"نہ ہم کیوں جائیں کسی ٹی وی چینل پر' تم جاؤ یا تمہارا گڈی والا جائے۔ کم بخت میرے منہ لگتی ہے۔" بی جی نہ جانے کیا سمجھی تھیں۔ تب ہی غصہ سے بولیں۔ نسرین سے بات کرتے تو وہ ویسے ہی ہوش کھو دیتی تھیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ بچیوں کا مطالبہ کرنے والی کا منہ ہی نوچ لے۔
"بی جی آپ کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ آپ ہر بات میں اپنی مرضی کا مطلب نکال لیتی ہیں۔"
"کیوں نہ نکالوں۔ تم میرے گھر کی دہلیز پر قدم تو رکھو۔ دھکے مار کر نکال دوں گی۔" بی جی ابھی بھی کچھ اور سمجھی تھیں۔ ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ غصے اور جوش میں سامنے والے کی بات کم ہی سمجھتی تھیں۔
"مجھے آپ سے جو کہنا تھا جتنا کہنا تھا کہہ لیا۔ اب بھی اگر آپ نے مجھے بچیاں واپس نہ کیں تو۔ میں اپنی بچیاں دوسرے طریقے سے لے جاؤں گی۔ سوچنے کے لیے صرف دو دن کا وقت ہے آپ کے پاس۔" نسرین بی جی کی باتوں پر چڑ سی گئی تھی۔
"کس کا فون ہے۔ لاؤ میں بات کروں۔" دادا جان اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آئے۔ بی جی نے خاموشی سے فون انہیں تھمادیا۔ انہیں واقعی اس وقت پھولے ہوئے سانسوں کو بحال کرنے کی ضرورت تھی' جبکہ دوسری طرف نسرین نے بھی کسی اور کے فون پکڑنے پر سکھ کا سانس لیا تھا۔
"دیکھیں چچا جی۔ میں بچیوں کی ماں ہوں اور اولاد پر ماں کا حق سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ آپ جاسمین یا زینب میں سے کم از کم ایک بیٹی تو دے دیں۔ کیونکہ میں ہر صورت بچی لے کر جاؤں گی۔ مجھے زبردستی کرنے پر مجبور مت کریں۔" اس بار نسرین نے دھمکی کی بجائے نرمی سے کہا۔
"بیٹا! آپ کو نہیں لگتا آپ نے بچیوں پر اپنا حق جتانے میں دیر کر دی۔" دادا جان نرمی سے بولے۔
"میں ان کی ماں ہوں چچا جان۔ وہ یقیناً" میرے پاس آنے کے لیے بے چین ہوں گی۔"
"جتنا میں اپنے خون کو سمجھتا ہوں بیٹا' وہ اپنے رشتوں اور محبتوں سے دور ہونے کے متعلق سوچ بھی

نہیں سکتیں۔ آپ بچیوں کا خیال دل سے نکال دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ کیونکہ تمہاری بی جی بھی تمہاری بات نہیں مانے گی۔ انہوں نے تو مجھے دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں دی' آپ کو کیا خاک بچیاں دے گی۔ یقین کریں بچیاں آپ کے حوالے کرنا ان کے لیے مجھے دوسری شادی کی اجازت دینے سے زیادہ مشکل ہے۔ ہک ہا۔ اگر بی جی آپ مجھے امریکا جانے کی اجازت دے دیتی تو ایک گوری مل ہی جاتی۔" دادا جان اتنی دیر سنجیدہ اور وہ بھی ماضی کی بات کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ تب ہی پیچھے منہ کرکے بی جی سے پوچھا گیا۔ جو فون کے ساتھ کان لگائے سننے کی کوشش کررہی تھیں۔ ان کے پوچھنے پر گھور کر رہ گئیں۔ "بیٹا' نسرین پتر' ساٹھ سال کے نوجوان کو امریکا والے رشتہ دے دیتے ہیں۔" دادا جان نے معصومیت سے پوچھا۔

"اوہو۔۔۔" نسرین نے جھنجلاتے ہوئے فون رکھ دیا۔

"لگتا ہے دے دیتے ہیں۔" دادا جان نے قیاس کرتے ہوئے فون بند کردیا۔ کچھ دیر بعد بی جی نے ہاشم کو فون کیا تھا۔ ان کا خیال تھا اس سے بات کرکے کل یا پرسوں اس سے جاسوں کا نکاح کردیا جائے۔ اس نے کچھ دیر بعد گھر آنے کے لیے کہا تھا اور بی جی نے جاسمین کو بازار جاکر نکاح کا جوڑا اپنی مرضی کا لانے کے لیے کہا تھا' جبکہ جاسمین تو نکاح کا سن کر ہی بپھر اٹھی تھی۔

"بی جی میں نے آپ کو بتادیا ہے کہ اگر میرے ڈاکٹر بننے سے پہلے کسی نے میری زبردستی شادی کروانے کی کوشش کی تو' میں چھت سے کود جاؤں گی۔ نہیں تو جاتے ہی اس شیر بلند خان کی ٹانگیں توڑ دوں گی۔ پھر نہ کہنا۔" جاسمین کو یہ ہی لگا تھا کہ اس کا نکاح شیر بلند خان سے کیا جارہا ہے۔

"نہ بی بی یہ دھمکیاں مجھے مت دینا۔ میں تو جب تک تیری شادی نہیں کردیتی سکون سے نہیں بیٹھوں گی' اگر یہاں رہنا ہے تو میری بات ماننا پڑے گی۔ ورنہ پنڈ جانے کی تیاری پکڑو۔ تمہارا باوا خود ہی وہاں کوئی ریڑھی والا دیکھ کر تمہاری شادی کردے گا۔" بی جی جانتی تھیں کہ پنڈ جانے سے وہ کتنا گھبراتی ہے' تب ہی دھمکی دی تھی' جبکہ اس کی زبان درازی پر ان کا دل کررہا تھا کہ اسے ابھی پنڈ پھینک آئیں۔

"دیکھو تو چوہدری جی۔۔۔ یہ چھٹانک بھر کی چھوکری (لڑکی) بوڑھی دادی کو دھمکیاں دے رہی ہے۔" بی جی نے شاید شیر بلند خان کا نام اس کے منہ سے نہیں سنا تھا۔ تب ہی غصے سے پھولے ہوئے نتھنوں کے ساتھ دادا جی کو مخاطب کیا۔

"اگر بچی راضی نہیں ہے تو اتنی جلدی مت کرو۔" جاسوں نے ممنون نظروں سے انہیں دیکھا۔

"مشورے تو ایسے دے رہے ہو۔ جیسے آپ کچھ جانتے ہی نہ ہوں۔" بی جی بڑبڑاتے ہوئے رخ موڑ گئیں "اور تم" بی جی نے اس کی طرف انگلی اٹھائی "تم جاؤ پنڈ جانے کی تیاری کرو یا شادی کا جوڑا خریدنے کے لیے بازار جانے کی تیاری' غضب خدا کا بھلے کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔ میں کیسے اپنا پنڈ اپنی مٹی چھوڑ کر اس موئے شہر میں رہ رہی ہوں۔ جہاں ایک دن پانی بند' تو ایک دن بجلی بند اور کبھی آدھی روٹی پکی ہوتی ہے اور گیس ہوجاتی ہے بند۔ مگر تمہیں احساس تک نہیں کہ بوڑھی دادی کیسے تم لوگوں کے اچھے مستقبل کے لیے اپنی مٹی سے دور بیٹھی ہوئی ہے۔ صرف اس لیے کہ تم لوگ پڑھ لکھ جاؤ اور اوپر سے تمہارے ماں' پیو بھی کہتے تھے بی جی آپ بچوں کو لے کر شہر میں رہیں۔ ہم آہستہ آہستہ زمین بیچ کر آپ کے پیچھے آجائیں گے۔ بعد میں کہہ دیا بی جی شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں' کوئی کاروبار نہیں ہے۔ ہم نے سوچا ہے ہم کھیتی باڑی ہی کریں گے۔ لو بھلا اب میں تنہا کب تک شہر میں پڑی رہوں' مہینے میں ایک دو بار آکر مل جاتے ہیں' مگر اب میں فون کرتی ہوں۔ تمہارے پیو کو اور کہتی ہوں کہ سنبھالو اپنی اولاد کو۔ مجھ سے نہیں سنبھلتی۔" بی جی غصے سے مسلسل بولے جارہی تھیں۔ ایک تو پہلے ہی نسرین کی دھمکیوں سے بی جی پریشان تھیں اور اوپر سے اس کی زبان درازی بی جی کو کھولا کر رکھ گئی تھی۔

"ناں اس گھر میں باقی بھی تین بچیاں ہیں مگر کبھی کسی میں اتنی جرات نہیں ہوئی کہ وہ میرے سامنے زبان کھولے۔" بی جی کے کہنے پر باقی تینوں نے سعادت مندی سے سر جھکالیا' جبکہ دل ہی دل میں جاسوں کی حالت پر خوب محظوظ ہورہی تھیں۔ جاسمین کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

"آپ نے بھی تو کبھی دوسروں کی طرح مجھے اچھا نہیں سمجھا۔ آپ نے ہمیشہ میری ماں کے چلے جانے کا بدلہ مجھ سے لیا ہے۔ صرف اس لیے کہ میری شکل ان سے ملتی ہے۔ اگر میری ماں ہوتی تو وہ کبھی میرے ساتھ ایسا نہ کرتیں۔" اس نے غصے سے کہا تھا اور دھم دھم کرتی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی' جبکہ اس کے کہنے پر بی جی کے ساتھ دادا جان نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں صرف دکھ تھا۔

☆ ☆ ☆

"خیریت بی جی... آپ نے مجھے ایمرجنسی میں بلایا۔" ہاشم علی آدھے گھنٹے میں بی جی کے کمرے میں ان کے ساتھ بیٹھا پوچھ رہا تھا اور پھر بی جی نے نسرین کی بچیوں کے مطالبے سے لے کر جاسمین کی جلد شادی کرنے کی وجہ سب کچھ بتادیا تھا۔

"بعض اوقات بی جی! ہم غلط فہمیوں کا شکار ہو کر ایسی باتیں فرض کرلیتے ہیں۔ جن کا حقیقت میں کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ ہوسکتا جیسا آپ سوچ رہی ہیں جاسمین ویسا نہ سوچتی ہو۔ وہ اپنی مدر کے پاس نہ جانا چاہتی ہو۔" ہاشم نے تمام باتیں سننے کے بعد سوچتے ہوئے کہا۔

"بیٹا اس کی ہر بات تو ماں کے ذکر پر ختم ہوتی ہے۔ کیسے سوچ لوں کہ وہ ماں کے پاس جانا نہیں چاہتی۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ وہ اپنی ماں کے پاس جاکر خوش رہے گی تو شاید میں دل پر پتھر رکھ کر اسے بھیج دیتی۔ مگر میں جانتی ہوں۔ وہ وہاں خوش نہیں رہے گی۔ اس کی صرف شکل اپنی ماں سے ملتی ہے۔ باقی وہ اس سے بہت مختلف ہے۔" بی جی بہت دلگرفتہ اور تھکی سی لگ رہی تھیں۔

"پھر بھی بی جی ایک بار آپ کو جاسمین سے بات ضرور کرکے دیکھنی چاہیے۔ یقیناً" اس سے بات کرنا بہتر ہوگا۔" ہاشم نے بی جی کو پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہ پتر۔ اس کا کیا پتا کہ فوراً" اماں کے پاس جانے کی حامی بھر لے۔ اگر وہ چلی گئی تو میرا پتر ایک بار پھر بکھر جائے گا اور میں۔ میں تو دوسرا سانس تک نہیں لوں گی۔ میں اپنے بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" بی جی نے رونا شروع کردیا تھا۔ ہاشم ان کے رونے سے گھبرا گیا۔ وہ مختصر عرصے میں ہی انہیں دل کے قریب محسوس کرنے لگا تھا۔

"پلیز بی جی روئیں مت۔ بتائیں آپ کیا چاہتی ہیں؟ ویسا ہی ہوگا۔" اسے ابھی ابھی ادراک ہوا وہ بی جی کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کرسکتا۔

"میں چاہتی ہوں کہ جاسمین کی شادی نہیں تو کم از کم نکاح ہی کردوں۔ شادی اس کی رضامندی کے بعد ہوجائے گی۔ مجھے پتا ہے۔ وہ نسرین یقیناً" اپنے کسی مفاد کے لیے میری بچی کو لے جاکر اس کی شادی کروادے گی۔ جاسمین کا نکاح ہوگیا تو یقیناً" پھر ادھر کا رخ نہیں کرے گی اور میری زینت تو اتنی معصوم ہے کہ اسے جو کہوں گی خاموشی سے مان لے گی۔" بی جی نے اپنے آنسو دوپٹے کے پلو سے صاف کرکے دوبارہ چشمہ لگاتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کو اور ماموں لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہے' لڑکا پسند ہے تو نکاح کردیتے ہیں۔ میں جاسمین کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ یقیناً" مان جائے گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" ہاشم نے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے محبت سے کہا۔

"مجھے اپنے پتر سے اسی سعادت مندی کی امید تھی۔ تمہیں دیکھتی ہوں تو امریکا سے بھی شکوے ختم ہونے لگتے ہیں۔" بی جی کے معصومیت سے کہنے پر ہاشم نے بے ساختہ ہونٹوں تک آنے والی مسکراہٹ چھپائی۔ "اگر تمہارے والدین ادھر ہوتے تو میں کبھی

بھی تمہیں نکاح کا بندوبست کرنے کے لیے نہ کہتی۔ مگر تمہاری ماں سے کچھ دیر پہلے آنے کے متعلق پوچھا تھا' مگر اس نے کہہ دیا کہ اسے آنے میں چند دن لگ جائیں گے۔ اگر تم خود ہی نکاح کی تیاری کرسکتے ہو تو کرلو۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔" بی جی نے چند منٹ پہلے نسرین سے فون پر ہونے والی گفتگو اس کو بتائی۔

"ممی ڈیڈی نہیں ہوں گے نکاح میں تو اچھا نہیں لگے گا۔ مگر مجبوری ہے کہ ان کے بغیر ہی نکاح ہورہا ہے۔" ہاشم واقعی افسردہ تھا۔

"تم پریشان مت ہو پتر۔ رخصتی ان کی موجودگی میں دھوم دھام سے ہی ہوگی میرے بچوں کی۔" بی جی نے نہال ہوتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"میں جاسمین سے مل کے آتا ہوں بی جی۔" ہاشم کھڑا ہوا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ساتھ والا کمرہ لڑکیوں کا ہی ہے۔" بی جی نے جلدی سے کہا۔ وہ سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ ہاشم نے ایک نظر بی جی کے برابر والے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور انگلی سے دستک دی۔

"کون۔۔۔" جاسمین نے سوں۔۔۔ سوں کرتی ناک کے ساتھ پوچھا۔ اس سے ہمدردی جتاتی تینوں نے بھی بند دروازے کو دیکھا۔

"میں ہوں ہاشم علی۔" وہ سب ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔

"کیا۔۔۔ کیا کام ہے ہاشم بھائی۔" زینی نے فوراً پوچھا۔

"دروازہ کھولیں' مجھے جاسمین سے کچھ بات کرنی ہے۔" اگلے ہی لمحے اندر کھلبلی مچی اور دروازہ کھل گیا۔ ہاشم نے ایک نظر ان سب کے حیرت زدہ پر تشویش چہرے کو دیکھا اور اندر چلا آیا۔ "کون ہے۔" جاسمین واش روم سے لنگڑاتے ہوئے نکلی۔ ہاشم کے اندر آنے سے پہلے وہ واش روم میں گھس گئی تھی۔

"اچھا آپ ہیں۔" وہ دونوں آنکھوں کو ناک کے ساتھ لگاتے ہوئے ٹیڑھی کرکے اسے دیکھ کر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی چیئر پر بیٹھ گئی۔ "کیسی طبیعت ہے آپ کی۔" ہاشم گہری ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"آپ کے سامنے ہی ہوں۔" اس نے سعادت مندی سے کہا۔ ہاشم چند لمحے خاموش رہا۔ شاید بات کرنے کے لیے مناسب لفظ ڈھونڈ رہا تھا۔ "میں آپ سے کچھ کہنے آیا ہوں۔"

"اگر بی جی نے آپ کو مجھے سمجھانے بھیجا ہے تو۔ چلے جائیں اور جاکر ان سے کہہ دیں کہ میں ڈاکٹر بنے بغیر ہرگز شادی نہیں کروں گی۔" وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بولی۔ ہاشم کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ "آپ ڈاکٹر بن رہی ہے؟"

"ہاں۔۔۔ جیسے ہی میرا رزلٹ آئے گا۔ میں کسی اسپتال میں جاب کے لیے اپلائی کروں گی۔ آپ بی جی کو سمجھائیں کہ وہ پہلے مجھے ڈاکٹر بنا جی بننے دیں۔ پھر چاہے جس سے مرضی شادی کردیں۔ میں اعتراض نہیں کروں گی۔" آنکھیں ٹیڑھے پن سے تھکنے لگی تو اس نے سر جھکالیا۔

"ویری سیڈ۔۔۔" ہاشم کو نئے سرے سے دکھ ہوا کہ اتنی قابل اور محنتی لڑکی کی ایسی حالت۔۔۔ اس نے کئی بار سرسری سا ذکر مما کے منہ سے سنا تو تھا کہ ماموں کی کوئی بیٹی ڈاکٹر بن رہی ہے۔ مگر وہ لڑکی جاسمین ہوگی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

"مجھے آپ کی خواہش کا احترام ہے اور یقیناً" بی جی بھی ایسا ہی چاہتی ہیں۔ تب ہی انہوں نے کہا ہے کہ وہ صرف آپ کا نکاح کریں گی رخصتی تب ہی ہوگی۔ جب آپ کی اپنی مرضی ہوگی۔ آپ کو بی جی کی مجبوری سمجھنی چاہیں۔"

"بی جی نے واقعی کہا کہ وہ صرف میرا نکاح کریں گی رخصتی نہیں۔" جاسمین ایک دم جوش سے کھڑی ہوئی۔ مگر ہاشم پر نظر پڑتے ہی مصنوعی آہ بھر کے رہ گئی۔ یہ کیا کم خوشی تھی کہ رخصتی اس کے ڈاکٹر بننے کے بعد ہوگی۔

"بالکل بی جی نے یہ ہی کہا ہے۔" ہاشم سے اس کی

خوشی چھپی ہوئی نہیں رہی تھی۔ تب ہی مسکرایا۔ باقی تینوں نے بھی ایک دوسرے کے ہاتھ دبائے خوشی سے۔

"مگر میں کون سا بھاگی جارہی ہوں۔ جو نکاح کرنا ضروری ہے۔" جاسمین کو ایک بار پھر اعتراض کے ساتھ بی جی سے شکوہ ہوا۔

"آپ کے لیے یہ بہتر نہیں ہے کہ رخصتی آپ کی مرضی پر ہوگی۔"

"یہ تو ہے۔" وہ سرہلا کر رہ گئی۔ ہاشم کے جاتے ہی وہ خوشی سے جھوم اٹھی تھی۔ ہاشم کے بتانے پر کہ وہ اس فیصلے پر رضامند ہے' بی جی اور دادا جان بھی پرسکون ہوگئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ہاشم بی جی نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے نکاح کی سب تیاری کرلی ہے اور کل نکاح ہے۔" پروین نے فون پر ہاشم سے پوچھا۔

"جی ممی۔۔۔ آپ لوگ ادھر ہوتے تو یہ تیاری آپ کرتیں۔ مگر آپ فکر نہ کریں۔ سب کچھ میں بہت اچھے سے سنبھال لوں گا۔ رخصتی آپ کی موجودگی میں ہی ہوگی۔ مجھے پتا ہے۔ آپ اپنی فیملی میں ہونے والی پہلی شادی میں شامل نہ ہونے پر دکھی ہوں گی۔"

"فیملی کے بچے۔ شرم نہیں آتی ماں سے یوں غیروں کی طرح بات کرتے ہوئے۔ سچ کہتی تھی بی جی کہ اسے امریکا مت بھیجو۔ گوروں کی زبان بولنے لگے گا۔ مگر تم اپنے والدین کو اتنا غیر اہم کردو گے۔ یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ تم نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے ہاشم۔" پروین پھوپھو کی آواز آنسوؤں میں بدلی تو انہوں نے فون بند کردیا تھا۔ ہاشم۔۔۔ ممی' ممی کرتا رہ گیا تھا۔ مگر انہوں نے فون بند کردیا تھا۔ پھر وہ کتنی دیر مسلسل کال کرتا رہا تھا۔ مگر انہوں نے کال ریسیو نہیں کی۔ وہ ممی کی ناراضی کی وجہ سوچتے سوچتے سوگیا تھا۔ کوئی اسے ایسی قابل گرفت بات نظر نہیں آئی تھی۔ جس پر ممی اس سے یوں ناراض ہوتیں۔

"وقاص۔۔۔ چھوڑیں ساری میٹنگز اور سارے کام۔ فوراً پاکستان چلنے کی تیاری کریں۔ بیٹا اگر ہمیں پرایا بنا رہا ہے تو میں ہرگز اس کی خوشی میں شریک ہوئے بغیر نہیں رہوں گی۔" پروین نے وقاص علی سے روتے ہوئے کہا تھا اور وہ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ مایوس تو وہ بھی اکلوتے بیٹے سے ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"بی جی کہہ رہی ہے کہ ہم سب جاکر نکاح پر پہننے کے لیے کپڑے لے آئیں۔" روبی کے کہنے پر زینی اور زیبی دونوں ہی جلدی' جلدی تیار ہونے لگی تھیں۔ جبکہ وہ ہنوز کمبل میں دبکی رہی۔

"اب تم بھی اٹھ جاؤ۔ تمہیں بھی اپنے نکاح کے لیے کوئی ڈریس خریدنا ہوگا۔" روبی نے اس کے اوپر سے کمبل کھینچ کر اتارا۔

"مجھے کہیں نہیں جانا۔ خود ہی جو مرضی ہو۔ وہ لے آنا۔" اس نے چڑے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے دوبارہ کمبل سینے تک اوڑھ لیا۔ روبی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کہیں نکاح سے مکرنے کا تو ارادہ نہیں ہے۔ دیکھو' اب اگر تم نے کوئی بھی شوشا چھوڑا تو بی جی نکاح کے ساتھ تمہاری رخصتی بھی کردیں گی۔"

"بی جی اور کر بھی کیا سکتی ہیں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بھئی اگر بی جی کو مجھ سے کوئی مسئلہ ہے تو کھل کر مجھ سے کہیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ بس کسی کے نام میری رجسٹری کروانی ہے چاہے شادی کرواکر چاہے نکاح کرواکر۔ میں خود کو کسی نئے رشتے کے لیے تیار نہیں کرپارہی تو اس میں میرا کیا قصور۔" وہ بے حد الجھی ہوئی تھی۔

"کچھ فیصلے دوسروں کی بات رکھنے کے لیے کیے جاتے ہیں میری جان۔۔۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو بی جی جہاں میری شادی کرنا چاہتی میں آنکھیں بند کرکے کرلیتی۔" روبی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو میں کون سا یہ کہہ رہی ہوں کہ مجھے شیر بلند خان

سے نہیں بلکہ کسی اور سے شادی کرتا ہے۔ میں تو یہ کہہ رہی کہ مجھے پہلے ڈاکٹر بن جانے دیں، پھر چاہے کسی قصائی سے ہی میری شادی کردیں۔ میں انکار نہیں کروں گی۔ مگر ہمارے ہاں بدقسمتی سے اکثر گھرانے چھوٹوں کو کچھ زیادہ ہی چھوٹا سمجھ لیتے ہے۔ ان سے مسئلے مسائل ڈس کس نہیں کرتے۔ فضول خیال کرتے ہیں۔ اب بی جی کو دیکھ لو۔ کسی مسئلے کی وجہ سے ہی میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔ مگر بار بار پوچھنے پر بھی ہمیں بتانا ضروری نہیں سمجھتیں، بلکہ ابو جی اور باقی سب کو بھی یقیناً" انہوں نے ہی منع کیا ہے۔ تب ہی کوئی بھی کچھ بتانے کو راضی نہیں ہے۔" جاسمین کو خود کو مسئلے سے دور رکھنے پر بے حد غصہ آرہا تھا اور بی جی سے بھی ڈھیر سارے شکوے ہو رہے تھے۔

"جب تمہیں پتا ہے بی جی ہمیں کچھ نہیں بتائیں گی۔ یقیناً" وہ ہمیں پریشان نہیں کرنا چاہتی ہوں گی۔ ان کے نہ بتانے کی یہ ہی وجہ ہوسکتی ہے۔ اب بھی یہ ہی ہوگی تو پریشان ہونے کا کیا فائدہ۔ اب اٹھو بازار چلتے ہیں۔" روبی نے کہنے کے ساتھ اس کا بازو کھینچا۔

"میرا دل نہیں کررہا بازار جانے کو تم اپنی پسند سے کچھ بھی لے آنا اور اب پلیز مجھے سونے دو۔" وہ دوبارہ کمبل میں منہ چھپا گئی۔" روبی بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

"ٹھیک ہے نا زبیدہ بہو' نکاح سادگی سے کرلیتے ہیں اور جب اپنی جاسمین بیٹی کی ہاشم کے ساتھ رخصتی کریں گے تو سب رشتے داروں کو بلائیں گے۔ رخصتی پر خوب دھوم دھڑکا کریں گے۔" بی جی بہو کے ساتھ کچن میں کام نمٹاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ تب ہی وہ سب تیار ہو کر آگئیں۔

"چلیں امی جی۔" زبی کے کہنے پر بی جی نے ایک نظر انہیں دیکھا اور جاسمین کو نہ پاکر فوراً" اس کی عدم موجودگی کا پوچھا۔ "بی جی۔ وہ کہہ رہی ہے کہ ہم خود ہی اس کے لیے کپڑے لے آئیں۔" بی جی روبی کے کہنے پر کچھ سوچ کر سر ہلا گئیں۔

"زبیدہ بچیوں کے ساتھ ہی رہنا اور ہاں ہاشم کے لیے بھی کوئی اچھا سا ریڈی میڈ سوٹ خرید لینا۔ بچے کے ماں' پھپو تو ملک سے دور بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں ہی اس کا خیال کرنا ہے۔ بچہ بڑا نیک بچہ ہے۔ کھوسہ میں تمہیں کچھ اور پیسے دیتی ہوں۔" بی جی بہو کو ہدایتیں دیتے ہوئے کچن سے باہر نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

آج چونکہ نکاح تھا اس لیے صبح سے ہی افراتفری کا سماں تھا۔ چند خاص رشتے داروں اور ملنے ملانے والوں کو بلاتے بلاتے بھی خاصے مہمان جمع ہوگئے تھے۔ کیونکہ چوہدری ہاؤس میں یہ بچوں کے حوالے سے پہلا فنکشن تھا۔ تب ہی ہر چیز پر خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ ابھی بھی کچن میں کئی ڈشز بنانے کے ساتھ بازار سے ریڈی میڈ بھی کچھ نہ کچھ منگوایا گیا تھا۔ دس بجے کے قریب بی جی نے ہاشم کو بھی ناشتا چوہدری ہاؤس میں کرنے کے لیے بلالیا تھا۔ مقصد یہ ہی تھا کہ وہ اپنے نکاح کے دن اپنے ماں' پھپو کو اپنے ساتھ نہ پاکر دکھی نہ ہو۔ ان کا خیال تھا یہاں رہے گا تو مہمانوں کے ساتھ بہلا رہے گا۔ کیونکہ وہ خود بھی پروین اور وقاص علی کی غیر موجودگی پر افسردہ ہو رہی تھیں۔

"روبی پتر' ہاشم بھائی کو بیسن کا حلوہ پلیٹ میں نکال کردو۔" بی جی نے اسے ناشتے سے ہاتھ کھینچتے دیکھ کر روبی سے کہا۔ ہاشم نے چونک کر بی جی کو دیکھا۔ جو کتنی بار زبی کو روبی بول کر کام کروا رہی تھیں۔

"بی جی' روبی کوئی مہمان آئی ہے۔" بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ دروازے کی جھری سے جھانکتی جاسمین کے ساتھ وہ تینوں بھی اپنی جگہ سے اچھل پڑیں۔ بی جی نے اپنا چشمہ ناک پر جماتے ہوئے بغور ہاشم کو دیکھا۔

"روبی کوئی مہمان تھوڑی ہے۔ تمہارے بڑے ماموں کی بڑی بیٹی ہے۔" اس سے پہلے کہ بی جی بولتیں' گاؤں سے آئی پھوپھی خورشید نے بھنویں اچکا کر جیسے جتایا۔

"مگر بڑے ماموں کی بڑی بیٹی تو زیب النساء ہے۔"

مطلب زینی۔" ہاشم ابھی تک الجھا ہوا تھا۔

"ارے پتر' زینی چھوٹی اور روبی بڑی ہے۔" بی جی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مگر روبی مجھے نظر کیوں نہیں آرہی۔" ہاشم نے کوفت سے ایک نظر چٹائی پر بیٹھی تمام لڑکیوں کو دیکھا اور ان تینوں نے بے ساختہ نظر چرائی۔

"پتر تو' تو خود امریکا کا ڈاکٹر ہے۔ اگر نظر اتنی ہی کمزور ہوگئی تھی تو چیک کرلیتے' نہیں تو کسی دوسرے ڈاکٹر کو دکھاتے۔ آج کل کے بچے اپنا خیال کب رکھتے ہیں۔ جسے دیکھو نظر کا چشمہ لگا ہوا ہے۔ ایک ہماری جوانی تھی۔ نظر اتنی تیز کے اڑتی چڑیا کے پر گن لیا کرتے تھے۔" دادا جان کیسے جوانی کا تبصرہ کیے بغیر رہتے۔

"ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔ بن ماں کی بچی اتنی بھاری ہوگئی تھی کہ اتنی جلد بازی میں کسی انے کانے سے بیاہ رہی ہو۔" پھوپھی خورشید نے دونوں گال پیٹتے ہوئے طنزاً" انداز میں بی جی کو دیکھا۔ اس الزام پر بی جی کے تو ہاتھ پیر ہی پھول گئے تھے' جبکہ ہاشم نے ایک نئی الجھن سے کہنے والی اور پھر بی جی کو دیکھا۔ میں نے تو سنا ہے کہ شیر بلند خان پڑھا لکھا خوش شکل جوان ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کہیں بی جی جلد بازی میں کسی ایسے ہی شخص سے تو جاسمین کی شادی نہیں کر رہیں۔ پھر میں نے یہ کیسے سوچ لیا کہ جاسوں کے ساتھ اتنے مسئلے ہونے کے باوجود کوئی مکمل نارمل انسان اسے مل سکتا ہے۔ یقیناً" پھوپھی کی بات صحیح ہے۔

"ارے بیٹا۔۔۔ کس سوچ میں ڈوب گئے۔ پریشان مت ہو۔ یہ میرا چشمہ لگا کر دیکھو۔ شاید تمہیں روبی نظر آجائے۔" بی جی نے فوراً" اپنا چشمہ اتار کر اسے پیش کیا۔ پہلے تو وہ کچھ سمجھا ہی نہیں۔ تب ہی بی جی کو حیرت سے دیکھا۔ پھر سمجھا تو۔۔۔

"اوہو! میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ میری نظر چلی گئی ہے۔ میں تو کہہ رہا ہوں کہ۔۔۔"

"نظر آپ کی گرل فرینڈ تھی۔" روبی نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بات گھمانے کے لیے بات۔۔۔ جاسمین نے اپنی فوج کو میدان میں اترتے دیکھ کر کب کا رکا سانس بحال کیا۔

"آپ نظر کو بھول جائیں ہاشم بھائی۔" روبی کے کہنے پر ہاشم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر زینی نے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

"آپ کو اس کم بخت نظر کو بھولنا ہی ہوگا۔ ورنہ ہمیں ایسا رشتہ منظور نہیں ہے۔ ہے نا بی جی۔" زینی کو بہن کی فکر ہوئی۔ تب ہی دھمکی دی۔ پھوپھی خورشید کھانا چھوڑ کر گول گول نظریں گھماتے ہوئے۔ بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"اوہو۔۔۔ یہ رشتہ بیچ میں کہاں سے آگیا' میں تو کہہ رہا ہوں کہ میری نظر کمزور نہیں ہے۔ مجھے آپ سب لوگ نظر آرہے ہو۔ بس وہ۔۔۔"

"چوہدری جی۔۔۔ مگر مجھے نظر کیوں دکھائی نہیں دے رہی۔ ہائے میرے ربا۔ میری جاسمین کا کیا ہوگا۔ ہائے۔۔۔ ہاشم ہماری تو سات نسلوں میں کوئی امریکا کی گوری نظر نہیں آئی۔" بی جی تو گہرے تفکر کے ساتھ باقاعدہ رونے والی ہوگئی تھیں۔

"یہ چند چڑھانا رہ گیا تھا۔" پھوپھی خورشید نے ناک سے مکھی اڑائی' جبکہ ہاشم کا دل چاہا۔ اپنا سر دیوار کے ساتھ مار دے۔

"چھوڑیں ساری باتیں بی جی۔ بس اتنا بتا دیجیے کہ دونوں ماموں کی دو' دو بیٹیاں ہی ہیں نا اور چھوٹے ماموں کی بڑی بیٹی بیمار ہے جاسمین۔" ہاشم نے اپنی طرف سے پوری بات سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ اسی مجبوری میں اسے جاسمین کی بیماری کا ذکر بھی کرنا پڑا

"اور نہ ہی میری کوئی گوری' کالی گرل فرینڈ ہے۔"

"ہائے۔۔۔ میں مر گئی۔ میری لاڈلی میری جاسمین کو کون سی بیماری لگ گئی۔ پتر تو ٹھیک نہیں تھی تو مجھے بتایا کیوں نہیں۔" بی جی نے بین کرنے والے انداز میں روتے ہوئے دیوار پر لگی جاسمین کی تصویر کو مخاطب کیا۔ ہاشم نے جھنجلا کر بی جی کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور رو دینے کے قریب ہوگیا۔ جہاں اس کے خیال میں زینی کی تصویر لگی ہوئی تھی' جبکہ بی جی کے رونے پر اندر کھڑی جاسوں کی آنکھیں بھی

بھیگ گئی تھیں۔

"بی جی میں زینی کی بات نہیں کر رہا۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔" ہاشم نے دانت پیس کر کہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میری زینی تو بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔" بی جی نے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی زینی کو خود سے لگاتے ہوئے پھوپھی کو دیکھا۔ جو ان کی بات پر منہ بسور گئیں۔

"بی جی کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہیں۔ جنت ٹھیک ہے۔ بس اس کی ذرا سی یادداشت کمزور ہے۔" ہاشم کو بی جی کا جنت سے بے وقت کا پیار ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ "مجھے کیا ہوا ہے۔" بی جی جلدی سے زینی کو چھوڑ کر سینے پر ہاتھ رکھ کر مشکوک نظروں سے ہاشم کو دیکھنے لگیں۔

"بی جی آپ کی یادداشت کمزور ہو گئی تھی تو ہمیں بتایا کیوں نہیں۔ گاؤں سے آپ کے لیے باداموں کا حلوہ بنا کر بھیج دیتے۔" نوازش علی جو کب سے الجھے سے بیٹھے تھے۔ ایک دم فکر مند ہوئے۔

"بی جی کو کچھ نہیں ہوا ماموں جی۔ جنت کی یادداشت تھوڑی ویک ہے۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے جھنجلایا۔

"تمہارا مطلب ہے میں کملی ہوں۔ یہ ہی دن دیکھنا رہ گیا تھا کہ نواسا اٹھ کر بی جی کو کملی بول دے۔" بی جی نے دوپٹے سے ناک رگڑی۔ رامش اور دانش اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے رخ موڑ گئے۔

"میں نے آپ کو کب کملی کہا ہے بی جی۔" ہاشم رو دینے کے قریب تھا۔

"بیٹا ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ جنت کی یادداشت کمزور ہے۔" دادا جان نے پریشان الجھے چہرے کے ساتھ تحمل سے کہا۔

"جنت کی یادداشت کمزور ہونے میں بی جی کیسے کملی ہو گئیں۔" وہ الجھا سا اٹھ کھڑا ہوا۔ "پتا نہیں میں پاگل ہو گیا ہوں یا آپ سب کو کچھ ہو گیا ہے؟"

"زینی پتر! پانی کا گلاس دو۔ ورنہ کوئی اور نہ ہو۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اتنا تو کبھی جوانی میں خوار نہیں ہوا' جتنا اس وقت ہو رہا ہوں۔" دادا جان کے کہنے پر زینی نے جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر ان کی طرف بڑھایا۔ ہاشم جو یہاں سے جانے بلکہ بھاگنے لگا تھا ٹھٹک کر رک گیا۔

"ایک منٹ نانا جان۔ یہ تو پروین ہے نا' پھر آپ اسے زینی کیوں بول رہے ہیں۔" ہاشم کو لگ رہا تھا کہیں کچھ غلط ہے۔ کیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس کے کہنے پر اندر کھڑی جاسمین کے ساتھ باقی تینوں کا بھی سانس رک گیا تھا۔ ابھی سے وہ بی جی کے ہاتھوں میں اپنا گلا دیکھ رہی تھی۔ جبکہ اس کے کہنے پر دادا جان نے منہ کی طرف گلاس لے جاتے رک کر اسے یوں دیکھا۔ جیسے اس کی دماغی حالت پر شک ہو۔ پھوپھی دانتوں میں انگلی دبائے۔ ابھی سی بیٹھی تھیں۔ اپنی تمام تیز طراری کے باوجود خاک پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

"ہائے۔۔۔ میری پروین کا پتر پاگل ہو گیا۔ کہا بھی تھا کہ اسے امریکا مت بھیج۔ یقیناً" امریکا والوں نے کچھ گھول گھال کر پلا دیا ہو گا۔ وہ ہی تو قاتل پاکستانیوں کے دشمن ہیں کہاں دیکھا گیا ہو گا کہ ان کے ملک میں بننے والا ڈاکٹر پاکستان کی خدمت کرے۔ ہائے ربا' میری چھوکری کا چھوکرا کملا ہو گیا۔" بی جی تو اسے پاگل خیال کر کے منہ پر کپڑا رکھ کر بھا۔۔۔ بھا۔۔۔ کرنے لگی تھیں۔ ہاشم ان کے بین پر شرم سے پانی پانی ہو گیا تھا۔ لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں نے بھی اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے چہرہ ضرورت سے زیادہ ہی جھکا لیا تھا۔ بی جی کے رونے پر جاسمین بے ساختہ دروازے کی طرف بڑھی کہ اسے سب سچ بتا دینا چاہیے۔ مگر پھر بی جی کے ممکن ردعمل پر اپنی رخصتی کے خیال نے اس کے قدم روک دیے۔

"بی جی میں پاگل نہیں ہوا ہوں۔ نہ امریکا نے مجھ پر کوئی منتر پڑھ کر پھونکا ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ زینی نہیں' بلکہ پروین ملوترہ ہے اور یہ زینی ہے۔" اب کی بار ہاشم نے باقاعدہ روبی کو زینی اور زینی کو پروین ملوتر ثابت کرنے کے لیے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"پھر وہی مرغی کی ایک ٹانگ۔ ہم کیوں ہندوؤں

کے نام رکھنے لگے' ملوترہ۔" بی جی نے منہ بنایا۔" میں کیسے اپنی بیٹی کو بتاؤں کہ اس کا لڑکا پاگل ہو گیا ہے۔"
بی جی پھر رونے لگیں۔
"تمہیں کچھ سمجھ آرہی ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔" پھوپھی خورشید نے برابر بیٹھی اپنی بہو سے پوچھا اور اس کے نفی میں سر ہلانے پر حیرت سے بولیں۔ "مجھے بھی کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ ویسے بی جی کو کملی ہوتے دیکھ کر مزا ضرور آرہا ہے۔" پھوپھی خورشید چٹخارہ لے کر بولیں۔
"دیکھ پتر! اپنی ڈاکٹری چمکانے کے لیے ہمیں پاگل نہ کر۔ بس جو میں بولوں' اسے مان لینا اور خاموشی سے مان لینا۔" دادا جان نے جیسے منت کی اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔
"دیکھ پتر یہ روبی ہے اور یہ زیبی ہے۔ ہمارے خاندان میں ایک ہی پروین ہے۔ جو خوش قسمتی سے یا بد قسمتی سے تمہاری ماں ہے۔" دادا نے تحمل سے کہتے ہوئے روبی اور زیبی کو کندھے سے پکڑ کر الگ الگ کیا۔ ہاشم مزید الجھ گیا۔ "قسم سے اتنا تنگ تو میں تب بھی نہیں آیا تھا۔ جب جوانی میں تمہاری بی جی مجھے لفٹ نہیں کرواتی تھی۔" دادا جان بھی اس ڈرامے سے خوب بے زار ہوئے تھے۔
"مجھے آپ کو لفٹ نہ کروانے کی سزا مل رہی ہے چوہدری جی۔ تب ہی تو میری لڑکی کا لڑکا پاگل ہو گیا۔" بی جی تو صدمے سے پاگل ہوئی جا رہی تھیں۔ ہاشم نے کوفت سے بی جی کو دیکھا۔ ایک تو ان کا واویلا اسے کچھ سوچنے سمجھنے کا وقت ہی نہیں دے رہا تھا۔
"میں یہاں چند منٹ مزید رکا تو ضرور پاگل ہو جاؤں گا۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں اپنے بال جکڑے۔
"ہائے میرا سوہنا پتر!" اس کو بال نوچتے دیکھ کر بی جی کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ "نہ میرا پتر! پریشان نہیں ہوتے۔ ابھی تمہاری ماں کی ماں تمہاری بی جی زندہ ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہونے دے گی۔ میں آج ہی بابا مرحوم دوائی والے کے پاس جاتی ہوں اور تمہارے لیے تعویذ اور دوائی لے کر آتی ہوں۔ دیکھنا تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔" بی جی نے محبت سے اس کے سر اور چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے امید دلائی۔
"ایک مرحوم اوپر سے دوائی والا۔" رامش نے دانش کے کان میں مسخرے پن سے سرگوشی کی اور دونوں دھیما دھیما ہنسنے لگے' جبکہ ہاشم نے بھی دل ہی دل میں لاحول ولا قوۃ کہا تھا۔
"بی جی میں ابھی پاگل نہیں ہوا' لیکن لگ رہا ہے کہ یہاں کچھ دیر مزید رہا تو ضرور ہو جاؤں گا۔" ہاشم نے بے بسی سے دائیں بائیں دیکھا' پھر ایک دو لمبے سانس لیتے ہوئے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔
"بی جی آپ اور نانا جان تحمل سے اور سکون کے ساتھ میری صرف ایک بات کا جواب دے دیں۔ پھر تھوڑی بہت ہم ایک دوسرے کی بات سمجھ جائیں گے۔"
"پوچھو بیٹا۔ جلدی پوچھ لو' جو بھی پوچھنا ہے۔ ورنہ میرا تو دم نکل جائے گا۔ بس اس بحث کو جتنی جلدی ممکن ہو۔ ختم کرو۔" بی جی نے فوراً" اجازت دی۔
"ہو سکتا ہے۔ جو بات میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ آپ نے رشتے داروں سے چھپائی ہو۔ اس لیے مجھے لگتا ہے۔ ہمیں یہ بات تنہائی میں کرنی چاہیے۔" ہاشم کے کہنے پر پھوپھی خورشید نے ایک لمبے ہوں کے ساتھ آنکھیں گھمائیں۔ مانو دال میں کچھ کالا ہے۔ انہوں نے ہاتھ رگڑے۔
"چلو بیٹا۔ جہاں مرضی لے چلو۔ بس بحث ختم کرو۔" بی جی اور دادا جان نے پہلے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر دادا جان ہاشم سے بولے اور تینوں کونے میں چلے گئے۔ مہمانوں کی نظریں ان پر ہی تھیں' جبکہ پھوپھی نے دوپٹا کان سے ہٹاتے ہوئے کان بھی اس طرف لگا دیے۔
"نانا جان اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں کبھی بھی آپ دونوں سے یہ بات نہ کرتا۔" ہاشم نے تمہید باندھی۔ اسے بہت آکورڈ لگ رہا تھا۔ جنت کے بارے میں نانا جی سے بات کرنا۔

"پوچھو بیٹا۔ بس پوچھ لو۔" دادا جی نے الجھتے ہوئے کہا۔ "جنت جنت ہے۔ وہ آپ کی بیٹی اور میری خالہ ہے نا۔"

"ہائے۔۔۔ میرے مولا۔۔۔ اب بہت ہو گیا۔ بس اب نیچے آکر ہمارا یہ سیاپا ختم کروا دے۔" بی جی تو اس کی بات پوری ہوتے ہی سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بین کرنے لگی تھیں۔ باقی سب بھی گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے' جبکہ ہاشم کو اس رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ تب ہی سٹپٹا کر پیچھے ہوا۔

"میرے ربا مجھے بس اٹھا لے۔ اب کسی بہانے نہیں جی پاؤں گی میں۔ لڑکیوں مٹی کا تیل لاؤ۔ آج خود پر تیل ڈال کر آگ لگالوں گی۔ ارے نہیں' تیل تو پہلے ہی بہت مہنگا ہے۔ ختم ہو گیا تو آگ کیسے جلاؤں گی۔ گیس تو پہلے ہی نہیں آتی۔ ایسے کرو میرے سر پر کوئی چیز اٹھا کر مار دو۔ تاکہ میرا تو قصہ ختم ہو۔ ہائے ربا۔ بے حیائی سی بے حیائی کہ نواسا' نانا سے پوچھ رہا ہے کہ نانی آپ کی بیٹی ہے۔ یہ ساری بے حیائی امریکا نے اسے سکھائی ہے۔ لگتا ہے ہمارا نکاح ختم کروانے کے لیے امریکا نے اسے بھیجا ہے چوہدری جی۔ جو کام آپ کی والدہ نہیں کر سکیں۔ وہ کام میرے نواسے کے ذریعے کروا رہی ہیں۔ ضرور آپ کی والدہ کا امریکا والوں سے کوئی تعلق ہو گا۔ تب ہی تو میری لڑکی کا لڑکا وہ کام کر رہا ہے جیسا آپ کی والدہ چاہتی تھیں۔" بی جی تو جیسے صدمے دکھ اور بے یقینی سے نڈھال ہوئی جا رہی تھیں۔

"بی جی اب میں نے کیا کیا ہے۔" ہاشم نے بے حد تھکے سے رو دینے والے انداز میں کہا تھا۔

"بیٹا کچھ اور کرنا باقی ہے تو وہ بھی کر لیں۔" بی جی نے پھر ناک رگڑی۔

"بی جی میں نے آپ کی اجازت سے ایک بات پوچھی تھی۔" وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ جتنا اس بحث کو ختم کرنا چاہ رہا تھا۔ دلدل کی طرح اتنا ہی اس میں دھنستا جا رہا تھا۔

"بے شرمی کی انتہا دیکھو' ابھی بھی اپنے سوال پر شرمندہ نہیں ہے۔ امریکا تیرا بیڑا غرق ہو۔ تجھے آئے کسی کی آئی تو نے میرے نواسے کو نہ جانے کیا گھول کر پلا دیا ہے۔" بی جی جھولی پھیلا کر بد دعائیں دینے لگیں۔

"اے میرے مولا اگر تو نے مجھے میری کوتاہیوں' میرے نکمے پن کی سزا مجھے دینی شروع کر ہی دی ہے تو مجھے اوپر بلا لے مجھے دنیا میں رسوا مت کر۔" دادا جان جو کب سے گم صم بے یقین سے بت بنے کھڑے تھے۔ ایک دم تاسف سے سر ہلاتے ہوئے فریاد کرنے لگے۔ ہاشم نے سخت بے زاری سے دادا جان کی اس بے وقت کی فریاد پر انہیں دیکھا۔

"اب آپ کو کیا کہہ دیا ہے میں نے۔"

"میرے کھوتے ڈاکٹر پتر۔ ہوش کے ناخن لے اور دھیان سے میری بات سن کہ جنت بی جی تمہاری بی جی کا نام ہے۔ جو میری منکوحہ ہے۔ سمجھا کہ اس کھوتے ذہن پر دو جوتے لگاؤں۔" دادا جان سخت برہم نظر آرہے تھے۔

"مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ نے تمام بچوں کے نام دادیوں' نانیوں کے ناموں پر رکھے ہیں۔ اس لیے یقیناً" دادا جان نے اپنی دوسری بیوی کی بیٹی کا نام جنت رکھ دیا ہو گا۔ میں دادا جان کی دوسری بیوی کی بیٹی جنت کی بات کر رہا ہوں۔" ہاشم نے اپنی طرف سے انہیں سمجھانے کے لیے تفصیل بتائی۔ سب افراد کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ جاسمین نے مزید کچھ سننے سے پہلے ہونٹوں تلے زبان دبائی۔

"میں بھی کہوں بی جی اور چوہدری شہر میں کیوں بچوں کی پڑھائی کا بہانہ کر کے بیٹھے ہیں۔ ہوں تو یہ گل کھلائیں ہیں' تب ہی منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔" پھوپھی خورشید طنزاً کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔

"ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔ چوہدری جی یہ کیا تم نے گل کھلا دیا۔ تم نے تو مجھے جیتے جی مار دیا۔ ارے کہاں رکھا ہے تم نے میری سوکن اور اس کی بچی کو۔" بی جی تو دل پر ہاتھ رکھے وہیں صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

"قسم سے بی جی۔۔۔ میں نے تو تمہارے سوا کبھی

کسی سے محبت نہیں کی۔ دوسری شادی کی باتیں تو میں محض تمہیں تنگ کرنے کے لیے کرتا تھا۔ ورنہ اس دنیا میں تجھ سے زیادہ کوئی دوسری سوہنی نہیں ہے۔ مجھے اگر پتا ہوتا تمہیں تنگ کرنے کی سزا مجھے یوں خوار ہونے میں ملے گی تو کبھی نہیں کرتا۔ ارے ہاشم یار بول اپنی بی جی کو کہ تو مذاق کر رہا ہے۔" دادا جان بی جی کو صفائیاں دیتے ہوئے ایک دم ہونق بنے پریشان سے ہاشم کی طرف بڑھے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے نانا جان کہ جنت بی جی کے زیر سایہ ہو اور وہ اس کی حقیقت سے لاعلم ہو۔" ہاشم نے جیسے داداجی کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ تب ہی الجھا سا بڑبڑایا۔

"میرے زیر سایہ... مگر چوہدری ہاؤس میں تو صرف چار لڑکیاں ہیں۔" نوازش علی خود الجھے سے تھے۔

"چار نہیں ماموں جان پانچ ہے۔ دو، دو آپ کی بیٹیاں اور پانچویں یہ جنت۔" ہاشم جھکراتے سر کے ساتھ تصحیح کرتے ہوئے بولا۔ اسے پہلی بار پتا چلا تھا کہ بعض اوقات سامنے والے کو اپنی بات سمجھانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

"کون جنت؟" بی جی نے اس کو زینی کی طرف اشارہ کرتے دیکھ کر تصدیق کے لیے پوچھا۔

"یہ جنت جو ہے۔ وہ نانا جان کی بیٹی ہے نا۔" ہاشم نے باقاعدہ زینی کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ سب افراد نے قدرے حیرت سے ہاشم کو دیکھا۔

"مگر یہ تو میری بیٹی ہے زینب۔" تب ہی دو لیڈی کانسٹیبل کے ساتھ نسرین وارد ہوئی۔ سامنے کھڑی زینی اور دروازے سے لگی جاسمین دونوں گم صم ہو گئیں۔

"آپ کو کیا لگا بی جی کہ آپ میری مرضی کے بغیر میری بیٹی کی شادی کر دیں گی۔ میں بھی نسرین ہوں۔ جو کبھی ہار نہیں مانتی۔ آج اپنی بیٹی لے کر ہی جاؤں گی۔ بہت عرصہ آپ نے میری بچیوں کو غلام بنا کر رکھ لیا۔" نسرین تنی گردن کے ساتھ بڑے تفاخر سے بولی۔

جاسمین نے بے ساختہ کانوں میں روئی ٹھونس لی۔

"میں بھی دیکھتی ہوں کیسے تو میری بچیوں کو ہاتھ لگاتی ہے۔ اب اگر تم نے بچیوں کا نام بھی لیا تو زبان حلق سے نکال کر پھینک دوں گی۔" بی جی جو نڈھال سی بیٹھی تھیں۔ نسرین کو دیکھ کر ایک دم نئی توانائی کے ساتھ اٹھیں۔

"ہائے اتنے لوگ جمع ہیں، کہیں میرے ہاشم کا نکاح تو نہیں ہو گیا۔" اسی وقت پروین اور وقاص آگے پیچھے داخل ہوئے۔ ہاشم نے ان کے نکاح والی بات پر حیرت سے منہ کھول کر انہیں دیکھا۔

"تو نے تو ہمیں پرایا کر دیا تھا۔ ہاشم مگر ہم خود کو تیری خوشی میں شامل ہونے سے نہیں روک پائے۔"

"ایک منٹ ممی... میری کون سی خوشی۔" وہ الجھا سا ان کی بات کاٹ گیا۔

"لو بھلا تمہارا نکاح ہو رہا ہے۔ بھلا اس سے بڑھ کر کوئی اور خوشی ہو گی۔" پروین نے بھیگی آنکھیں صاف کیں۔

"میرا نکاح... مگر میں بھلا آپ کے اور پاپا کے بغیر نکاح کیسے کر سکتا ہوں اور آپ فون پر بھی کسی وجہ سے مجھ پر غصہ ہو رہی تھیں اور بعد میں میرا ایک بھی فون ریسیو نہیں کیا۔" ہاشم کو لگ رہا تھا وہ جتنا ابھرنے کی کوشش کر رہا ہے اتنا ہی زیادہ ڈوب رہا ہے۔

"بی جی... قاضی صاحب کہہ رہے ہیں کہ جمعہ کے بعد انہیں کسی کا جنازہ پڑھانے جانا ہے۔ اس لیے ابھی نکاح کروا لیں۔" تب ہی رامش بیل کی آواز پر جو باہر دیکھنے گیا تھا اور اب قاضی کو لیے وہیں چلا آیا تھا۔

"محترم چوہدری جی نے مجھے بتایا تھا کہ لڑکا لڑکی گھر کے ہی بچے ہیں۔ اس لیے میں وقت سے پہلے آ گیا۔ بتائیں اس مجمع میں سے کن دو کا نکاح کرنا ہے۔"

قاضی کچھ زیادہ ہی جلدی میں لگ رہے تھے۔

"دیکھا وقاص اگر آنے میں ہمیں چند منٹ کی مزید تاخیر ہو جاتی تو ہاشم نے نکاح کر لینا تھا۔" پروین نے سوں سوں کرتے ہوئے وقاص کی طرف دیکھا۔ جو ہکا بکا سے کھڑے باری باری سب کی بولیاں سن رہے

تھے۔
"ممی۔ کیا بولے جارہی ہیں۔ آپ کو یقیناً" کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کے بغیر میرا نکاح کیسے ہو سکتا ہے۔ نکاح تو جاسمین کا ہو رہا ہے۔" ہاشم نے جیسے چڑ کر وضاحت دی۔
"پروین تیرے پتر کو امریکا والوں نے کملا کر دیا ہے۔ یوں کہہ رہا ہے جیسے جاسمین کا بیاہ کسی گملے سے ہو رہا ہے۔" بی جی بے حد پریشان سی ہاشم کی بات پر پروین کو بتانے لگیں۔ ہاشم نے پھر امریکہ پر الزام سن کر سر تھام لیا۔ وہ ہمیشہ بحث و مباحثے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ مگر اب اسے لگ رہا تھا وہ اب بھی بحث کرنا تو دور کی بات، سیدھے سے اپنا نام بھی بتا نہیں سکے گا۔ اتنا ہی اس کا ذہن گھوما ہوا تھا۔
"پتر اگر کوئی فیصلہ کیا ہے تو ماں، باپ کے سامنے گھبرا کیوں رہا ہے۔ مرد کے بچے گھبراتے نہیں ہیں۔" تایا جی نے بھی ہاشم کو سمجھانے کی کوشش کی۔
"کیسا فیصلہ ماموں جی۔ میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" وہ غصے سے چلایا تھا۔ سب ہی افراد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے اس کی دماغی حالت پر شک کیا۔
"بیٹا جی۔ اگر ہمارا اپنے نکاح میں آنا تمہیں اتنا ہی برا لگا ہے کہ تم چلانے لگے ہو تو ہم چلے جاتے ہیں۔" وقاص اس کے چلانے کا کچھ اور ہی مقصد سمجھے تھے۔ ہاشم بے بسی سے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔
"جسے جانا ہے جائے۔ مگر میں اپنی بچیوں کو لیے بغیر نہیں جاؤں گی۔ اب تو میں اپنی دونوں بچیوں کو ہی ساتھ لے کر جاؤں گی۔"
"دیکھو۔ بی جی کی سختیوں پر میری بچی کا کتنا سامنہ نکل آیا ہے۔" نسرین نے کہتے ہوئے خاموش کھڑی بھیگی نظروں سے خود کو دیکھتی زینی کو خود سے لگالیا۔ زینی نے کوئی ردعمل نہیں کیا۔ خاموشی سے ان کے ساتھ لگ گئی۔
"بھئی نکاح کسی نے کروانا ہے تو کروالو - ورنہ [illegible]اس۔" قاضی جو کب سے آنکھیں سکوڑے ان

کی لڑائی کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ پلے نہ پڑتے دیکھ کر بدمزا ہو کر بولے۔
"ارے بڑے میاں، تم تو صبر کرو۔ سمجھنے دو۔ آخر مسئلہ ہے کیا۔ پنڈ میں خبر بھی دینی ہے۔" پھوپھی خورشید قاضی کو جھڑک کر ابھی سے سب کے منہ دیکھنے لگیں۔ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ پھوپھی کی زیرک نظروں اور لومڑی جیسے ذہن میں کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ پنڈ میں بی بی سی کے نام سے اسی لیے تو مشہور تھیں کہ گھر گھر کی خبر ان کے پاس ہوتی تھی۔ یہ اتنی غلط فہمیاں، اتنی غلط فہمی تو ہم نے پیدا نہیں کی تھیں کہ ہمیں خود بھی سمجھ نہ آئیں۔ روبی تو خود مکڑی کے جال کی طرح ان سب کی باتوں پر حیران ہوتے ہوئے الجھ رہی تھی۔ جتنا سمجھنے کی کوشش کرتی اتنا ہی مزید الجھ جاتی۔ کچھ باتوں کا تو خود انہیں بھی نہیں پتا تھا۔
"جاسمین کا نکاح جو لیے ہو کس سے رہا ہے۔" زینی ابھی تک ہاشم کے نکاح والی بات میں ہی الجھی ہوئی تھی۔
"جاسمین کا تو شیر بلند خان سے ہو رہا ہے۔ یہ سوچنے والی بات ہے ہاشم بھائی کا کس سے ہو رہا ہے۔" روبی ماتھا مسلتے ہوئے بڑبڑا کر سوچنے لگی۔
"ممی یقیناً" آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ بھلا میں آپ سے کیوں کچھ چھپاؤں گا۔"
"بس بیٹا۔ اب کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کو پتا چل گیا ہے کہ تمہاری زندگی میں ہماری کوئی اہمیت نہیں۔" پروین نے ناراضی جتائی۔
"مجھے یہ بتائے تھی کہ میرا نکاح کس سے ہو رہا ہے۔" ہاشم نے گتھی سلجھانے کے لیے پتے کی بات کی۔
"دیکھا کانسٹیبل صاحب! ماں سے چھپا کر بچی کی شادی ہو رہی ہے۔ مجھے تو یہ بھی پتا چلا ہے کہ میری جاسمین کی مرضی کے بغیر اس کا نکاح کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مجھے تو اسی دن پتا چل گیا تھا کہ میری بچیاں یہاں خوش نہیں ہیں اور میرے پاس آنا چاہتی

ہوں گی۔ جب ایک دن میں نے انہیں بازار میں دیکھا تھا کیسے میری جاسمین ڈری سہمی کہہ رہی تھی کہ چلو بھئی جلدی گھر چلیں کہیں ایسا نہ ہو کہ بی جی دیر سے گھر آنے پر ٹانگیں توڑ کر رکھ دیں۔ اس بار تو ماں کے پاس چلے جانے والی دھمکی بھی کام نہیں آئے گی۔" نسرین نے ہاشم کے سوال پر پروین کے بولنے سے پہلے ہی اپنی بات کانسٹیبل کو بتانی شروع کردی۔ ابھی تک یہ ہی تو ہو رہا تھا کہ کسی کو جواب دینے کا موقع دیے بغیر کوئی تیسرا اپنی کہانی لے کر بیٹھ جاتا' ابھی بھی یہ ہی ہوا تھا۔

"چوہدری جی۔۔۔ اگر بچے نکاح کے لیے راضی نہیں ہیں تو آپ ہی نکاح کروالیں۔ آپ کو بھی تو یقیناً" دوسری شادی کا شوق ہو گا نا۔" قاضی جی تو بس اپنا فرض پورا کر کے بھاگ جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔

"آپ تو چپ کریں قاضی جی۔ پتا تو چلنے دیں آخر بات ہے کیا۔" پھوپھی خورشید نے پھر لمبی داڑھی والے قاضی کو جھڑک دیا۔ وہ بدمزا ہو کر گھڑی پر ٹائم دیکھنے لگے۔

"ڈیڈی۔۔۔ آپ تو میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں بھلا آپ کی اور ممی کی مرضی کے بغیر۔"

"بس بیٹا۔۔۔ تم نے ہمیں بہت مایوس کیا ہے۔" وقاص ناراض سے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے۔ ہاشم کا دل چاہا وہ کسی اونچی منزل سے چھلانگ لگادے۔

"نہ ہمیں بھی کوئی بولنے کا موقع دے گا یا آپ کا خیال ہے ہم یہاں انڈے بیچنے آئے ہیں۔" کب سے تماشا دیکھتی کانسٹیبل کو بھی اچانک اپنی وردی کے رعب کا خیال آیا۔

"دیکھیں جی۔۔۔ اگر نکاح کے لیے لڑکی نہیں مل رہی تو۔۔۔ آپ میرے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ میری ابھی تک منگنی بھی نہیں ہوئی جی۔" دوسری قدرے بھاری جسم کی کانسٹیبل نے ذرا سا شرما کر کہا۔

"بی جی جلدی سے بچیوں کو مل لیں۔ میں انہیں لے کر جاؤں گی۔ مجھے ذرا جلدی ہے۔" نسرین نے گھڑی پر ٹائم دیکھتے ہوئے بے زار سے لہجے میں کہا۔

"بچیاں تو میں تمہیں کسی صورت نہیں دوں گی۔ اگر تم نے بچیاں لے جانے کی کوشش کی تو تمہیں میری لاش پر سے گزر کر جانا پڑے گا۔" بی جی نے زینی کو اس سے کھینچ کر الگ کرتے ہوئے سینہ تان کر کہا۔ زینی بی جی کے ساتھ لگ گئی۔

"تم بھول رہی ہو۔ نسرین بیگم تم بچیاں خود بی جی کو دے کر گئی تھیں۔" کب سے خاموش پریشان اور الجھے سے نوازش علی نے بھی زبان کھولی۔ "اب اگر مزید تمہاری اولاد نہیں ہوئی تو اس میں ہماری کیا غلطی۔ مگر یاد رکھو۔ اب بچیاں ہرگز تمہیں نہیں ملیں گی۔" نسرین کو لگا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ "تم اپنا منہ بند رکھو۔ میں بھی دیکھتی ہوں کہ کیسے نہیں تم میری بچیاں مجھے دیتے۔ تم لوگ میری بچیوں کو میرے پاس آنے سے روک نہیں سکتے۔" وہ زینی کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگی۔ "چلو زینی" زینی نے گھبرا کر بی جی کا بازو پکڑا۔

"چھوڑو۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ میری بچی کو۔" بی جی نے اس کے ہاتھ پر دو تین تھپڑ مار کر زینی کو اپنی طرف کھینچا۔

"اے پولیس والیو۔ دیکھ کیا رہی ہو' پکڑو انہیں۔" نسرین نے حیران پریشان کھڑی پولیس والیوں کو چلا کر کہا۔ انہوں نے جلدی سے نسرین کو پکڑلیا۔

"بدبختوں مجھے نہیں۔ بی جی کو پکڑو۔" نسرین نے جھنجلا کر کہا۔

"چچی بی جی کو ہم نے پکڑا ہے۔" روبی اور زیبی نے ایک ہاتھ سے بی جی کو سہارا دیتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے زینی کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"پھر ہم کس کو پکڑیں۔" کانسٹیبل نے پوچھا۔

"بھئی کسی کو بھی پکڑلو۔ بس پکڑلو۔" نسرین کوفت سے چلائی۔۔۔ ساتھ زینی کو بھی کھینچنا جاری رکھا۔ کانسٹیبل نے گھبرا کر بی جی کی طرف آتے نوازش علی کو پکڑلیا۔

"آپ کی شادی ہوئی ہے۔" ساتھ ہی پوچھا گیا۔

"ہوئی تھی۔" نوازش نے اس کے پکڑنے پر جھنجلا کر کہا۔

"میری بھی دو ہوئی تھیں، مگر ناکام ہو گئیں۔ شادیاں کرنے میں کیا جاتا ہے۔ آپ بھی سوچیں میرے بارے میں... میں بھی سوچوں گی۔"

"سوچوں گا... مگر ابھی تو چھوڑیں..." نوازش نے جان چھڑانے کے لیے بے زاری سے کہا۔ تب ہی اس نے فوراً" اس کا بازو چھوڑ دیا۔

"ہائے میرے ربا۔ کوئی اللہ کا بندہ ہے۔ جو اللہ کے واسطے نکاح کروائے اور مجھے یہاں سے جانے دے۔" قاضی نے دو ہتھڑ اپنے سر پر مارے۔

"میرے ٹیچر کہتے ہیں کہ مسئلے مسائل سیاسی ہوں یا گھریلو ہمیشہ مشاورت کے ذریعے حل ہوتے ہیں اور مشاورت تب بافائدہ ہوتی ہے۔ جب تحمل کے ساتھ سامنے والے کی بات سنی اور سمجھی جائے۔" رامش نے انہیں کھینچا تانی کرتے دیکھ کر مدبرانہ انداز میں کہا۔ مگر اس کی سنی کب جارہی تھی۔

"نسرین... میں کہتی ہوں، میری بچی کو چھوڑ دے... ورنہ میں تیرے ہاتھ توڑ دوں گی۔"

"آپ مجھے سختی کرنے پر مجبور مت کریں۔ ورنہ پوری چوہدری فیملی کو ہتھکڑی لگوا دوں گی۔"

"چلو بھو... بیگ پکڑو یہاں تو بات ہتھکڑی لگنے تک پہنچ گئی ہے۔ سنا ہے پولیس کے چکر میں بڑے پیسے لگتے ہیں۔" پھوپھی خورشید نے اپنی بھو کو ٹھوکا دیا۔

میری جاسمین کو بھی بلائیں۔ اسے کہاں چھپایا ہے؟" نسرین کو اچانک جاسمین کی غیر موجودگی کا بھی خیال آیا۔ اسی لمحے جاسمین نے بھی کانوں سے روئی نکالی۔

"میری جاسمین کا نام مت لینا۔ آج میری جاسمین کا میرے ہاشم کے ساتھ نکاح ہو رہا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ یہاں خون خرابہ ہو۔ بس کان دبا کر چلی جا۔" بی جی کے کہنے پر پروین نے جتاتی نظروں سے ہاشم کو دیکھا۔ ہاشم ہکا بکا سا بہت کچھ سمجھتے ہوئے منہ کھولے

انہیں دیکھنے لگا، جبکہ جاسمین کو بھی اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ بہت ساری الجھنیں اپنے آپ ہی سلجھنے لگی تھیں۔ تب ہی اسے احساس ہوا، یاہر بات ہاتھاپائی تک پہنچ گئی ہے۔ اس بار وہ خود کو باہر جانے سے روک نہیں پائی۔

"بی جی... مگر جاسمین کا نکاح تو شیر بلند خان سے ہو رہا ہے۔" ہاشم نے ہونٹوں کو کچلتے ہوئے بی جی سے استفسار کیا۔

"بیٹا اس وقت تیری ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر بات کریں گے تو فکر نہ کر اس کھوتی سے نپٹ لوں۔ پھر تمہیں بابا مرحوم دوائی والے کے پاس لے کر جاتی ہوں۔" بی جی نے زور آزمائی کرتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاشم نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"بی جی! میں آپ سے کہہ رہی..."

"بس کیجیے... آپ سب لوگ۔" تب ہی جاسمین نے لاؤنج میں آکر نسرین کی بات کاٹ کر غصے سے کہا۔

"آپ کو کس نے حق دیا ہے کہ آپ ہمارے بارے میں بی جی سے کوئی بازپرس کریں۔" جاسمین نے نسرین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیوری چڑھا کر کہا۔ وہ جو اس کو دیکھ کر والہانہ پن سے اس کی طرف بڑھی تھیں۔ اس کے لہجے کی سرد مہری پر ٹھٹک کر رک گئیں۔

"اور بی جی... آپ تو تب کسی سے لڑائی کریں یا کسی کو وضاحت دیں۔ جب آپ کو ہم پر یا اپنی تربیت پر بھروسا نہ ہو۔ آپ کو ہمیشہ سے یہ گمان رہا ہے کہ میں اپنی ماں کو مس کرتی ہوں۔ تب ہی ہر بات کے آخر میں کہتی ہوں کہ اگر میری ماں ہوتیں تو وہ ضرور میری بات مان لیتیں۔ میں یہ بات اس لیے نہیں کہتی تھی کہ میں اپنی ماں کو مس کرتی تھی یا میں ان کے پاس جانا چاہتی تھی۔ میں تو ہمیشہ آپ کو جذباتی بلیک میل کرتی تھی۔ تاکہ آپ میری بات مان لیں۔ کیونکہ میں نے بچپن میں ہمیشہ دیکھا تھا کہ ادھر کسی نے مجھے بن ماں کی بچی کہا یا ماں کے حوالے سے کوئی بات کی تو" آپ فوراً" میرا دل بہلانے کے لیے میری جائز ناجائز بات مان

لیتیں۔"

آپ کو یہ بھی تو لگتا ہے ناکہ مجھے گاؤں پسند نہیں ہے۔ جہاں جانے سے ہمیشہ میں گھبراتی ہوں۔ جہاں میں جانا نہیں چاہتی۔ مگر یہ بھی غلط فہمی میں آج دور کیے دیتی ہوں کہ مجھے دنیا کی ہر جگہ سے زیادہ پیارا اور عزیز میرا گاؤں ہے۔ جہاں میرے ابو جی ہیں' جہاں میرا بچپن گزرا ہے۔ مگر وہاں نہ جانے کی وجہ صرف یہ ہی ہے کہ وہاں کے لوگ مجھ سے میرے متعلق نہیں بلکہ میری چھوڑ جانے والی ماں کے متعلق بات کرتے ہیں۔ وہاں میری ماں کو جاننے والے لوگ زیادہ ہیں' جبکہ میں صرف اپنے حوالے سے جانی جانا چاہتی ہوں یا پھر بی جی کی پوتی' بی جی کی بیٹی کے حوالے سے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ میں ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں' تاکہ جب میں گاؤں جاؤں تو لوگ نسرین کی بیٹی نہیں' بلکہ ڈاکٹر باجی کہیں۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے۔ میں ڈاکٹر باجی بن کر ہی گاؤں والوں کے ذہن میں اپنا حوالہ بنا سکتی ہوں۔ جہاں وہ مجھے کسی نسرین کی بیٹی کے نام سے نہیں بلکہ ڈاکٹر باجی کے حوالے سے جانیں۔" وہ ایک لمحے کے لیے رکی۔ آنسوؤں کا گولہ نکلا اور ہکا بکا کھڑی نسرین کو دیکھا۔

"آپ کو یقیناً" کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ممی۔ کیونکہ ہم بی جی کے ساتھ خوش ہیں اور بی جی کے سوا ہمیں کسی کی ضرورت نہیں' کیوں زینی؟" اس نے خاموشی سے آنسو بہاتی زینی سے پوچھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے اثبات میں سر ہلایا اور بت بنی بی جی کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ انہیں تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ سب باتیں' جاسوں بول رہی ہے۔

"آپ نے مجھے اور زینی کو کیوں چھوڑ دیا۔ ہمیں آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ آپ ہمیں کیوں واپس لے کر جانا چاہتی ہیں۔ یہ جاننے کا بھی ہمیں کوئی شوق نہیں ہے۔ اس لیے بغیر کچھ کہے بغیر کچھ پوچھے چلی جائیں' کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ کیونکہ آپ نے ہم پر اپنا حق جتانے میں دیر کردی۔ اب ہمیں آپ کے ساتھ کی نہ خواہش ہے اور نہ ضرورت۔" نسرین نے جھکے ہوتے چہرے کے ساتھ سب سے نظریں چرائی تھیں۔ جاسمین کی باتیں یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھیں کہ اسے غلط فہمی ہوئی تھی کہ اس کی بچیاں اس کے ایک بار کہنے پر اس کے ساتھ چل پڑیں گی۔ واقعی میں نے دیر کردی۔ اس نے سوچا تھا اور بغیر کسی کی طرف دیکھے پلٹ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ دونوں کانسٹیبل بھی۔

سب کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ سوائے ہاشم کے جو ابھی بھی خود کو تختہ دار پر لٹکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ تب ہی جاسمین کی نظر اس کے پریشان چہرے پر پڑی۔

"آئم سوری ہاشم۔ یہ جتنی بھی غلط فہمی ہوئی صرف میری وجہ سے ہوئی۔ کیونکہ سب کے نام میں نے غلط بتائے یقین کریں۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ آپ شیر بلند خان نہیں بلکہ ہاشم علی ہیں تو میں کبھی آپ کے سامنے بیمار ہونے کا ناٹک نہیں کرتی۔ مجھے لگا اگر میں شیر بلند خان کے سامنے خود کو بیمار ظاہر کروں گی تو وہ خود ہی مجھ سے شادی کرنے سے انکار کردے گا۔ کیونکہ میں کسی صورت ڈاکٹر بنے بغیر شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ صرف اسی لیے کہ میرے سسرال والے بھی مجھے ڈاکٹر باجی کے حوالے سے جانیں۔ میری عزت کریں' نہ کہ میری ماں کا ہمیں چھوڑ جانا' میرے لیے طعنہ بن جائے' مگر بدقسمتی سے میں آپ کو شیر بلند خان سمجھ بیٹھی۔ جب پتا چلا کہ آپ شیر بلند خان نہیں' بلکہ ہاشم ہیں تو اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لیے مزید جھوٹ بولتی چلی گئی۔ میں نے سوچا تھا کہ کسی مناسب وقت پر آپ کو سب سچ بتا دوں گی' مگر یہ خوف کہ اگر بی جی کو میرے جھوٹوں کا پتا چل گیا تو وہ کل کے بجائے میری آج شادی کردیں گی۔ اسی نے مجھے آپ کو سچ بتانے سے روکے رکھا۔ مگر یقین کریں' میں نے جان بوجھ کر آپ کو بے وقوف نہیں بنایا۔" جاسمین نے شرمندہ شرمندہ اس کو تفصیل بتانے کے ساتھ معذرت کرلی۔

"یہ سب تو غلط فہمی تھی۔ مگر میں نے نکاح کے لیے کب کہا۔" وہ جاسمین پر آنے والے غصے کو دباتے ہوئے الجھن سے بولا۔ ویسے بھی سب سے بڑی الجھن تو یہ ہی تھی کہ اس کا نکاح ہو رہا ہے اور اسے ہی

پتا نہیں۔

"لگتا ہے آج کی تاریخ میں نکاح نہیں ہو گا' مگر آپ کو نکاح پڑھانے کا وعدہ کیا ہے چوہدری جی۔۔۔ اس لیے وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔ اس لیے یہیں سونے لگا ہوں۔ جب تمام غلط فہمیاں دور ہو جائیں تو مجھے اٹھا دیجیے گا۔" قاضی صاحب تو بے زاری سے کہتے ہوئے وہیں صوفے پر منہ پر رومال رکھ کر نیم دراز ہو گئے۔

"تو خود ہی تو کہا تھا کہ تم پہلے جاسوں کو اپنے ساتھ اسپتال لے کر جانا چاہتے ہو اور یہ کہا تھا کہ شادی تو بعد میں بھی ہو جائے گی۔" بی جی نے فورا" جتایا۔ ہاشم کچھ کچھ سمجھ گیا۔

"بی جی وہ تو میں سمجھا تھا کہ جاسمین بیمار ہے۔ اس لیے پہلے اپنے ساتھ اسپتال لے جا کر اس کا علاج کروانا چاہتا تھا۔ تب ہی کہا تھا کہ اس کے ٹھیک ہونے کے بعد شادی کر دیں اس کی۔ میں نے اپنے ساتھ شادی کے لیے تھوڑی کہا تھا۔"

"بیٹا اگر یہ بات تھی تو صاف صاف کرتے۔ میں تو یہ ہی سمجھی کہ تم جاسمین سے شادی کرنا چاہتے ہو۔"

"مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ آپ نے جاسمین کی بیماری سب سے چھپائی ہے۔" ہاشم نے خونخوار نظروں سے جاسمین کو دیکھا۔ جو نظر چرا گئی۔

"مان گئے بی جی۔۔۔ اپنی پوتی قابل ڈاکٹر کے پلے باندھ رہی ہیں۔ واہ جی واہ۔" پھوپھی خورشید کے ذہن میں بھی تمام کہانی آگئی تھی۔ تب ہی سکون کا سانس لیتے ہوئے طنز کیا۔

"مگر بی جی آپ نے تو ہمیں بتایا تھا کہ ہاشم نکاح کے لیے راضی ہے۔" نوازش علی سخت اضطراب میں تھے۔

"میں نے ہاشم سے پوچھا تھا کہ ہاشم نکاح کے لیے راضی ہے' تو نکاح کر دیتے ہیں اور رخصتی پروین اور وقاص کے آنے پر کرلیں گے۔ اس نے کہا۔ ٹھیک ہے بی جی۔ اگر بڑوں کو اعتراض نہیں ہے تو نکاح کر دیں۔ رخصتی ممی پاپا کی موجودگی میں کرلیں گے۔" بی جی نے شرمندہ ہوتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

اسے پتا تھا پھوپھی یہ ساری باتیں جاتے ہی گاؤں کے گھر گھر میں جاکر نشر کردیں گی۔ عزت دار کو عزت اچھلنے سے بھی زیادہ بھلا کسی چیز کا خوف ہوتا ہے۔

"میں تو یہ ہی سمجھا تھا بی جی کہ آپ شیر بلند خان کے ساتھ جاسمین کے نکاح کی بات کررہی ہیں۔"

"شیر بلند خان کی تو بھینس کی ٹکر سے ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ جو جڑنے میں نہ جانے کتنا وقت لگ جاتا۔ اس لیے میں نے ان کے جاسمین کو دیکھ کر جانے کے دوسرے دن ہی معذرت کرلی تھی۔ کیونکہ نسرین کی دھمکیوں کی وجہ سے میں جلد سے جلد جاسوں کی شادی کردینا چاہتی تھی۔" بی جی بہت تھکے تھکے لہجے میں بتا رہی تھیں۔

"آئم سوری بی جی۔ یہ سب کچھ میرے جھوٹ بولنے کی وجہ سے ہوا۔ مجھے معاف کردیجیے بی جی۔" وہ بی جی کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر شرمندہ سی بولی۔ ہاشم نے بغور اسے دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے اپنے ماں باپ کو دیکھا۔ وہ دونوں بھی کچھ سوچ رہے تھے۔

"نہ اب تیرے معافی مانگنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو نکاح نہ ہونے کی صورت میں چوہدری فیملی کی جگ ہنسائی ہوئی ہے۔ وہ تمہاری معافی سے رک نہیں جائے گی۔" بی جی جو اس کی باتوں سے چند منٹ پہلے خوش ہوئی تھیں۔ اب پھر سے ناراض اور سخت ناراض ہورہی تھیں۔

"ہمیں یوں ہی خوار کیا۔" پھوپھی خورشید نے ناک سکوڑی۔ ہاشم نے کچھ ناپسندیدگی سے پھوپھی کو دیکھا۔

"یقین کیجیے بی جی مجھے یہ ہی لگا تھا کہ میرا نکاح شیر بلند خان سے ہورہا ہے۔ اگر مجھے پتا چل جاتا کہ آپ میرے اور ہاشم کے متعلق سوچ رہی ہیں تو میں آپ کو پہلے ہی سب سچ بتادیتی۔" جاسوں روہانسی سی وضاحت دینے لگی۔ بی جی کے ساتھ ہاشم کو بھی اس کی سچائی کا یقین تھا۔ مگر جگ ہنسائی کا خوف بی جی کو رولانے کے لیے کافی تھا۔

"تو اگر سوچ لیا تو کیا غلط کیا میری ماں نے۔" پروین ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ان کی طرف بڑھیں۔ "اچھا ہے نا اماں کہ آپ نے خود ہی میرے ہاشم کے لیے اتنی اچھی لڑکی ڈھونڈی۔ جو اپنی بات منوانا بھی جانتی ہے اور اپنوں کی قدر کرنا بھی۔ اس سے اچھی لڑکی میرے ہاشم کو بھلا کہاں ملے گی۔" پروین کے محبت سے کہنے پر بی جی کے ساتھ ساتھ جاسوں نے بھی حیرت سے پہلے پھوپھو کو اور پھر ہاشم کو دیکھا۔ جو سینے پر بازو باندھے مسکرا رہا تھا۔

اس کا تو خیال تھا کہ اب اس کی نکاح اور شادی سے جان چھوٹ جائے گی اور شادی تب ہی کرے گی۔ جب لوگ اسے ڈاکٹر باجی کے حوالے سے جاننے لگیں گے۔

"بھئی پروین پہلے ہاشم سے پوچھ لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی غلط فہمی ہوئی ہو۔" پھوپھی خورشید بی جی کو پروین کے گلے لگتے دیکھ کر بولیں۔ خوشی بی جی کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

"مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔ شادی تو کرنی ہے۔ آج نہیں تو کل۔ پھر جاسمین میں کیا برائی ہے۔ ویسے بھی اگر بی جی اس کا نکاح مجھ سے کروانا چاہ رہی ہیں تو ضرور کوئی تو قابل توجہ بات اس میں ہوگی۔ بی جی کی تربیت میں جوان ہونے والی لڑکی سے شادی کرنا میرے لیے قابل فخر ہوگا۔" ہاشم پھوپھی سے کافی عاجز آیا ہوا تھا۔ تب ہی وضاحت سے بلکہ جتا جتا کر جواب دیا۔ پھوپھی صرف "ہونہہ" کرکے رہ گئیں۔ بی جی کی اتنی تعریف کیا ان سے ہضم ہوتی تھی۔

"پھر جتنے جھوٹ مجھ سے بولے ہیں۔ ان کا حساب لینے کے لیے شادی کرکے ساتھ رکھنا ضروری ہے۔" ہاشم نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ ایک بار پھر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"کان میں کیا کہہ رہا ہے۔" روبی کی نظروں سے ہاشم کی سرگوشی چھپ نہیں سکی تھی۔ تب ہی اسے پیچھے کی طرف کھینچ کر پوچھا۔ اس نے ایک نظر روبی کی کھوجتی نظروں کو دیکھا اور اسے جلانے کے لیے شرارت سے ہونٹ کا کونا دبا کر بولی۔

"کہہ رہا ہے کہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور امریکا سے صرف میرے لیے آیا ہے۔" روبی نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

"جاؤ لڑکیوں... جاسوں کو تیار کرو اور یہ قاضی کو بھی اٹھاؤ۔ آج نکاح کر لیتے ہیں۔ شادی کچھ عرصے بعد دھوم دھام سے کرلیں گے۔" پروین پھوپھو نے جوش کے ساتھ کہا۔

"یہ تو سنا تھا کہ غلط فہمی میں کسی نے اپنی بیٹی کو قتل کردیا یا غلط فہمی میں پولیس فلاں کی جگہ فلاں کو لے گئی۔ یہ کہیں نہیں سنا کہ غلط فہمی میں کسی کا نکاح ہوگیا۔" پھوپھی خورشید نے پھر اندر کی جلن نکالی۔ بی جی کے ساتھ ان کی ہمیشہ سے ہی بہت لگتی تھی۔

"چلیں پھوپھی! بی جی کو دعائیں دیں۔ ان کی وجہ سے آپ نے غلط فہمی میں نکاح ہونے کا بھی سن لیا۔ بلکہ ابھی آپ دیکھ بھی لیں گی۔ ویسے آپس کی بات ہے۔" وقاص نے کہتے ہوئے پھوپھی کی طرف سر جھکایا۔ "بعض اوقات غلط فہمی فائدہ بھی دے جاتی ہے۔"

"یہ ہمیں کیا معلوم۔ بی جی سے پوچھو۔ جن کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے۔" پھوپھی خورشید نے ناک سے مکھی اڑائی۔

بعض معاملوں میں بڑے ہماری ایک نہیں چلنے دیتے۔ نہ ہماری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ماننے کی۔ مگر جب یہ یقین ہو کہ ہمارے بڑے ہمارے لیے کوئی ایسا فیصلہ ہرگز نہیں کریں گے۔ جس سے زندگی میں ہمیں کبھی کوئی نقصان ہو تو ایسے میں اپنی عقل و سمجھ کو ایک طرف رکھ کر کمپرومائز کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جاسمین نے اپنی ہر تدبیر کو ناکام ہوتے دیکھ کر انگور کھٹے ہیں کہ مصداق سوچا اور ایک لمبی سے سانس لیتے ہوئے خود کو نکاح کے لیے تیار کرنے لگی۔ کیونکہ اب ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"ارے لڑکیوں' اب تم بھی جاکر تیار ہو جاؤ۔" بی جی نے ابھی تک انہیں وہیں کھڑا دیکھ کر کہا "اور ہاشم پتر تم بھی تیار ہو جاؤ۔"

"چلو جلدی کرو" جاسمین نے کہنے کے ساتھ ہی اندر کی طرف دوڑ لگائی۔ یہ دیکھیں بغیر کہ اپنے ہی خیالوں میں ہاشم بھی دروازے کی طرف جارہا ہے۔ نتیجہ ہاشم سے ٹکراکر گزر گئی۔ اس سے پہلے کہ ہاشم اس اچانک پڑنے والی مصیبت کو سمجھتا وہ تینوں بھی سمندر کی لہروں کی طرح اس سے ٹکراتے ہوئے گزری اور ہاشم میاں سنبھلنے کی کوشش میں لڑکھڑاتے ہوئے صوفے کے اوپر۔

"اف..." بے حد جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔

"ہائے میرے پتر کے زیادہ چوٹ تو نہیں لگ گئی۔" بی جی بے حد گھبرا کر صوفے پر ٹانگیں اوپر کی طرف کرکے پڑے ہاشم کی طرف لپکیں اور باقی سب ان کے پیچھے۔

"بارات آگئی' بارات آگئی۔" تب ہی شور سے مولوی جی کی بھی آنکھ کھلی تھی اور وہ ہڑبڑا کر کہہ رہے تھے۔ پھوپھی خورشید نے بے ساختہ اپنا سر پکڑ لیا۔

☼ ☼

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

تباہی کی وجہ

انسانوں کی طرح ملک اور قومیں بھی ہمیشہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے نہیں اپنی خوبیوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہیں۔ خوبی وہ چیز ہوتی ہے جس پر انسان اعتماد کرتا ہے، جس کی وجہ سے دوسرے لوگ اس کی ذات پر اعتماد کرتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ خوبی اس کی اصلی اچھائیوں کو کھانے لگتی ہے۔ اس کی خوبی کی وجہ سے اس میں تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اس خوبی کے باعث وہ انسانیت سے لڑنے لگتا ہے۔ فرد، قومیں، سب اپنی خوبیوں کی وجہ سے تباہ ہوتی ہیں۔

(راجا گدھ۔۔۔ بانو قدسیہ)
فریحہ شیر۔۔۔ شاہ نکڈر

ذلت

اپنی نظر میں ذلیل ہونے سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ذلت نہیں، کیونکہ خود سے چھپنے کے لیے کوئی اوٹ نہیں ہوتی، کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ سب کچھ ایسے صاف ہوتا ہے۔ جیسے کانچ کی شفاف دیوار کے ایک طرف بیٹھ کر دوسری طرف کا منظر دیکھ رہے ہوں۔

(بشریٰ سعید۔۔۔ سفال گر)
شبانہ سلمان۔۔۔ کراچی

صلہ

کہتے ہیں محبت اور محنت کبھی نہ کبھی صلہ ضرور دیتی ہے۔ ضروری نہیں ہے یہ صلہ اسی شکل میں ملے، جس شکل میں آپ چاہتے ہیں۔ بعض اوقات ہم عمل کسی اور جگہ کرتے ہیں، نتیجے کا سامنا ہمیں کسی اور جگہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ہمیں صلہ بھی بہت انوکھے اور مختلف انداز سے ملتا ہے۔

(انیلا کرن۔۔۔ چاہت کے رشتے)
ثناء شہزاد۔۔۔ کراچی

توبہ

کوئی کتنا بھی گناہ گار کیوں نہ ہو اللہ اس کے لیے دعا کا راستہ کبھی بند نہیں کرتا، وہ اپنے بندے کو نوازنے سے نہیں رکتا۔ جو اللہ اپنے بجائے کسی دوسرے کو خدا بنا کر پوجنے والے پر بھی اپنی رحمتیں بند نہیں کرتا، وہ اپنے نام لیوا کے لیے دعا اور توبہ کا راستہ کیسے بند کر سکتا ہے؟ اسی لیے اپنی چھوٹی بڑی غلطیوں پر اپنے رب سے توبہ کرتے رہو، دعا کا ہاتھ نہ چھوڑو۔

(آمنہ ریاض۔۔۔ ستارہ شام)
صدف سمیع۔۔۔ لاہور

موڈ آف

بارش میں چلتے ہوئے پتا نہیں کیوں، مجھے اپنے بچپن کا دوست شیخ رضا مہدی یاد آگیا۔ اس کا سر بھی میری طرح بالوں سے "تقریباً" ہاتھ دھو چکا تھا ایک دن مجھ سے کہنے لگا۔

"یہ قدرت نے ہمارے بال اڑا کے ہمارے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا؟"

"کوئی بات نہیں یار! کوئی فرق نہیں پڑتا رضا مہدی" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"فرق کیوں نہیں پڑتا یار! صبح سویرے جب دانت صاف کرنے کے لیے بیسن کے آگے کھڑا ہوتا ہوں اور سامنے لگے شیشے میں اپنی صورت دیکھتا ہوں تو میرا موڈ آف ہو جاتا ہے، دوسروں سے ہم کیا توقع کر سکتے ہیں۔

(امجد اسلام امجد)
ثریا شاہ۔۔۔ کہروڑ پکا

دھوکا

بہت سے لوگ دنیا میں جان بوجھ کر دھوکا کھاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم جس بندے پر اپنے خالص جذبات کا خزانہ لٹا رہے ہیں وہ اس قابل نہیں ہے۔ اس کے باوجود انسان بڑا خوش فہم واقع ہوتا ہے۔

وہ ایک ذرا سی امید اور خوش گمانی کے چکر میں اپنی محبت کے مدار کے اردگرد چکر لگاتا رہتا ہے کہ شاید کہیں کوئی اندر جانے کا راستہ مل جائے۔ ایسے لوگ جان بوجھ کر اپنے دل کے کہنے پر سرابوں کے پیچھے بھاگتے ہیں اور آخرکار تھک کر گر جاتے ہیں۔

(گمشدہ جنت۔۔۔ صائمہ اکرم چوہدری)

سمیعہ رحمان۔۔۔ کراچی

کھیل

کچھ دن فٹبال سے بھی سر مارا' آخر لمحہ اتصال تک یہ فیصلہ نہیں کرپاتے تھے کہ اس دفعہ فٹبال پر اپنا دایاں پاؤں ماریں یا بایاں زیادہ مناسب رہے گا دودھ کے دانت ٹوٹنے سے پہلے ہی ہم خاصے دبیز شیشے کی عینک لگانے لگے تھے۔ کئی دفعہ عینک توڑنے کے بعد اب ہم اسے اتار کر بے خطر کھیلنے لگے تھے کھیلتے کیا تھے' ہر ایک سے مینڈھے کی طرح ٹکریں لیتے پھرتے تھے۔ مخالف ٹیم میں ہمیشہ بہت "پاپولر" اس لیے کہ اپنی ہی ٹیم سے گیند چھینتے اور انہی کو فاؤل مارتے پھرتے تھے۔ کھیل کے شروع میں ٹاس کیا جاتا۔ جو کپتان ٹاس ہار جاتا وہ ہمیں اپنی ٹیم میں شامل کرنے کا پابند ہوتا۔

(زرگزشت۔۔۔ مشتاق احمد یوسفی)

اقصیٰ مریم ملغانی' اسوہ مریم ملغانی۔۔۔ کوٹ ادو

دعا

جب ہماری کوئی دعا قبول ہو جاتی ہے تو ہم لوگ یہ کیوں کہتے ہیں کاش قبولیت کی اس گھڑی میں ہم نے کچھ اور مانگ لیا ہوتا۔ جب ہم نے کچھ دیر پہلے وہ چیز مانگی تھی اور وہ اللہ نے ہمیں فوراً" دے بھی دی تو ہم بجائے اس کا شکر ادا کرنے کے ناشکراپن کیوں دکھانے لگتے ہیں آخر ہم حاصل ہونے والی شے پر قانع اور مطمئن کیوں نہیں ہوتے۔

(فرحت اشتیاق۔۔۔ وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر)

سعدیہ بختیار۔۔۔ راولپنڈی اسلام آباد

لوک داستانیں

پنجاب کی ٹریجڈی یہ ہے کہ اس کے پاس جتنے اچھے عاشق ہیں سب مردہ ہیں' ہیر رانجھا بھی ان میں سے ہیں۔ کیدو ان کی کہانی کا مرکزی کردار ہے اسے کیدو اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی زندگی کا اصول تھا جو دیکھو سب کہہ دو پنجاب کی لوک داستانیں پڑھ کر لگتا ہے' یہاں کے لوگوں کی جوانی کا آغاز محبت سے اور اختتام بھی محبت سے ہوتا ہے اور نئی نسل کو اس سے بچانے کا ایک طریقہ ہے کہ اسے نصاب میں شامل کر دیا جائے۔

(ڈاکٹر یونس بٹ۔۔۔ بٹ صورتیاں)

نسرین زمان۔۔۔ سبی کوئٹہ

عشق

الٰہی بخش نے کہا۔ "ابا۔۔۔ تم عشق کی بات کرتے ہو' کہتے ہو زندگی کا مقصد عشق ہونا چاہیے۔۔۔ عشق اللہ سے اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ یہ تو بتاؤ' یہ عشق کیا چیز ہے مشکل ہے کہ آسان ہے۔ مجھے محبت بہت آسان لگتی ہے کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی' ہو جاتی ہے تو' ہو جاتی ہے۔ نہیں ہوتی تو نہیں ہوتی مگر اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں لگتا یہ' جتنا تم اسے بتاتے ہو۔"

باپ کے چہرے پر نرمی ہی نرمی بکھر گئی۔ آنکھوں میں جیسے گہری سوچ اتر آئی۔

"میں تو جاہل آدمی ہوں بیٹے' پر آپ ہی آپ یہ باتیں سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ اس کو سمجھنے کے لیے کتابیں پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ یہ عشق تو آدمی کے اندر ہوتا ہے نا بس اس کے لیے خود کو سمجھنا اور تبدیل کرتے رہنا ہوتا ہے۔" وہ کہتے کہتے رکا اور بظاہر سامنے والی دیوار پر کچھ دیکھنے لگا لیکن لگتا تھا کہ وہ بہت دور دیکھ رہا ہے "عشق تو بیٹے آسان ہے۔۔۔ بہت ہی آسان یہ تو ہو جاتا ہے پر عشق کرتے رہنا' کیے جانا بہت مشکل ہے۔ عشق کے تقاضے پورے کرنا بالکل آسان نہیں اس کے لیے تو اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔"

(عشق کا عین۔۔۔ علیم الحق حقی)

فوزیہ ناز۔۔۔ نواب شاہ

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

فرمان الٰہی

بے شک جو شخص اپنے رب کے پاس مجرم بن کر آئے گا تو بے شک اس کے لیے جہنم ہے (اور وہ ایسا عذاب ہے کہ) نہ وہ اس میں مر سکے گا اور نہ ہی زندہ رہے گا۔ (سورۃ طہٰ آیت نمبر 74)

رشیدہ فیض۔۔۔ جام پور

چھ طرح کے لوگ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"چھ طرح کے لوگوں پر میں نے اور اللہ تعالیٰ نے اور ہر نبی مستجاب نے لعنت کی ہے۔ اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والا' اور اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا' زبردستی غالب آجانے والا تاکہ جسے اللہ نے ذلیل کیا ہے اسے عزت دے اور جسے اللہ نے عزت دی ہے اسے ذلیل کرے اور اللہ کے حرام کو حلال سمجھنے والا اور میری اولاد سے حلال جانے اس چیز کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے (یعنی کسی کو بے گناہ قتل کرے) اور میری سنت کو چھوڑنے والا۔" 101

(مشکوۃ شریف : باب الایمان بالقدر)

بارہ رکعات سنت کی فضیلت

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جو شخص ہمیشہ بارہ رکعات پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کے لیے جنت میں ایک مکان بنائے گا' چار رکعات نماز ظہر سے پہلے اور دو رکعات نماز ظہر کے بعد اور دو رکعات نماز مغرب کے بعد اور دو رکعات نماز عشاء کے بعد اور دو رکعات نماز فجر سے پہلے۔"

امینہ ملک۔۔۔ کراچی

روشن باتیں

"رشتے"

فاصلے کبھی بھی رشتے الگ نہیں کرتے اور نزدیکیاں کبھی بھی رشتے نہیں بناتیں اگر احساس سچے اور پرخلوص ہوں تو رشتے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

"بہتر سے بہترین"

زندگی تب بہتر ہوتی ہے جب آپ خوش ہوتے ہیں لیکن زندگی تب بہترین ہوتی ہے جب آپ کی وجہ سے کوئی دوسرا خوش ہوتا ہے۔

"موت"

جو غیبت اور فضول گوئی زیادہ کرے گا وہ دین اسلام پر نہیں مرے گا۔

ناراضی

خدا کے خوف سے تنہائی میں رونے کے سوا کوئی بھی چیز خدا کی ناراضی نہیں مٹا سکتی۔

مدیحہ نورین مہک۔۔۔ برنالی

جنت کی مٹی

ٹیچر اسٹوڈنٹ سے! "اگر تم میں سے کوئی مجھے مٹھی بھر جنت کی مٹی لا کر دے گا تو وہ تم میں سے کامیاب اسٹوڈنٹ ہو گا۔"

اگلے دن ایک چھوٹا بچہ مٹھی بھر مٹی لے آیا اور ٹیچر کو دے دی۔

ٹیچر نے ناراض ہو کر کہا۔

"تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔ یہ مٹی کہاں سے لائے ہو۔"

اسٹوڈنٹ نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ مٹی میں اپنی ماں کی قبر سے اٹھا کر لایا ہوں آپ نے ہی ہمیں سکھایا ہے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔"

مدیحہ نورین مہک۔۔۔ برنالی

آپ بھی سنیے!

☆ کچھ لوگ ہوا کی مانند ہوتے ہیں چپکے سے زندگی میں آتے اور چپکے سے زندگی کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

☆ محبت پربتوں کے دامن سے پھوٹنے والے چشمے کی طرح اپنی سمت اور اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے لیکن کچھ محبتیں درگاہ پہ تقسیم ہونے والی نیاز کی طرح ہوتی ہیں جنہیں خالی ہاتھوں سے اپنے قدموں پہ خود چل کر حاصل کرنا پڑتا ہے۔

☆ کچھ دل بہت نازک ہوتے ہیں ان پر لفظ استعمال کرنے سے پہلے ان کے حوصلوں کو جان لو' ورنہ یا وہ دل ٹوٹ جائے گا یا تم خود۔

☆ پوری انسانیت سے پیار بہت آسان ہے لیکن صرف ہمسائے سے پیار کرنا بہت مشکل ہے۔

☆ اتنے غلط انسان نہیں ہوتے جتنے غلط رویے ہوتے ہیں۔

ثمینہ کوثر عطاری' صبا نوشاہی ڈوگر۔۔۔ گجرات

اگر سمجھ سکو تو سمجھ لو

ایک بزرگ اپنا موبائل مرمت کرانے لے گیا دکاندار نے چیک کرنے کے بعد کہا۔

"بابا جی! اس میں تو کوئی نقص نہیں ہے۔"

بزرگ ہلکی سی مایوسی اور آہستگی سے بولا۔

"تو پھر میرے بچوں کی کال کیوں نہیں آتی؟"

نشا نورین' صائقہ نورین۔۔۔ بوتالہ جھنڈ سنگھ

یادوں کے کنول

وقت کا سیل رواں
جس کے اس پار کہیں رکھی ہے
گمشدہ عمر کے لمحوں کی کتاب
اور اس پار فقط خواب ہی خواب
تیری یادوں کے کنول
تیری جدائی کے گلاب

(امجد اسلام امجد)

سیدہ نسبت زہرا کھروڑ پکا

"سکون"

سکون حاصل کرنے کی کوشش چھوڑ دو' سکون دینے کی فکر کرو تو سکون مل جائے گا۔ اللہ کے فیصلوں پر تنقید نہ کرنا سکون مل جائے گا۔ بے سکونی تمنا کا نام ہے جب تمنا تابع فرمان الہی ہو جائے تو سکون شروع ہو جاتا ہے۔ اپنی زندگی میں آپ کو جو چیز سب سے اچھی نظر آتی ہے اسے تقسیم کرنا شروع کر دو سکون آ جائے گا۔

(واصف علی واصف)

ثریا شاہ کھروڑ پکا

موتیوں جیسے الفاظ

☆ کسی کی خوبیوں کی تعریف کرنے میں وقت ضائع مت کرو بلکہ اس کی خوبیوں کو اپنانے کی کوشش کرو۔

☆ خوب صورتی ختم ہو جاتی ہے لیکن سیرت قبر تک جاتی ہے۔

☆ اس دن پر آنسو بہاؤ جو تم نے بغیر نیکی کے گزار دیا

☆ گناہ اتنا کرو جتنا تم میں عذاب سہنے کی طاقت ہے

☆ زبان کے خنجر سے کسی کو زخمی مت کرو۔

☆ قلم' قدم اور قسم زندگی میں ہمیشہ سوچ کر اٹھانا

☆ جب جسم کے لیے موت ہے تو راہ حق میں شہید ہونا سب سے بہتر ہے۔

روبینہ لیاقت۔۔۔ ملتان

☆ ☆

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

"اسامہ انجم" کی ڈائری میں تحریر
ایک خوبصورت نظم

"جب دھرتی ماں نے یاد کیا"

جب دھرتی ماں نے یاد کیا، لبیک دیوانے چل نکلے
اس پاک وطن کی مٹی پر ہم جان لٹانے چل نکلے
ہے تیری امانت خون اپنا ہم خون بہانے چل نکلے
کھائی ہے تیری عزت کی قسم، یہ عہد نبھانے چل نکلے
اے پاک وطن تو شان اپنی، ہم شان بڑھانے چل نکلے
دیکھا ہے میلی آنکھ سے جب وہ آنکھ جھکانے چل نکلے
جو بم بڑھا مٹی کی طرف، وہ بم جلانے چل نکلے
پرچم جو بڑھا دھرتی کی طرف، پرچم وہ گرانے چل نکلے
جو آگے بڑھے ذلت سے اس دشمن کو مٹانے چل نکلے
ہیں موت سے ہم بے خوف و خطر، ہم جان لٹانے چل نکلے
ہے ماں کی دعا اللہ کی رضا، وہ پوری کرنے چل نکلے
ظلم نہ کاٹوں، جنت کا سکوں، وہ رتبہ پانے چل نکلے
اللہ کی امانت جان اپنی، واپس لوٹانے چل نکلے
اور پیارے نبیؐ کی امت کی حرمت کو بچانے چل نکلے
نعرہ ہے ردِ کفر اپنا تکبیر سنانے چل نکلے

"نسرین بشیر" کی ڈائری میں تحریر
اعتبار ساجد کی غزل

"مجھ کو محسوس کرو"

مجھ کو محسوس کرو روح کی گہرائی میں
یا کسی اجڑی ہوئی گود کی تنہائی میں
یا کسی کھوئے ہوئے شہر کی رعنائی میں
مجھ کو محسوس کرو

تم نے گر لفظ کے آئینہ بے روح میں دیکھا ہوگا
میری سوچوں کے خدوخال کے اجلے پن کو
اس طرح شرح خیالات سے نہیں ہو سکتی
اس طرح تم سے ملاقات نہیں ہو سکتی
مجھ کو محسوس کرو

اپنی خواہش کے جزیروں میں محسوس کرو
صرف محسوس کرو

"نادرہ سلطانہ" کی ڈائری میں تحریر
بشیر بدر کی غزل

میں تو اک کاغذی پھول تھا، مگر شام خوشبو سے بھر گیا
میں کہاں کہاں مجھ کو خبر نہیں مجھے کون چھو کے گزر گیا

وہ اداس لڑکی بہار لائی پہاڑوں سے زمیں پر
میرے دل میں قدر کا چاند بھی یونہی زینہ زینہ اتر گیا

یہ گلاب بھی مرا عکس ہے یہ ستارہ بھی مرا نقش ہے
میں کبھی زمیں میں دفن ہوں کبھی آسمان سے گزر گیا

میں اداس چاند کا باغ ہوں میں گئے دنوں کا سراغ ہوں
مری شاخ شاخ جھلس گئی مرا پھول پھول بکھر گیا

وہ سفید پھولوں سی اک دعا مرے ساتھ ساتھ رہی سدا
یہ اسی کا فیض ہے بارہا میں بکھر بکھر کے سنور گیا

مرے آنسوؤں کی کتاب بھی ترے خوشبوؤں سے مہک گیا
مرے شعر میں ترا آئینہ جہاں شام آئی سنور گیا

ثمن، کی ڈائری میں تحریر

فرحت عباس شاہ کی نظم

کبھی کچھ یاد آئے تو،

اذیت کی نگہداری اگرچہ انتہائی مشکل ہے
مگر اس قریہ قریہ منتشر دوری کے پردے پس
نجانے کب، کہاں، کس نے، کس کو، سونپ رکھی ہے

عجب بے اختیاری ہے
میں اپنی بات کرتا ہوں
نگہداری اذیت کی تمہیں کب یاد ہو گی تم نے
کسی کو کب کہاں نستے لگائی تھی
مگر یہ دل
دراڑوں سے بھری دیوارِ دل
تمنا تمہاری آزمائش کا
مری آنکھوں سے اب بھی جھانکنے لگتا ہے
حیرت سے
یہ پنجرہ، یہ نگہباں پاس داری کا
وریدوں میں لہو کی گردشیں بھی
اس کو جیتی ہیں تمہیں آنا نہیں لیکن
کسی کو بھیج کر بازار
کچھ قیدی پرندوں کو
رہا کروا دیا کرنا
کبھی کچھ یاد آئے تو

سیدہ فرزین حبیب، کی ڈائری میں تحریر

احمد فراز کی غزل

قربت بھی نہیں دل سے اُتر بھی نہیں جاتا
وہ شخص کوئی فیصلہ کر بھی نہیں جاتا

آنکھیں بھی ہیں کہ خالی نہیں ہوتیں لہو سے
اور زخم جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا

وہ راحت جاں ہے مگر اس دربدری میں
ایسا ہے کہ اب دھیان اُدھر بھی نہیں جاتا

ہم دوہری اذیت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی شل، شوقِ سفر بھی نہیں جاتا

دل کو تیری چاہت پہ بھروسا بھی بہت ہے
اور تجھ سے بچھڑ جانے کا ڈر بھی نہیں جاتا

پاگل ہوئے جاتے ہو فراز! اُس سے ملے کیا
اتنی سی خوشی پہ کوئی مر بھی نہیں جاتا

شازیہ گلزار، کی ڈائری میں تحریر

ساقی کی غزل

اس نے چاہا تو چاہتوں کی حدوں سے بڑھ کر
کہتا تھا ہمدم نہ چھوڑنا طوفانوں سے ڈر کر

پھر خود ہی توڑ دیا وہ تعلق زندگی کے اک موڑ پر
آج میں نے پوچھا تو کہتا ہے وہ لمحہ تھا گزر گیا کناروں کو توڑ کر

خود ہی رو پڑا وہ اک زندگی کے موڑ پر
اور کہہ گیا تم کسی اور کے ہو جاؤ مجھے بھول کر

میں حسرت سے دیکھتا رہا اسے اپنے ہاتھوں کو جوڑ کر
اور وہ چل پڑا میری وفاؤں کو چھوڑ کر

مگر میں کروں گا انتظار ان لمحات کو تھام کر ساقی
کبھی تو ہو گا اسے بھی احساس کسی نے چاہا تھا اسے دنیا کو چھوڑ کر

شگفتہ سلیمان

مجھے یہ شعر پسند ہے

سیدہ نسبت زہرا ——— کہروڑپکا

مجھ کو معلوم نہ تھی ہجر کی یہ رمز کہ تو
جب میرے پاس نہ ہوگا تو پھر ہر سو ہوگا

گڑیا شاہ ——— کہروڑپکا

شہر ویران سے ڈر گئے ہوتے
تم سے ہوتے تو گھر گئے ہوتے
وہ تو آنکھیں تھیں کہہ گئیں سب کچھ
ہونٹ ہوتے تو مکر گئے ہوتے

طاہرہ ملک، رضوانہ ملک ——— جلال پور پیروالا

کاش کہ میرے خوابوں کی تعبیر مل جائے
جاگتی آنکھوں میں اس کی تصویر مل جائے
جو شخص مقدر میں نہیں ہے میرے
وہ شخص مجھے بنا تقدیر کے مل جائے

نور عبدالسلام ——— نواب شاہ

اب یہ سوچا ہے کہ اپنی ذات میں سمٹے رہیں
ہم نے کر کے دیکھ لی سب سے شناسائی بہت

فریحہ شبیر ——— شاہ نکدر

وہ ایک شخص جس کی یادوں سے چلتی ہے میری نبض حیات
تم کیسے طبیب ہو کہتے ہو بھول جاؤ اسے

ناہید راشد ——— کراچی

دیمک زدہ کتاب تھی یادوں کی زندگی
ہر ورق کھولنے کی خواہش میں پھٹ گیا

ثمینہ کوثر عطاری ——— ڈوگہ گجرات

تہہ بار سنگ گراں ہے دل کہ ہے خاک خاک اٹا ہوا
کہیں فرد فرد سے رابطے، کہیں شہر بھر سے کٹا ہوا
مجھے بھیجتے ہو سمندروں کے سفر پہ کس لیے دوستو
میری ناؤ بھی ہے چھدی ہوئی میرا بادباں بھی پھٹا ہوا

ندا، فضہ ——— کراچی

زوال یہ ہے کہ تیرا ساتھ نہیں
کمال یہ ہے کہ جی رہی ہوں

انیلا ——— بھائی پھیرو

چاہنے والے بھی بڑے نصیب سے ملتے ہیں
تم یہ بات تسلیم کرو گے میرے بچھڑنے کے بعد

بیا اسامہ انجم ——— فیصل آباد

عادتیں بہت مختلف ہیں ہماری دنیا والوں سے
محبت کم کرتے ہیں مگر لاجواب کرتے ہیں

عذرا ناصر ——— کراچی

تفصیل سے کیسے سنائیں یہ قصہ محبت کا
کہ تم مصروف ہو اب تک ہمیں برباد کرنے میں

اقصیٰ ناصر ——— کراچی

اک تبسم ہزار شکووں کا
کتنا پیارا جواب ہوتا

حمزہ، اقراء ——— کراچی

پہلے موسم ہی بدلتے تھے جہاں میں لوگو
اب ارادوں کی طرح لوگ بدل جاتے ہیں

صبا ——— کورنگی

مجھے خبر ہے تجھے سوچنے کی خاطر ہم
بہت سے کام مقدر پہ ڈال دیتے ہیں

مدیحہ فہید ——— کراچی

محبت ہاتھ میں پہنی ہوئی چوڑی کی مانند ہے
سنورتی ہے کھنکتی ہے کھنک کر ٹوٹ جاتی ہے

عائشہ ——— گوجرہ

کبھی تھا خواب اس کے سنگ چلنے کا ان راستوں پر
اب میں ہوں، راستے ہیں، پر وہ کہیں نہیں

ماہ نور غلام علی ——— کراچی

میری منزلیں بھی عجیب تھیں میرا فیض بھی تھا کمال پر
کبھی سب کچھ ملا بنا طلب، کبھی کچھ نہ ملا سوال پر

تحریم ——— فیصل آباد

جب غرض ہو تب پیار کیا، جب وقت ملا تب یاد کیا
اب اور حقیقت کیا لکھوں اس دور کے مخلص لوگوں کی

حسن کی صحت

ادارہ

لیموں

آپ شاید جانتی نہ ہوں کہ یہ سبزی ہے' جادو سے بھری اور ہر دوسرے مسئلے کا حل

لیموں یا لیمن! غذائی اہمیت کے علاوہ جمالیاتی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ اس میں حیاتین اے' حیاتین بی' حیاتین سی سب پھلوں سے زیادہ مقدار میں ہے۔ جدید تحقیق کی رو سے لیموں میں وٹامن ڈی کی بھی کمی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ لیموں کے رس میں کیلشیم (چونا) کے مرکبات پائے جاتے ہیں جو نہ صرف انسانی نشوونما بلکہ افزائش حسن کے لیے بھی نہایت ضروری ہے۔ افزائش حسن کے لیے اس کے استعمال کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1 ۔ جن خواتین کے چہرے کی رنگت پہلے گوری ہو اور پھر سانولی ہونے لگے۔ ان کو چاہیے کہ صبح کے وقت آدھا لیموں نیم گرم پانی کے ایک گلاس میں نچوڑ کر پی لیا کریں اور باقی آدھا لیموں بالائی میں نچوڑ کر رات کو سونے سے پہلے چہرے پر ملیں۔ جب تک بالائی کی بتیاں سی نہ بننے لگیں۔ چہرے پر ملتی رہیں۔

2 ۔ جن خواتین کی جلد بے حد چکنی اور کھلے مسام والی ہو ان کو چاہیے کہ چہرہ دھونے سے پہلے لیمن کلینزنگ لوشن سے جلد صاف کریں۔ پھر چہرہ دھونے کے بعد ویلیو اسمتھ لوشن اور اسٹرنجنٹ استعمال کریں۔ اس سے چہرے کی چکناہٹ دور ہوگی اور چہرے کے کھلے مسام یکسر بند ہو جائیں گے۔

3 ۔ جو خواتین عینک لگاتی ہیں اور عینک سے ان کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ جاتے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ لیموں کے چھلکے باریک پیس کر نیویا کریم کے ساتھ ملا کر آنکھوں کے حلقوں کے گرد لگائیں۔ حلقے دور ہو جائیں گے۔

4 ۔ لیموں کا ماسک چہرے کے کیل مہاسوں کو دور کرتا ہے۔ چہرے کو ڈیٹول سوپ سے دھو کر لیموں کے چھلکے نہایت باریک پیس کر گلیسرین میں ملا کر چہرے پر ماسک خالی ہاتھ سے یا کسی فوم کے ٹکڑے کے ساتھ

لگائیں۔ پورے چہرے پر ماسک لگانے کے بعد اسے کم سے کم پندرہ منٹ چہرے پر لگا رہنے دیں۔

5 ۔ بچے کی ولادت کے بعد اکثر خواتین کے چہرے کی جلد پر دھبے پڑ جاتے ہیں۔ یہ داغ جسم میں آئرن اور وٹامن سی کی کمی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ نہار منہ شہد اور لیموں کو پانی میں ملا کر پئیں۔ چند روز کے استعمال سے داغ دھبے دور ہو جائیں گے۔

6 ۔ چہرے کی چھائیاں دور کرنے کے لیے بھی لیموں مجرب ہے اور اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ مندرجہ ذیل نسخہ چھائیاں دور کرنے کے لیے استعمال کریں۔

لیموں آدھا' ہلدی آدھا چمچہ اور بیسن دو چمچے ملا کر پیسٹ بنالیں اور اس کا ماسک چہرے پر لگائیں۔ دو' تین بار ماسک لگانے سے چہرے کی چھائیاں دور ہو جاتی ہیں۔

7 ۔ بعض خواتین کے پاؤں بدنما ہوتے ہیں۔ ان کے لیے درج ذیل فارمولا مفید ہے۔ چھوٹے ٹب میں گرم پانی اور اس میں کھانے کا نمک ڈالیں۔ پندرہ منٹ تک پاؤں بھیگے رہنے دیں۔ اب جھانویں سے پاؤں رگڑیں۔ دھونے کے بعد پاؤں خشک کرکے لیمن کریم لگائیں۔ اگر کوئی لیمن کریم دستیاب نہ ہو تو کسی بھی کریم میں لیمن نچوڑ کر اس کو لیمن کریم بنائیں۔۔ اور فریج میں رکھ دیں۔

8 ۔ بعض خواتین کے ناخن ٹوٹتے ہیں' ان کو چاہیے کہ وہ لیموں پئیں۔ ناخن جسم میں کیلشیم کی کمی کی وجہ سے بھی ٹوٹتے ہیں۔

لیموں کے عرق میں پھٹکری ملا کر اس محلول کو روئی کے ساتھ ناخنوں پر لگائیں۔ پندرہ منٹ بعد ہاتھ دھو کر لیمن کریم لگائیں۔

9 ۔ گلاب کے عرق میں لیموں نچوڑ کر غرارے کریں۔ اس سے دانت چمکدار ہوتے ہیں۔ یہ آمیزہ بالوں کے لیے بھی بہترین کنڈیشنر ہے۔

10 ۔ گلیسرین میں لیموں کا رس ملا کر رکھ لیں۔۔ ہر روز صبح منہ دھو کر لیموں ملے گلیسرین کی چہرے پر مالش کریں۔ اس سے جلد نرم ہوتی ہے اور رنگ نکھرتا ہے۔ یہ چہرے کی رنگت نکھارنے کے لیے ایک بہترین لوشن ہے۔ جو چہرے کی رنگت نکھارنے کے لیے جادو کا اثر رکھتا ہے۔

11 ۔ جھریاں دور کرنے کا بہترین نسخہ یہ ہے کہ دس تولہ شہد میں ایک لیموں کا رس ملا کر چہرے پر لیپ کرکے پندرہ منٹ کے بعد دھو ڈالیں۔ پندرہ یا بیس دن لگانے سے چہرے کی جھریاں دور ہو جاتی ہیں اور چہرہ صاف ہو جاتا ہے۔

12 ۔ چہرے کی جلد زیادہ چکنی ہونے کا باعث بدپرہیزی اور بدہضمی ہے۔ جن کے چہرے پر ہمیشہ چکناہٹ موجود رہتی ہے۔ ان کو چاہیے کہ خوراک سادہ اور زود ہضم کھائیں۔ گھی اور انڈے جیسی چیزوں کا استعمال بہت کم کریں۔ سنگترے کا جوس اور لیموں کا جوس کھانے کے ساتھ ضرور پئیں اس سے جلد کی چکناہٹ دور ہو جاتی ہے۔

13 ۔ بعض خواتین کی گردن نہانے کے باوجود میلی نظر آتی ہے۔ ان کے لیے مندرجہ ذیل فارمولا بہترین ہے۔

ایک حصہ گلیسرین میں اتنا ہی عرق گلاب اور تین حصہ لیموں کا رس کا مرکب بنا کر روئی کے پھوئے سے گردن پر لگائیں۔ آہستہ آہستہ مساج بھی کریں۔ مرکب کو خوب اچھی طرح کھال میں جذب کر دیں۔۔ یہ عمل رات کو سوتے وقت کرنا چاہیے۔ رات بھر گردن کو اسی حالت میں رہنے دیں۔ صبح دھو ڈالیں۔ دو' تین بار رات کو سوتے وقت یہ عمل کرنے سے گردن کی جلد میں اور خوب صورتی میں نمایاں اضافہ ہو جائے گا۔

اب تو آپ بھی سمجھ گئی ہوں گی کہ چھوٹی سی بے ضرر سی چیز میں ایک جہاں آباد ہے۔

☆ ☆

روبینہ شریف

مسکراتی کرنیں

تحفہ

جج ملزم کے ساتھ سختی سے پیش آرہا تھا۔ اس نے سوال کیا۔

"تم کب پیدا ہوئے تھے؟"

جواب نہ پاکر وہ پھر بولا۔

"تمہاری سالگرہ کب ہے؟"

ملزم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"میں نہیں بتاتا' آپ جیسے روکھے شخص سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ آپ نے کون سا مجھے کوئی تحفہ دینا ہے۔"

مدیحہ نورین۔۔۔ برنالی

انجام بخیر

ایک صاحب اپنی بیوی کے ساتھ کہیں جارہے تھے راستے میں ان کا ایک دوست ملا جس کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ دو پولیس والے اس کے دائیں بائیں چل رہے تھے وہ صاحب دوڑتے ہوئے اس کے قریب گئے اور بولے۔

"ارے یہ کیا ہوا؟"

"میں نے اپنی بیوی کو قتل کردیا اور مجھے چھ ہفتے کے لیے جیل بھیجا جارہا ہے۔"

"بیوی کے قتل کرنے پر صرف چھ ہفتے کی جیل؟"

وہ صاحب بڑبڑائے پھر بیوی کو پکارا۔

"ادھر آؤ میں برسوں سے ایک بات پر غور کررہا ہوں میں سوچتا ہوں اسے آج انجام دے ہی ڈالوں۔"

انہوں نے یہ کہہ کر پولیس مین سے بندوق چھینی اور بیوی کو گولی ماردی' ان کے دوست نے بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

"میں چھ ہفتے جیل میں رہوں گا پھر مجھے پھانسی کی سزا ہوجائے گی۔"

نازیہ ناز۔۔۔ گجرات

گلوکار

ایک گلوکار موصوف ہروقت اپنے ساتھ دو میڈل لیے گھوما کرتے تھے۔ ایک میڈل چھوٹا اور ایک بڑا۔ ایک دفعہ ان کے دوست نے خیال ظاہر کیا کہ۔

"غالباً" چھوٹا میڈل کسی ہلکے پھلکے گانے کا مقابلہ جیتنے پر اور بڑا میڈل کوئی کلاسیکل مقابلہ جیتنے پر ملا ہوگا۔"

"ایک دفعہ گلوکاری کا بہت بڑا مقابلہ ہوا تھا چھوٹا میڈل مجھے بہترین گانے پر ملا۔" گلوکار نے وضاحت کی۔

"اور بڑا میڈل؟" دوست نے پوچھا۔

"بڑا میڈل وہی گانا بند کرنے پر۔" گلوکار نے جواب دیا۔

گڑیا شاہ۔۔۔ کہروڑپکا

ثبوت

ایک بیگم صاحبہ گرمیوں کی چھٹیوں میں بچوں کو لے کر میکے چلی گئیں اور روز شام کو فون کرکے شوہر سے پوچھتیں۔

"کہاں ہیں آپ؟"

شوہر بڑے اعتماد سے کہتا۔

"گھر پر ہوں اور میں نے کون سی دوسری کے پاس جانا ہے۔"

بیگم کہتی۔ "جو سر چلا کے سنائیں۔"

شوہر اٹھ کر جو سر چلا دیتا۔

"گھررررگرررر گھرررر۔"

ایک شام بیگم بغیر بتائے واپس آگئیں' دروازے پہ تالا لگا تھا۔ پڑوسن سے پوچھا۔

"یہ کب آتے ہیں کچھ پتا ہے؟"

پڑوسن نے کہا۔

"یہ صبح جو سر لے کے نکل جاتے ہیں۔ رات کو ایک دو بجے واپس آتے ہیں۔"

حنا فرحان۔۔۔ راجن پور

گرامر

مظہر صاحب گرامر پڑھا رہے تھے۔ اچانک ایک طالب علم اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" وہ گرجے۔

"میں ٹائلٹ کو جاتا ہوں۔" لڑکا بولا۔

"نہیں بالکل غلط۔" مظہر صاحب بولے۔

"مجھے ٹائلٹ جانا ہے۔ اسے ٹائلٹ جانا ہے۔ ہمیں ٹائلٹ جانا ہے ہم سب کو ٹائلٹ جانا ہے۔"

"اف میرے خدایا!" لڑکا چیخا۔

"لیکن وہاں تو صرف ایک لوٹا ہے۔"

سائرہ بی بی۔۔۔ لاہور

بل

پیرس کے ایک ریستوران میں دو بجے رات' آخری گاہک اپنی میز پر سر رکھے سو رہا تھا۔ صفائی کرنے والی عورت نے مالک سے کہا۔

"میں نے آپ کو پانچ بار اس گاہک کو اٹھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ اسے نکال کیوں نہیں دیتے۔"

مالک نے جواب دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں' میں جب بھی اسے اٹھاتا ہوں اور بل مانگتا ہوں یہ بل ادا کر کے پھر سو جاتا ہے۔"

ام ہانیہ۔۔۔ کوئٹہ

وجہ تسمیہ

ایک سیاح خواتین کی محفل میں اپنی زندگی کے ناقابل فراموش واقعات سناتے ہوئے بولا۔

"افریقہ میں ایک بار سامنا وحشی عورتوں کے ایک قبیلے سے ہوا جن کی زبانیں ہی نہیں تھیں۔"

"زبانیں ہی نہیں تھیں۔۔۔؟" کئی خواتین نے حیرت سے چلا اٹھیں۔

"پھر تو وہ بے چاری بول بھی نہیں سکتی ہوں گی۔"

"اسی چیز نے تو انہیں وحشی بنا دیا تھا۔" سیاح نے جواب دیا۔

آمنہ میر۔۔۔ گجرات

مشورہ

ایک مقدمے میں گواہوں کے بیانات سننے کے بعد جج نے ملزم کے وکیل سے کہا کہ۔

"کیس تمہارے موکل کے خلاف جا رہا ہے تم چاہو تو ملزم کو مزید کارروائی سے قبل اس کو الگ لے جا کر مناسب مشورہ دے دو۔"

یہ سن کر وکیل ملزم کو لے کر الگ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وکیل اکیلے واپس آیا تو جج نے دریافت کیا کہ۔

"ملزم کہاں ہے؟"

وکیل نے جواب دیا۔

"وہ تو بھاگ گیا۔ میرا اسے یہی مشورہ تھا۔"

سیدہ بنت زہرا۔۔۔ کھوڑ پکا

غلط فہمی

ڈاکٹر نے ریسیور رکھتے ہوئے نرس سے کہا۔

"جلدی سے میرا سامان لے آؤ ایک مریض کا فون آیا ہے وہ میرے بغیر مر رہا ہے۔"

نرس نے آہستہ سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب وہ فون آپ کے لیے نہیں' میرے لیے تھا۔"

سونیا ربانی۔۔۔ قافیاں

مدیرہ کرن

نامے میرے نام

اس ماہ کا خط

ثناء شہزاد۔۔۔ کراچی

جولائی کا شمارہ 26 کو ملا اس کے باوجود جلدی جلدی پڑھ کر خط روانہ کر دیا۔ مگر افسوس مجھے اس بار کرن میں جگہ نہ مل سکی دل تھوڑا اداس ہوا مگر میں نے اسے پیار سے سمجھایا تو وہ بے چارا سمجھ گیا۔ جبکہ اگست کا شمارہ 13 تاریخ کو مل گیا آزادی سے ایک دن پہلے، کرن کتاب بہت پسند آئی۔ ماڈل کچھ اداس اداس سی لگی۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا پھر محمود خاور کے لیے دعائے مغفرت کی اس کے بعد "حمد و نعت" کو پڑھنے کا شرف بخشا۔ اس بار فائزہ افتخار کا "شاید" غیر حاضر تھا جس کی کمی بہت شدت سے محسوس کی کیونکہ یہ میرا موسٹ فیورٹ ناول ہے۔ تنزیلہ ریاض کافی ٹائم بعد آئیں اور آتے ہی ہمیں اپنے حصار میں جکڑ لیا جتنا منفرد نام ہے "راپنزل" اتنی ہی منفرد کہانی بھی ہو گی ابھی دو قسطیں پڑھی ہیں اس لیے زیادہ تبصرہ نہیں کر سکتی۔ افسانے اس بار کے بس صحیح لگے زیادہ متاثر نہیں کیا۔

"میں گمان نہیں یقین ہوں" بہت اچھا جا رہا ہے مگر مجھے ذیان پر بہت غصہ آ رہا ہے۔ جو اتنی محبتوں کے ملنے کے باوجود بھی نفرت کی آگ میں جل رہی ہے ایک جب اس کے لیے نرم گوشہ رکھ رہا ہے اس سے محبت کر رہا ہے تو ذیان کو بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے دینا چاہیے۔ مگر نبیلہ ابر راجہ کا یہ خاصا ہے کہ ان کی ہیروئین شادی کے بعد سدھرتی ہے تو ذیان کی عقل بھی شادی کے بعد ٹھکانے آئے گی اور یہ وہ نم صاحب کس خوشی میں ذیان سے حسد رکھ رہی ہیں اور محترمہ ایک بار ہی جا کر اپنے گھر پر دیکھیں تو سہی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے فاخرہ گل کے ناولٹ "خالہ سالا اور اوپر والا" کا شکر ہے اختتام ہوا یاسمین نشاط نے "اعتبار کر دیکھو" اچھا لکھا اس کے علاوہ عزہ خالد کا "بہار آئی" بھی زبردست تھا گو ہر عینا سے محبت کرتا ہے بعد میں پتا چلا شروع میں تو مجھے یہی لگا کہ وہ عینا کو بہن ہی سمجھتا ہو گا مکمل ناول "رفاقتوں کے گلاب" میں بہت اچھا سبق تھا ایسی ساسوں کے لیے جو اپنی نازک بہوؤں پر ظلم کے پہاڑ توڑتی ہیں دوسرا مکمل ناول بھی اچھا تھا بہت سارے کریکٹر تھے جو ذہن کو الجھا رہے تھے مگر اس کہانی کا اینڈ اچھا لگا۔

انٹرویوز ایک بھی نہیں پڑھے کیونکہ اس بار مجھے کرن میں لازمی جگہ چاہیے پلیز یہ خط ضرور شائع کیجیے گا ورنہ پھر میں خط شاید کبھی نہ بھیجوں اور پلیز مجھے بتا دیں کہ "مقابل ہے آئینہ" میں صرف جوابات لکھ کر بھیجتے ہیں یا ہمیں سوال بھی خود لکھنے پڑیں گے۔ پلیز خط کو ردی کی ٹوکری میں مت ڈالیے گا۔

ج ثناء! آپ کرن کی مستقل ممبر ہیں ہم آپ کا دل کیسے توڑ سکتے ہیں خط دیر سے موصول ہو تو پھر ہم معذرت خواہ ہیں کہ اسے اس محفل میں شامل نہیں کر سکتے۔ کہانیاں پسند آئیں۔ شکریہ "مقابل ہے آئینہ" میں آپ سوالات کے ساتھ جواب لکھیں تو بہتر رہے گا۔

اقصیٰ مریم مغلانی۔۔۔ کاسی اسٹریٹ کوئٹہ

کرن کی بزم میں خوش آمدید، ہزاروں لاکھوں دعائیں نیک تمنائیں اور کرن کی ترقی کے لیے خصوصی دعا قبول ہو

کرن "نامے میرے نام" میں یہ میرا پہلا خط ہے جسے میں محبت، چاہت اور لگن کے ساتھ تحریر کر رہی ہوں۔ میں بھی کبھی کبھی کرن پڑھ لیا کرتی تھی لیکن باقاعدہ قاری نہ بن سکی۔ کچھ اس میں کمال ہمارا اپنا بھی ہے اور کچھ کرشمے

ہمارے ہاکر نے بھی دکھائے ہیں کہ کرن بہت لیٹ موصول ہوتا ہے۔ اگست کا شمارہ نہیں ملا لہٰذا کچھ بھی کہنے سے قاصر ہوں۔ لیکن اتنا ضرور بتاتی چلوں کہ میں بھی اب کرن کی باقاعدہ قاری بننے جا رہی ہوں جس کا موجب تنزیلہ ریاض ٹھہری ہیں۔ تنزیلہ کو مبارک باد کہ وہ اتنا خوب صورت ناول لے کر آئی ہیں۔

اس کے علاوہ کرن کے باقی تمام سلسلے بھی خوب سے خوب تر ہیں۔

دوسری خوش آئند بات یہ ہے کہ کرن میں زیادہ سے زیادہ جگہ نئی لکھاری بہنوں کو دی جاتی ہے۔ جن کے افسانے لاجواب ہوتے ہیں۔ خدائے برتر کرن کے تمام عملے کو اسی طرح محنت کرواتا رہے اور یہ جریدہ ہر ماہ نئی سے نئی تحریر سلسلے کے ساتھ ہمارے دلوں میں گھر کیے رکھے آمین۔

خط ضرور شائع کیجیے گا ورنہ.... چلیے چھوڑیے آپ کو دھمکی دینا بھی ہمارے بس کا روگ نہیں۔

ج اقصیٰ مریم! کرن میں آپ کو خوش آمدید! کرن کے لیے آپ کی دعاؤں کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کے کہانیوں پر تفصیلی تبصرے کا انتظار رہے گا۔

ماریہ طفیل..... تحصیل میاں چنوں ضلع خانیوال

کرن میرا موسٹ فیورٹ رسالہ ہے۔ کرن کو میں 7th کلاس سے پڑھ رہی ہوں۔ لیکن شرکت پہلی دفعہ کر رہی ہوں۔ کرن کے سب سلسلے بہت اچھے ہیں۔ اگست کا شمارہ بہت اچھا تھا۔

مجھے بہت افسوس ہوا کہ فائزہ افتخار کا ناولٹ "شاید" اس دفعہ شائع نہیں ہو سکا "میں گمان نہیں یقین ہوں" میں زیان' اور ایک کا کردار بہت اچھا لگتا ہے پلیز زیان ایک کو ہی ملنی چاہیے "راپنزل" بس ٹھیک ہے۔ کیونکہ کردار ابھی واضح نہیں ہیں۔

باقی مکمل ناول اور افسانے بہت اچھے تھے۔ اچھا اب اجازت۔

ج ماریہ! کرن میں آپ کی آمد سے بہت خوشی ہوئی کہانیوں کو پسند کرنے کا شکریہ آپ کے کہانیوں پر تفصیلی تبصرے کا انتظار رہے گا۔

روزینہ نعیم..... نامعلوم

آج کل تو میں یہی سوچ رہی ہوں کہ کیا نیا کروں زندگی میں کیونکہ پیپرز کے بعد میں بالکل فری ہوں میں پچھلے آٹھ سالوں سے آپ کی خاموش قاری ہوں لیکن کل پھر اچانک مجھ پر دارد ہوا کہ کیوں نہ آپ کو خط لکھا جائے۔ اس ماہ کا ٹائٹل بس نارمل تھا۔ لڑکی کی آنکھیں پیاری تھیں ویسے "ردائے وفا" بھی اچھا جا رہا ہے پلیز حدید کے ساتھ کچھ برا نہ کیجیے گا۔ فائزہ جی کا ناول "شاید" تو کرن کی جان ہے۔ پر اس دفعہ تو شائع ہی نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ "راپنزل" کو ابھی شرف ملاقات نہیں بخشی۔ افسانوں میں مصباح علی کا افسانہ بہت اچھا تھا۔ یاسمین نشاط اور نزہت جی کی ناول سو سو تھے بس روزینہ جی نے ہی اچھے موضوع پر لکھا۔

"خالہ سالا اور اوپر والا" تو مجھے بالکل پسند نہیں آیا میں نے تو ہاتھ بھی نہیں لگایا اسے (معذرت کے ساتھ) "میں گمان نہیں یقین ہوں" میں زیان تھوڑی نہیں' بہت زیادہ ہی مغرور ہے مجھے تو نہیں پسند۔ اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب تو بہت ہی اچھی تھی۔

"میری بھی سنیے" میں تو ایک جیسے سوالات اور شکلیں دیکھ دیکھ کر تو ہم سب قاری بہنیں یقیناً" تھک گئی ہوں گی پلیز اس میں کچھ نیا پن لے کر آئیں۔

ایک درخواست ہے کہ پلیز FM-103 کے آر جے سلیمان صدیقی کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

ج روزینہ! "نام میرے نام" میں ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہم آپ کا خط کیوں نہیں شائع کریں گے ہمیں تو اب قارئین بہنوں کی رائے کا انتظار رہتا ہے۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا دی گئی ہے۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی خط لکھیں گی۔

نور عبدالسلام..... نواب شاہ

اگست کا شمارا سو بری مدیحہ کے ساتھ بہت اچھا لگا کرن کے ہاتھ میں آتے ہی کرنیں آس پاس بکھر گئیں جلدی سے حمد و نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ کر آگے چلے۔ اپنے بیسٹ ناول "ردائے وفا" میں عفت اور حدید پر بہت زیادہ ترس آیا میرے خیال میں عفت اور حدید کے ساتھ بہت اچھا ہونا چاہیے تھا اور نائلہ اس کا تو فرحین جی کچھ کریں اور تنزیلہ ریاض کا تو نام ہی کافی ہے دیکھتے ہیں آگے چل کر ابھی تو اسٹارٹ ہے اور انٹرویو "میری بھی سنیے" میں مایا علی سے خوب ملاقات رہی۔ پڑھ کر اچھا لگا اور افسانوں میں خاص طور پر حمیرا نوشین "میں نہ مانوں ہار"

پڑھ کر بہت ہنسی آئی واقعی ہمارے اردگرد ایسے بھی کردار ملیں گے آپ کو اور "خالا سالار اور اوپر والا" کا اینڈ فاخرہ گل نے توقعات سے بڑھ کر کیا۔ واہ فاخرہ جی! مکمل ناول "زندگی خاک نہ تھی" اپنے نام کی طرح ہی تھا اور "رفاقتوں کے گلاب" سارے رسالے کی جان اور "میں گمان نہیں" نبیلہ جی بہت زبردست اور سارے سلسلوں میں "میری سوچ میرا پاکستان" از دابیسٹ پیارے کرن کی پوری ٹیم کو ۱۴ اگست بہت بہت مبارک۔

ج نور عبدالسلام کرن پسند کرنے کا شکریہ۔

بشریٰ امین..... گوجر خان

اگست کا شمارہ مع خوب صورت ٹائٹل ہمارے ہاتھوں میں ہے واہ بھئی واہ مزا آگیا..... کیا یہ مقابلہ نمبر تھا؟ ایک سے بڑھ کر ایک کہانی یہ فیصلہ ہی کرنا مشکل کونسی سب بہتر ہے "ردائے وفا" اپنی ٹون میں آگے بڑھ رہا ہے مگر "راپنزل" تنزیلہ ریاض کے بارے میں کیا کہوں، لفظ کم تعریف زیادہ، یقیناً "ون اینڈ اونلی رائٹر اور تحریروں کی طرح ان کی یہ تحریر بھی شاہکار ثابت ہوگی اور بہرحال ابھی کردار کھل رہے ہیں اور شہرین کا بھائی اویس کا ردعمل میرے نزدیک بالکل فطری ہے لیکن آخر میں رائٹر شہرین کو حق بجانب قرار دے دیں، وہ الگ بات ہے۔ ابھی تو کچھ بھی کہنا قیافے اور قیاس کے مانند ہوگا" رفاقتوں کے گلاب" سوری نزہت یہ اچھا تھا مگر آپ اس سے زیادہ اچھا بھی لکھ سکتی تھیں۔ یاسمین نشاط "اعتبار کر دیکھو" ارے ارے کیا کمال تحریر تھی دل مٹھی میں لے لیا۔ ایسا لگا مصنفہ درد کے رو میں بہتی جارہی ہے قلم تھمنے کا نام نہ لے رہا ہو۔ دکھ بھی جب کسی کے در پر آتے ہیں تو زرش کی طرح آتے جاتے ہیں۔ یاسمین نے اینڈ بہت ہی اچھا کیا کم از کم ندا جیسی لڑکیوں کے لیے حوصلہ افزا۔ "بہار آگئی" بے شک موضوع پرانا تھا مگر بعض پرانے موضوع ہر بار پڑھنے میں اچھے لگتے ہیں۔ ویل ڈن جناب ناول اور ناولٹ تو ایک دو پڑھنے سے رہ گئے مگر افسانے ایک ہی بار میں سارے پڑھ ڈالے۔

"مصباح علی" کا "لنگا ہوا منگا" یقین مانیں نام کی وجہ سے ہی پہلے پڑھا ارے واہ کیا بات ہے "چیزیں خواہ کرائے کی ہوں مگر رشتوں میں خلوص کرائے کا نہ ہو۔ مصباح علی کا وطیرہ ہے ہلکے پھلکے الفاظ میں انتہائی سبق آموز بات کہہ دیتی ہیں۔ مگر بہت دیر دیر سے لکھتی ہیں ذرا جلدی لکھا کریں۔ ہماری فیملی میں بھی اس قسم کا قصہ ہوا ہے۔ بری کی کمی بیشی پر لڑائی..... جو ابھی تک جاری ہے بلکہ معاملہ روز بروز کھٹائی میں پڑ رہا ہے۔ میں نے افسانہ پڑھتے ہی انہیں لپیٹ کر بھجوا دیا۔ کیا تمہیں بھی وانیہ کی طرح گھر کا سامان بیچ کر ہی بری چاہیے؟ شاید اسے بھی عقل آ ہی جائے۔

"سیما بنت عاصم" کا ٹوٹکا کہانی بہت ہی معاشرتی تھی، جی بہت مزا آیا مگر نام کہانی سے میچ نہیں ہو رہا تھا۔ بھئی کونسا ٹوٹکا؟ اور ہاں "میں نہ مانوں ہار" تو حمیرا باجی آپ کو ہارنے کو کس نے کہا ہے لیکن یہ اپنی نوعیت کا انوکھا مقابلہ تھا۔ حمیرہ، سعدیہ عزیز، سیما بنت عاصم اور مصباح جی نے تو لگتا ہے مقابلہ لگا کر ہی لکھا ہے ہاہا..... قرض دار" سادی مگر اچھی تحریر تھی۔ مستقل سلسلے سارے اچھے تھے۔ میں بھی "چند موتی چنے ہیں" بھیج دوں؟

ج بشریٰ امین! جس طرح آپ نے کہانیوں میں اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کیا ہے اس سے آپکی کرن سے وابستگی دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے جو "موتی چنے ہیں" وہ ہمیں ضرور ارسال کیجیے۔

عاصمہ ابراہیم..... شہر تلمبہ، میاں چنوں، ضلع خانیوال

اگست کے شمارہ میں اپنا خط شائع دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ مگر اپنے شہر کا نام تلمبہ کی جگہ خانیوال دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔

پلیز اب نام درست کر دیجیے گا۔ مجھے کہانیاں لکھنے کا بہت شوق ہے میں نے ایک افسانہ بھی لکھا ہوا ہے۔ مگر میں نے پوسٹ نہیں کیا۔ "میں گمان نہیں یقین ہوں" میں زیان ایک کو ہی ملنی چاہیے پلیز، اور مکمل ناول، ناولٹ اور افسانے سب ہی بہت اچھے تھے۔ مگر زندگی خاک نہ تھی" بہت پسند آیا۔

ج عاصمہ ابراہیم! کرن کو پسند کرنے کا شکریہ شہر کے نام کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ کہانی آپ کرن کے ایڈریس پر ارسال کر دیں قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع کریں گے۔

طاہرہ ملک..... جلال پور پیروالا

اگست کا شمارہ Thank God مقررہ تاریخ کو ملا۔

ٹائٹل گرل ہمیشہ کی طرح اچھی لگی۔ مدیرہ جی سے سلام دعا کی ان کی طرح ہمارے دل سے بھی بے ساختہ دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس پیارے وطن کو ہمیشہ کے لیے شاد و آباد رکھیں اور دشمنوں سے محفوظ رکھے آمین۔

"میری سوچ میرا پاکستان" سروے اچھا لگا زرنش خان' ماہا علی سے مل کر اچھا لگا "راپنزل" "خوب صورت سا نام تنزیلہ ریاض ہمیشہ کی طرح آپ کا یہ ناول بھی چھا جائے گا راپنزل کے لمبے بالوں کا ذکر بڑا دلچسپ تھا کیونکہ جی لمبے بال میری کمزوری جو ٹھہرے۔

"ٹوٹکا" فہد بے چارے کی قسمت پر افسوس ہوا اور ویسے بھی یہ افسانہ تھوڑا ہٹ کے تھا کیونکہ ہم یہ ہمیشہ سے پڑھتے آرہے ہیں کہ رشتے کے لیے بے چاری لڑکیوں کو پل صراط سی گزرنا پڑتا ہے ایسا پہلی بار پڑھا کہ کوئی لڑکا بھی اس بردکھوے کی تکلیف سے گزرا خیر اینڈ اچھا ہوا فہد کی اور انجم آرا کی قسمت کھل ہی گئی۔

"میں گمان نہیں یقین ہوں" مائی فیورٹ ناول نبیلہ ابر جی شکریہ آپ نے زیان کو وہاب کے چنگل سے نکالا اب زیان پہ غصہ آتا ہے کہ وہ ایک سے کیوں اس طرح کا برتاؤ کر رہی ہے ایک کے ماں باپ اور بھائی سے تو اس کا رویہ بہت اچھا ہے اگر اپنی ماں سے ہرٹ ہے تو وہ پھر ان کے سامنے تو کچھ نہیں کہتی اور ہاں رنم کا زیان سے جیلس ہونا کچھ بھایا نہیں بھئی کروڑوں کی جائیداد کی مالک اور اب نوکرانی (نوکرانی بھی تو خود بنی ہے ویسے اس کی ہمت کی داد دینی پڑے گی لگتا ہے رنم جی مستقبل میں ملک ہاؤس ہی کی بہو بنیں گی۔

"ردائے وفا" پہلی قسط سے ہی دل میں گھر کر گیا سوہا انس کی غلط فہمیاں ختم ہو گئیں انہیں خوش دیکھ کر ہم بھی خوش ہو گئے 'ماہا کو آنے والی کال یقیناً" حسیب کے ایکسیڈنٹ سے متعلق ہو گی مجھے تو نائلہ پہ حیرانی ہوتی ہے (الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے) اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہونے کی بجائے مزید لوگوں کے دل توڑ رہی ہے عفت' حدید کی حالت پر افسوس ہوتا ہے برا ہوا ان بے چارے سیدھے سادھے لوگوں کے ساتھ۔

"خالہ' سالا اور اوپر والا" فاخرہ گل جی چندا کے ابا نے کنجوسی کی جو عالی ریکارڈ قائم کیے تھے وہ آپ نے ایک ہی قسط میں توڑ ڈالے (واہ جی) چلیں جی خوشی ہوئی خالہ اور چندا کی نیا بالا آخر پار لگ ہی گئی اور علی کے تو وارے نیارے ہو گئے جہاں اسے چاہت والی لڑکی ملی وہاں جائیداد بھی مل گئی۔

"رفاقتوں کے گلاب" نزہت جبیں ضیا آپ کی کاوش بہت پسند آئی شجیہ بے چاری پہ ترس آیا مادی چیزوں کی وجہ سے اس کی زندگی اجیرن بنا دی گئی ساسوں کو ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے نزہت جی نے تو اس میں شادی شدہ لوگوں کو دو سبق دیے ایک تو یہ کہ اپنا حق مانگ لینا چاہیے کبھی کبھی نام نہاد انا کی دیواروں کا گر جانا ہی اچھا ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ جس شخص سے آپ منسلک ہوتی ہیں اس کا خیال پہلے رکھنا چاہیے کہا تو آپ نے ٹھیک ہے جب مرد کو گھر میں توجہ نہ ملے تو وہ باہر ڈھونڈتا ہے۔

آپ کے یہ ڈائجسٹ اس لیے تو ہمیں عزیز ہیں کہ ان میں ہی زندگی گزارنے کے سلیقے ہوتے ہیں Kiran Thank you So much اتنی اچھی کہانیاں دینے کے لیے اب بات ہو جائے "اک ساگر ہے زندگی کی" مانا کہ ہم لیٹ ہو گئے ہیں لیکن اس پہ تبصرہ نہ کرنا ناانصافی ہو گی کیونکہ ہمیں یہ دل و جان سے عزیز تھا لیکن نفیسہ سعید جی آپ نے ہمیں ہرٹ کر دیا شاہ زین سے کی گئی ناانصافی نے ہمیں ڈس ہارٹ کر دیا حبیبہ کا فیصلہ ہمیں بالکل پسند نہیں آیا اسے یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ سالار' نازیہ اور شاہ زین کے بابا ان سب نے کتنا ساتھ دیا تھا حبیبہ کا اپنے بیٹے کی کنڈیشن پہ ان کا تو دل دکھا ہو گا۔ فرہاد کی حبیبہ کی ماں زینب سے محبت اور جدائی نہ برداشت کرتے ہوئے موت کو گلے لگانا اس انکشاف سے آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے جب فرہاد خود کو change کر چکا تھا تو زینب ایسا قدم نہ اٹھاتی وجاہت کے عشق کی شدتوں پہ حیرانی ہوئی ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں دنیا میں کرن کے سب سلسلے بھی بے حد پسند آئے۔

کرن کتاب کی تعریف نہ کرنا تو جی زیادتی ہی زیادتی ہو گی کیونکہ اس میں اتنے یونیک نیم تھے کہ دل خوش ہو گیا کمال ہے بھئی جہاں نام اتنے زبردست وہاں معنی بھی لاجواب۔ اور ہاں کیا یاد کروا دیا پچھلے ماہ آپ نے جو میک اپ اسٹک کے نمبر بتائے تھے وہ تینوں میرے Face پہ سوٹ نہیں کرتے کیونکہ میرا کلر فیئر ہے (بھئی انگریزوں والا نہیں) ویسے اچھا خاصا گورا ہے پلیز پلیز مجھے ضرور بتا دیں اور آپ نے کہا کہ دو تین کلرز مکس کر کے لگائیں پلیز وہ

بھی بتا دیں میں بے چینی سے wait کروں گی۔

last میں تمام کرن اسٹاف کا بے حد شکریہ جو اتنی محنت سے آپ ہمارے لیے کرن کو سجاتے سنوارتے ہیں اور کیوٹ اسٹاف اولی ریڈرز بیوٹی فل رائٹرز میری طرف سے آپ کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے عیدالاضحیٰ مبارک اور سوئیٹ نازیہ کنول نازی' سمیرا شریف طور آپ کو خوب صورت بندھن میں بندھنے پر بے حد مبارکباد۔

ج طاہرہ ملک! قاری بہنیں اپنے خطوں میں یقیناً" تعریف کرتی ہیں دوسری بہنوں کی ارسال کی ہوئی تحریروں کی مگر ہم سب کے خطوط شامل کرنا چاہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے زیادہ تفصیلی خطوط شائع نہیں کرپاتے۔ آپ کسی ایسی شاپ پر جائیں جہاں پر لیڈیز شاپ کیپر ہوں وہ یقیناً" آپ کا کمپلیکشن دیکھ کر مشورہ دیں گی کہ آپ کون سے نمبر کی اسٹک استعمال کریں۔

رضوانہ ملک۔۔۔ جلال پور پیروالا

اگست کا شمارہ خلاف توقع بارہ کو ملا تو بے انتہا خوشی ہوئی۔ سب سے پہلے میں نفیسہ سعید کے ناول "اک ساگر ہے زندگی" کی بات کروں گی کہ اس کے اینڈ نے کافی اداس کردیا شاہ زین اور حبیبہ کا ملاپ نہ ہوا جس کا بہت زیادہ افسوس ہوا وہ بچارہ تو اس سے سچا پیار کرتا تھا اس میں اس کا تو کوئی قصور نہ تھا لیکن دوسروں کے کیے کی سزا اسے ملی اور فرہاد کی موت کا بھی دکھ ہوا وہ زینب سے تو بہت پیار کرتا تھا لیکن اس نے اظہار نہ کیا لیکن ایسی محبت کا کیا فائدہ جب دوسرے کو پتا بھی نہ ہو کہ آپ کسی کے لیے اسپیشل ہیں اور فرہاد کی بہن پر بہت زیادہ غصہ آیا کہ اسی کی وجہ سے ان دونوں کی زندگی خراب ہوئی اس نے اپنی محرومیوں کا بدلہ اپنے بھائی بھابھی سے لیا۔ مائی موسٹ فیورٹ ناول "ردائے وفا" میں تھینکس گاڈ کہ انس اور سوہا کی جوڑی آپس میں سیٹ ہوگئی ہے اور یہ لیا حسیب کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے لیکن ماہا کو تو پتا ہی نہیں ہے اس بات کا وہ تو سمجھتی ہے کہ وہ چلا گیا ہے تو عفت کا نکاح ہوگیا ہے لیکن اس کے دل میں تو کوئی خوشی ہی نہیں اب پتا نہیں آگے اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے حدید تو سیدھا سا لڑکا تھا لیکن نائلہ جیسی بلا اس کے گلے پڑ گئی ہے جو کسی کی بھی نہیں ہے "میں گمان نہیں یقین ہوں" میں رنم کو اپنا گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا اسے اب گھر چلے جانا چاہیے۔

فائزہ افتخار کا ناول "شاید" بہت ہی زبردست ہے پلیز سمی کا دل نہ توڑیں وہ جسے پسند کرتی ہے ادھر ہی اس کی شادی ہونے دیں۔ تنزیلہ ریاض کا ناول "راپنزل" بہت ہی بیسٹ ہے اس میں سلیم کی ماں نے بہت ہی سمجھ داری سے کام لیا ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کو ضائع نہیں ہونے دیا بلکہ اسے کارآمد شہری بنادیا ——— سب سے بیسٹ تحریر قرۃ العین خرم ہاشمی کی تھی ماہ رخ کی ساری فیملی بہت نائس تھی احسن' جنید' انوشے' عمر' شہرام لیکن ماہ رخ کا کافی افسوس ہوا کہ اتنی پیاری اور معصوم سی لڑکی کو خوشیاں نہ ملیں جہانگیر کو طلاق نہیں دینی چاہیے تھی انوشے اور عمر کا بیسٹ کپل تھا۔

"رفاقتوں کے گلاب" بھی اچھا ناول تھا یہ شادی شدہ خواتین کے لیے تھا جو بچوں کی پیدائش کے بعد نہ خود پر توجہ دیتی ہیں اور نہ ہی خاوند کے لیے ان کے پاس ٹائم ہوتا ہے اور پھر بعد میں انہیں پچھتانا پڑتا ہے اس میں نزہت جبیں ضیا نے میرڈ خواتین کو اچھا طریقہ بتایا ہے کہ وہ کس طرح گھر چلائیں۔

یاسمین نشاط کا ناولٹ بھی بہت اچھا تھا زرش کی ساری زندگی شہریار کے بنا کانٹوں پہ گزری فقیہ الدین جیسے لوگ جو دوسروں کی زندگی جہنم بنادیتے ہیں ان کا انجام بھی ایسے ہی ہوتا ہے ندا کافی سمجھ دار اور ہوشیار تھی جو اس نے ہمت سے کام لیا اگر وہ اپنی ماں اور بہن کو لے کر نہ چلی جاتی تو ان دونوں کی زندگی بھی اپنی ماں کی طرح خراب ہوجاتی۔ عزہ خالد کا ناولٹ بھی بہت اچھا تھا شہناز آفندی نے وجدان کے ساتھ کافی برا سلوک کیا اسے باپ اور بھائی دونوں سے دور کردیا اس میں وجدان پر کافی ترس آیا لیکن عینا اچھی لڑکی تھی اس نے وجدان سے اس کی محبت نہ چھینی۔

حمیرا نوشین کا افسانہ "میں نہ مانوں ہار" کافی دلچسپ تھا رفعت و عشرت نے ایک دوسرے کی ضد میں اپنی صحت کا بھی خیال نہ رکھا سعدیہ عزیز آفندی' سیما بنت عاصم' مصباح علی اور روزینہ حنیف سب کے افسانے اچھے تھے 14 اگست کے حوالے سے سروے "میری سوچ میرا پاکستان" کافی اچھا لگا زرنش خان اور مایا علی دونوں سے ملاقات اچھی رہی زرنش اور مایا اپنے نام کی طرح خود بھی پیاری ہیں۔

"کرن کا دسترخوان" میں ساری ڈشز لاجواب تھیں "مقابل ہے آئینہ" میں رابعہ افتخار اچھی لگی۔

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب "خوب صورت اور بامعنی نام" میں بہت پیارے پیارے اور یونیک نام تھے۔
اور پلیز عمران عباس اور فہد مصطفیٰ کا انٹرویو بھی شائع کر دیں۔
اور میں اپنے بھائی محمد جنید ملک کو تھینکس کہنا چاہوں گی جو ہر ماہ خوشی خوشی گھر سے کافی دور لیٹر پوسٹ کر آتا ہے۔

ج پیاری رضوانہ آپ بہت دلچسپی اور محبت سے کرن کی ہر کہانی اور سلسلے کو پڑھتی ہیں شکریہ اسی طرح تبصرہ کرتی رہا کریں۔

نشا نورین، صائقہ نورین۔۔۔ پوتالہ جھنڈا سنگھ

اب کی دفعہ کرن جلدی مل گیا اس دفعہ ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا سب سے پہلے حمد باری تعالیٰ پڑھی اور نعت شریف پڑھ کر دل کو سکون ملا پھر جلدی سے چھلانگ لگائی "نامے میرے نام" جہاں اپنا نام چمکتا دیکھ کر دل وڈا وڈا ہو گیا کیوں نہ ہو آخر کرن سے تعلق بہت پرانا ہے میری تنہائی کا ساتھی جس سے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا اب تو میری کزن صائقہ بھی اس کی بہت بڑی فین ہو گئی ہے۔
"ردائے وفا" میں نائلہ کیا کرتی جا رہی ہے کچھ سمجھ نہیں آ رہی آخر یہ چاہتی کیا ہے انسانوں کی طرح اس کو حدید کو قبول کرنا چاہیے اور رہا ہے عفت کو جیون ساتھی اچھا ملے۔
مکمل ناول میں "زندگی خاک نہ تھی" میں قرۃ العین نمبر لے گئی جہاں ماہ رخ کی بے بسی پر رونا آیا وہاں ایک دم جہانگیر کو قتل کرنے کو دل چاہا لیکن شکر ہے آخر میں کم از کم اپنی بیٹی کا فیصلہ ٹھیک کیا اپنی انا اور ضد کو توڑ کر۔
"خالہ سالا اور اوپر والا" کی آخری قسط دیکھ کر دکھ ہوا اکثر جب اکیلی ہوتی تھی اس ناولٹ کو پڑھتی اور اکیلی ہی مسکراتی رہتی تھی ویلڈن فاخرہ جی۔ یاسمین نشاط کا ناولٹ "اعتبار کر کے دیکھو" میں زرش کا اپنے شوہر شہریار سے پیار کرتے دیکھ کر اچھا لگا وہاں اس کی موت کا سن کر دل بہت پریشان ہوا اور بے چاری کے مقدر میں بڈھا حرام فقیہ الدین آیا جو کہ نہیں آنا چاہیے تھا۔
جاتے جاتے ہمیشہ کی طرح ایک فرمائش جو کہ کبھی تو پوری ہو گی وہ یہ کہ آپی فرحت اشتیاق پلیز جلدی سے ایک مکمل ناول لے کر آئیں۔
ج نشا! آپ کا اور آپ کی کزن صائقہ کا کرن کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔

فوزیہ ثمر بٹ، آمنہ میرام ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

اگست کا شمارہ چودہ اگست ہنستا مسکراتا ہوا ہمارے گھر تشریف لایا۔ اس دفعہ ٹائٹل کچھ خاص نہیں لگا۔ حسب عادت سب سے پہلے حمد باری تعالیٰ اور نعت۔ سوال مقبول سے فیض یاب ہوئے "میری سوچ میرا پاکستان" سب فنکاروں نے اپنے اپنے خیالات کا اچھا اظہار کیا۔
شاہین جی تھوڑی سی ورائٹی لائیں سوالوں میں سب سے پہلے "راپنزل" کو پڑھا۔ اس بار بھی قسط اچھی رہی تحریر کی جان نینا اور سلیم ہیں دونوں کی نوک جھوک مزے کی لگتی ہیں۔ نینا تو انتہا پسند ہے۔ کبھی کبھی سلیم پر بڑے ظالمانہ طنز کر جاتی ہیں۔
صوفیہ کو کاشف پر صبر کر لینا چاہیے۔ کاشف جیسے مرد جو بیوی کو بکری جیسا سمجھتے ہیں۔ جیسے گھر میں بکری لا کر بندھ دی۔ ویسے ہی بیوی بھی۔ صبیحہ جیسی عورت ان مردوں کا ایمان خراب کرنے کو تیار ہے۔
ناولٹ "اعتبار کر کے دیکھوں" بہت اچھی تحریر تھی۔ زندگی کے ہر موڑ خوشی، غم کو دکھایا ہے۔ مگر ندا کے بھائی کا یہ فقرہ اچھا لگا۔
"جوان بہن کا بھائی ہوں کسی کی عزت اچھالنے کا سوچ بھی کیسے سکتا ہوں۔"
مکمل ناول "زندگی خاک نہ تھی" جہانگیر خود پسند انسان جو خود سری کے نشے میں اپنی خوشیوں کو خاک میں ملا دیتے ہیں نہ خود خوش رہتے ہیں نہ خود سے وابستہ رشتوں کو خوش رکھ سکتے ہیں۔
"مجھے ایسا پیا کا پیار ملے" پورے ڈائجسٹ کی جان تحریر۔ اینڈ دل کو افسردہ کر گیا۔ بے اختیار منہ سے نکلا اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا۔ "بہار آ گئی" اچھی تحریر تھی تینوں کزنز کی آپس میں محبت اور نوک جھوک مزے کی لگی۔
"میں نہ مانوں ہار" اس ماہ کا بہترین افسانہ۔ واہ کیا موضوع ڈھونڈ کے لائیں ہیں۔ حمیرا نوشین "ردائے وفا" عفت کی بے بسی پہ رونا آ گیا۔ نائلہ پہ حد سے زیادہ غصہ آتا ہے۔ اس کی وجہ سے سب اردگرد بکھر گئے۔
"رفاقتوں کے گلاب" بس اچھا لگا۔ "مقابل ہے آئینہ" کے جوابات تسلی بخش تھے۔ "کچھ موتی چنے ہیں" نوال افضل وثیقہ کا اقتباس پسند آیا۔